

ایضاً شہداء و شہداء

# زیر پوائنٹ 4

جاوید چودھری



WWW.PAKSOCIETY.COM



مسی کا وہ گارنٹ اللہ تعالیٰ سے جنت اور دوزخ دیکھنے کی درخواست کی اللہ تعالیٰ نے اسے فرشتوں کے حواسے کر دیا کرتے تھے اسے دوزخ میں لے گئے دوزخ ایک بہت بڑا انگلیک ہال تھا جس میں شاندار کرسیاں ملی تھیں اور ان کرسیوں پر اونچائی والا فرشتہ اور دو عورتوں لوگ بیٹھے تھے ان لوگوں کے سامنے سوپ کے بڑے بڑے پیالے رکھے تھے اور ان کے ہاتھوں میں لیے لیے پیچھے تھے گناہ گار نے دیکھا ان لوگوں کی کہیاں نہیں ہیں اور یہ لوگ اپنے بازو تھپکیں کر سکتے چنہ چنہ یہ لوگ پیالے سے پیچھے بھرتے ہیں پیچھے کو سر تک لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن سوپ پیٹوں تک پہنچنے سے پہلے ان کے گریبان پر گر جاتا ہے وہ مسد یوں سے سوپ پینے کی کوشش کرتے رہتے لیکن پیچھے ان کے ہاتھوں تک نہیں پہنچ پارسے تھے فرشتے اسے وہاں سے جنت میں لے گئے یہ بھی ایک بہت بڑا انگلیک ہال تھا اس ہال میں بھی لوگ بیٹھے تھے اور ان کے سامنے بھی سوپ کے پیالے پڑے تھے لیکن یہ لوگ انتہائی صحت مند خوبصورت اور مطمئن تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہنس مکھیل رہے تھے گناہ گار نے فرشتوں سے جنت اور دوزخ کا فرق پوچھا تو فرشتے بولے ان لوگوں کے بازوؤں میں بھی کہیاں نہیں ہیں لیکن انہوں نے اس کا بازو لپیٹ کر ہال میں لے لیا ہے یہ پیالے سے پیچھے بھرتے ہیں اور پیچھے اپنے ہمسائے کے منہ میں ڈال دیتے ہیں اور یہاں اپنا پیچھے ان کے منہ میں چنہ پیچھے دلوں کی جھونک منٹ جاتی ہے۔  
وہ گناہ گار واپس آیا اور اس نے اہل دنیا کو جنت اور دوزخ میں سرف مکمل کا فرق ہوتا ہے دوزخ میں لوگ اپنا پیچھے اپنے منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ جنت میں اپنے پیالے سے پیچھے بھرتے ہیں اور دوسرے کے منہ میں ڈال دیتے ہیں انہیں نے گناہ گار کی بات سنی تو بھیس اس وقت معلوم ہوا وہ جنت میں آسمانوں میں حاش کرتے رہتے ہیں وہ جنت زندگی بھر ہماری ڈانگہ بھیل ہی پڑی رہتی ہے ہم نے بس ایک پیچھے بھرنے ہی میں پیچھے نص کے منہ میں ڈالنا ہے اور اللہ کا قرب پا جاتا ہے بس اتنی سی بات ہے لیکن ہم اتنی سی بات کیلئے عمر بھر مارے مارے بھرتے ہیں ہم فعل کے پیچھے کو بھرنے میں مکمل لیے سلسلے میں جاتی کرتے رہتے ہیں۔  
ہم کہتے رہے وقت ہیں۔



کی  
دیکھ سب

Rs. 500/-

Designed by  
FAZIL KHALI

الحمد مارکیٹ 40- اردو بازار لاہور  
فون 7232336 7352332 7223584



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

زیر پوائنٹ 4

# زیرو پوائنٹ 4

جاوید چودھری

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور

فون: 7352332-7232336



## جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

|            |                           |
|------------|---------------------------|
| نام کتاب   | نہید پناہ گشت 4           |
| مصنف       | چاویہ جودھری              |
| ناشر       | گل فرناز احمد             |
| مطبع       | علم و عرفان پبلشرز، لاہور |
| پروف ریڈنگ | زاہد نوید پرنٹرز، لاہور   |
| کمپوزنگ    | محمد نواز صابر            |
| اشاعت اول  | نفر اقبال                 |
| اشاعت دوم  | ستمبر 2007ء               |
| تعداد      | اپریل 2010ء               |
| قیمت       | 1100                      |
|            | = 500/- روپے              |

پتہ: قیام پور، لاہور۔ فون: 0300-9450911

Kashif Azad © OneUrdu.com

ملے کے ہے

## علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اردو بازار، لاہور  
فون: 7352332-7232336

### اشرف بک انجینی

اقبال روڈ، کینٹی چوک، راولپنڈی

دیکم بک پورٹ

اردو بازار، کراچی

### کتاب گھر

اقبال روڈ، کینٹی چوک، راولپنڈی

خزینہ علم و ادب

انکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

ادارہ علم و عرفان پبلشرز کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اپنی سیارگی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ شائقینِ دماغ میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متعلق ہونے والے غلط فہمیوں کو کم، انسانی طاقت اور ہمارے مطالعہ کی کچھ حکامات، صحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری قلم سے اگر کوئی غلطی یا سہولت درست نہ ہوں تو ازراہِ کرم مطلع فرمائیے۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں اصلاح کیا جائے گا۔ (ناشر)

انتساب!

اپنے بیٹے

قائز جاوید

اور

شما عیال جاوید کے نام



# کاشفِ آزاد

## ترتیب

|    |  |    |
|----|--|----|
| 11 | سارے طالبان دہشت گرد نہیں ہیں                    | 1  |
| 14 | ورنہ یہ لوگ ہم پر نہیں مے                        | 2  |
| 17 | یہ 29 لاکھ لوگ                                   | 3  |
| 20 | لیس وی کین                                       | 4  |
| 23 | آٹھ بجے  | 5  |
| 26 | پچاس چینی کا سک                                  | 6  |
| 29 | قدرت کا ہاتھ                                     | 7  |
| 32 | دس ڈالر کا نوٹ                                   | 8  |
| 35 | ایک بڑی خورس                                     | 9  |
| 38 | تین وجوہات                                       | 10 |
| 41 | حشر کو ابھی بہت دن باقی ہیں                      | 11 |
| 44 | کیا ہم ڈاکٹر عبداللہ کیلئے اتنا بھی نہیں کر سکتے | 12 |
| 47 | خودکش  | 13 |
| 50 | ہم ایک بے وقوف قوم ہیں                           | 14 |
| 53 | شاید کوئی نہیں                                   | 15 |
| 56 | خدا کیلئے کچھ کریں                               | 16 |
| 58 | پستول کی عدالت                                   | 17 |
| 61 | بے عزت   | 18 |
| 64 | مر جانا اور مار دینا                             | 19 |
| 67 | ہوٹل اور مسجد                                    | 20 |
| 70 | ہم دنیا کی طرح کب سوچیں گے                       | 21 |
| 73 | ہم ایڈیشن  | 22 |
| 76 | پاؤں سے گلے تک                                   | 23 |
| 79 | ہم بددعاؤں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے               | 24 |

|     |                                     |    |
|-----|-------------------------------------|----|
| 82  | خوف الہی کی نعمت                    | 25 |
| 85  | اپنی چنگاریاں اپنا دامن             | 26 |
| 88  | کوئی برے ہوتے ہیں کوئی نہیں         | 27 |
| 91  | یہ جنگ کیسے شروع ہوئی               | 28 |
| 94  | اس کے بعد کیا ہوا                   | 29 |
| 97  | اب کس کی باری ہے                    | 30 |
| 100 | دوسرا راستہ بھی ہے                  | 31 |
| 103 | پسپائی کے پچاس سال                  | 32 |
| 106 | بادشاہوں کی غلطیاں                  | 33 |
| 109 | 67 لاکھ شہر مرغ                     | 34 |
| 112 | سکھ فوج                             | 35 |
| 116 | دفاع                                | 36 |
| 119 | بھارت صرف 653 عہدوں کی قربانی دے دے | 37 |
| 122 | جاپان اب ترقی کر کے دکھائے          | 38 |
| 125 | مرٹنے کا مقام                       | 39 |
| 128 | عشق کا مقام                         | 40 |
| 131 | ڈائیلاگ کی گنجائش موجود ہے          | 41 |
| 134 | زوال کی تمنی وجوہات                 | 42 |
| 137 | زوال کی چوتھی وجہ                   | 43 |
| 140 | نورسے کی ماں                        | 44 |
| 143 | بھائی لوگوں کی خدمت                 | 45 |
| 146 | جادوگر                              | 46 |
| 148 | ٹمک کی چٹان پر گنا                  | 47 |
| 151 | خواہشوں کا دن                       | 48 |
| 154 | تم کافر لوگ                         | 49 |
| 157 | ٹمک کی کان                          | 50 |
| 160 | بیٹھے منہ                           | 51 |
| 163 | پاکستان ٹیلٹ نہیں                   | 52 |
| 166 | قبر تک                              | 53 |



|     |                                 |    |
|-----|---------------------------------|----|
| 169 | پرستی کا اونٹ                   | 54 |
| 172 | فیک                             | 55 |
| 175 | چودھری شجاعت مجھدار ہیں         | 56 |
| 178 | یہ کتاب ثابت کرتی ہے            | 57 |
| 181 | پانچ چھ سالوں کی گیم            | 58 |
| 185 | کوٹے                            | 59 |
| 188 | اصل مشاہد حسین کون ہے           | 60 |
| 192 | بزنس میچوں کیلئے بھی وقت نکالئے | 61 |
| 195 | خارجہ پالیسی                    | 62 |
| 198 | پاکستان کا سوئٹزر لینڈ          | 63 |
| 201 | سرحد حکومت سے درخواست           | 64 |
| 204 | بلوچ قیادت بھی قصور دار ہے      | 65 |
| 207 | بس آنکھیں بند کریں              | 66 |
| 210 | بلوچوں کے ساتھ زیادتی ہوتی رہی  | 67 |
| 213 | پنجابی قصور دار ہیں             | 68 |
| 216 | کام چور                         | 69 |
| 219 | کرپٹ                            | 70 |
| 222 | ایماندار                        | 71 |
| 225 | شاید ہم کبھی                    | 72 |
| 28  | سواتین دن میں                   | 73 |
| 231 | علیحدگی کی وجہ                  | 74 |
| 234 | کیا اپوری اسلامی دنیا میں       | 75 |
| 237 | دل کے ارب پتی                   | 76 |
| 240 | ریڈ زون                         | 77 |
| 243 | مہنگائی                         | 78 |
| 246 | سات سوالوں کے بہات جواب         | 79 |
| 249 | دمداری                          | 80 |
| 252 | اللہ کے سفیر                    | 81 |
|     | حجہ ۱۴۰۳ھ                       | 82 |

|     |                                  |     |
|-----|----------------------------------|-----|
| 258 | میں جانتا ہوں یہ پاگل ہے         | 83  |
| 261 | شاید ہمیں                        | 84  |
| 264 | لوڈ شیڈنگ                        | 85  |
| 267 | مراقت                            | 86  |
| 270 | کیونیکیشن ایج                    | 87  |
| 273 | پروٹوکول                         | 88  |
| 275 | دن لاہور دن                      | 89  |
| 278 | ترجیحات                          | 90  |
| 280 | سنگول                            | 91  |
| 283 | ہم سب غمگین ہو چائیں             | 92  |
| 286 | غلاموں کے غلام                   | 93  |
| 289 | کاش ہم تلبیاں ہوتے               | 94  |
| 292 | صرف حاضری لگوانے کیلئے           | 95  |
| 295 | ہمارے پاس بنیاد ہی نہیں          | 96  |
| 298 | دس لوگ                           | 97  |
| 301 | جہاں زیادہ محنت وہاں زیادہ ٹیلنٹ | 98  |
| 304 | ایک زبان دو کان                  | 99  |
| 306 | سیلف ریٹائرمنٹ                   | 100 |
| 309 | استقامت کے دس دن                 | 101 |
| 312 | قربانی فنڈ                       | 102 |
| 315 | اللہ کے نام پر                   | 103 |
| 318 | عصر کی قسم                       | 104 |
| 321 | گھائے کے سوداگر                  | 105 |
| 324 | Do Not Wish For Less Problems    | 106 |
| 326 | وائے ٹی                          | 107 |





## سارے طالبانِ دہشت گرد نہیں ہیں

ہم لوگ ریاض سے مدینہ شریف جا رہے تھے، انیق احمد اور میری سٹیس ساتھ ساتھ تھیں، انیق احمد پاکستان کے ان چند بنگلہ پر سبز میں شمار ہوتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے علمِ عاجزی اور اخلاق سے نوازا ہے، انیق صاحب جہاں علامہ اقبال کے حافظ ہیں وہاں وہ دنیا کے تمام قدیم اور جدید دانشوروں، مفکروں اور علماء کرام کے بھی ناخس ہیں، ان کا تعلق ایک دینی گھرانے کے ساتھ تھا، ان کے والد ایک معروف عالم دین تھے اور انیق صاحب نے قرآن مجید، فقہ اور احادیث کی بحثوں کے درمیان آنکھ کھولی تھی لہذا اس دینی اور علمی فضا کی جھلکت انیق صاحب کی گفتگو میں دکھائی دیتی ہے، علمِ دولت، شہرت اور اقتدار کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ 99 فیصد لوگوں کا دماغ خراب کر دیتا ہے، یہ چند دنوں کا اقتدار، کاغذ کی بنی عارضی دولت، مصنوعی روشنیوں سے ادھار لی ہوئی شہرت اور چند کتابوں اور چند گریوں کا علم بھی عجیب چیز ہے، یہ عموماً باہشت بھر کے انسان کو فرعون بنا دیتا ہے اور 99 فیصد لوگوں کا یہی المیہ ہے لیکن وہ ایک فیصد لوگ جو اقتدار، دولت، شہرت اور علم کے باوجود انسان رہتے ہیں، جن کی گردن اور کندھے جھکے رہتے ہیں اور جو تعریف کے ہر لفظ کے بعد ممنونیت کے اظہار کے لیے آسمان کی طرف دیکھتے، وہ جیئرز لوگ اللہ کے کرم کے اصل حق دار ہوتے ہیں اور انیق احمد، شمار ان ایک فیصد لوگوں میں ہوتا ہے، انیق احمد کو اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ عاجزی دی ہے، انیق احمد کی زندگی کا زیادہ تر حصہ اردو زبان کے مشہور شاعر اور دانشور جون ایلیا کے ساتھ گزرا، یہ جون ایلیا کے شاگرد بھی تھے اور دوست بھی، جون ایلیا ایک درویش صفت بلکہ فقیر منش شاعر تھے، جون صاحب ساری رات جاگتے تھے، شعر سننے اور شعر کہتے تھے اور مشروب مغرب سے لطف اندوز ہوتے تھے، صبح کے وقت سو جاتے تھے اور پھر دن کے ایک بجے جاگتے تھے، انیق احمد رات اس وقت تک ان کے ساتھ رہتے تھے جب تک جون ایلیا انہیں پہچانتے تھے، مجھے انیق صاحب اور جون ایلیا کے تعلق کا علم تھا چنانچہ میں نے دورانِ سفر ان سے جون ایلیا کی زندگی کے دلچسپ واقعات سننے کی درخواست کی، انیق احمد نے بے شمار واقعات سنائے لیکن ان میں ایک واقعہ انتہائی دلچسپ تھا، انیق احمد کا کہنا تھا جون ایلیا دن ایک بجے تک سوتے تھے لیکن مجھے یہ سہولت حاصل تھی میں انہیں ایمر جنسی میں کسی بھی وقت جگا سکتا تھا، میں نے ایک دن ٹیلی ویژن آن کیا

ان دنوں پاکستان میں ایک ہی غیر ملکی جہل دکھایا جاتا تھا اور وہی این این تھا جس نے سی این این پر سوویت یونین کو ٹوٹے ہوئے دیکھا یہ منظر میرے لئے حیران کن تھا کیونکہ جون ایلیا بائیس بازو کے دانشور تھے اور ان کا دعویٰ تھا اشتراکیت کسی نہ کسی دن پوری دنیا پر غلبہ پائے گی یہ دن کے گیارہ بجے تھے جس نے ٹیلی فون کر کے انہیں جگایا وہ نیند کے عالم میں ٹیلی فون پر آگئے میں نے انہیں بتایا "جون صاحب سوویت یونین ٹوٹ گیا" انہوں نے خود گی کے عالم میں جواب دیا "یہ مذاق کا وقت نہیں" میں نے عرض کیا "جون صاحب میں ٹیلی ویژن پر دیکھ رہا ہوں لوگ لینن کا مجسمہ گرا رہے ہیں ماسکو میں فوجی ٹینک بھر رہے ہیں اور فوج رائفلس اور توپوں نے کرشمہ میں گھوم رہی ہے" جون ایلیا یہ سن کر تھوڑی دیر خاموش رہے اور اس کے بعد خود کھامی کے انداز میں بولے "کیا فوج رائفلس لے کر ماسکو میں گھوم رہی ہے" میں نے کہا "ہاں" وہ بولے "کیا فوج ماسکو میں توپوں اور ٹینکوں کے ساتھ بھر رہی ہے" میں نے کہا "ہاں" جون ایلیا نے قہقہہ لگایا اور بولے "پھر ایک بات طے ہوگئی" میں نے پوچھا "وہ کیا جون صاحب" "جون ایلیا بولے" "پھر فوج کسی بھی ملک کی ہو وہ ہوتی بخالی فوج ہی ہے۔"

میں نے اور انتیق صاحب نے قہقہہ لگایا انتیق صاحب اس کے بعد خاموش ہو گئے اور میں جون ایلیا کے فقرے کی لذت لینے لگا ہم میں بحیثیت پاکستانی ایک بڑا دلچسپ فالٹ ہے ہم لوگوں کو اداروں اور چیزوں کو ان کی کارکردگی ان کی خوبیوں اور ان کی خامیوں کی بنیاد پر الگ الگ نہیں کرتے ہم سب کو ایک ہی پڑے میں تو لیتے ہیں مثلاً ہم ہر امریکی کو اپنا دشمن کہتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے بھول جاتے ہیں امریکہ کے 55 فیصد لوگ وھیٹ ہاؤس کی "وار آف ٹیرر پالیسی" کے خلاف ہیں اور یہ لوگ واشنگٹن میں عراقی افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقوں کے عوام پر امریکی حملوں کے خلاف جلوس نکالتے ہیں اور ہٹلر کو ہزاروں معصوم لوگوں کا قاتل قرار دیتے ہیں ہم ہر یہودی اور ہر اسرائیلی کو عالم اسلام کا دشمن کہتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے بھول جاتے ہیں تیسری دنیا کو ختمی ٹینکوں کی دیکسین بھی مختلف یہودی فراہم کر رہے ہیں اور ایڈز سپلائش ٹی بی اور کالگو لیور جیسی مہلک بیماریوں کا علاج بھی یہودی ہی دریافت کر رہے ہیں اور یہ لوگ یہ علاج انسانیت کو مفت دیں گے ہم بھارت کو بھی گالی دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی بھول جاتے ہیں بھارت میں 20 کروڑ مسلمان اور 40 کروڑ دلت بھی آباد ہیں اور بھارتی پالیسیوں میں ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں اور یہ لوگ بھی بھارتی حکومت اور بھارتی شدت پسندوں کے ہاتھوں استے ہی جھک ہیں جتنا ہم لوگ اسی طرح ہمارے بلوچی سندھی اور پشتون بھائی بھی پنجاب کو اپنے تمام مسائل کی وجہ قرار دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں پنجاب کا عام شہری عام کسان عام مزدور اور عام ہاری سندھیوں بلوچیوں اور پشتونوں سے کہیں زیادہ خوفناک اور قاتل رحم زندگی گزار رہا ہے یہ بھول جاتے ہیں پنجاب میں پورے ملک کے مقابلے میں سب سے زیادہ بے روزگاری ہے پنجاب میں سب سے زیادہ جرائم ہوتے ہیں پنجاب میں تعلیم کا معیار دوسرے صوبوں کے مقابلے میں کہیں پست ہے پنجاب کی زیادہ آبادی خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہی ہے اور پنجاب میں دوسرے صوبوں کے مقابلے میں صحت کے زیادہ مسائل ہیں لیکن ہمارے بلوچی سندھی اور



چشتوں بھائیوں نے پنجاب کے ہر شہری ہر باسی کو میاں نواز شریف، میاں شہباز شریف اور جنرل کیانی سمجھ لیا ہے اور یہ لوگ پورے پنجاب کو ماڈل ٹاؤن رائے ونڈ یا ڈیفنس سمجھ رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے آپ لاہور کی مال روڈ سے پانچ کلومیٹر پیچے اتر جائیں تو بلوچستان، سندھ، سرحد اور پنجاب میں کوئی فرق نہیں رہتا، ہم نے اسی طرح ایوب خان، یحییٰ خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف کو پاک فوج سمجھ لیا ہے، ہم جنرل محمود جنرل فضل حق، جنرل مجید زادہ اور جنرل ملک کو فوج سمجھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں پاکستان کی اصل فوج میجر عزیز، میٹھی شہید، حوالدار لاکھ جان شہید، کیپٹن کرگل شیر خان شہید، لانس ٹائیک محمد محفوظ شہید، سوار محمد حسین شہید، میجر شہید، میجر محمد اکرم شہید، میجر محمد طفیل شہید، کیپٹن محمد سردر شہید اور پائلٹ آفیسر راشد منہاس شہید ہے پاکستان کی اصل فوج وہ ہے جو چمن، طورخم، چولستان اور خیل و بلی میں ملک کی حفاظت کر رہی ہے اور اس میں لاڈکانہ سے لے کر ڈیرہ بگٹی اور جہلم سے لے کر جنوبی وزیرستان تک پاکستان کے ہر علاقے اور ہر خطے کے جوان موجود ہیں۔

یہ حقیقت ہے ہم چیزوں کو بلیک و دیکھتے ہیں یا وامیٹ، ہم ان کے درمیان موجود گرے امیر یا کو ہمیشہ فراموش کر دیتے ہیں آپ طالبان کو لے لیجئے، ہم نے آج کل ہر داڑھی والے کو طالبان کہنا شروع کر دیا ہے، ہم علم حاصل کرنے، نماز روزے کی پابندی کرنے اور شریعت کا علم پھیلانے والے طالبان اور پاکستانی فوج، پاکستانی حکومت اور پاکستانی معاشرے سے لڑنے والے طالبان میں فرق ہی نہیں کرتے، ہماری نظر میں ہر داڑھی والا شخص طالبان ہے اور ہم اس کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں، ہماری یہ اپروچ سو فیصد غلط ہے، ہم مسلمان ہیں، پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور ہم پر بحیثیت مسلمان شریعت کی پابندی کرنے والے ہر مسلمان کا احترام فرض ہے، ہمیں قطعاً یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم شریعت کی پابندی کرنے والوں کے خلاف نفرت کا اظہار کریں، ہم اگر شدت پسندوں کے خلاف ہیں اور اپنی مخصوص شریعت کو راکٹل کی ٹوک پر نافذ کرنے والوں کو ملک دشمن قرار دیتے ہیں تو ہمیں امن پسند طالبان سے نفرت کا بھی کوئی حق حاصل نہیں چنانچہ جس طرح ساری فوج پنجابی، سارے سیاستدان شوکت عزیز، سارے پنجابی قاصب، ساری حکومت امریکہ، نواز اور ساری پیورو کریسی کرپٹ نہیں ہوتی بالکل اسی طرح سارے داڑھی والے لوگ طالبان نہیں ہوتے اور سارے طالبان دہشت گرد نہیں ہوتے لہذا ہمیں دونوں کے درمیان ایک لکیر ضرور کھینچنا ہوگی۔





## ورنہ یہ لوگ ہم پر ہنسیں گے

”کیا تمہاری چیف جسٹس افتخار محمد چودھری صاحب سے ملاقات ہوئی“ میرے دوست کے سوال میں یقین تھا میں نے انکار میں سر ہلا دیا اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا میں نے عرض کیا ”میں مبارک باد دینے کے لیے ان کے گھر گیا تھا لیکن وہاں رش تھا چنانچہ میں واپس آ گیا“ دوست نے مجھے بے یقینی کے عالم میں دیکھا اور دوبارہ بولا ”کیا بحال ہونے والے دوسرے بجوں کے ساتھ بھی تمہارا رابطہ نہیں ہوا“ میں نے جواب دیا ”صرف دو کے ساتھ ہوا“ جسٹس خواجہ شریف میرے پرانے کرم فرما ہیں میں نے انہیں مبارک باد کے لیے فون کیا تھا جبکہ جسٹس جاوید اقبال نے مجھے فون کر کے مبارک باد دی جسٹس جاوید اقبال کا خیال تھا میڈیا نے عدلیہ کی بحالی میں بنیادی کردار ادا کیا جبکہ میں نے عرض کیا ”خیر اور وکلاء اگر استقامت نہ دکھاتے تو میڈیا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا“ یہ معزول بجوں کی استقامت تھی جس کی وجہ سے ہم ان کا ساتھ دینے پر مجبور ہو گئے۔“ میرے دوست نے فوراً پوچھا ”کیا تم ان بجوں کو مبارک باد کے فون نہیں کرو گے“ کیا تم ان سے ملاقات کے لیے بھی نہیں جاؤ گے“ میں نے عرض کیا ”مجھے اور میرے دوسرے صحافی دوستوں کو ایسا نہیں کرنا چاہئے بلکہ میرا خیال ہے بار کونسلو کے اراکین چودھری اعترارہ حسن علی احمد کریم شیرا سے ملے اور اطہر من اللہ سمیت تمام سینئر وکلاء سول سوسائٹی کے نمائندوں اور سیاسی جماعتوں کی قیادت کو بھی اب بجوں سے ملاقاتیں بند کر دینی چاہئیں اور آج کے بعد ان تمام لوگوں کو بجوں سے الگ ہو جانا چاہئے جنہوں نے عدلیہ کی بحالی میں کوئی کردار ادا کیا تھا تاکہ یہ بیج آج سے اپنا کام شروع کر سکیں“ میرے دوست کے چہرے پر حیرت گہری ہو گئی اور اس نے سنسناتی آواز میں پوچھا ”مگر کیوں؟“ میں نے عرض کیا ”ہم نے اگر معزول بجوں کی بحالی کی تحریک اخلاص کے ساتھ چلائی تھی اور ہم لوگ اگر واقعی عدلیہ کی آزادی کے خواب کو شرمندہ تعبیر دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں اب خود کو بجوں سے ”ڈی لنک“ کرنا ہو گا۔ میں اگر کبھی افتخار محمد چودھری صاحب کے ساتھیوں اور دشمنوں کو مشورہ دینے کی پوزیشن میں ہوتا تو میں چودھری اعترارہ حسن نسبت چیف جسٹس تمام مہربانوں کو مشورہ دیتا یہ اب سپریم کورٹ کی وکالت سے تائب ہو جائیں۔ اسی طرح شریف الدین جیرزادہ عبداللطیف جیرزادہ فاروقی ایچ ٹی ٹی کے لطیف کھوسہ اور بابر اعوان سے بھی عرض کرتا کہ آپ لوگ کیونکہ معزول بجوں کی بحالی کے خلاف تھے چنانچہ آپ کو بھی اب پریکٹس چھوڑ دینی چاہئے تاکہ انصاف کے

دائن پر کوئی دھبہ نہ لگے کیونکہ یہ حقیقت ہے جب سرسراہتر از حسن علی احمد کرد یا منیر اے ملک پریم کورٹ میں پیش ہوں گے اور دوسری طرف سے نسیم بخاری یا براہمان اللطیف کھوسہ یا میر زادہ صاحب عدالت میں آئیں گے تو ججوں پر بڑی آسانی سے جانبداری کا الزام لگایا جاسکے گا اور اس سے وہ سارا کاروبار ہو جائے گا جس کے لیے پوری قوم نے دو سال تک سڑکوں پر دھکے کھائے تھے اور ان دھکوں کے نتیجے میں تاریخ میں پہلی بار ججز عدالتوں سے فارغ ہونے کے بعد دوبارہ اپنے عہدوں پر فائز ہوئے تھے میڈیا کے ان تمام لوگوں کو بھی اب پریم کورٹ اور ہائی کورٹ کا رخ نہیں کرنا چاہئے جنہوں نے دو سال تک سول سوسائٹی اور دکلاء کے کندھے سے کندھا جوڑے رکھا کیونکہ اب ہم سب کو مل کر انصاف کے لیے کام کرنا چاہئے اور انصاف کے لیے ہمیں آج سے وہی کروادار کرنا چاہئے جو ہم نے صدر پرویز مشرف اور صدر آصف علی زرداری کے خلاف ادا کیا تھا۔ میں خاموش ہو گیا۔

میرے دوست کی آنکھوں میں حیرت مگھری ہو گئی۔ میں نے عرض کیا ”ہم لوگ جب عدلیہ کی آزادی کے لئے سڑکوں پر تھے تو معزول ججوں کے مخالف ہم پر الزام لگاتے تھے ہم انصاف کے لیے نہیں بلکہ فرد واحد کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ہم اس کے جواب میں کہتے تھے انصاف کا عمل اسی فرد واحد سے شروع ہوگا“ ہمیں اب یہ دعویٰ صحیح ثابت کرنا ہے ہم نے ثابت کرنا ہے ہم نے صرف 60 ججوں اور افتخار محمد چودھری کی ملازمت کے لیے یہ تحریک نہیں چلائی تھی بلکہ ہم اس ملک کے ان تمام مظلوموں کو انصاف فراہم کرنے کے لیے سڑکوں پر آئے تھے جن کے حقوق محاشرے کے کسی نہ کسی زور آور نے اپنے جوتے تھمے دیار کھے ہیں۔ ہم ان لوگوں کے لیے لڑتے رہے ہیں جن کا انصاف یا جوج ماجوج کی دیوار کے پیچھے چھپا ہے اور یہ لوگ عمر بھر یہ دیوار چانتے رہتے ہیں لیکن دیوار میں اتنی درز پیدا نہیں ہوتی کہ ان کی آواز علی انصاف کے کانوں تک پہنچ سکے۔ مجسٹریٹ کی عدالت سے پریم کورٹ کے درو دیوار تک ہمارا انصاف کا سارا نظام بے انصافی ٹوٹ کھسٹ سیاسی دباؤ سمجھوتوں تاخیر اور کرپشن میں لتھڑا ہے اور اس میں انصاف صرف اسی شخص کو ملتا ہے جو انصاف خرید سکتا ہو انصاف کو دبا سکتا ہو یا پھر قانون اور آئین کی دھجیاں بکھیر سکتا ہو۔ اس ملک میں عام شہری کیلئے سزا جبکہ بڑے لوگوں کے لیے امین آراہوتے ہیں چنانچہ ہم نے ثابت کرنا ہے ہم نے یہ تحریک عام شہری کو انصاف کی دلیہر تک پہنچانے یا انصاف کو عام شہری کی چوکھٹ تک لانے کے لیے شروع کی تھی چنانچہ آج سے ہمیں ججوں کا احتساب شروع کرنا چاہئے۔ ہمیں اس ملک کے ہر اس مظلوم کی آواز عدلیہ کے ایوانوں تک پہنچانی چاہئے جس کے حقوق پر کسی نہ کسی زور آور کا ٹھنار کھایا ہے اور سول جج سے لے کر مسٹر جسٹس تک جوج یہ آواز نہ سنے اس کے خلاف بھی ہمیں اتنی ہی بڑی تحریک چلانی چاہئے جتنی ہم نے صدر پرویز مشرف اور صدر آصف علی زرداری کے خلاف چلائی تھی۔“ میرے دوست نے حیرت سے پوچھا ”کیا تم ملک میں بغاوت پھیلانا چاہتے ہو“ میں نے انکار میں سر ہلایا اور عرض کیا ”نہیں انصاف۔ یہ ظلم ہوگا ہم صدر پرویز مشرف اور صدر آصف علی زرداری کی آمریت اور انا کا قلعہ توڑ کر ملک کے اندر جوؤٹشل ڈیکسٹر شپ کا ایک نیا قلعہ کھڑا کر دیں یہ ظلم بھی ہوگا اور زیادتی بھی۔ قدرت نے ہمیں نرم انقلاب کا ایک موقع فراہم کیا ہے تو ہمیں



اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ہمیں ان تمام ججوں کے ہاتھ مضبوط کرنے چاہئیں جو انصاف قائم کرنے کی کوشش کریں اور ان تمام ججوں کا راستہ روکنا چاہئے جو جڈیشنل ڈیکلیریشن کی کوشش کریں اور وہ جج خواہ کوئی بھی ہو ہمیں چاہئے ہم حکومت پر ججوں کے درست فیصلوں پر عملدرآمد کے لیے دباؤ ڈالیں اور ججوں کے غلط فیصلوں کی حوصلہ افزائی نہ کریں کیونکہ اسی سے ملک آگے بڑھ سکے گا۔

میرے دوست نے بے چینی سے کرسی پر کھڑے بدلی اور جلدی سے بولا، "لیکن یہ فیصلہ کون کرے گا کہ کون سا فیصلہ درست ہے اور کون سا غلط۔" میں نے فوراً جواب دیا، "درست اور غلط فیصلے کا فیصلہ قانون، آئین یا دلائل نہیں کرتے انسانی ضمیر کرتا ہے پاکستان کے تمام قانون دان کہتے تھے آئین اور قانون کی روشنی میں معزول جج بحال نہیں ہو سکتے لیکن عوامی ضمیر کی عدالت نے آئین اور قانون کے خلاف فیصلہ دے دیا اور حکومت کو اس فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑا چنانچہ آج کے بعد ججوں کے فیصلوں کی درستی اور غلطی کا فیصلہ عوام کا ضمیر کیا کرے گا عوام چند سیکنڈ میں ججوں کے فیصلوں کا فیصلہ کر دیا کریں گے اور جس دن کسی جج نے کسی سمجھوتے دیا یا ترغیب میں آ کر فیصلہ دیا اسی دن اس کا ڈیڑے بھی شروع ہو جائے گا۔ عوام ہاشور ہو چکے ہیں اور یہ لوگ اب کسی قیمت پر یہ شعور سرینڈر نہیں کریں گے چنانچہ انکار محمد چودھری کو چاہئے وہ آج سے سول کورٹس سے لے کر سپریم کورٹ تک انصاف کے سارے نظام کو شفاف، فوری اور مستاباد میں تمام مقدموں کے فیصلوں کی مدت طے کر دیں کوئی کیس چھ ماہ سے اوپر نہ جائے عدالتیں غریب اور بے بس لوگوں کے مقدمے مفت پیڈل کریں ڈسٹرکٹ سے لے کر صوبے تک اور صوبے سے لے کر سپریم کورٹ تک جو ڈیشنل کونسلیں بنادی جائیں جن میں کوئی بھی شخص کرپٹ ججوں کے خلاف درخواست دے سکے یہ کونسلیں ججوں کے خلاف انگوائری کریں اور جس جج کے خلاف کرپشن، اقربا پروری، لمبورت ازم یا قانون سے تہاؤ کا الزام ثابت ہو جائے اسے اسی وقت فارغ کر دیا جائے۔ جھوٹے مقدمے قائم کرنے والوں کو سنگین سزائیں دی جائیں صدر سے لے کر عام شہری تک سب لوگ عدالت کے سامنے جواب دہ ہوں حکومت کے ساتھ مل کر ججوں کی تحواہوں اور مراعات میں پانچ سو فیصد اضافہ کر دیا جائے تا کہ جج کرپشن سے بچ سکیں اور جیلوں میں خصوصی ٹریڈنگ بھجوا کر معمولی جرائم میں قید مجرموں کا قابل ضمانت جرائم کے شکار ظرمان اور وہ لوگ جو سزا پوری کر چکے ہیں ان کی رہائی کا بندوبست کرادیں اور مظلوم کی صرف ایک درخواست دشمنی عدل کا کام کرے تاکہ ہم اپنی کوشش اپنی سڑگل پر فخر کر سکیں کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ تمام لوگ جو ہماری جدوجہد کو فرد واحد کے لیے کوشش قرار دے رہے تھے وہ ہم پر نہیں گئے وہ ہمارا مذاق اڑائیں گے۔"





## یہ 29 لاکھ لوگ

ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان پالیٹیشن و پبلیسیٹری وفاق و زیر ہیں ڈاکٹر صاحبہ سیالکوٹ سے تعلق رکھتی ہیں اور سابق پیپلر چودھری امیر حسین کوٹکست دے کر قومی اسمبلی پہنچی تھیں ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان گزشتہ سب سے امدادی سامان لے کر متاثرین کے کیمپوں میں گئیں یہ سامان وزارت کے ملازمین کی ایک دن کی تنخواہ سے خریدا گیا تھا اور یہ سامان اس لحاظ سے مختلف تھا کہ ڈاکٹر صاحبہ پہلی بار زنانہ استعمال کی مخصوص اشیاء ساتھ لے کر گئی تھیں۔ متاثرین کے کیمپوں میں سات لاکھ خواتین ہیں ان میں 70 ہزار خواتین حاملہ ہیں یہ تمام خواتین فطری حوالے سے بھی گزرتی ہیں چنانچہ کیمپوں میں بڑے پیمانے پر ایسے سامان کی ضرورت ہے جو صرف خواتین کے لیے مخصوص ہے لیکن بد قسمتی سے امداد فراہم کرنے والے اداروں، این جی او اور انفرادی لوگوں کو یہ "ضرورت" یاد نہیں رہی چنانچہ کیمپوں میں چھپٹے ایک ماہ سے بحرانی صورتحال تھی۔ ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان خاتون ہیں چنانچہ انہوں نے اس ضرورت کو "اعتراف نہیں کیا" انہوں نے ایک ڈونر ایجنسی کی مدد سے خواتین کے لیے پچاس ہزار بیگ بنوائے اور یہ بیگ مختلف کیمپوں میں تقسیم کر دیئے۔ ڈاکٹر صاحبہ کا کہنا تھا یہ بیگ خواتین کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھے چنانچہ انہوں نے ان سب کی آنکھوں میں ممنونیت کے گہرے جذبات دیکھے۔ ڈاکٹر صاحبہ کا کہنا تھا یہ پچاس ہزار بیگ بہت کم ہیں چنانچہ امدادی سامان بھجوانے والے اداروں اور افراد کو خواتین کی اس ضرورت کا احساس کرنا چاہیے اور کیمپوں میں ایسے زیادہ سے زیادہ بیگ بھجوانے چاہئیں جن میں خواتین کی ضرورت کا سامان موجود ہو۔

ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان جب دورے کے لیے روانہ ہونے لگیں تو انہیں سیکورٹی کے نام پر ڈرانے کی کوشش بھی کی گئی لیکن وہ اس کے باوجود کیمپوں کے دورے پر نکل گئیں پاکستان کے چند ادارے جان بوجھ کر ایسی اطلاعات پھیلا رہے ہیں جن کے نتیجے میں وفاقی وزراء، این جی او کے سربراہ، غیر ملکی ڈونر ایجنسیوں کے پاس اور ملک کے بڑے تاجر اور صنعت کار کیمپوں میں جانے سے پرہیز کر رہے ہیں اس سے جہاں متاثرین کے دل میں وفاق کے خلاف نفرت پیدا ہو رہی ہے وہاں کیمپوں کے اندر بھی کرپشن کا دور دورہ ہے۔ وفاقی حکومت اگر ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان کو مثال بنا کر دوسرے وزراء کو بھی کیمپوں کے دورے کا حکم دے اور یہ لوگ بھی روز کسی نہ

کسی کیپ کا درود کریں تو حکومت کو کیپوں میں موجود لوگوں کی حالت زار کا اندازہ بھی ہو جائے گا اور سٹریٹس کی ڈھارس بھی بند ہے گی یہ کیپ جیتنا کسی بڑے انسانی ایسے سے کم نہیں ہیں۔ ڈاکٹر فردوس عاشق احوان کو وہاں ایک اور تجربہ بھی ہوا وہ جلالہ کیپ کے متاثرین میں امدادی سامان تقسیم کر رہی تھیں ان کے سامنے قطار لگی تھی اور اس قطار میں بے شمار لوگ کھڑے تھے ان لوگوں میں ایک بزرگ خاتون بھی شامل تھی اسے میں وہاں ایک بزرگ آئے انہوں نے اس خاتون کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹنا شروع کر دیا وہ بزرگ اس خاتون کو پشتوں میں گالیاں دے رہے تھے۔ ڈاکٹر فردوس عاشق نے اپنے عملے سے پوچھا "یہ باباجی اس خاتون کو کیا کہہ رہے ہیں" ڈاکٹر صاحبہ کے عملے نے بتایا باباجی اس خاتون کے شوہر ہیں وہ اسے قطار میں کھڑا دیکھ کر ناراض ہو رہے ہیں اور اسے گھسیٹ کر واپس لے جا رہے ہیں امدادی سامان تقسیم کرنے کے بعد ڈاکٹر فردوس عاشق احوان اس بوڑھے بوڑھے کے ٹینٹ میں چلی گئیں اور ان سے اس نفرت کی وجہ پوچھی وہ بزرگ ڈاکٹر صاحبہ پر برس پڑے ان کا کہنا تھا وہ جب سوات میں تھے تو طالبان انہیں امریکیوں کا ایجنٹ قرار دے کر مارتے تھے جب فوج آئی تو انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا یہ لوگ وہاں سے نقل مکانی کر کے کیپ میں آ گئے لیکن ان کے خاندان کے دوسرے افراد علاقے میں رہ گئے ان کے بارہ جوان ہیں "بھتیجے اور بھانجے پک اپ میں سوار ہوئے اور علاقے سے نکلنے لگے اس دوران ایک مارٹر گولا اس پک اپ پر آگرا اور ان کے خاندان کے بارہ جوان اسی جگہ شہید ہو گئے۔ اس بزرگ کا کہنا تھا جاری نظر میں طالبان اور سیکورٹی فورسز میں کوئی فرق نہیں وہ بھی ہم کو مارتے تھے اور یہ بھی ہمیں ہی نشانہ بنارہے ہیں چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا ہم بھوکے مرجائیں گے لیکن حکومت کی طرف سے بھجوا یا ہوا سامان نہیں لیں گے۔ ڈاکٹر فردوس عاشق احوان کو وہاں جا کر معلوم ہوا دونوں میاں بیوی نے آج تک کوئی امدادی سامان نہیں لیا تھا ڈاکٹر صاحبہ نے جب سامان تقسیم کرنا شروع کیا تو خاتون بھوک سے مجبور ہو کر قطار میں کھڑی ہو گئی لیکن اس کا خاندان سے گھسیٹ کر واپس لے آیا ڈاکٹر فردوس عاشق نے ان کے ساتھ ان کے بیٹوں بھتیجوں اور بھانجوں کی تعزیت کی اور حکومت کی طرف سے ان سے معافی مانگی۔ "اکثر صاحبہ نے بزرگ جوڑے سے کہا "میں آپ کی بیٹی ہوں اور بچتوں اپنی بیٹیوں سے ناراض نہیں ہوتے" اس بات پر دونوں میاں بیوی قائل ہو گئے چنانچہ ڈاکٹر صاحبہ ان دونوں کو اپنے کیپ میں لے کر آئیں انہیں کھانا کھلایا ان کا طبی معائنہ کرایا اور انہیں امدادی سامان دیا اس سلوک پر وہ خاتون وقائی و ذریعہ کے گلے لگ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

یہ صرف ایک کہانی نہیں بلکہ کیپوں میں موجود ہر خاندان کے پاس ایک ایسی ہی خوفناک کہانی موجود ہے یہ سب لوگ اپنے اپنے دل میں اپنے کسی عزیز رشتے دار کی نعش چھپا کر بیٹھے ہیں یہ سب لوگ اپنے بھرے بھرائے گھر چھوڑ کر آئے ہیں ان لوگوں کے اپنے گھر تھے ان کی اپنی دکانیں تھیں ان کی اپنی گاڑیاں تھیں ان کے اپنے کھیت تھے اور ان کے اپنے باغ تھے ان لوگوں کی تفصیلات تک تیار نہیں سوات سے ہر سال ایک ارب روپے کا فروٹ پنجاب اور سندھ آتا تھا ان کے باغ پکے چکے ہیں اور پھل درختوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں لیکن یہ



لوگ اپنے باغوں، اپنی زمینوں سے سینکڑوں میل دور دوسروں کے گھروں پر پڑے ہیں۔ آپ ان لوگوں کی فانی اور جذباتی کیفیت کا اندازہ لگائیے، نقل مکانی موت سے بدتر عذاب ہوتا ہے کیونکہ موت کے بعد انسان پر سکون ہو جاتا ہے لیکن نقل مکانی ایک ایسی موت ہوتی ہے جس کا ذائقہ انسان ہر سانس کے ساتھ جھیلتا ہے یہ حقیقت ہے انسان جب اپنے گھر سے نکل کر در بدر ہوتا ہے تو اس کی ساری نفسیات بدل جاتی ہے اور وہ اگر واپس بھی آجائے تو بھی اس کے جذبات کو اپنی جگہ پر واپس آنے میں کمی رہائیاں لگ جاتی ہیں یہ لوگ بھی اس وقت اسی قسم کی کیفیت سے گزر رہے ہیں اور ہم نے اگر اس وقت ان لوگوں کو محبت نہ دی ہم نے ان کے زخموں پر سر ہم نہ رکھا ہم نے ڈاکٹر فردوس عاشق اعوان کی طرح ان لوگوں کو سینے سے لگا کر ان کے درد کو باہر نکالنے کا راستہ نہ دیا ہماری حکومت نے انہیں پیار اور کینسر نہ دی اور پورے ملک نے اپنا سینہ ان کے لیے نہ کھولا تو یہ لوگ ان طالبان کو اپنا لیڈر مان کر واپس جائیں گے جن سے نفرت کی وجہ سے ان لوگوں نے سیشنل امیر یا زکاء رخ کیا تھا لہذا ہم سب لوگوں کو فوری طور پر ان پر شک بند کر دینا چاہیے یہ سب لوگ ہمارے بہن اور بھائی ہیں اور ان کے ساتھ بہنوں اور بھائیوں جیسا سلوک ہونا چاہیے۔ حکومت کو چاہیے یہ اپنے 92 وزراء کے مختلف گروپ بنائے اور یہ وزراء آٹھ آٹھ کے گروپ میں کمپوں میں جائیں اور تین تین چار چار دن کمپوں میں گزار کر آئیں۔ صدر روزیرا عظیم چیئر مین سینیٹ اور سپیکر صدارت بھی ہر ہفتے کمپس کا دورہ کریں اور لوگوں سے فردا فردا مل کر ان کے مسائل سنیں۔ یہ لوگ اگر سندھ پنجاب اور بلوچستان میں اپنے عزیزوں کے پاس جانا چاہتے ہیں تو ان کی رجسٹریشن کریں اور انہیں ریل کا مفت ٹکٹ دے کر وہاں پہنچا دیں تاکہ یہ لوگ عزت کے ساتھ یہ گرمیاں گزار سکیں اور فوج نے جو علاقے کلیئر کر دیے ہیں وہاں کی زمین اور باغ مالکان کے حوالے کر دیے جائیں تاکہ یہ لوگ اپنا پھل اور فصلیں سمیٹ سکیں اور ان کی فروخت سے اپنے ہاں نفع کا بندوبست کر سکیں۔ حکومت فضائی بمباری اور ہیلکوپٹر بھی روک دے اور زمینی دستوں کو آگے بڑھائے اس سے اجتماعی نقصان بھی کم سے کم ہوگا لوگوں کی املاک بھی محفوظ رہیں گی اور یہ لوگ کل کلاں اپنے گھروں میں دوبارہ آباد بھی ہو سکیں گے۔

یہ ایک نازک گھڑی ہے اگر ہم نے اس گھڑی میں احتیاط سے کام نہ لیا تو ان 29 لاکھ مہمانوں کو طالبان بننے دینے نہیں لگے گی یہ لوگ دلوں میں دشمنی کا بیج لے کر واپس جائیں گے اور یہ اس ملک کی جہاد کے لیے انتہائی خطرناک ہوگا۔





## یس وی کین

لائگ مارچ سے دو دن پہلے ایک سینئر سیاستدان میرے ساتھ شرط لگانے کے لیے تیار تھے ان کا کہنا تھا ”یہ لائگ مارچ کامیاب نہیں ہوگا“ میں نے وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا ”اگر یہ لائگ مارچ کامیاب ہو گیا تو عوام کو اپنی طاقت کا اندازہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ملک میں مارشل لا لگانا ممکن نہیں رہے گا“ میں نے حیرت سے پوچھا ”لائگ مارچ کا مارشل لا کے ساتھ کیا تعلق ہے؟“ سینئر سیاستدان نے قہقہہ لگایا اور جواب دیا ”تم اگر تاریخ کا مطالعہ کرو تو تمہیں معلوم ہو گا جس ملک کے عوام کو اپنی طاقت کا اندازہ ہو جاتا ہے جنہیں لائگ مارچ کا ڈھنگ آ جاتا ہے اور جو اپنے حقوق کے لیے سڑکوں پر آ جاتے ہیں اس ملک میں مارشل لا نہیں لگ سکتا“ میں خاموشی سے سنتا رہا وہ بولے ”عوام پاکستان کی تاریخ میں 9 مارچ 2007ء کے بعد پہلی بار چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کے لیے سڑکوں پر آئے اور اس وقت تک سڑکوں سے واپس نہیں گئے جب تک جنرل پرویز مشرف جیسا آمر پسپا نہیں ہوا“۔ میں ان کی بات سنتا رہا وہ بولے ”یہ لائگ مارچ نظام کے خلاف عوام کی تیسری بغاوت ہے پہلی بغاوت مارچ 2007ء کو شروع ہوئی تھی جس کے نتیجے میں سپریم کورٹ کے 17 ججز افتخار محمد چودھری کو 20 جولائی 2007ء کو بحال کرنے پر مجبور ہوئے جنرل پرویز مشرف نے یونٹارم اتاری احتراماً بے نظیر بھنوا اور میاں نواز شریف کو پاکستان آنے کی اجازت دی انکیشن کرائے اور اقتدار پاکستان پیپلز پارٹی کے حوالے کیا۔ دوسری بغاوت 13 جون 2008ء کے لائگ مارچ کی صورت میں سامنے آئی اور وہ بغاوت صدر پرویز مشرف کو تاریخ کے ریلے میں بہا لے گئی اور اب یہ عوام کی تیسری بغاوت ہے۔ اگر یہ بغاوت بھی کامیاب ہوگی اگر اس لائگ مارچ کے نتیجے میں افتخار محمد چودھری بحال ہو گئے تو عوام کو یقین ہو جائے گا وہ اسکے بڑے بڑے بتوں کو پاش پاش کر سکتے ہیں چنانچہ اس کے بعد فوج اقتدار پر قبضہ کر سکے گی اور نہ ہی حکومت کا کوئی عہدیدار عوامی وعدوں سے پھر سکے گا اور یہ وہ روایت ہے جس کی اجازت اسٹیبلشمنٹ کبھی نہیں دے گی کیونکہ اس کے بعد جب بھی فوج بارکوں سے باہر آئے گی عوام سینہ کھول کر اس کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے اور فوج کو صدر پرویز مشرف کی طرح پسپائی اختیار کرنا پڑے گی۔“

میرے سینئر سیاستدان دوست خاموش ہوئے تو میں پوری طرح قائل ہو گیا چنانچہ میرا خیال تھا یہ لاہگ مارچ کامیاب نہیں ہوگا۔ عوامی مرکزوں پر فکس گے اور گورنر پنجاب سلمان تاثیر پولیس کے ذریعے ان کے سارے خواب کھل دیں گے اور اگر کسی نہ کسی طرح لاہگ مارچ کے پانچ دس ہزار شرکاء اسلام آباد پہنچنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو رحمان ملک ان کی خواہشوں پر کوئی کنیشنز کرادیں گے یوں یہ تحریک ہمیشہ ہمیش کے لیے ختم ہو جائے گی لیکن 15 مارچ کا سورج ایک نئی تاریخ لے کر طلوع ہوا میں نے سب سے پہلے مال روڈ لاہور سے پولیس کو پسپا ہونے دیکھا۔ عوام نے پولیس کی ساری رکاوٹیں اٹھا کر دور پھینک دیں اور مال روڈ پر عوام کی حکومت قائم ہو گئی۔ اس کے بعد میاں نواز شریف کا قافلہ چلا تو رکاوٹیں ہٹتی چلی گئیں اور پولیس انتظامیہ اور کنیشنز پسپا ہوتے چلے گئے جس کے بعد ٹیلی ویژن سکرینوں پر عوام کا سیلاب سیلاب دکھائی دینے لگا۔ یہ سیلاب اسلام آباد کی طرف بڑھا تو میں نے پہلی بار اسٹیمبلشمنٹ کے ماتھے پر پینٹ دیکھا۔ حکومت کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس نے اس سیلاب کو روکنے کے لیے وہ تمام چمکنڈے استعمال کرنا شروع کر دیئے جو اس ملک میں پچھلے 60 سال سے استعمال ہو رہے ہیں۔ پولیس بھی استعمال ہوئی، میڈیا کو دبانے کی کوشش بھی کی گئی، لفافوں اور بریف کیسوں کا بندوبست بھی کیا گیا اور سیاسی عہدوں کی آفرز بھی کی گئیں لیکن یہ تمام چمکنڈے ناکام ہو گئے اور حکومت اپنے اپنے ”کنیشنز“ میں سستی چلی گئی اور یہ وہ مرحلہ تھا جب طاقت کے سارے ستون ایک جگہ جمع ہوئے اور انہوں نے رات گئے مغل چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کو کھانا، تحریک کے راہنما چودھری اعجاز احسن، میاں شہباز شریف اور میاں نواز شریف کو بھی ”لوپ“ میں لیا اور یوں اس مسئلے کا ایک پراسن حل تلاش کر لیا گیا۔ وزیراعظم صاحب نے قہجہ کے وقت چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی بحالی کا اعلان کر دیا۔ چیف جسٹس افتخار محمد چودھری بحال ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک خدشات موجود ہیں کیونکہ آپ اگر آصف علی زرداری کے ماضی کا تجزیہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا وہ زیادہ دیر تک دوسروں کے دباؤ میں نہیں رہتے اور یہ حقیقت ہے یہ فیصلہ ان سے زبردستی کرایا گیا تھا لہذا سوال یہ ہے کیا یہ کوئی نیا راستہ نہیں نکال لیں گے؟ صدر آصف علی زرداری نے ابھی تک عوام کے سامنے آکر اس فیصلے کی تصدیق نہیں کی، صدر نے اس فیصلے کو دل سے تسلیم نہیں کیا چنانچہ آنے والے دنوں میں ایمان صدر اور سپریم کورٹ ایک بار دوبارہ ایک دوسرے کے سامنے ضرور آئیں گے۔

آپ اب دوسری صورت حال بھی ملاحظہ کیجئے پاکستان میں عوام کو پہلی بار اپنی طاقت کا اندازہ ہوا نواز سے تنگ نے 1934ء میں کہا تھا ”جب تک کمزور لوگ اپنی کمزوری کو طاقت نہیں بناتے اس وقت تک انقلاب نہیں آتا۔“ یہ لاہگ مارچ دیکھ کر عسوس ہوتا ہے عوام نے اپنی کمزوری کو اپنی طاقت بنا لیا ہے چنانچہ پہلی بار اسٹیمبلشمنٹ کو پسپا ہونا اختیار کرنا پڑی۔ اگر عوام کے یہ جذبات یہ اتحاد اور اپنے طاقتور ہونے کا یہ احساس اسی طرح آگے بڑھتا رہا تو مجھے یقین ہے کوئی طاقت پاکستان کو ترقی سے نہیں روک سکے گی۔ اگر لاہگ مارچ کی یہ سپرٹ اسی طرح قائم رہی تو آج کے بعد پاکستان میں کوئی حکومت عوامی وعدوں سے کمر نہیں سکے گی کوئی سیاستدان لوٹا نہیں بن سکے گا کوئی

سیاسی جماعت ہارس ٹریڈنگ نہیں کر سکے گی، کوئی مسلمان تاجر اور کوئی رحمان ملک پولیس کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کر سکے گا، کوئی شوکت عزیز کراچی مشیل لٹز کا سودا نہیں کر سکے گا، کوئی حکمران امریکہ کو ڈرویز حملوں کی اجازت نہیں دے سکے گا اور کوئی وزیر سرکاری خزانہ نہیں لوٹ سکے گا۔ عوام نے اسٹیبلشمنٹ کا ایک بت تو ڈرایا ہے اگر عوام نے اپنے اس جذبے کو قائم رکھا تو ملک سے امریکی اثر و رسوخ بھی ختم ہو جائے گا، عوام دہشت گردی کا خاتمہ بھی کر سکیں گے اور یہ لوگ لٹاک مارچ کی سپرٹ سے ملک سے بے انصافی، غربت، بد امنی، بے روزگاری اور بیماری بھی ختم کر سکیں گے۔ امریکہ کے موجودہ صدر باراک حسین اوباما نے اپنی الیکشن مہم کے دوران چیچن یعنی تنہا بیلی کانفرہ لگایا تھا وہ اپنی ہر تقریر کے آخر میں کہتے تھے ”لیس وی کین“ یعنی ہم لوگ ملک کے موجودہ حالات تبدیل کر سکتے ہیں۔ اوباما کانفرہ سچ ثابت ہوا اور امریکہ کی تاریخ میں بھی پہلی بار سیاہ فام شخص طاقت کے سفید محل میں داخل ہو گیا۔ 9 مارچ 2007ء کو پاکستان کے عوام نے بھی افتخار محمد چوہدری کا ساتھ دے کر ”لیس وی کین“ کانفرہ لگایا تھا اس نعرے پر اس وقت پاکستان کے ہر طاقتور شخص نے قبضہ لگایا تھا، یہ لوگ 15 مارچ 2009ء کی شام تک قبضے لگاتے رہے تھے لیکن پھر رات ڈھلتے ہی پاکستانی عوام نے ثابت کر دیا ”لیس وی کین“۔ جس کے بعد طاقتور لوگوں کے مکروہ قبضہ پر شرمندہ ہو گئے۔ میری دعا ہے ”لیس وی کین“ کا یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہے اور طاقتور لوگوں کو عوام کی کمزوری پر دوبارہ قبضہ لگانے کی جرأت نہ ہو کیونکہ اب صرف کمزور لوگ ہی اس ملک کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ یہ ہم جو بنائیں ہیں جنہوں نے حالات اور نظام کے ہاتھیوں کو شکست دینی ہے چنانچہ اس ملک کے کمزور لوگو! خدا کے لیے اب ”لیس وی کین“ کا علم نیچے نہ ہونے دینا آگے بڑھو، منزل اب دور نہیں۔





## آٹھ بجے

”میں بتاتا ہوں سچی محبت کیا ہوتی ہے“ ڈاکٹر نے مسکرا کر ہماری طرف دیکھا اور کافی کے گلاس سے پھلنے لگا، ہم غور سے اس کی بات سننے لگے وہ گویا ہوا ”میں ایک دن کلینک میں بیٹھا تھا، یہ صبح کے ساڑھے سات بجے تھے ایک بوڑھا مریض بھاگتا ہوا کلینک میں داخل ہوا، اس کے ہاتھ پر پینہ تھا، سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی اور وہ بار بار دل پر ہاتھ رکھتا تھا، میرا سانس تیزی سے اس کی طرف بڑھا، بوڑھے کی عمر اسی برس سے زائد تھی لیکن وہ اس کے باوجود چلنے پھرنے کی پوزیشن میں تھا، وہ نرس اور وارڈ بوائے سے بحث کرنے لگا، میں دفتر کے شیشے سے انہیں الجھتے ہوئے دیکھنے لگا، ڈاکٹر اور بعد وارڈ بوائے میرے پاس آیا، میں اس وقت اخبار پڑھ رہا تھا، میں نے اخبار ایک طرف رکھا اور استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا، وارڈ بوائے نے بتایا باباجی کے انگوٹھے پر چوٹ لگی تھی، ہم نے تین پختہ پہلے ان کے نائکے لگا دیے تھے، وہ نائکے کھلوانے آئے ہیں، میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور وارڈ بوائے سے کہا، باباجی سے کہو، میں آٹھ بجے کام شروع کروں گا، وہ آدھ گھنٹہ انتظار کر لیں، میں سب سے پہلے ان کے نائکے کھولوں گا، وارڈ بوائے گیا اور فوراً واپس آ گیا، میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا، وہ گھبرا کر بولا، باباجی کو بہت جلدی ہے، انہوں نے آٹھ بجے کہیں پہنچنا ہے، وہ ہماری منت کر رہے ہیں، مجھے باباجی اور وارڈ بوائے دونوں پر غصہ آ گیا، میں نے اخبار میز پر پٹا اور شیشے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا، باباجی دروازے کے بالکل سامنے کھڑے تھے ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے، میں نے انہیں ڈانٹنے کی کوشش کی لیکن پھر ان کی حالت دیکھ کر ضبط کر گیا، میں نے انہیں بتایا کلینک کا وقت آٹھ بجے شروع ہوتا ہے، میں صرف اخبار پڑھنے کیلئے آدھ گھنٹہ پہلے آ جاتا ہوں، آپ امینا سے بیٹھ جائیں جوں ہی آٹھ بجیں گے، میں سب سے پہلے آپ کو دیکھوں گا، باباجی نے گھڑی کی طرف دیکھا اور لجاجت بھری آواز میں بولے، بیٹا جی میں نے آٹھ بجے دوسرے ہسپتال پہنچنا ہے، میں لیٹ ہو رہا ہوں اگر میں پانچ منٹ میں یہاں سے نہ نکلا تو میں وقت پر وہاں نہیں پہنچ سکوں گا اور اس سے میرا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا، پلیز میرے اوپر مہربانی کریں باباجی نے اس کے ساتھ ہی میری تھوڑی بکڑ لی، میرا غصہ صحت کو چھونے لگا، لیکن میں باباجی کی عمر دیکھ کر چپ ہو گیا، میں انہیں کلینک

میں لے آیا۔ فرے سنگواٹی اور احتیاط سے ان کے ٹانگے کھولنے لگا، باباجی اس سارے عمل کے دوران بار بار گھڑی دیکھتے رہے۔

ڈاکٹر کا اس نے لمبا سانس بھر اور دوبارہ بولا "میں نے ٹانگے کھولتے ہوئے باباجی سے پوچھا آپ نے کہاں جانا ہے باباجی نے بتایا "فلاس ہسپتال میں ان کی بیوی داخل ہے اور وہ ہر صورت آٹھ بجے اس کے پاس پہنچنا چاہتے ہیں" میں نے پوچھا خدا نخواستہ آپ کی بیگم کا آپریشن تو نہیں باباجی نے جواب دیا "نہیں میں روز صبح آٹھ بجے ہسپتال پہنچ کر اسے ناشتہ کراتا ہوں" مجھے ان کے جواب نے حیران کر دیا، میں نے پوچھا "کیوں باباجی بولے دو پانچ سال سے ہسپتال میں ہے اور میں پچھلے پانچ سال سے روز آٹھ بجے اس کے ہسپتال پہنچتا ہوں اور اسے اپنے ہاتھ سے ناشتہ کراتا ہوں" میں نے حیرت سے پوچھا "پانچ سال میں آپ کبھی لیٹ نہیں ہوئے باباجی نے انکار میں سر ہلا کر جواب دیا "جی نہیں آدھی ہو طوفان ہو سیلاب ہو بارش ہو سردی ہو گرمی میں کبھی لیٹ نہیں ہوا" میں نے پوچھا لیکن کیوں؟ باباجی سسکرائے "میں اس کا قرض ادا کر رہا ہوں ہم نے پچاس برس اکٹھے گزارے ہیں ان پچاس برسوں میں اس نے مجھے روزانہ آٹھ بجے ناشتہ کرایا تھا ہمارے گھر میں نوکروں اور خادموں کی کوئی کمی نہیں تھی لیکن سردی ہو گرمی ہو بارش ہو سیلاب ہو طوفان ہو یا آدھی وہ ہمیشہ ساڑھے چھ بجے جاگتی تھی، اپنے ہاتھوں سے ناشتہ بناتی تھی اور ٹھیک آٹھ بجے جب میں اوپر سے نیچے آتا تھا تو وہ میز پر ناشتہ لگا کر میرا انتظار کرتی تھی، ہم دونوں ہمیشہ اکٹھے ناشتہ کرتے تھے اس نے پچاس برسوں میں کبھی اس معمول میں قفل نہیں آنے دیا وہ میرے ناشتے کی وجہ سے کبھی سیکے نہیں گئی پانچ برس پہلے وہ ہسپتال میں داخل ہوئی تو یہ ڈیوٹی میں نے سنبھال لی اب میں روزانہ ساڑھے چھ بجے جاگتا ہوں اور آٹھ بجے سے پہلے اس کے کمرے میں پہنچ جاتا ہوں میں ناشتہ بناتا ہوں اور پھر ہم دونوں اکٹھے ناشتہ کرتے ہیں میری حیرت پر بیٹائی میں داخل ہو گئی اور میں نے باباجی سے پوچھا "آپ کی بیگم کو کیا بیماری ہے باباجی نے حسرت سے میری طرف دیکھا اور سسکی لے کر بولے ان کی یادداشت ختم ہو گئی ہے وہ اپنا نام نہیں، حال اور مستقبل بھول گئی ہیں انہیں اپنا نام تک یاد نہیں وہ دنیا کے کسی شخص کو نہیں پہچانتی وہ بولنا تک چھوڑ چکی ہیں انہیں پچھلے ایک سال سے کسی زبان کا کوئی لفظ یاد نہیں ڈاکٹر انہیں جیلی پر سن کہتے ہیں"

ڈاکٹر کا اس نے لمبی سانس لی اور دوبارہ گویا ہوا "میں نے باباجی سے کہا اس کا مطلب ہے آپ کی بیگم کو آلزائمر ہے" باباجی نے سر ہلا کر تصدیق کر دی میں نے باباجی سے پوچھا "کیا وہ آپ کو پہچانتی ہیں" باباجی نے فوراً انکار میں سر ہلایا اور کھی آواز میں بولے "وہ پانچ سال سے مجھے نہیں پہچان رہی" وہ یہ جانتی ہی نہیں میں کون ہوں اور روز صبح آٹھ بجے اس کے پاس کیوں آ جاتا ہوں" ڈاکٹر نے رک کر ہماری طرف دیکھا اور اس نے کہانی کے سرے جوڑتے ہوئے بتایا "باباجی کے ٹانگے اتر چکے تھے میں نے سپرٹ سے ان کا زخم صاف کیا اس پر پاؤں ڈر چمڑکا اور ان سے عرض کیا "آپ ہماری طرف سے فارغ ہیں آپ جا سکتے ہیں بابا جی نے اپنی چھڑی اٹھائی اور ماہر کی طرف چل پڑے میں ان کے ساتھ ساتھ چلتے لگا جب وہ باہر کے

دروازے کے پاس پہنچے تو میں نے ان سے آخری سوال پوچھا 'میں نے ان سے پوچھا جب آپ کی بیگم آپ کو پہچانتی ہی نہیں' جب ان کی نظر میں وارڈ بوائے اور آپ میں کوئی فرق نہیں تو آپ روز آٹھ بجے یہ تکلیف کیوں کرتے ہیں 'باباجی نے مزہ میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولے 'لیکن میں تو اسے پہچانتا ہوں' میں تو یہ جانتا ہوں وہ کون ہے اور میری زندگی میں اس کی کیا اہمیت 'اس کی کیا حیثیت ہے' وہ رکے اور دوبارہ بولے 'یادداشت اس کی ختم ہوئی ہے میری نہیں لہذا وہ آخری سانس تک میری بیوی ہے اور میں اسی طرح اس کی خدمت کرتا رہوں گا' باباجی رکے اور دوبارہ بولے 'محبت کا تعلق یادداشت سے نہیں ہوتا' اس کا جسم اور دماغ سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا' یہ دل میں پیدا ہوتی ہے اور دل کی آخری دھڑکن تک قائم رہتی ہے لہذا اگر آپ کا ساتھی آپ کو نہیں پہچانتا تو آپ کے دل میں اس کی محبت کم نہیں ہوتی چاہیے وہ رکے انہوں نے سانس لیا اور دوبارہ بولے 'میں کبھی کبھی سوچتا ہوں اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو کیا وہ مجھے فراموش کر دیتی؟ نہیں وہ مجھے کبھی فراموش نہ کرتی' وہ ٹھیک آٹھ بجے ٹاٹھتے کی ٹرے لے کر روز میرے سرہانے کھڑی ہو جاتی لہذا میں سوچتا ہوں اگر میری یادداشت جانے سے اس کی محبت کم نہیں ہو سکتی تو میری محبت کیسے کم ہو سکتی ہے' باباجی کلنک کی سیڑھیاں اترے 'باہر ٹیکسی کھڑی تھی' وہ ٹیکسی کی اگلی سیٹ پر بیٹھے 'انہوں نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر مجھے "دش" کیا اور وہاں سے روانہ ہو گئے لیکن میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور مجھے اس لمحے محسوس ہوا اچھی محبت کیا ہوتی ہے!"

ڈاکٹر کا "اس نے آنسو پونچھے اور ہماری طرف دیکھ کر بولا" اس کے بعد وہ باباجی مجھے کبھی نہیں لے لیکن جوں ہی آٹھ بجتے ہیں تو وہ مجھے فوراً یاد آ جاتے ہیں اور میں محبت کے تصور میں گم ہو جاتا ہوں 'میری زندگی میں آٹھ بجے کا لمحہ ہمیشہ محبت لے کر آتا ہے اور میں اپنے ساتھ عہد کرتا ہوں میری بیوی مجھ سے جتنی محبت کرتی ہے' میں اس محبت کا قرض چکائے بغیر اس دنیا سے نہیں جاؤں گا" ڈاکٹر خاموش ہوا تو ہم سب کی آنکھیں بولنے لگیں اور ہم انہیں خاموش کرنے کیلئے نشوونما تلاش کرنے لگے۔





## پچاس پینی کا سکہ

میں نے سکہ ہوا میں اچھال دیا سکہ اوپر اٹھا چند سیکنڈ ہوا میں قلابازیاں کھائیں اور پھر بڑی تیزی سے نیچے آنے لگا میں نے اپنی ہتھیلی آگے کر دی اندازہ ذرا سا غلط ثابت ہوا سکہ میرے انگوٹھے سے ٹکرایا اور فٹ پاتھ پر گر گیا میں سکہ اٹھانے کیلئے جھکا لیکن سکے نے میرے آگے دوڑ لگا دی وہ فٹ پاتھ سے سڑک پر گر اور دوڑتا ہوا سڑک کے درمیان میں پہنچ گیا میں اس وقت وہاں سے جیسی گزری سکہ ٹیکسی کے پیسے سے ٹکرایا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہنری غور سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا میں سکے سے مایوس ہو کر آگے چل پڑا میں نے چند قدموں کے بعد واپس مڑ کر دیکھا تو ہنری سڑک کے درمیان کھڑا تھا اور گاڑیاں پوری رفتار سے اس کے دائیں بائیں سے گزور رہی تھیں میں واپس آ گیا ہنری سڑک پر جبکہ کرسک تلاش کر رہا تھا وہ اس وقت بہت مضحکہ خیز لگ رہا تھا ہوا تیزی تیزی ہنری نے ایک ہاتھ سے دگ تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ کوٹ کے بھڑ بھڑاتے دامن پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ شتر مرغ کی طرح جبکہ کرسک تلاش کر رہا تھا اور میں لندن کی سردی میں فٹ پاتھ پر کھڑا اسے دیکھ رہا تھا اور پریشان ہو رہا تھا وہ سڑک کے عین درمیان بیٹھ گیا اس نے ٹائی کی پٹن ٹکائی اور سڑک کی درز میں کھرنے لگا وہ چند منٹوں تک اس کام میں مصروف رہا اور بالآخر سکہ نکالنے میں کامیاب ہو گیا اس نے فخر سے مجھے سکہ دکھایا اور گاڑیوں سے بچتا بچتا واپس فٹ پاتھ پر آ گیا اس کی ہتھیلی پر پچاس پینی کا سکہ تھا۔

دنیا میں ہر شخص کی کوئی نہ کوئی کمزوری کوئی نہ کوئی شوق ہوتا ہے میرا شوق اور میری کمزوری "کامیابی" ہے مجھے کامیاب لوگوں سے ملنے کا بے انتہا شوق ہے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں وہ کون سا خزانہ کون سا فارمولا ہے جو ایک عام سادہ سے شخص کو زمین سے اٹھا کر کامیابی کے آسمان پر پہنچا دیتا ہے میں اس شوق کی تکمیل کیلئے آدمی دنیا بھر چکا ہوں اور اب تک کی آیا کوکا سے لے کر ٹیل ٹیکس تک درجنوں کامیاب لوگوں سے مل چکا ہوں لیکن مجھے ابھی تک کامیابی کی اصل وجہ معلوم نہیں ہو سکی میں کامیابی کا کوئی کپسول فارمولا دریافت نہیں کر سکا ہنری بھی ان کامیاب لوگوں میں سے ایک تھا ہنری کا شمار لندن کے سوا میر ترین لوگوں میں ہوتا تھا وہ "کیش اینڈ کیری" کے

برنس سے وابستہ تھا اور لوگ حقیقتاً اس کی کامیابی پر حیران تھے اس نے یہ تمام تر کامیابی صرف پانچ برسوں میں حاصل کی تھی میرا ایک دوست ہنری کا بارنر تھا اس نے مجھے ہنری کی کہانی سنائی تو میں "موٹی ویٹ" ہو گیا میرے دوست نے ہنری کے ساتھ میری ملاقات طے کر دی میں لندن گیا ہنری سے ملا اس کے ساتھ کامیابی پر گمبشپ کی لیکن مجھے اس میں کوئی خاص بات محسوس نہ ہوئی ہنری ایک عام درمیانے درجے کا گورا تھا جس کی کوئی لمبی چوڑی فلاسفی نہیں تھی اس کا کہنا تھا بس انسان کو دن رات محنت کرنی چاہیے اور وہ کبھی نہ کبھی ضرور کامیاب ہو جائے گا اس کی بات میرے بنیادی خیال سے مختلف تھی میرا خیال ہے محنت دنیا کا ہر شخص کرتا ہے لیکن کامیاب صرف چند لوگ ہوتے ہیں ان چند لوگوں اور باقی لوگوں کی محنت میں کیا فرق ہے؟ یہ فرق بنیادی طور پر کامیابی کا فارمولا ہے لیکن ہنری یہ فرق واضح کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا بات چیت کے دوران اس نے مجھے لٹج کی دعوت دی میں نے اس کی دعوت قبول کر لی وہ مجھے آکسفورڈ سٹریٹ کے ایک اطالوی ریسٹوران میں لے گیا ہم نے کھانا کھایا اور پیدل اس کے دفتر کی طرف چل پڑے میری جیب میں پچاس پینی کا سکہ تھا میں نے یہ سکہ نکالا اور ہوا میں اچھالنا شروع کر دیا سکہ ہوا میں اٹھتا نیچے آتا اور میں اسے کیچ کر لیتا تنکے کی اسی اچھال کو دے دوران کہانی کا دوسرا حصہ شروع ہو گیا۔

ہنری کی اچھالی پر پچاس پینی کا سکہ تھا اس نے مجھے سکہ دکھایا اور مسکرا کر بولا "میری کامیابی کا آغاز پچاس پینی کے تنکے سے ہوا تھا لہذا میں دھات کے اس معمولی تنکے کی قدر و قیمت سے واقف ہوں" میں غور سے اس کی بات سننے لگا "وہ بولا" مجھے جوئے کی لت تھی میرے دن کا آغاز کسی نہ کسی کسبے سے ہوتا تھا اور جب تک اس کسبے کی ساری برتیاں اور سارے دروازے بند نہیں ہو جاتے تھے میں جوا کھیتا رہتا تھا ایک رات میں اپنا سب کچھ ہار گیا میرا مکان میری گاڑی میرا کوٹ میری گھڑی حتیٰ کہ میری عینک تک جوئے میں چلی گئی میں مایوس ہو کر جوئے کی میز سے اٹھنے لگا تو جیتے ہوئے جواری نے جیب سے پچاس پینی کا سکہ نکالا اور میری طرف اچھال کر بولا "میری طرف سے پہلی خیرات قبول کرو میں نے ہوا میں اچھال دیا اور چپ چاپ کسبے سے باہر آ گیا" میں بھکاری بن چکا تھا میں آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلنے لگا "ہنری رکا" اس نے لمبا سانس لیا اور اس لمبے میں بولا "دنیا میں بے شمار قسم کی ناکامیاں شکستیں اور محرومیاں ہوتی ہیں ہر ناکامی کا اپنا ایک دکھ ہوتا ہے لیکن تم ہارے ہوئے جواری کی ناکامی اور اس ناکامی کے دکھ کی گہرائی کا اندازہ نہیں لگا سکتے یہ دکھ انسان کی آخری نس آخری سرے تک جاتا ہے" میں اس وقت اسی دکھ میں مبتلا تھا اور فٹ پاتھ پر آہستہ آہستہ چل رہا تھا راستے میں مجھے پیشاب آ گیا میں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن جب بے بس ہو گیا تو میں نے ٹوائلٹ کی تلاش شروع کر دی سڑک کے کونے میں ایک موہاٹل ٹوائلٹ تھا یہ سکوں سے کھلنے والے ٹوائلٹ ہوتے ہیں آپ ان میں سکڑا لیتے ہیں تو ان کا دروازہ کھل جاتا ہے میری جیب میں پچاس پینی کا وہ سکہ تھا جو مجھے میرے جواری دوست نے بھیک میں دیا تھا میں نے سکہ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا اور ٹوائلٹ کے سامنے کھڑا ہو گیا اتنے میں ٹوائلٹ کا دروازہ کھلا اندر سے ایک انسانی باشندہ نکلا اور دروازہ کھڑکھڑا کر ہوا میں مسکرا کر بولا "میں یہاں سے نکلا کرتا ہوں" اور



داخل ہو جاؤ اس سے تمہارا سکہ بچ جائے گا میں نے قہقہہ لگایا سکہ واپس جیب میں ڈالا اور شکر یہ ادا کر کے اندر داخل ہو گیا میرا سکہ بچ گیا مجھے آدھے گھنٹے میں دوسری بار خیرات ملی تھی میں نوائلٹ سے نکلا تو سامنے ایک چھوٹی سے دکان تھی اس دکان میں جوئے کی مشین لگی تھی میں اس مشین کے سامنے رکا جیب سے سکہ نکالا اور یہ سکہ مشین میں ڈال دیا پھر وہاں ایک معجزہ والا اور مشین سے دھڑا دھڑا سکے نکلنے لگے میں نے پچاس پتی سے ایک ہزار پاؤنڈ جیت لئے میں نے وہ ہزار پاؤنڈ لئے اور بھاگ کر واپس کسٹو بکچ گیا یہاں سے مجھ پر خوش قسمتی کے دروازے کھلتے ہیں میں نے اس رات پانچ لاکھ پاؤنڈ جیت لئے میں نے پانچ لاکھ پاؤنڈ کا چیک جیب میں ڈالا اور جوئے کو ہمیشہ ہمیشہ خیر باد کہہ دیا مجھے یقین ہو گیا میں خوش قسمتی کے اس دور میں داخل ہو چکا ہوں جس میں مٹی سونا بن جاتی ہے میں نے اگلے دن اس ایشیائی باشندے کی تلاش شروع کر دی جس نے نوائلٹ کا دروازہ کھڑکیرا پچاس پتی کا سکہ بچایا تھا وہ مجھے دو ہفتے کی تلاش کے بعد ملا وہ کیپ ڈرائیو تھا میں نے اسے اپنے ساتھ شامل کر لیا ہم نے کینی بنائی اور کیش ایڈ کیری کا بزنس شروع کر دیا ہمارا کام چل نکلا آج صرف پانچ سال بعد میرا شمار لندن کے امیر ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔

وہ سانس لینے کیلئے رکا اس کی کہانی حقیقتاً حیران کن تھی اس نے لمبا سانس بھرا اور مسکرا کر بولا آپ کو زندگی میں بے شمار سکے بے شمار نوٹ ملتے ہیں ان نوٹوں ان سکوں میں آپ کے مقدر کا وہ سکہ بھی ہوتا ہے جو آپ کیلئے کامیابی کے سارے دروازے کھول دیتا ہے لیکن ہم لوگ اپنی بے وقوفی اور اپنے غرور کے باعث اپنے مقدر کا وہ سکہ کسی فنٹ پاتھ پر پھینک دیتے ہیں کسی جواری کی جیب میں ڈال دیتے ہیں یا پھر اپنے بیڈروم کے کسی کونے میں اچھال دیتے ہیں اور اس کے بعد اپنی خرمیوں اور اپنی ناکامیوں کا شکوہ کرتے ہوئے پوری زندگی گزار دیتے ہیں یہ سکے یہ چند نوٹ وہ چاہیاں ہوتے ہیں جن سے مقدر کے دروازے کھلتے ہیں لیکن ہم ان چاہیوں سے واقف نہیں ہوتے تم ملی نہیں سے وارن اینٹ تک کسی کا سیلاب فحوص کا پروفائل نکال کر دیکھ لو تمہیں اس کی ہتھیلی پر اسی قسم کا کوئی سکہ کوئی نوٹ ملے گا وہ رکا اور فس کر بولا تمہیں معلوم ہے وہ شخص کون تھا جس نے نوائلٹ کا دروازہ کھڑکیرا پچاس پتی کا سکہ بچایا تھا میں خاموشی سے اس کی شکل دیکھتا رہا وہ مسکرایا وہ تمہارا وہی پاکستانی دوست ہے جو تمہیں میرے پاس چھوڑ کر گیا ہے حیرت سے میرا منہ کھل گیا ہنری نے قہقہہ لگایا میرا ہاتھ کھولا پچاس پتی کا سکہ میری ہتھیلی پر رکھا شفقت سے میرا کمال تپہ چھپایا اور مجھے فنٹ پاتھ پر چھوڑ کر اپنے دفتر میں داخل ہو گیا میں نے سکے کو غور سے دیکھا اس میں ہنری کی ہتھیلی کی گرماش ابھی تک موجود تھی میں مسکرایا اور سکے اپنی جیب میں ڈال لیا۔





## PAKSOCIETY

کیلے ہسپتال گیا، مجھے مریضہ کا کمرہ معلوم نہیں تھا لہذا میں پرائیویٹ وارڈ کے مختلف کمروں کا جائزہ لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، میں نے ایک کمرے کے دروازے پر دستک دی اندر سے کسی خاتون کی آواز آئی، کم این میں دروازہ کھول کر اندر چلا گیا، اندر بیڈ پر ایک بزرگ لیٹے تھے ان کی ناک پر آکسیجن کا ماسک چڑھا تھا وہ ناف تک برسے تھے اور ان کی چھاتی پر بے شمار تاریں پائپ اور نوٹیاں لگی تھیں ان کے بیڈ کے گرد مختلف قسم کی سکرینیں تھیں اور ان سکرینوں پر لہریں سی چلی رہی تھیں باباجی کے سر ہانے درمیانی عمر کی ایک نرس کھڑی تھی میں جو نبی اندر داخل ہوا وہ تیزی سے میری طرف مڑی اور تلخ آواز میں بولی آپ اب آئے ہیں ہم لوگ دو دن سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں شرم آتی چاہیے آپ کو، میں گھبرا گیا وہ دایس باباجی کی طرف مڑی ان کے کان پر بھیگی اور آہستہ آواز میں بولی باباجی جی آپ کا بیٹا آگیا، باباجی نے آہستہ آہستہ پلکیں اٹھائیں دھندلی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں موندھ لیں۔ مجھے محسوس ہوا وہ نیند کی دواؤں کے زیر اثر ہیں میں نے کچھ بولنا چاہا لیکن نرس نے مجھے گھور کر دیکھا اور اسی تلخ آواز میں بولی ”اب آپ وہاں کیوں کھڑے ہیں آگے آئیں“ میں آگے آگیا اس نے میرا ہاتھ باباجی کے ہاتھ میں دیا اور ان کے کان پر جھک کر بولی باباجی انہیں پکڑ لیں اب انہیں جانے نہ دیتے گا، باباجی نے میرا ہاتھ گرفت میں لے لیا، ان کے کمرہ سے ہاتھ میں بڑی حدت تھی نرس نے گھڑی کی طرف دیکھا ہاتھ ہلایا اور باہر چلی گئی۔

میں باباجی کے قریب شول پر بیٹھ گیا، باباجی بڑے پیار سے میرا ہاتھ سہلانے لگے وہ کبھی میری آنکھیاں پکڑتے، کبھی انگوٹھے کو گرفت میں لیتے اور کبھی کلائی پکڑ لیتے میں نے محسوس کیا وہ میرے ہاتھ کو اپنے حافضے میں محفوظ کر رہے ہیں میں نے یہ ہاتھ چمڑانے کی کوشش کی لیکن باباجی میرا ہاتھ چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھے چنانچہ میں وہاں تک کر بیٹھ گیا اور ساری رات ان کے قریب بیٹھا رہا، میری پشت پر کھڑکی تھی اس کھڑکی کی کسی درز سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی یہ ہوا سیدھی میری پشت سے ٹکراتی تھی جس کے نتیجے میں میری ریڑھ کی ہڈی برف ہو گئی میں نے آدھی رات کے قریب سوچا میں اتھ کر کھڑکی بند کر دیتا ہوں میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن باباجی نے میرے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کر دی لہذا میں دوبارہ بیٹھ گیا اسی عالم میں بیٹھے بیٹھے صبح ہو گئی صبح کے وقت باباجی کا ہاتھ صاف ہونے لگا، مٹینوں کی ٹیکروں کی فارمیشن بدلنے لگی اور وہ مشکل مشکل سانس لینے لگے میں ہسپتال کے عملے کو بلانے کیلئے اٹھنے لگا تو انہوں نے میرا ہاتھ دالیا میں دوبارہ بیٹھ گیا میں عجیب کشش کا شکار تھا میں ڈاکٹروں کو بلانا چاہتا تھا لیکن باباجی میرا ہاتھ چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھے اسی کشش کے دوران باباجی کی سانسیں بند ہو گئیں مٹینوں کی ٹیکریں سیدھی ہو گئیں اور آکسیجن کے پمپ نے سکرٹا پھیلانا بند کر دیا۔ میں نے آہستگی سے اپنا ہاتھ نکالا اور ڈاکٹر کو بلانے کیلئے جھاگ کھڑا ہوا، ڈاکٹر آئے انہوں نے انہیں شاک دینے لیکن باباجی دنیا سے گزر چکے تھے۔ وہ سب دکھی سے ہو کر میری طرف پلٹے انہوں نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے باباجی کے منہ پر چادر ڈالی اور باہر نکل گئے میں بھی ان کے پیچھے چلتا ہوا ڈاکٹر کے دفتر آ گیا۔ میں نے بڑے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا یہ بزرگ کون تھے



انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور دہکی آواز میں بولے "کیا یہ آپ کے والد صاحب نہیں تھے؟ میں نے شرمندہ سا ہو کر جواب دیا "نہیں سر" میں نے تو انہیں زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مزید حیران ہو گئے یہ کیسے ہو سکتا ہے! ہم تو آپ کو ان کا بیٹا سمجھ رہے تھے۔ میں نے اس کے بعد انہیں ساری کہانی سنا دی جس کے بعد انہوں نے مجھے باباجی کی کہانی سنائی، ان کا کہنا تھا باباجی کراچی کے رہنے والے تھے کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد آئے تھے لیکن انہیں ہارٹ ایک ہو گیا دنیا میں ان کا صرف ایک بیٹا تھا، بینا لندن میں تھا انہوں نے ہمیں اس کا ٹبر دیا، ہم نے بیٹے سے رابطہ کیا اس کا موبائل بند تھا، ہم نے اس کے موبائل میں پیغام ریکارڈ کر دیا، ہم بار بار فون کرتے رہے پیغام ریکارڈ کرتے رہے مگر اس سے رابطہ نہ ہو سکا اسی دوران آپ آگئے تو زس آپ کو ان کا بیٹا سمجھ کر ان کے پاس بٹھا کر چلی گئی ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد مجھ سے پوچھا "لیکن آپ نے اس وقت کیوں نہ بتایا" میں نے جواب دیا ڈاکٹر صاحب جب انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا تو مجھے محسوس ہوا میرا ہاتھ ان کی آخری امید ہے مجھ میں یہ امید توڑنے کا حوصلہ نہیں تھا چنانچہ میں ساری رات چپ چاپ ان کے پاس بیٹھا رہا ڈاکٹر کی آنکھوں میں آنسو آگئے میری پلکیں بھی گھٹی ہو گئیں اور میں رونے لگا، اس کے ساتھ باہر آ گیا اور اس کے بعد کبھی اس ہسپتال کی طرف نہیں گیا۔

وہ خاموش ہو گیا اس کی پلکوں پر موتی چمک رہے تھے کمرے میں بڑی دیر تک خاموشی چھائی رہی میں نے توقف کے بعد پوچھا "لیکن اس واقعے کا آپ کی کامیابی کے ساتھ کیا تعلق" وہ مسکرایا "پتہ نہیں سر لیکن میرا خیال ہے میری کامیابی اور یہ واقعہ کسی نہ کسی سطح پر ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں" میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا وہ گویا ہوا "سروہ دن ہے اور آج کا دن ہے میں نے سنی کو ہاتھ لگایا تو وہ سونا ہو گئی" میں نے جب سے ایک روپیہ نکالا تو وہ ایک کروڑ بن کر واپس آ گیا آپ میری قسمت کا اندازہ لگائیے میں نے تجربہ میں مظفر آباد میں ایک پلازہ خریدا تھا 18 اکتوبر 2005ء کو زلزلہ آیا اس پلازے کے آگے پیچھے دائیں بائیں تمام عمارتیں گر گئیں تھیں لیکن اس عمارت کو خراش تک نہ آئی۔ میں جس بینک میں اکاؤنٹ کھول دیتا ہوں یقین کریں اس بینک کے ریونیو میں اضافہ ہوتا ہے اور میں جس کاغذ پر دستخط کرتا ہوں یقین کریں کاغذ کا وہ ٹکڑا دو چار کروڑ روپے کا ہو جاتا ہے چنانچہ مجھے محسوس ہوتا ہے میں نے جب اس باباجی کو اپنا ہاتھ پکڑا تھا تو قدیر ست نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا "وہ خاموش ہو گیا" میں نے اس سے پوچھا "وہ کون سا ہاتھ تھا" اس نے اپنا دائیں ہاتھ آگے بڑھا دیا میں اپنی کرسی سے اٹھا میں نے وہ ہاتھ پکڑا اور اپنی گیلی آنکھیں اس کی پھٹی پر رکھ دیں یہ میری زندگی کا پہلا جنتی ہاتھ تھا۔







کارٹ بھانپ لیتا تھا چنانچہ اس نے سٹلز کے ساتھ ساتھ کہنی کو گاڑیوں کے نئے ڈیزائن بنا کر دیے شروع کر دیئے فورڈ کی مشہور گاڑی MUSTANG بھی لی آئی تاکہ اس کی تحقیق تھی اس کے بنائے ماڈلوں نے کہنی کے کارابار میں کی گئی اضافہ کر دیا اور لی آئی کو کا ترتی کرتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ فورڈ کہنی کا صدر بن گیا 1975ء میں جب اس کی عمر محض پچاس برس تھی تو لوگ اسے آٹوموبائل کا آئین سٹائن کہتے تھے 1978ء میں اس نے فورڈ کو دے دئے ڈیزائن دیئے ایک چھوٹی کار تھی اور دوسری مینی وین یا فیملی کار اس وقت تک امریکہ میں اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا امریکی لوگ بڑی اور مضبوط گاڑیوں کے عادی تھے یہ ڈیزائن جب بورڈ آف گورنرز کے سامنے پیش ہوئے تو کہنی کے چیف انجینئروں نے فورڈ کو دئے لی آئی کو کا اور فورڈ میں اختلافات پیدا ہوئے اور اس نے استعفیٰ دے دیا۔ ان دنوں کریسلر کہنی دم توڑ رہی تھی کریسلر کہنی امریکہ کی سب سے بڑی آٹوموبائل کارپوریشن ہوتی تھی لیکن پچھلے دو پے نقصانات کے باعث وہ دیوالیہ ہو رہی تھی۔ اس وقت کہنی کے ڈائریکٹروں نے سوچا اگر کسی طرح لی آئی کو کا کریسلر کے ساتھ وابستہ ہو جائے تو کہنی ایک بار پھر اپنے قدموں پر کھڑی ہو جائیگی لی آئی کو کا نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ اس نے بڑھاپا ملازم فارغ کئے کہنی کی یورپی ڈویژن فروخت کر دی اور فورڈ کے بعض اچھے ورکرز کو کریسلر میں لے آیا لیکن کہنی میں جان پیدا نہ ہوئی اسے محسوس ہوا اگر کہنی کو کہیں سے وہ ملین ڈالر مل جائیں تو کہنی دوبارہ زندہ ہو سکتی ہے مگر کوئی بینک کریسلر کو قرضہ دینے کیلئے تیار نہیں تھا اس نے یورپ کے ایک بینک سے مذاکرات کئے بینک قرضہ دینے کیلئے تیار ہو گیا لیکن اس نے ایک عجیب و غریب شرط رکھ دی بینک نے کہا اگر امریکی حکومت گارنٹی دے تو ہم کہنی کو ڈیڑھ ملین ڈالر دینے کیلئے تیار ہیں یہ ایک ناقابل عمل شرط تھی لیکن لی آئی کو کا نے کوشش کا فیصلہ کیا اس نے ریگن سے بات کی اور ریگن نے اس کا کیس کاغذیں کے سامنے رکھ دیا کاغذیں نے اسے طلب کر لیا لی آئی کو کا نے کاغذیں جس خوبصورتی سے اپنا موقف پیش کیا وہ بذات خود ایک تاریخ ہے اس نے کہا اگر کریسلر بند ہو گئی تو یہ امریکہ جیسی سپر پاور کی شکست ہوگی دنیا یہ کہے گی جو امریکہ ایک کار ساز کہنی نہیں چلا سکا وہ دنیا پر خاک حکمرانی کرے گا اس نے بتایا اگر کریسلر بند ہو گئی تو 2 لاکھ امریکی بے روزگار ہو جائیں گے امریکی کاریں دنیا میں اپنی حیثیت کھو بیٹھیں گی اور ہم لوگ شرمندگی سے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے وغیرہ۔ تھ مختصر لی آئی کو کا نے کاغذیں کو قائل کر لیا کاغذیں نے بینک کو گارنٹی دے دی کریسلر کو ڈیڑھ ملین ڈالر مل گئے۔

لی آئی کو کا نے فوری طور پر وہ دونوں ماڈل بنوائے جن کی وجہ سے اسے فورڈ چھوڑنا پڑی تھی ”کے کار“ کریسلر کی ایک چھوٹی کار تھی جس وقت یہ گاڑی مارکیٹ میں آئی اس وقت امریکہ میں تیل کا بحران پیدا ہو چکا تھا یہ ایک ہلکی چٹکی گاڑی تھی جو کم پٹرول استعمال کرتی تھی یہ امریکہ کی پہلی چھوٹی کار تھی لہذا دیکھتے ہی دیکھتے ”کے کار“ پوری امریکی مارکیٹ پر چھا گئی مینی وین کریسلر کی دوسری بڑی پراڈکٹ تھی یہ گاڑی بے شمار مقاصد پورے کرتی تھی اس میں پورا خاندان آ سکتا تھا اسے لوگ ٹرانسپورٹیشن کے لئے بھی استعمال کر سکتے تھے یہ ”گمر ٹیکری“ دکان اور مارکیٹ ہر جگہ استعمال ہو سکتی تھی اس گاڑی نے بھی کمال کر دیا کریسلر کہنی نے اپنی صرف ان دو



پراؤنٹس کے ذریعے وقت سے کہیں پہلے سارا خرچہ ادا کر دیا 80 لاکھ روپے کے آخر میں لی آئیہ کوکانے اے ایم سی اور جیپ کے نام سے مزید دو گاڑیاں ستارف کرائیں ان گاڑیوں نے بھی اچھا بزنس کیا لیکن لی آئیہ کوکانے بہت بڑے نقصان تھے وہ کہا کرتے تھے ”لی آئیہ کوکانے کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں کو مستثر کرنے کی بے پناہ صلاحیتیں دے رکھی ہیں“ شاید یہی وجہ تھی صدر ریگن نے 1982ء میں لی آئیہ کوکانے کو بحسبہ آزادی فاؤنڈیشن کا سربراہ بنا دیا لی آئیہ کوکانے عوام سے اپیل کی ہم بحسبہ آزادی کی ترغیب و آرائش کرنا چاہتے ہیں یہ بحسبہ پوری امریکی قوم کا مشترکہ اثاثہ ہے میری خواہش ہے تمام امریکی اس قومی خدمت میں ہمارا ساتھ دیں اس کے الفاظ نے جادو کر دیا اور چند ہی دنوں میں 540 ملین ڈالر جمع ہو گئے۔

میں 2002ء میں امریکہ گیا تو میں اس کے دفتر چلا گیا میں نے اس کے سیکرٹری سے 10 منٹ کا وقت لیا تھا، ٹھیک دس منٹ بعد یہ ملاقات ختم ہو گئی لیکن ایک بڑے انسان کی صحبت میں گزارے یہ دس منٹ میری زندگی کا اثاثہ تھے اس ملاقات کے دوران میں نے اس سے صرف ایک سوال پوچھا میں نے پوچھا ”آپ کی کامیابی کا کیا راز ہے؟“ اس نے تہہ بہہ لگایا ”میرا والد“۔ میں حیران ہو گیا۔ اس نے بتایا ”میرا والد بیٹے میں ایک دن مجھے ڈنر کیلئے کسی اچھے ریستورانٹ میں لے کر جاتا تھا وہ کرسی پر بیٹھتے ہی میرے کے ہاتھ پر دس ڈالر رکھ دیتا تھا اور اس سے کہتا تھا ”یہ تمہاری ٹپ ہے“ ہم ڈنر کے لئے آئے ہیں اور اب تمہارا ڈنر خراب نہیں ہونا چاہئے اس کے بعد وہ دوطرفہ تمام گاؤں کو چھوڑ کر ہماری خدمت میں جت جاتا تھا میں نے والد کی اس عادت سے سیکھا اگر آپ کسی سے کام لینا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اسے اس کا حصہ دے دیں میں نے اسے اپنی زندگی کا اصول بنالیا پوری دنیا میں لوگ اپنے ورکروں کو سال کے آخر میں بزنس دیتے ہیں لیکن میں ہمیشہ سال کے شروع میں اپنے ورکروں کو اکٹھا کرتا ہوں ان سے کہتا ہوں تم لوگ تخمینہ لگاؤ ہم سال کے آخر میں کتنا منافع کمائیں گے وہ تخمینہ لگاتے ہیں میں اس تخمینے کے مطابق انہیں سال کے شروع میں بزنس دے دیتا ہوں اور اس کے بعد ان سے کہتا ہوں اب مجھے مارگٹ کے مطابق پیسہ کم کر دیں اور اس کے بعد ورکر کال کر دیتے ہیں میرے اس فارمولے کے باعث مجھے آج تک کوئی نقصان نہیں پہنچا رہی کارپوریٹ لائف کی بات تو اس کیلئے چار اصول ہیں۔ سب سے پہلے آپ یہ فیصلہ کریں آپ نے کرنا کیا ہے دوسرا اس کام کیلئے دنیا کے بہترین لوگ منتخب کریں تیسرا اپنی ترجیحات طے کریں اور چوتھا چاہے ایک آج ہی سہی اپنے مارگٹ کی طرف روزانہ تھوڑی تھوڑی پیش رفت کریں آپ کبھی ناکام نہیں ہوں گے ”سینکس ختم ہو گئی“ میں باہر آ گیا لفٹ سے نیچے اترتے ہوئے میں نے سوچا اگر انسان چاہے تو وہ دس ڈالر کے نوٹ سے بھی زندگی کا سب سے بڑا اصول وضع کر سکتا ہے اور وہ دس ڈالر کے نوٹ سے بھی دنیا کا بہت بڑا بزنس من بن سکتا ہے۔





## ایک بڑی فورس

یہ آج سے پانچ برس پرانی بات ہے۔ ہم چار دوست اکٹھے رہتے تھے، ہمارے گھر قریب قریب تھے، ہم صبح، دوپہر اور شام کو ایک دوسرے سے ملنے آتے تھے، ہم سب ایک جیسے حالات سے دوچار تھے، ہم سب کی زندگیوں میں بے ترتیبی، بے سکونی اور بے چینی تھی۔ ہم ایک مشکل سے نکلتے تھے تو دوسری میں پھنس جاتے تھے، ہماری ایک پریشانی ختم ہوتی تھی تو دوسری کندھوں پر آ بیٹھتی تھی، ہم میں سے تین عام دنیا دار قسم کے لوگ تھے لیکن ہمارا چوتھا ساتھی دین دار، تہجد گزار اور صوفی منش شخص تھا، وہ جو میں گھنٹے باوجود رہتا تھا، اس کے ہونٹوں پر ہر وقت ذکر چلتا رہتا تھا مگر اس عبادت اور ریاضت کے باوجود اس کی زندگی بھی ہماری طرح بے سکونی اور عدم استحکام کا شکار تھی۔ وہ بھی ہماری طرح ہر وقت پریشان اور بے چین رہتا تھا۔ ایک دن ہم چاروں ایک درویش کے پاس حاضر ہو گئے۔

درویش ایک دلچسپ شخص تھا، وہ بیک وقت ایک کامیاب تاجر، ایک باغی عالم، ایک تارک الدنیا صوفی اور ایک سخت مزاج منتظم تھا۔ وہ ہم سب کا مشترکہ دوست تھا، ہم سب اس کے محل میں اس کے سامنے بیٹھ گئے، وہ اڑھائی ایکڑ کے ایک بڑے محل میں رہتا تھا لیکن اس کا کمرہ بہت سادہ بلکہ بہت غریبانہ تھا، پورے کمرے کی واحد قیمتی چیز گھسرو منڈی کی دس بالی آٹھ فٹ کی بوسیدہ دیوڑھی تھی، درویش کے پاس کپڑوں کے صرف دو جوڑے تھے، وہ جو میں گھنٹے میں صرف ایک بار کھانا کھاتا تھا اور ہفتے میں پانچ دن روزے رکھتا تھا۔ اس نے ہماری پریشانیاں سن کر قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے بولا "تم لوگ غلط انداز سے زندگی گزار رہے ہو، تمہاری زندگی کی ترتیب غلط ہے لہذا تمہاری زندگیوں میں سکون اور آرام کیسے آ سکتا ہے، تمہاری پریشانیاں کیسے کم ہو سکتی ہیں؟" ہم نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا، اس نے مسکرا کر چائے کے کپ ہمارے ہاتھوں میں تھما دیے۔ "دیکھو اگر تم زندگی کا سلیقہ جاننا چاہتے تو تمہیں وہ سیرت نبویؐ میں ملے گا، سکون اور اطمینان تک پہنچنے کے سارے فارمولے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں پوشیدہ ہیں۔" وہ رکھا، اس نے غور سے ہمارے چہرے دیکھے اور پھر گویا ہوا "اسلامی ریاست کے چار ستون تھے، حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان اور حضرت علیؓ، ان چاروں حضرات نے اسلام کی کامیابی میں بڑا مرکزی کردار ادا کیا یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اللہ کا پیغام دنیا کے کونے کونے میں پھیلا دیا، تم

لوگ میری اس بات سے اتفاق کرتے ہو "اس نے رک کر ہم سے پوچھا، ہم نے ہاں میں گردن ہلا دی، وہ اپنے مخصوص انداز سے مسکرایا اور آہستہ اور میٹھے لہجے میں بولا "یہ اصحاب کون تھے، کیا تم لوگوں نے کبھی سوچا، یقیناً تم لوگوں نے انہیں اس نزاع سے کبھی نہیں دیکھا ہوگا، یہ اصحاب، یہ حضرات ایک مخصوص طرز زندگی تھے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ فقر اور غنا کا دوسرا نام تھے، آپ محبت رسول ﷺ میں سب کو لٹا دیتے تھے۔ حضرت عثمانؓ ایک مکمل اور مضبوط معیشت کی علامت تھے، ان کا شمار عرب کے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب حضرت عثمانؓ کا آخری اونٹ شام سے لٹا تھا تو پہلا مدینہ پہنچ چکا ہوتا تھا۔ عرب میں کہا جاتا تھا تجارت سیکھی ہو تو عثمانؓ سے سیکھو، وہ کبھی گھانے میں نہیں رہتے، حضرت عمرؓ مختظم تھے، وہ ایک مکمل روح نہیں، ایک شاندار ایڈمنسٹریشن کا نام تھے، وہ قوت ارادی اور اٹل پن کی علامت تھے، تم لوگ خود سوچو، جس شخص کے ایمان کا آغاز حق اس فعل سے ہو کہ وہ گھروں میں چھپے مسلمانوں کو ساتھ لے، انہیں خانہ کعبہ لانے اور پھر کہہ تم لوگ سب کے سامنے نماز پڑھو، عمرؓ کی تلوار تہاردی حفاظت کرے گی۔ اس شخص کی قوت ارادی کی کیا سطح ہوگی، وہ کس قدر مضبوط فیئیس کا مالک ہوگا اور آخر میں حضرت علیؓ "درویش رکا، اس نے لمبی سانس لی اور اسی رواں لہجے میں بولا "حضرت علیؓ اس دور کے سب سے بڑے عالم تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا، میں علم کا شہر ہوں تو علیؓ اس کا دروازہ ہیں، یہ چار حضرات رسول اللہ ﷺ کے اولین ساتھی تھے۔ ان حضرات کا ساتھ ثابت کرتا ہے اسلام جیسے مذہب کو بھی اپنے اظہار کیلئے فقر، معیشت، انتظامی مہارت اور علم کی ضرورت ہوتی ہے۔"

وہ رکا تو میں نے بے چین ہو کر پوچھا "یاد درویش تمہارے اس فلسفے کا ہمارے مسئلے سے کیا تعلق، ہم اپنی بات کر رہے اور تم ہمارے گرد اسلام کا دائرہ بگھڑ رہے ہو۔" درویش نے تہقیر لگایا "بیوقوف! میں تمہارے مسئلے کا حل بتا رہا ہوں، یہ چاروں حضرات ثابت کرتے ہیں اسلام جیسے آفاقی نظریے کو بھی عملی تفسیر کیلئے ایک فقیر، ایک مختظم، ایک معیشت دان اور ایک عالم کی ضرورت ہوتی ہے لہذا معاشرہ ہو یا فرد جس بندے کے پاس علم نہیں، جس کے پاس ضروریات زندگی کیلئے مناسب رقم نہیں، جس کی زندگی میں انکم و ضبط نہیں اور جس کی ذات میں حضرت ابو بکرؓ جیسا فقر نہیں وہ ایک اچھی اور پرسکون زندگی نہیں گزار سکتا، تم لوگوں کا بھی مسئلہ ہے "درویش رکا اور اس نے ہم میں سے ایک کئے چہرے پر نظریں گاڑیں اور بولا "مثلاً تم، تمہارے پاس روپیہ، چیرہ تو ہے، تم کروڑ پتی ہو لیکن تمہارے اندر کا فقیر مر چکا ہے، تمہارا علم اخبار بنی تک محدود ہے اور تمہاری انتظامی صلاحیتیں ختم ہو چکی ہیں لہذا تم بے سکون ہو اور تم "وہ مولوی صاحب کی طرف مڑا "تم نے پوری زندگی رکوع و سجود میں لگا دی، تمہارے بچے روز بھوکے پیٹ سکول جاتے ہیں، خود تم اپنی بھوک کو روزے کی شکل دینے کی کوشش کرتے رہتے ہو اور تم "وہ میری طرف مڑا "تم کتابوں کے پہاڑ سے کوڑ کر خوشی کر رہے ہو اور تم "وہ ہمارے چوتھے ساتھی کی طرف مڑا "تم اپنے گھر والوں کی ساری ضرورتوں، ساری خراجاتوں کو اپنی تانے بچلے رہے ہو، تم اپنی ایڈمنسٹریشن کے ذریعے زندگی کو سیدھا اور ہموار بنانا چاہتے ہو لیکن یاد رکھو، انتظام اچھی چیز ہوتا ہے لیکن وہ ایک روپے کو بچاس روپے نہیں بنا سکتا۔"

درویش نے ٹانگیں سیدھی کیں اور فس کر بولا "بے وقوف! صرف عام شخص نہیں دنیا میں صرف وہ ملک ترقی کی معراج تک پہنچتے ہیں جن کے پاس یہ چاروں چیزیں اکٹھی موجود ہوتی ہیں اور وہ تمام ملک پیچھے رہ جاتے ہیں جو ایک ستون پر پوری عمارت کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بے وقوف! اگر صرف نقد سے ملک چل سکتے تو طالبان کا افغانستان اس وقت دنیا کا ترقی یافتہ ترین ملک ہوتا، اگر ایڈمنسٹریشن ہی سب کچھ ہوتی تو سوویت یونین کبھی نہ ٹوٹتا، اگر تعلیم سے ملک ترقی کر سکتے تو سری لنکا جنوبی ایشیا کا سب سے بڑا ملک ہوتا اور اگر دولت ہی کافی ہوتی تو سعودی عرب اس وقت دنیا کی سپر پاور ہوتا" وہ رکا اور فس کر بولا "لیکن ایسا نہیں ہوا، دنیا کی کوئی عمارت صرف ایک ستون پر کھڑی نہیں رہ سکتی، اسے استحکام کیلئے ایک وقت چار ستون درکار ہوتے ہیں، تم لوگ بھی اپنی زندگی میں ایسی ترتیب پیدا کر لو تو تمہیں یہ دنیا جنت لگنے لگے گی اور حکومت کو بھی بتاؤ وہ صرف معیشت پر توجہ نہ دے، وہ معیشت کے ساتھ ساتھ ملک میں درویشوں، عالموں اور مختصمین کی ایک بڑی فورس بھی پیدا کرے، تب کہیں جا کر ملک ترقی کرے گا"



Kashif Azad @ OneUrdu.com



## تین وجوہات

لی کوآن یو کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ تھی، انہوں نے حاضرین کو غور سے دیکھا اور سر جھکا لیا، یہ منظر ہمیشہ کیلئے میرے ذہن میں ریکارڈ ہو گیا اور جب بھی میں کسی شخص سے عالم اسلام کے زوال اور پاکستان کی پسماندگی کے بارے میں سنتا ہوں تو میرے دماغ میں وہ سارا منظر روشن ہو جاتا ہے لی کوآن یو اس وقت سنگاپور کے وزیراعظم ہاؤس کے ایک پرٹکلف ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے، ان کے صوفے کے پیچھے کھڑکی تھی اور کھڑکی کے شیشے پر تیل چڑھی تھی لی کوآن یو کے ساتھ اس وقت کے وزیراعظم نواز شریف بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ہائیوں اختر بیٹھے تھے، ان سے ذرا قافلے پر سنگاپور میں پاکستان کے سفیر براجمان تھے اور سامنے کرسیوں پر دوسرے احباب تشریف رکھتے تھے یہ ایک غیر رسمی ملاقات تھی جس میں ایک جونیئر وزیراعظم ایک سینئر وزیراعظم سے حکمت اور دانائی حاصل کرنے آیا تھا۔ لی کوآن یو اس وقت تک ریٹائرمنٹ لے چکے تھے لیکن اس کے باوجود سنگاپور کے لوگ انہیں اقتدار میں دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ وہ سینئر وزیر کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہے تھے ان کے پاس کوئی باقاعدہ وزارت نہیں تھی ان کا رول بڑی حد تک مانیٹر اور اسٹاڈ کا تھا وہ کابینہ کے اجلاس میں بیٹھتے تھے، جونیئر وزراء کو مختلف معاملات میں مشورے دیتے تھے اور مختلف وزارتوں کی کارکردگی کا جائزہ لیتے تھے، انہیں جہاں کسی غلطی کا احساس ہوتا تھا وہ فوراً غلطی کی نشاندہی کرتے تھے اور متعلقہ افسر اور سیاستدان کو ازالے کے بارے میں سمجھاتے تھے، پورا سنگاپور لی کوآن یو کا احترام کرتا تھا وہ 30 برس تک سنگاپور کے وزیراعظم رہے تھے اور انہوں نے ان 30 برسوں میں اس بدبودار دلدلی جزیرے کو دنیا کی نویں بڑی معیشت بنا دیا تھا، سنگاپور ایک معجزہ تھا اور اس معجزے کے تخلیق کار لی کوآن یو تھے۔

سنگاپور کی کہانی انتہائی دلچسپ تھی، یہ 640 مربع کلومیٹر کا ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا اس جزیرے پر انیسویں صدی تک ہولناک جنگل تھے اور ان جنگلوں میں خونخوار درندوں، شیروں اور گرگچوں کا راج تھا اس جزیرے میں غلطی کی سب سے بڑی دلدل بھی تھی بعد ازاں بحری قزاقوں نے اسے اپنا مسکن بنالیا تھا چنانچہ دنیا کا کوئی شخص اس کی طرف رخ نہیں کرتا تھا۔ انیسویں صدی میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ جزیرہ خرید لیا، پہلی جنگ عظیم

میں برطانیہ نے اسے بحری اڈہ بنایا جبکہ دوسری جنگ عظیم میں اس پر جاپان نے قبضہ کر لیا۔ سنگاپور 1963ء میں ملائیشیا کو واپس مل گیا لیکن 1965ء میں ملائیشیا نے اسے بوجھ سمجھ کر اپنے سر سے اتار دیا۔ سنگاپور کو آزادی دے دی گئی۔ اس وقت لی کوآن یو سنگاپور کے وزیر اعظم تھے، وہ 1959ء میں پہلی بار سنگاپور کے وزیر اعظم منتخب ہوئے تھے، کوآن یو نے اس بدبودار جریرے کو دنیا کا شاندار ملک بنانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے پورے ملک سے ایماندار لوگوں کو جن کرچ بنایا اور ان جنوں کو مکمل خود مختاری دی۔ یہ جج صدر اور وزیر اعظم سے لے کر چڑا اسی تک تمام سرکاری اہلکاروں کو کسی بھی وقت عدالت میں طلب کر سکتے تھے اور ان کی مکمل عام گوشمالی کر سکتے تھے۔ عدل کے بعد انہوں نے سنگاپور کے خوشحال طبقے سے انتہائی پڑھے لکھے، مہذب اور ایماندار لوگ چنے اور انہیں اپنی کابینہ میں بھرتی کر لیا۔ انہوں نے کابینہ کیلئے احتساب کا ایک کڑا نظام بھی تشکیل دیا اور اس نظام سے کوئی شخص مبرا نہیں تھا، اس کے بعد انہوں نے پوری دنیا میں سمکھرے سنگاپور کے پڑھے لکھے اور ہنرمند لو جو انوں سے رابطہ کیا اور انہیں بھاری معاوضے پر سرکاری ملازمتوں کی پیش کش کی، آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی سنگاپور دنیا کا واحد ملک تھا اور ہے جس میں سرکاری ملازمتوں کی تنخواہیں کارپوریٹ سیکٹر کے برابر ہیں سنگاپور میں اگر ایک ایم بی اے نو جوان پرائیویٹ بینک سے دو لاکھ روپے تنخواہ لیتا ہے تو حکومت بھی اس کو ایکشن کے نو جوان کو دو لاکھ روپے تنخواہ دیتی ہے لی کوآن یو نے سنگاپور کے قانون کو دنیا کا سخت ترین قانون بنا دیا تھا مثلاً سنگاپور میں جیوٹم چپا کر مرکز یا گلی میں پھینکنے کا جرمانہ دو ہزار ڈالر تھا، کسی دیوار یا عوامی جگہ پر گالی لکھنے کی سزا موت تھی اور سنگاپور میں اگر کوئی وزیر یا مشیر کرپشن میں ملوث پایا جاتا تھا تو لی کوآن یو اسے خودکشی یا احتساب میں سے کسی ایک آپشن کے انتخاب کا موقع دیتا تھا، وزیر عام عموماً اس لئے خودکشی کو ترجیح دیتے تھے چنانچہ لی کوآن یو کی ان اصطلاحات کے نتیجے میں صرف تین برسوں میں سنگاپور دنیا کا نواں امیر ترین ملک بن گیا، لی کوآن یو تیس برس بعد 1990ء میں مستعفی ہو گئے اور انہوں نے اپنے لیے نگران کا کردار منتخب کر لیا۔

میاں نواز شریف 1999ء میں سنگاپور کے دورے پر گئے، میں بھی وزیر اعظم کے وفد میں شامل تھا، نواز شریف نے سرکاری مصروفیات کے بعد لی کوآن یو سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی وہ لی کوآن یو سے لیڈر شپ اور ترقی کی "ٹیم" لینا چاہتے تھے۔ سنگاپور کے وزیر اعظم نے لی کوآن یو کے ساتھ ان کی ملاقات طے کر دی۔ نواز شریف نے چند لوگوں کا انتخاب کیا اور اس شام لی کوآن یو کے پاس حاضر ہو گئے۔ یہ ملاقات وزیر اعظم ہاؤس میں وقوع پذیر ہوئی۔ گفتگو کے آغاز میں لی کوآن یو نے انکشاف کیا وہ مختلف جمیٹوں سے 8 مرتبہ پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں لہذا وہ پاکستان کے حریف، دم و درواج اور لوگوں سے پوری طرح آگاہ ہیں، نواز شریف نے بڑے ادب سے ان سے پوچھا "کیا آپ اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ سمجھتے ہیں پاکستان کبھی سنگاپور جتنی ترقی کرے گا" لی کوآن یو نے ذرا دیر سوچا اور انکار میں سر ہلا دیا، ان کا رد عمل انتہائی سفاک، کھر اور غیر سفارشی تھا، حاضرین پریشان ہو گئے، لی کوآن یو ذرا دیر بعد بولے "اس کی تین بڑی وجوہات ہیں، پہلی وجہ آئیٹل یا لوجی ہے، آپ اور ہم میں ایک بنیادی



فرق ہے آپ اس دنیا کو عارضی سمجھتے ہیں اور آپ کا خیال ہے آپ کی اصل زندگی مرنے کے بعد شروع ہوگی چنانچہ آپ لوگ اس عارضی دنیا پر توجہ نہیں دیتے، آپ سڑک، عمارت، ہیڈروجن سسٹم، ٹریفک اور قانون کو سنجیدہ نہیں لیتے جبکہ ہم لوگ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہیں لہذا ہم اس دنیا کو خوبصورت سے خوبصورت تر بناد رہے ہیں۔ وہ رے کے اور رادیر بعد بولے "خود سوچئے جو لوگ اس دنیا پر یقین نہیں رکھتے وہ اسے خوبصورت کیوں بنائیں گے، دوسری وجہ آپ لوگوں کی اپرویج ہے، میں چشمے کے لحاظ سے وکیل ہوں، ہندوستان کی تقسیم سے پہلے میں اس علاقے میں پریکٹس کرتا تھا، کلکتہ سے کراچی تک میرے مکمل پھیلے تھے میں نے ان دنوں ہندو اور مسلمان کی نفسیات میں بڑا فرق دیکھا، میرے پاس جب کوئی ہندو کلائنٹ آتا تھا اور میں اس کے کیس کے جائزے کے بعد اسے بتاتا تھا تمہارے کیس میں جان نہیں، اگر تم عدالت میں گئے تو تم یہ کیس ہار جاؤ گے تو وہ میرا شکریہ ادا کرتا تھا اور مجھ سے کہتا تھا "آپ مہربانی فرما کر میری دوسری پارٹی سے صلح کرادیں" میں اس کی صلح کر دیتا تھا اور یوں مسئلہ ختم ہو جاتا تھا جبکہ اس کے برعکس جب کوئی مسلمان کلائنٹ میرے پاس آتا تھا اور میں اسے صلح کا مشورہ دیتا تھا تو اس کا جواب بڑا دلچسپ ہوتا تھا "وہ کہتا تھا وکیل صاحب آپ کیس دائر کریں میں پوری زندگی مقدمہ لڑوں گا۔ میرے بعد میرے بچے لڑیں گے اور اس کے بعد ان کے بچے لڑیں گے" لی کوآن یو کے اور مسکرا کر بولے "میرا تجربہ ہے جو تو میں اپنے خاندانوں اور اپنی لیسوں کو ورثے میں مقدمے اور مسئلے دیتی ہوں وہ ترقی نہیں کرتیں اور تیسری اور بڑی وجہ فوج ہے آپ کے ملک میں فوج سیاست کا حصہ بن چکی ہے اور مجھے پوری دنیا میں آج تک کوئی ایسا ملک نہیں ملا جس نے فوجی اثر میں رہ کر ترقی کی ہو"

وہ رے کے اور دوبارہ بولے "فوجی اور سیاستدان کی سوچ اور ٹریننگ میں بڑا فرق ہوتا ہے فوجی ہمیشہ مسئلہ پیدا کرتا ہے جبکہ سیاستدان مسئلے حل کرتے ہیں، فوجی کی زندگی کا صرف ایک اصول ہوتا ہے "میں خود جیوں گا اور نہ کسی کو جینے دوں گا جبکہ سیاستدان جیو اور جینے دو کے فلسفے پر کاربند ہوتے ہیں، فوجی کو زندگی میں سر جاؤ یا مار دو کی ٹریننگ دی جاتی ہے جبکہ سیاستدان کو صلح، مذاکرات اور نرمی کی تربیت دی جاتی ہے چنانچہ میرا تجربہ ہے جس ملک میں حکومت اور سیاست فوج کے پاس ہوتی ہے وہ ملک کبھی ترقی نہیں کرتا" لی کوآن یو نے مسکرا کر سب کی طرف دیکھا، گھڑی پر نظر ڈالی اور ہاتھ رگڑ کر بولا "میں نے واک کیلئے جانا ہے، اگر آپ لوگ میرا ساتھ دے سکتے ہیں تو چلیے واک کرتے ہیں" وہاں موجود تمام لوگوں نے اپنے پاؤں دیکھے اور اس کے بعد لی کوآن یو کے قدموں کی طرف دیکھا اور چہرے پر معذرت سجا کر ان کی طرف دیکھنے لگے لی کوآن یو نے سب کے ساتھ ہاتھ ملایا اور باہر نکل گئے۔





## حشر کو ابھی بہت دن باقی ہیں

میں ضیاء شاہد صاحب کا بچپن سے ”یقین تھا“ وہ میں سال پہلے میگزین میں ”جمعہ بخیر“ کے نام سے ایک طویل کالم لکھا کرتے تھے یہ ایک سوشل کالم ہوتا تھا جس کی تحریر میں صوفیانہ کشش اور ادبی محاسن ہوتی تھی ”ضیاء صاحب کے ساتھ ساتھ یہ کالم مختلف اخبارات کا سفر کرتا رہا“ میں بھی بطور قاری ان کے ساتھ اخبارات تہہ بیل کرتا رہا۔ ”قارئین اور ”مخیر“ کی ایک عجیب سائیکالوجی ہوتی ہے یہ لوگ اپنے پسندیدہ لکھاری ”مصور“ اداکار اور کھلاڑی سے متعلق تمام معلومات جمع کرنے لگتے ہیں میں بھی اس شوق میں مبتلا ہو گیا چنانچہ میں ضیاء شاہد صاحب کے پس منظر ان کے خاندان اور بچوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا ان دنوں مجھے معلوم ہوا ضیاء صاحب کے بڑے بیٹے کا نام عدنان ہے اور وہ میرا ہم عمر ہے ضیاء صاحب اپنے کالموں اور تحریروں میں اس کا ذکر کرتے رہے تھے میں نے 1992ء میں لاہور سے صحافت شروع کی میں اس شعبے کا ایک بالائے کارکن تھا چنانچہ میں ”روزنامہ سنون“ بن گیا اور مختلف اخباروں میں دھکے کھاتا ہوا روزنامہ خبریں تک جا پہنچا میں نے 1997ء میں محترم ظہیر ملک کی سفارش پر خبریں میں کالم لکھنا شروع کیا مجھے خوشنود علی خان نے خبریں سے وابستہ کیا تھا لیکن میرے تیسرے کالم کے بعد ضیاء صاحب کے ساتھ میرا تعلق قائم ہو گیا اور 1998ء کے آخر میں عدنان شاہد کے ساتھ میری ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ 1998ء ہی وہ سال تھا جب ایک چھوٹی سی غلط فہمی کی وجہ سے ضیاء شاہد صاحب نے مجھے ایک خط لکھا اور خبریں کے ساتھ میرا تعلق ختم ہو گیا میں روزنامہ جنگ سے منسلک ہو گیا ضیاء شاہد صاحب مجھ سے دور ہو گئے لیکن عدنان شاہد قریب آ گیا وہ مجھ سے مسلسل ملتا بھی رہا اور اس کے ساتھ میری ٹیلی فون پر گفتگو بھی جاری رہی لیکن میں نے اصل عدنان شاہد کو 2001ء میں ”ڈسکور“ کیا۔

2001ء میں پاکستانی صحافیوں کا ایک گروپ انٹرنیشنل وینیزیز پریگرام پر امریکہ گیا اس گروپ میں عدنان شاہد رحیم اللہ یوسفی، سلیم حسینی اور میں بھی شامل تھا ہم لوگ امریکہ میں 21 دن اکٹھے رہے ان 21 دنوں نے ہمارے درمیان بے تکلفی دوستی اور تعلق کا ایک ایسا رشتہ قائم کر دیا جو عدنان شاہد کے انتقال تک جاری رہا میں نے امریکہ میں ایک ایسا عدنان شاہد ڈسکور کیا جو نہ صرف زندگی کے رنگوں سے بھر پور تھا بلکہ وہ انسانیت

خدمت اور محبت سے بھی لبریز تھا۔ وہ اس وقت بھی خبریں کا ایلڈیٹر تھا اور ہم سب لوگ اخبارات میں معمولی کارکن تھے لیکن وہ ہمارے بیک بنک اٹھا لیتا تھا، اگر ہمیں کسی وجہ سے ہونٹل کے ایک کمرے میں انکھار بننا پڑ گیا تو عدنان شاہد دوسروں کو بیڈ پر سلاتا تھا اور خود فرش پر سوتا تھا۔ ہم لوگ اکٹھے کھانا کھاتے تھے، کھانا کھانے کی یہ روایت "امریکن سسٹم" کہلاتی ہے اس سسٹم میں دو یا دو سے زائد لوگ انکھا کھانا منگواتے ہیں اور آخر میں مل آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں، ہم لوگ امریکہ میں تھے لہذا ہم لوگ امریکن سسٹم کے تحت مل دیتے تھے لیکن کھانے کے آخر میں "شپ" ہمیشہ عدنان شاہد دیتا تھا۔ عدنان نے پورے امریکہ کی شپ اپنے ذمے لے لی تھی، بس کاڈرا نیور ہو یا کنڈیکٹر، ہونٹل کے دربان ہوں، وٹرز ہوں یا ہٹل یوانے ریسٹورانوں کی وٹریس ہوں یا پھر امریکی بھکاری، ان کی فرمے ہیٹ اور ہاتھ پر ہمیشہ عدنان شاہد شپ رکھتا تھا، وہ کہتا تھا "امریکہ 55 برس سے پاکستان کو شپ دے رہا ہے آج میں اس شپ کا بدلہ لے رہا ہوں" ہمارے ساتھ ہفت روزہ بحیرہ کے ایلڈیٹر فاروق عادل بھی تھے فاروق عادل نے ایک مرتبہ قلعی سے پانچ ڈالر لاندہ دے دیئے، وٹرس پیسے لے کر واپس آئی تو فاروق عادل نے وہ پانچ ڈالر اسے بخش دیئے اور ہماری طرف دیکھ کر بولا "لو آج سے میں بھی عدنان شاہد ہو گیا ہوں" اس دورے کے دوران ہم نے ایک دلچسپ "کوڈ" بھی تخلیق کیا، یہ "کوڈ" مصنف تھا، ہم لوگ مختلف لکھاریوں کی نقیسات پر گپ شپ کر رہے تھے، میں نے اسے بتایا بعض لکھاری مصنف کہلانے کے خط میں جتا ہوتے ہیں، یہ لوگ اپنے سفرناموں یا سوانح عمریوں میں کچھ اس طرح لکھتے ہیں "جب مصنف ٹوپہ ٹیک سنگھ میں داخل ہوا تو بارش شروع ہو چکی تھی، یہ لوگ اپنی تصویروں کے نیچے ہمیشہ مصنف صدر ایوب خان کے ساتھ یا مصنف ماسکوش شاہن کے مقبرے کے سامنے یا مصنف جنرل ضیاء الحق کو اس کی مجلس شوریٰ کی خامیاں بتاتے ہوئے قسم کے کشین لکھتے ہیں، اس نے توجہ لگایا، میں نے اسے بتایا، مجھے پچھلے دنوں کسی صاحب نے اپنا سفرنامہ بھجوا دیا تھا۔ اس سفرنامے میں مصنف کی بیشمار تصویریں چمچی تھیں، ایک تصویر میں انہوں نے پانچ برس کے ایک بچے کو گود میں اٹھا رکھا تھا اور اس تصویر کے نیچے لکھا تھا "مصنف آسٹریا کے سفر پر روانہ ہونے سے دو دن قبل اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ" عدنان شاہد نے ایک طویل قہقہہ لگایا اور اس کے بعد ہم جب بھی تصویر بھجوانے لگتے تو عدنان شاہد کہتا "دو مصنف ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی چھت پر کھڑے ہیں" اور ہم سب قہقہہ لگاتے، ایک روز ہم میکڈونلڈ سے نکلے تو اس نے پیٹ پر ہاتھ بھر کر کہا "میں یہاں تصویر کھینچنا چاہتا ہوں، میں یہ تصویر اپنی سوانح عمری میں شائع کروں گا اور اس کے نیچے یہ کشین لکھواؤں گا، مصنف دوش برگر کھانے کے بعد میکڈونلڈ کے سامنے ہشاش بشاش کھڑا ہے" اس کے بعد "مصنف" ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہمارا کوڈ ورڈ ہو گیا، میں جب بھی اسے فون کرتا، وہ نون اٹھا تا تو میں اس سے پوچھتا "مصنف کیا کر رہا ہے" اس کا جواب عموماً اس قسم کا ہوتا "مصنف اپنے بٹے کو قلعی کھلا رہا ہے یا مصنف اپنی بیوی کے سینڈل تبدیل کرانے لبرٹی جا رہا ہے یا مصنف اس وقت ریگیل سینما کے سامنے کھڑا ہے وغیرہ" اسی طرح وہ جب ہم اچھے فوراً کرتا تھا تو اس کا سلا فقرو کچھ لوں ہوتا تھا "کمالک مصنف دوسرے مصنف سے گفتگو کر سکتا ہے"



اور میں غفل بادشاہوں کی طرح جواب دیتا تھا "ہاں اجازت ہے" ایک ہمارا اس کا فون آیا "کیا مصنف ایک بھوکے کو کھانا کھلا سکتا ہے" مصنف نے فوراً حاکمی بھری، وہ شام اس نے میرے ساتھ گزاری، وہ ان دنوں "دی پوسٹ" شروع کر رہا تھا۔ وہ ضیاء شاہد صاحب سے ہٹ کر اپنی الگ پہچان بنانا چاہتا تھا، اس کی خواہش تھی وہ کوئی چھوٹا سا پراجیکٹ شروع کرے اور اپنی محنت سے اس بیج کو درخت بنائے۔ وہ ایک ایسا اخبار نکالنا چاہتا تھا جو صرف عدنان شاہد کا اخبار ہو وہ دی پوسٹ کو عدنان شاہد کا پراجیکٹ سمجھتا تھا، اس نے مجھ سے پوچھا "کیا مصنف انگریزی میں کالم لکھے گا" میں نے انکار میں سر ہلا کر جواب دیا "مصنف نے آج تک انگریزی میں خط نہیں لکھا" وہ مسکرا کر بولا "اگر ہم مصنف کا اردو کالم انگریزی میں ترجمہ کر لیں تو مصنف کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا" میں نے مسکرا کر جواب دیا "مصنف کو تو نہیں ہوگا لیکن مصنف کے اخبار کو ضرور ہوگا" میں جب "ایکسپریس" میں آیا تو "خبریں" میں ہمارے خلاف مضامین شائع ہونے لگے، اس نے مجھے فون کیا، میں نے اس سے پوچھا "تم لوگوں نے مصنف کے خلاف جہاد شروع کر دیا ہے"۔ اس نے قہقہہ لگایا اور ہنستے ہنستے بولا "لیکن میں مصنف کے ساتھ ہوں" اس نے مجھ سے اس تبدیلی کی وجہ پوچھی تو میں نے دیگر وجوہات کے علاوہ اسے بتایا "اگر خدا خواستہ تمہیں کچھ ہو جائے تو میں جنگ اخبار میں تمہارے لئے کالم نہیں لکھ سکتا تھا، میں اپنے دوستوں کے تعزیتی کالم لکھنے کیلئے ایکسپریس آیا ہوں" اس نے قہقہہ لگایا۔

مجھے 10 فروری 2007ء کو عدنان شاہد کے انتقال کی خبر ملی اور 12 فروری کو میں نے اس پر خصوصی ایڈیشن دیکھا، اس خصوصی ایڈیشن میں اس کی تصویریں چھپی تھیں۔ وہ ہر اس تصویر میں مسکرا رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں نے اس کی تصویروں سے کہا "عدنان تمہارے لیے مصنف ادا اس ہے، تم واپس آ جاؤ"۔ لیکن عدنان شاہد واپس نہیں آیا، وہ کبھی واپس نہیں آئے گا، زندگی کی ہر سڑک ہر راستے میں ایک یوٹرن ضرور ہوتا ہے لیکن موت ایک ایسا راستہ ہے جس پر کوئی یوٹرن نہیں اور بد قسمتی سے عدنان شاہد اس موڑ پر چڑھ گیا ہے، میں جب یہ کالم لکھ رہا تھا تو میں نے لکھتے لکھتے بے اختیار اس کے موبائل پر فون کر دیا، دوسری طرف سے آواز آئی "آپ کا مطلوبہ نمبر فی الحال بند ہے آپ تھوڑی دیر بعد کوشش کیجئے گا" میں نے سوچا یہ "تھوڑی دیر" کتنی ہوگی؟ معلوم ہوا یہ تھوڑی دیر سینکڑوں، ہزاروں سال پر محیط ہے کیونکہ دنیا میں چھڑنے والے لوگ صرف حشر کے دن ال سکتے ہیں اور حشر کو ابھی بہت دن باقی ہیں۔





## کیا ہم ڈاکٹر عبدالقدیر کیلئے اتنا نہیں کر سکتے

نوجوان کا سوال بہت دلچسپ تھا، اس کا کہنا تھا، ”ہم کیا کر سکتے ہیں“ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا، وہ بولا ”میں ایک طالب علم ہوں، میرے والد صاحب مڈل سکول کے استاد ہیں، میری چھ بہنیں اور ایک بیٹائی ہے، میں ٹیوشن پڑھاتا ہوں اور اس سے اپنی تعلیم کے اخراجات پورے کرتا ہوں، اگر میں آپ کی باتوں پر عمل شروع کر دوں تو میں یونیورسٹی سے فارغ ہو جاؤں، میں مارا جاؤں، غائب کر دیا جاؤں یا پھر جیل میں پھینک دیا جاؤں اور اس کے بعد میرا پورا خاندان در بدر ہو جائے، میری بہنیں گلیوں میں خوار ہو جائیں، ماں صدمے سے پاگل ہو جائے اور باپ کو ہارٹ اٹیک ہو جائے، ہم سب مارے جائیں، وہ رکا، اس نے خود سے میری طرف دیکھا اور جذبات سے جھپٹی آواز میں بولا ”ڈاکٹر عبدالقدیر ہمارے محسن ہیں، وہ ہمارے ہیرو بھی ہیں، اگر وہ نہ ہوتے، اگر وہ پاکستان نہ آتے، تو آج ہم یوں سینہ تان کر نہ کھڑے ہوتے، آپ کی بات درست ہے، ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، حکومت کو انہیں گرفتار نہیں کرنا چاہئے تھا، ان سے ٹیلی ویژن پر معافی نہیں منگوانا چاہئے تھی اور انہیں ہاؤس اریسٹ نہیں کرنا چاہئے تھا، یہ محسن کشی اور ظلم ہے، وہ رکا، اس نے دم لیا اور دوبارہ گویا ہوا، ”مجھے اپوزیشن کی باتوں میں بھی صداقت محسوس ہوتی ہے، میں نے آج اخبارات میں پڑھا، ڈاکٹر عبدالقدیر کو سلو پائزنگ دی جا رہی ہے، انہیں آہستہ آہستہ ہر دیا جا رہا ہے، تاکہ وہ چپ چاپ انتقال کر جائیں اور ان کے انتقال سے بے شمار لوگوں کو زندگی مل جائے، وہ لوگ جو نیوکلیئر پروگرام کی خرید و فروخت میں ملوث تھے، ان کے ناموں اور کارناموں پر پردہ پڑ جائے، کل ہماری یونیورسٹی میں کوئی صاحب بات کر رہے تھے، اگر ڈاکٹر عبدالقدیر زندہ رہتے ہیں تو انہیں امریکی حکومت لے جائے گی یا پھر انہیں دوسرے معاف گواہ بنا کر جہاز مرزا اسلام بیک سے لے کر جہازل جہانگیر کرامت اور جہازل کرامت سے جہازل ذوالفقار بیک بے شمار ریٹائرڈ فوجی افسروں کو عالمی عدالت میں ٹھیسٹ لیا جائے گا اور ڈاکٹر صاحب سے جھوٹے سچے بیان منسوب کر کے ہمارے جوہری پروگرام، ہمارے سیاستدانوں اور ہماری فوج کو بدنام کیا جائے گا، وہ صاحب بتا رہے تھے، ڈاکٹر عبدالقدیر کی زندگی بے شمار لوگوں کیلئے موت ثابت ہوگی لہذا ڈاکٹر صاحب اس وقت وسیع تر قومی مفاد کیلئے انتہائی خطرناک شخص ہیں، وہ بڑی تیزی سے نظریہ ضرورت کی زد

نہا، رسنہ تیں اور ملک وقوم کو ان کی قربانی کی اشد ضرورت ہے" وہ رکا، اس کی آنکھوں سے پانی کی ٹیکریں نکل رہی تھیں، اس نے آنکھوں پر نشو پیچ رکھا اور کھانس کر بولا "میں ڈاکٹر صاحب سے شدید محبت کرتا ہوں، میں پانچویں جماعت میں تھا جب میرے والد نے ڈاکٹر صاحب کی تصویر میرے کمرے میں لگائی تھی، میں اس وقت سے انہیں اپنا آئیڈیل مانتا آ رہا ہوں، میں پچھلے 18 برسوں سے ہر نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کرتا ہوں وہ مجھے ڈاکٹر صاحب کی طرح ملک وقوم کی خدمت کرنے کی توفیق دے وہ مجھے ڈاکٹر عبدالقدیر بنا دے" وہ رکا دم لیا اور زہریلے انداز سے بولا "میرے صرف میں نہیں اس ملک کا ہر نوجوان ڈاکٹر عبدالقدیر کو اپنا آئیڈیل سمجھتا اور مانتا ہے وہ ڈاکٹر عبدالقدیر بننا چاہتا ہے ہر ڈاکٹر صاحب کے انہام کا سوچ کر ہر نوجوان کا دل دھڑکتا بند ہو جاتا ہے اس کے جسم پر وحشت طاری ہو جاتا ہے لیکن سر ہم بے بس لوگ ہیں اور ہم مجبور لاچار اور بے بس لوگ دعا کے سوا کیا کر سکتے ہیں؟ ہم اگر سڑکوں پر آ گئے ہم لوگوں نے اگر آپ جیسے دانشوروں کی باتیں مان لیں تو ہم بے بسی کی موت مارے جائیں گے اور ہمارے خاندان کچھ جائیں گے" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور عرض کیا "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ایک اکیلی ابا بیل کچھ نہیں کر سکتی لیکن اگر دس ہزار ابا بیلیں اکٹھی ہو جائیں تو سب کسی ایک ہاتھی کو مار گٹ کر لیں اور ایک زاویے پر ایک ہی وقت میں ایک ایک ٹکڑی پھینک دیں تو کیا ہو گا؟" وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا "میں نے کہا" ہاتھی مر جائے گا یا پھپائی پر مجبور ہو جائے گا" وہ مسکرایا اور آگے جھک کر بولا "لیکن سر ہم ابا بیلیں نہیں ہیں ہم انسان ہیں اور انسان بھی ایسے جو غیر متعلق، غیر متفق اور اپنے اپنے مفاد کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں سر ہم لوگ ہاتھیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے" میں مسکرایا "لیکن ہم اس کے باوجود ڈاکٹر عبدالقدیر کے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں ہم اپنی عاجزی اپنے انکسار اپنی کمزوری اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اپنی محبت کو ایک نئی شکل دے سکتے ہیں ہم دنیا میں احتجاج کا ایک نیا طریقہ متعارف کر سکتے ہیں ہم پوری دنیا کی توجہ حاصل کر سکتے ہیں" وہ میری طرف دیکھتا رہا "میں نے عرض کیا" ہم میں سے ہر شخص ایک گلدستے کے ایک چھوٹا سا کارڈ خریدے اس کارڈ پر سرخ سیاہی سے "دی آر پواؤڈ آف یو ڈاکٹر صاحب" لکھیں یہ کارڈ گلدستے کے ساتھ لگائے چپ چاپ ڈاکٹر صاحب کے گھر کے سامنے ہائے اور یہ گلدستہ ان کے گیٹ پر چھوڑ کر آ جائے آپ ذرا سوچو اگر صرف دس لاکھ لوگ روزانہ ایک ایک گلدستہ ڈاکٹر صاحب کے گیٹ پر رکھ دیں تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ مجھے خیال ہے ڈاکٹر صاحب کے گھر جانے والی ساری سڑک بھر جائے گی پوری سڑک پر پھول ہی پھول گلدستے ہی گلدستے ہوں گے اور اس کے بعد کیا ہو گا؟ پوری دنیا کا بیڑا یا تو کھٹا احتجاج کو کر کے گا یوں پاکستان کے کمزور لوگوں کی محبت انٹرنیشنل میڈیا کی ہیڈ لائن بن جائے گی اور شاید یہ ہیڈ لائنیں ہماری محبت اور عقیدت کے یہ گلدستے ڈاکٹر صاحب کو صحت اور سلامتی دے دیں شاید ہماری یہ محبت ان کی آخری ساتھیوں کو شفا کروانے ان کے دل کا ملال دھل جائے وہ ہمارے ساتھ راضی ہو جائیں ان کی جان بچ جائے" میں ایک لمحے کے لئے رکا اور اس کے بعد عرض کیا "کیا ہم لوگ اپنے اس محسن کو ایک گلدستہ

نہیں دے سکتے جس نے ہمارے لئے اپنی جان داؤ پر لگا دی تھی، کیا ہم اپنے آئیڈیل اپنے ہیرو کے لئے ایک کارڈ  
'ایک گلہ سستے کی قربانی نہیں دے سکتے' اس ملک میں چار ہزار سیاسی جماعتیں ہیں اس ملک میں عمران خان اور  
قاضی حسین احمد ہیں اس ملک میں تحریک انصاف، جماعت اسلامی، مسلم لیگ ن اور پیپلز پارٹی ہے کیا ان  
جماعتوں ان رہنماؤں میں سے کوئی شخص اس گلہ سستے تحریک کی قیادت نہیں کر سکتا، کیا طالب علموں کی کوئی یونین، کیا  
کوئی تعلیمی ادارہ، کوئی یونیورسٹی یہ تحریک شروع نہیں کر سکتی؟ کیا ہم اپنے ہیرو کے لئے اتنا نہیں کر سکتے؟ "تو جوان  
اعضا اس نے میری میز پر پڑا گلہ سستا اٹھایا اور چپ چاپ باہر نکل گیا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com



## خود کش

شاہد خاندان کا پہلا فرد تھا جو کرکٹ کھیلنے کیلئے گراؤنڈ میں اترا یہ ایک نیم دہائی خاندان تھا ان کے والد ملک محمد اختر گوجر خان کے ایک پسماندہ گاؤں جلیاری معظم شاہ کے رہنے والے تھے وہ پڑھے لکھے تھے لہذا انہیں ریلوے میں جوئیئر افسر کی ملازمت مل گئی اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ راولپنڈی شفٹ ہو گئے ملک محمد اختر کو اللہ تعالیٰ نے چار بیٹے دیے لیکن بد قسمتی سے ان کے تین بیٹے بڑیوں کی ایک مہلک بیماری کا شکار نکلے اس بیماری کو طبی زبان میں "ہائپر ایکسٹینسو جوائنٹس" کہا جاتا ہے اس بیماری میں مریض کے جوڑ پھیل جاتے ہیں اور اس کے جسمانی اعضاء بے ڈھنگے ہو جاتے ہیں بڑے بیٹے شاہد کو اس بیماری کے باوجود سپورٹس کا شوق ہوا اور اس نے مورگاہ کے گراؤنڈ میں فٹ بال اور کرکٹ کھیلنا شروع کر دی وہ بہت اچھا کھلاڑی تھا اس نے اپنی ٹیم بھی بنالی لیکن وہ رہنمائی کی کمی کے باعث آگے نہ بڑھ سکا طاہر اختر خاندان کا دوسرا لڑکا تھا جس نے بڑے بھائی کی پیروی میں میدان میں قدم رکھا لیکن وہ بھی کھیل میں زیادہ دیر نہ جم سکا اس نے ملازمت اختیار کر لی تیسرا بھائی عبید اختر بھی کرکٹ کی طرف آیا لیکن وہ پڑھائی میں اچھا تھا چنانچہ اس نے کرکٹ کو پڑھائی پر قربان کر دیا بیچھے وہ گیا شعیب تو شعیب سب سے چھوٹا بھائی تھا۔

شعیب اختر کھلاڑی نہیں بن سکا تھا اس کے جسم میں چار بڑے نقص تھے اس کے پاؤں ہموار تھے ہموار پاؤں کے لوگوں کو انگریزی میں "فلٹ فٹ" کہا جاتا ہے یہ لوگ بھاگنے دوڑنے دیوار پر چڑھنے اور پھلانگنے کی صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں لہذا آج تک دنیا میں کوئی "فلٹ فٹ" شخص کھلاڑی نہیں بن سکا شعیب کا دوسرا نقص "ہائپر ایکسٹینسو جوائنٹس" تھے وہ اس بیماری کا انتہائی مریض تھا لہذا اس کے بازو اور اس کی ٹانگیں لٹک جاتی تھیں اس نے پانچ سال کی عمر میں چلنا شروع کیا تھا اس کا تیسرا نقص دم تھا اسے بچپن میں کالی کھانسی ہوئی اور یہ کھانسی اس کے پچیسھروں پر اثر چھوڑ گئی تھی اور اس کا چوتھا نقص اس کا مزاج تھا وہ اپنے رویوں میں نارمل نہیں تھا وہ انتہا پر جا کر سوچتا تھا لہذا اس کے والدین اس کے بہن بھائیوں اور اس کے دوست احباب اس کے مستقبل کے بارے میں زیادہ پراسید نہیں تھے وہ پڑھائی میں بھی اچھا نہیں تھا لیکن پھر ایک عجیب معجزہ ہوا اس بچے نے ایک دن

بیٹ پکڑ اور ساری ٹیم کو حیران کر دیا، وہ قدرتی طور پر کرکٹر نکلا، اس میں باؤلنگ، بیٹنگ اور فیلڈنگ تینوں خوبیاں موجود تھیں چنانچہ اس نے ایک برس میں ٹیم میں اپنا مقام پیدا کر لیا، وہ سب سے پہلے انک آئل کپنی آئی فریم کا حصہ بنا، وہاں سے وہ جی ایچ کیو کی ٹیم میں گیا اور وہاں سے وہ راولپنڈی ڈویژنل کرکٹ ایسوسی ایشن تک جا پہنچا، 1994-95ء میں کرکٹ کے لیجنڈ کھلاڑی ماجد خان نے اسے انھایا اور اسے قومی سطح تک متعارف کرا دیا۔ 1995-96ء میں نیوزی لینڈ کی ٹیم راولپنڈی آئی، شعیب اختر راولپنڈی کی طرف سے میدان میں اترے اور اس نے نیوزی لینڈ کے دس کھلاڑی آؤٹ کر دیئے، وہ گولی کی طرح تیز بال کراتا تھا، نیوزی لینڈ ٹیم کا ٹیجر جان رائٹ تھا، جان نے اس نوجوان کو دیکھا تو پیش گوئی کی ”یہ لڑکا بہت جلد پوری دنیا میں مشہور ہو جائے گا“ جان رائٹ کی اس پیش گوئی نے شعیب کے خلاف سازشوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا، یہاں سے شعیب اختر کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا سلسلہ یک وقت شروع ہوتا ہے۔

شعیب اختر کا کھلاڑی بننا اور پھر کرکٹ کی دنیا میں سب سے تیز بال پھینکنے کا اعزاز حاصل کرنا معجزہ تھا، یہ کھیلوں کی تاریخ کا پہلا کھلاڑی تھا جس کے پاؤں بھی، مموار تھے اور جو ”ہائپر ایکشن شو جوائنٹس“ کا مرینس بھی تھا لیکن اس معذوری کے باوجود اس نے پوری دنیا کو حیران کر دیا، یہ معجزہ کیسے ہوا؟ یہ بات بھی کسی معجزے سے کم نہیں تھی اس معجزے کی بنیاد اس کا رویہ تھا، شعیب اختر بنیادی طور پر انتخاب پسند شخص ہے، اس کے حراج میں خود کوئی کی حد تک اینڈ وچر پایا جاتا ہے، وہ چیلنج قبول کرتا ہے اور اس چیلنج کو بعد ازاں زندگی اور موت کا مسئلہ بنا لیتا ہے، اس نے آٹھ نو سال کی عمر میں موٹر سائیکل چلانا سیکھی اور راولپنڈی میں موٹر سائیکل کے کرعب شروع کر دیئے، وہ کئی بار اس کھیل میں مرتے مرتے بچا لیکن وہ باؤنڈ آیا ڈاکٹروں نے اسے بھاگنے سے منع کیا تھا لیکن اس نے قاسم بار بےش کا اعلان کر دیا، ڈاکٹروں نے اسے جوڑوں پر دباؤ ڈالنے سے روکا لیکن اس نے دنیا کی تیز ترین بال پھینکنے کا فیصلہ کر لیا، میڈیکل سائنس شعیب کی اس شدت کو حقاقت سمجھتی ہے لیکن وقت نے ثابت کیا اس کی یہی شدت پسندی اس کی کامیابی کی واحد وجہ بنی اس نے اپنی شدت پسندی کے ذریعے اپنی پیدائشی معذوری اور اپنی بیماری کو شکست دے دی اور وہ کھلاڑیوں کی صفیں چیرتا ہوا وہاں جا پہنچا جہاں عزت اور شہرت اس کے پاؤں میں پڑی تھی۔

مجھ سے شعیب اختر کا تعارف ہمارے ایک سینئر صحافی نے کرایا تھا، اس سینئر صحافی کو لوگ ”استاد بول“ کہتے ہیں استاد۔ بلا براہ ایک مذہبی شخصیت ہیں، ان کی تحریروں میں بھی ایمان اور اسلام کا تذکرہ ملتا ہے لیکن بد قسمتی سے ان کی ذاتی زندگی ان کی تحریروں سے بیکسر مختلف ہے، وہ بول اور فعل کے شدید بحران کا شکار ہیں، وہ جو بیس کھینے کے حامد ہیں اور حسد میں وہ بعض اوقات کفر تک چلے جاتے ہیں ہمارے ایک دوست نے استاد بول کے بارے میں یہ اتار چکی تھی کہ ”اس نے کہا تھا“ اگر استاد بول کے منہ سے انکو صل کی بوند آتی تو وہ کہے دلی ہوتے“ بہر حال شعیب اختر سے میرا تعارف استاد بول نے کرایا تھا، میں نے استاد کے کہنے پر شعیب کا کھیل دیکھنا شروع کیا اور میں اس کے عمر میں گرفتار ہوتا چلا گیا، شعیب کے دو بھائی میرے دوست ہیں جبکہ اس کی والدہ میں مجھے اپنی ماں کی



بھٹک نظر آتی ہے وہ محبت، شفقت اور رواداری کی چلتی پھرتی تصویر ہیں، میرا خیال ہے یہ شعیب کی ماں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے وہ ملی لحاظ سے ان فٹ ہونے کے باوجود دنیا کا سب سے کم عمر ترین باؤ لڑ بھی بنا اور اس نے میڈیکل سائنس اور سپورٹس کی دنیا کو بھی حیران کر دیا۔ شعیب اختر 1997ء میں قومی ٹیم میں منتخب ہوا، اس وقت کے ایک چرچہ کپتان اسے ٹیم میں نہیں لینا چاہتے تھے، اس کی وجہ شعیب کا رد یہ تھا، شعیب فاسلے پر رہنے والا اکٹر مزاج نوجوان تھا جبکہ کپتان پاکستانی مزاج کا شخص تھا وہ کھلاڑیوں سے جی حضوری اور تابعداری کا خواہاں تھا لہذا شعیب اختر اس کے کرائی ٹیم پر پورا نہیں اتارتا تھا لیکن ماجد خان اور سلیم اللہ کی مہربانی سے شعیب اختر کو سلیکٹ کر لیا گیا، اس نے ورلڈ اسٹریز کے خلاف میچ کھیلے اور اس میچ میں اس نے دو کھلاڑی آؤٹ کر دیے۔ یہاں سے شعیب کا انٹرنیشنل کیریئر شروع ہو گیا۔

شعیب اختر کا مزاج اور جسم دو بڑے مسائل کا شکار ہیں۔ شعیب مزاج کے لحاظ سے خود کش ہے، اس نے نیوزی لینڈ میں دس ہزار میٹر کی بلندی سے چھلانگ لگا دی تھی اور وہ نیا گرافال سے خیر ہوا ہوا نیچے آیا اور یہ حرکت کوئی ہارلے شخص نہیں کر سکتا، وہ ایڈوکیٹر کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا، یہ شدت بنیادی طور پر اس کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ اگر آپ اسے بھاگتے ہوئے اور بال پھینکتے ہوئے دیکھیں آپ کو اس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کی وحشت، غصہ اور تھراؤ دکھائی دے گا، اس وقت آپ کو اس کے انگ انگ میں ایک "انارلٹی" نظر آئے گی، یہ وہ انارلٹی ہے یہ وہ وحشت اور یہ وہ غصہ ہے جس کی وجہ سے وہ سوسل کی رفتار سے بال پھینکتا ہے، اگر شعیب میں یہ غصہ اور یہ شدت نہ ہوتی تو وہ کبھی اپنے ہموار پاؤں اور "ہائپر ایکسٹینسو جوائنٹس" کے ساتھ دنیا کا سب سے اول کھلاڑی نہ بن پاتا، وہ کبھی اس مقام تک نہ پہنچتا شعیب کو ہر میچ میں اپنے حوصلے، فیصلے اور جرأت کا تاوان ادا کرنا پڑتا ہے، ہر میچ میں اس کا جسم ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ ان فٹ ہو جاتا ہے۔ یہ "ان فٹ نس" اس کی شدت میں اضافہ کر دیتی ہے اور وہ اپنے قرب و جوار سے الجھنا شروع کر دیتا ہے اور یہ الجھن اس کے کیریئر کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ یہ رکاوٹ بھی دور کر لیتا تھا لیکن پھر استاد بوتل جیسے لوگ آڑے آ گئے، شعیب کی زندگی کی سب سے بڑی بد قسمتی استاد بوتل جیسے لوگ ہیں، ان لوگوں نے آج تک اسے اور اس کے مسئلوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، شعیب نے آج تک پاکستان کو بہت کچھ دیا لیکن ہم پاکستانیوں نے اسے انوس اور تکلیف کے سوا کچھ نہیں دیا۔

شعیب اختر ان حالات تک کیسے پہنچا اور کن کن لوگوں نے اس کے خلاف کیا کچھ کیا یہ میں آپ کو کل

بتاؤں گا۔





## ہم ایک بے وقوف قوم ہیں

شعیب اختر کے کیریئر میں تین چیزیں نمایاں ہیں، ایک اس کی جسمانی ساخت وہ قلیٹ لفظ اور ہاتھ ایکسپلینڈ جو آتش کا شکار ہے، دوسری اس کی عجزاتی کامیابیاں اور تیسری اس کے خلاف سازشیں، میں نے کل عرض کیا تھا شعیب نے اپنی شدت اور حوصلے سے اپنی جسمانی خامیوں پر قابو پا لیا اور وہ دونوں میں کرکٹ کی دنیا میں اس مقام پر جا پہنچا جس کی ہزاروں لاکھوں کرکٹرز زندگی بھر خواہش کرتے رہے ہیں۔ شعیب اختر نے اپنی ہمت سے نہ صرف اپنا وجود منوایا بلکہ وہ پاکستانی ٹیم کی کامیابی کا بنیادی عنصر بھی بن گیا اور دنیا بھر کے کرکٹرز زور ماہرین نے کہنا شروع کر دیا ”جس ٹیم میں شعیب اختر نہ ہو وہ ٹیم کچھ نہیں جیت سکتی“ پاکستانی عوام کی بھی راسخ رہی۔ عوام کی یہ رائے اور ماہرین کے خیالات پاکستان کرکٹ بورڈ کی قیادت کے دل میں شعیب اختر کے خلاف بغض پیدا کرتے رہے اور اس کے حامدین کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا، شعیب اختر پبلک ریلیٹنگ کا بندہ نہیں تھا وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا شخص تھا، وہ لوگوں سے فاصلے پر رہتا تھا لہذا وہ پاکستان کرکٹ بورڈ زیر نگرین کھلاڑیوں اور کرکٹ کے ماہرین سے پبلک ریلیٹنگ نہ کر سکا چنانچہ اس کے خلاف حسد اور نفرت کا لاوا جمع ہوتا چلا گیا یہ لاوا 15 اکتوبر 2006ء کو پھٹا اور پاکستان کرکٹ کی شہری روایات کو جڑوں سے ہلا گیا اور پاکستان اور پاکستان کے کھلاڑی پوری دنیا میں بدنام ہو گئے۔

15 اکتوبر 2006ء کا ایک طلوع نہیں ہوا یہ سازشوں کا ایک تسلسل ہے جو پچھلے دس برس سے شعیب کے خلاف جاری تھا، شعیب اختر اپنی ٹیم خاصوں کے باعث اکثر جسمانی ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہتا تھا وہ 1999ء سے 2006ء تک 8 مرتبہ شدید جسمانی عارضوں کا شکار ہوا، 1999ء میں اس کا پایاں کندھا زخمی ہو گیا، 2000ء میں اس کے گھٹنے کے پیچھے 4 انچ لمبا زخم آ گیا، اسی سال اس کی گیارہویں اور بارہویں ہڈی ٹوٹ گئی، 2001ء میں اس کے کندھے کا جوڑ ٹھٹھل گیا، 2002ء میں اسے شدید زخم آئے، 2005ء میں اس کا بازو فریکچر ہو گیا، 2006ء کے شروع میں اس کے ہاتھ کے مسلز پھٹ گئے اور 2006ء کے درمیان اس کی کمر کے نچلے حصے میں درد رہنے لگا اس کی ہر بیماری اس کے خلاف سازشوں اور افواہوں کا طوفان لے کر طلوع ہوتی تھی اور کرکٹ بورڈ کی قیادت اس کے خلاف میڈیا فرائل شروع کر دیتی تھی لیکن اللہ کے کرم سے وہ اس بحران سے بچا نکلا تھا، شعیب کے موجودہ بحران کا آغاز نومبر 2005ء میں ہوا تھا 12 نومبر 2005ء کو برطانیہ کی ٹیم پاکستان کے دورے پر آئی اور اس نے 21 دسمبر 2005ء تک پاکستان میں کچھ کھیلے شعیب اختر نے تین ٹیسٹ میچوں میں

17 دکنس حاصل کیں اور وہ پاکستان کی کامیابی کا باعث بنا اس سیریز کے دوران وہ زخمی ہو گیا، شعیب اختر کے کیریئر کا دوسرا بحران جنوری 2006ء میں شروع ہوا ان دنوں بھارت کے ساتھ پاکستان کا نیا نیا سفارتی روابط شروع ہوا تھا پاکستان نے بھارت کے ساتھ بس ٹرک اور ٹرین ڈپلومیسی کے ساتھ کرکٹ ڈپلومیسی کا بھی فیصلہ کیا تھا بھارت کی ٹیم پاکستان کے دورے پر آئی اور پاکستان نے بھارت کو خوش کرنے کیلئے قلیٹ پیچر بنا کیں، شعیب کو زخمی حالت میں کھیلنے پر مجبور کیا گیا، شعیب نے کوشش کی لیکن اس کوشش کے دوران اس کے زخموں میں اضافہ ہو گیا اور وہ مکمل طور پر ان فٹ ہو گیا اس کی انجری اس کے کھیلنے تک چلی گئی اور وہ پچلے تک سے معذور ہو گیا، اس دوران ایک بار پھر اس کے خلاف میڈیا فرائل شروع ہو گیا اور پاکستان کرکٹ بورڈ کے بعض سینئر لوگوں نے شعیب کے کیریئر کے خاتمے کی خبریں اڑانا شروع کر دیں۔ شعیب 28 فروری 2006ء کو گھٹنے کے علاج کیلئے آسٹریلیا چلا گیا آسٹریلیا کے سرجن ڈیوڈ بیک نے شعیب اختر کے گھٹنے کی آرتھو سکوپک سرجری کی، یہ سرجری کامیاب ہو گئی اور شعیب بڑی تیزی سے رو بہ صحت ہونے لگا، شعیب اختر جب ڈاکٹر ڈیوڈ بیک کے پاس زیر علاج تھا تو اس کی جلد صحت مندی کے لیے اسے "ہائی پریسی" دوائیں دی گئی تھیں، یہ دوائیں کیا تھیں، شعیب ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، اگست 2006ء میں پاکستان کی ٹیم برطانیہ کے دورے پر گئی، اس وقت پاکستان کے تینوں باؤلر شعیب اختر، محمد آصف اور رانا لوید آکسن ان فٹ تھے یہ تینوں کھلاڑی پاکستانی ٹیم کی بیک بون تھے۔ ان تینوں کی غیر موجودگی کے باعث پاکستان ٹیسٹ بیچ ہار گیا، یہ پاکستان کرکٹ بورڈ کے لیے انتہائی خطرناک صورتحال تھی، حکام کو محسوس ہوا اگر ان کے تینوں باؤلر جلد تندرست نہ ہوئے تو وہ 2006ء کے تمام بیچ بھی ہار جائیں گے اور 2007ء کا ورلڈ کپ بھی کھاتی میں پڑ جائے گا چنانچہ اعلیٰ حکام نے ڈاکٹروں کو حکم دیا "ان کھلاڑیوں کو ہر قیمت پر جلد سے جلد فٹ کیا جائے" اس حکم کے تحت ڈاکٹروں نے شعیب اختر اور محمد آصف کو طاقت کے ٹیکے لگانا شروع کر دیئے اور ان ٹیکوں کی "برکٹ" سے دونوں کھلاڑی جبر کے شروع میں اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے، محمد آصف نے اپنی ڈوچنگ کیشن کے سامنے اپنے بیان میں ان ٹیکوں کا ذکر بھی کیا تھا اس کا کہنا تھا اسے برطانیہ کے دورے کے دوران تین ٹیکے دیئے گئے تھے جبکہ شعیب اختر کو ایک خفیہ سرجری ڈریلے نے ایسا بیان دینے سے روک دیا۔

اکتوبر 2006ء میں پاکستان نے بیچ کھیلنے کیلئے بھارت جانا تھا پاکستان کرکٹ بورڈ کے ارباب بست و کشاد محمد آصف اور شعیب اختر کو لگائے جانے والے ٹیکوں سے واقف تھے لہذا 25 ستمبر سے 2 اکتوبر 2006ء تک تمام کھلاڑیوں کے خون کے نمونے لیے گئے اور یہ نمونے ڈوچنگ ٹیسٹ کے لیے ملائیشیا بھجوا دیے گئے۔ 12 اکتوبر 2006ء کو ٹیسٹوں کی رپورٹ آگئی اس رپورٹ میں محمد آصف اور شعیب اختر کے خون میں منومہ عنصر "سینڈ رولون" نکل آیا۔ اس وقت پاکستان کی ٹیم بھارت پہنچ چکی تھی، خون کی یہ رپورٹ خطرناک تھی، اگر ہم فرض کر لیں اس معاملے میں محمد آصف اور شعیب اختر قصور وار ہیں اور کرکٹ بورڈ ممنوع ادویات کے استعمال سے واقف نہیں تھا تو بھی حقل کا تقاضا تھا پاکستان کرکٹ بورڈ یہ رپورٹ تصدیق کے لیے روک لیتا اور محمد آصف اور شعیب اختر کو کسی بہانے والیں پاکستان بلا لیتا اس سے پاکستان اور پاکستان کرکٹ بورڈ کی عزت بھی بچ جاتی اور ہمارے قومی ہیرو ڈاکٹر سیریز بھی محفوظ رہتا لیکن بورڈ نے خاموشی کے بجائے اس خبر کو عالمی شکل دے دی، دونوں



کھلاڑیوں کو معطل کیا اور انہیں بے عزت کر کے پاکستان واپس بلا لیا، حکومت نے اس کے بعد انٹلی ڈیوٹنگ کمیشن بنایا، شاہد حامد، انتخاب عالم اور ڈاکٹر وقار احمد کو اس کا ممبر بنایا، کمیشن نے 27، 28 اکتوبر اور یکم نومبر کو ”ملتان“ کے میانات سے اور ان دونوں کھلاڑیوں کے خلاف فیصلہ دے دیا، شعیب اختر پر دو سال اور محمد آصف پر ایک سال کے لیے انٹرنیشنل کرکٹ کھیلنے پر پابندی لگا دی گئی جس کے بعد پورے ملک اور پوری دنیا میں ”کرکٹ لیورز“ کے دل ٹوٹ گئے۔ ہم اب آتے ہیں اس فیصلے کے پس منظر کی طرف، جب کمیشن کی کارروائی چل رہی تھی تو شعیب کو باقاعدہ ٹریپ کیا گیا، اس سے کہا گیا وہ یہ بیان دے کہ وہ ٹیکسوں کی دوائیں استعمال کرتا رہا تھا اسے کہا گیا دنیا میں یونانی ادویات کی پڑتال کا کوئی نظام موجود نہیں لہذا اسے شک کی بنیاد پر معاف کر دیا جائے گا، شعیب اس ٹریپ میں آ گیا اور اس نے یونانی ادویات کے استعمال کا اعتراف کر لیا، اس کے بعد اسے گرین سٹنل دے دیا گیا اور اس نے باقاعدہ پریکٹس بھی شروع کر دی لیکن بعد ازاں اس کے خلاف فیصلہ دے دیا گیا، اس فیصلے کے بارے میں میں نے قسم کی افواہیں پائی جاتی ہیں، پہلی افواہ کے مطابق جن دنوں کمیشن کی کارروائی چل رہی تھی ان دنوں باجوڑ کا واقعہ پیش آیا، اس واقعے میں باجوڑ کے 83 طالب علم جاں بحق ہو گئے، حکومت نے اس واقعے کی ذمہ داری قبول کر لی جس کے نتیجے میں حکومت کے خلاف عوامی احتجاج شروع ہو گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے حکومت کو باجوڑ کے واقعے سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے کسی بڑے ایٹمی ضرورت تھی لہذا اس وقت محمد آصف اور شعیب اختر کی قربانی دینے کا فیصلہ ہوا، ان دنوں کی خبر شائع ہوئی اور لوگوں کی توجہ باجوڑ سے ہٹ گئی، دوسری افواہ پاکستان کرکٹ بورڈ کے نئے چیئرمین ڈاکٹر نسیم اشرف تھے، ڈاکٹر نسیم اشرف 8 اکتوبر 2006ء کو بورڈ کے چیئر مین بنے تھے اور انہیں عالمی سٹیڈیا میں جگہ پانے اور بڑے بڑے انٹرویوز دینے کے لیے کسی ایٹمی ضرورت تھی لہذا شعیب اختر اور محمد آصف کو ڈاکٹر صاحب کی ”انٹری“ بنادیا گیا، انٹلی ڈیوٹنگ کمیشن کا فیصلہ آیا اور ڈاکٹر نسیم اشرف پوری دنیا میں مشہور ہو گئے، تیسری افواہ جو اب ہے ”کرکٹ کے بعض جفاکوری ماہرین کا کہنا ہے اس معاملے میں جوئے کے عنصر کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، مارچ 2007ء میں ورلڈ کپ شروع ہو رہا ہے اور دیا جاتی ہے ہماری ٹیم سردست ان دنوں کھلاڑیوں کے بغیر ورلڈ کپ نہیں جیت سکتی لہذا دونوں کھلاڑیوں پر جوا شروع ہو گیا اور اس جوئے کے نتیجے میں دونوں کھلاڑی سیاست کی وکٹ پر آؤٹ ہو گئے، سرے دست یہ تینوں افواہیں محض سرگوشیاں اور فحشائیاں ہیں اور ان میں کون سی بات درست ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے یا اس سازش کے جولا ہے لیکن ایک بات سچ ہے وہ شعیب اختر جس نے ان تھک محنت اور اپنے اہل ارادے سے اپنی معذوری کو ٹھکست دے دی تھی، وہ شعیب اختر اور اس کا ٹیلنٹ سازش کے ہاتھوں کلین بولڈ ہو گیا۔

میں جب بھی شعیب اختر کی تصویر دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے ہم ایک بے وفا اور احسان فراموش قوم بننے جا رہے ہیں، ہمارے پاس ڈاکٹر عبدالقدیر ہوں یا پھر شعیب اختر ہم اپنے ہر ہیر کو بے وقور اور رسوا کر دیتے ہیں، ہم اپنے ملک میں پیدا ہونے والے ہر قد آور شخص کے پاؤں کاٹ دیتے ہیں، ہم اپنے ہر محسن کو حسد اور ان کی صلیب پر چڑھا دیتے ہیں۔





## شاید کوئی نہیں

یہ دو انتہائیں ہیں ایک انتہا پر دیر لوتر کی سیکینہ کٹری ہے اور دوسری انتہا پر ہمارے محبوب وزیر اعظم جناب شوکت عزیز مسکرا رہے ہیں اور ہم سب لوگ ان دو انتہاؤں کے درمیان کٹ رہے ہیں اور کبھی سیکینہ کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی جناب شوکت عزیز کی زیارت کرتے ہیں اور پھر سوچتے ہیں ہم سیکینہ ہیں یا پھر شوکت عزیز کے خوشحال اور ترقی یافتہ پاکستان کے باشندے!

سیکینہ لوئر دیر کے ایک دفعی اور کٹے پھٹے گاؤں "انچ" کی باسی ہے۔ اس کے سات بچے ہیں سیکینہ کا خاوند محنت مزدوری کرتا ہے اگر اسے مزدوری مل جائے تو گھر کے آدمی افراد کی روزی کا بندوبست ہو جاتا ہے بصورت دیگر سب لوگ مل کر "روزہ" رکھ لیتے ہیں آج سے دو سال پہلے سیکینہ کے بیٹے عمر کو برکان ہوا اس کا پورا جسم پیلا پڑ گیا سیکینہ نے شروع میں ویسی ٹوکوں کا سہارا لیا لیکن عمر کو قاتل نہ ہوا سیکینہ اسے دیر لے لگی وہاں جا کر پتہ چلا عمر کو "پہاٹنش سی" ہے اور اگر وہ بیٹے کی زندگی چاہتی ہے تو اسے پچاس ساٹھ ہزار روپے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ سیکینہ کے پلو میں صرف دو سو روپے بندھے تھے اس نے پلو کھولا یہ دو سو روپے ڈاکٹر کے سامنے رکھے اور بیٹے کو لے کر چپ چاپ واپس آ گئی گھر پہنچی تو پتہ چلا اس کی تیرہ سالہ بیٹی روزینہ کا چہرہ بھی پیلا ہو چکا ہے وہ دوسرے دن روزینہ کو بھی شہر لے گئی ڈاکٹر نے بتایا روزینہ بھی عمر کی طرح پہاٹنش کی مریض ہے وہ اسے بھی لے کر واپس آ گئی دوسرے ہفتے عابدہ کا چہرہ پیلا ہوا تیسرے ہفتے رابعہ کی آنکھیں چڑھنا شروع ہوئیں اور اس سے اگلے مہینے سلمان کو بھی پہاٹنش ہی ہو گیا اب سیکینہ کے گھر میں تین چار پائیاں اور پانچ مریض تھے اس نے ایک ایک چار پائی پر دو دوسری مریض لٹائے اور خود ان کے سر ہانے بیٹھ کر روتی رہتی لیکن اگر رونے سے مسائل حل ہوتے تو دنیا میں کوئی شخص دکھی نہ رہتا سیکینہ کے مسائل بھی بڑھتے چلے گئے پورے گاؤں نے اس کی تھوڑی تھوڑی مدد کرنا شروع کر دی لوگ اپنا پیٹ کاٹ کر اسے ادھار دینے لگے سیکینہ نے جیسے تیسے کر کے اپنے بچوں کو پچاس ہزار روپے کی دوائیں لا دیں لیکن مریض چار پائیاں سے نہ اٹھ سکے اسی دوران کسی نے بتایا اگر وہ ایک لاکھ روپے کا بندوبست کر لے تو اس کے بچوں کا علاج ہو سکتا ہے سیکینہ کو حوصلہ ہوا لیکن اس نے زندگی میں کبھی اتنی بڑی رقم نہیں

دیکھی تھی وہ سوچنے لگی اس کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئے گی؟ اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا، کہا جاتا ہے جب انسان کسی مشکل میں پھنستا ہے تو وہ اپنی قیمتی چیزیں بیچنے لگتا ہے سیکرن کے مسئلے کا بھی یہی حل تھا، سیکرن نے آگے پیچھے دیکھا اس کے گھر میں صرف ایک ہی قیمتی چیز تھی اور یہ قیمتی چیز اس کی سولہ برس کی جوان بیٹی روبینہ تھی، سیکرن نے روبینہ کو بیچنے کا فیصلہ کر لیا، اس نے جوہری بلوائے جوہریوں نے لڑکی دیکھی اور اس کی ایک لاکھ روپے قیمت لگا دی، سیکرن نے بیعانے لے لیا لیکن اس شام روبینہ کا چہرہ بھی پیلا ہو گیا، جب جوہریوں کو پتہ چلا روبینہ بھی پھانسی کی مرلیض ہے تو وہ آئے اور بیعانے لے کر واپس چلے گئے، اس دن سے سیکرن اس ملک کے حکمرانوں سے ایک درخواست کر رہی ہے وہ ان سے کہہ رہی ہے "آپ لوگ صرف روبینہ کا علاج کرا دیں میں اسے بچ کر باقی بچوں کا علاج کرا لوں گی۔" یہ ایک انتہا ہے۔

دوسری انتہا ہمارے وزیراعظم جناب شوکت عزیز ہیں، حکومت نے 5 جون 2006ء کو قومی اسمبلی میں بجٹ کی جو دستاویزات دی تھیں ان دستاویزات سے انکشاف ہوا، حکومت نے 2005-06ء کے دوران قومی اسمبلی کے 342 ارکان اور ایک سو سینٹروں کو تنخواہوں اور الاؤنسز کی مد میں 662 ملین روپے ادا کئے تھے جبکہ وزیراعظم جناب شوکت عزیز نے ایک سال میں غیر ملکی دوروں پر 750 ملین روپے خرچ کئے، اگر ہم اس رقم کو کروڑوں میں دیکھیں تو یہ 75 کروڑ روپے بنتے ہیں، حکومتی دستاویزات کے مطابق 2005-06ء میں قومی اسمبلی کے سپیکر، ڈپٹی سپیکر، چیئرمین سینٹ، دونوں ایوانوں کی سینیڈز، جج کیٹھیوں کے چیئرمینوں، پارلیمانی سیکرٹریوں، وفاقی وزراء، وزراء مملکت اور تمام ارکان اسمبلی اور سینٹروں پر ایک ارب روپے خرچ ہوئے جبکہ وزیراعظم نے صرف بی بی ہاں صرف غیر ملکی دوروں پر 75 کروڑ روپے خرچ کر دیئے، اگر ہم وزیراعظم کے دوروں میں صدر جنرل پرویز مشرف کے دورے بھی شامل کر لیں تو سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ان دوروں پر ایک ارب روپے خرچ ہوئے تھے گو یا پوری پارلیمنٹ اور کابینہ کے اخراجات ایک طرف اور وزیراعظم اور صدر کے غیر ملکی دورے دوسری طرف۔

ہم ان دوروں کے خلاف نہیں ہیں، یہ دورے غیر ملکی اور خارجہ تعلقات کے لئے ضروری ہوتے ہیں، ان دوروں کے دوران تو ہم Give اور Take کرتے ہیں اور ان دوروں کے دوران سربراہان اپنے عالمی مسائل حل کرتے ہیں لیکن بد قسمتی سے ایک ارب کے ان دوروں سے پاکستان کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا، وزیراعظم کے شاہانہ دوروں کے باوجود امریکہ اور پاکستان کا باہمی فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے، افغانستان اور بھارت اپنے جوتے ہمارے سر پر رکھ رہے ہیں، ایران کی نظر میں پاکستان اور امریکہ دونوں ایک ہیں، یورپ ہمیں دہشت گرد اور بنیاد پرست سمجھتا ہے، سعودی عرب نے ہمارے لئے عمرے کی شرائط سخت کر دی ہیں، اے ایل ایسٹ میں پاکستانیوں کو مزدوری نہیں مل رہی، تیل پیدا کرنے والے تمام ممالک ہمیں پوری دنیا سے مہنگا پٹرول دے رہے ہیں اور ہمارے وزراء تک جوتے اتار کر امریکہ میں داخل ہوتے ہیں لہذا اس صورتحال میں ہمارے غیر ملکی دورے سیاحت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود ہمارے وزیراعظم دورے پر دورہ فرماتے جا رہے ہیں اور ان کے ہر

دورے میں کم از کم دو اڑھائی سو لوگ ہوتے ہیں، یہ انتہا ہے اور لوگ اس انتہا کو دیکھ کر یہ سوچتے پر مجبور ہیں اگر ہمارے محبوب وزیر اعظم صرف ایک دورہ منسوخ کر دیں اور اس دورے کے پیسے سیکرٹری جیسے لوگوں کو دے دیں تو کتنی سکیناؤں کی بیٹیاں بکنے سے بچ جائیں، کتنی روپیہ ناؤں کی عزت، ناموس اور ایمان بچ جائے اور چھپا پائش اور کینسر کے شکار کتے مرلیٹوں کو زندگی مل جائے لیکن شاید اس فیصلے کے لئے دل میں درد اور سینے میں ضمیر ہونا ضروری ہے اور یہ وہ قیمتی اثاثے ہیں جن سے ہماری حکومتیں اور ہمارے حکمران محروم ہیں، یہ لوگ ایسی مشینیں ہیں جن کے سینے میں دل ہوتا ہے اور نہ ہی درد، جنہوں نے اپنے اپنے ضمیر کا بائی پاس کر رکھا ہے اور جنہیں سکیناؤں اور روپیہ ناؤں کی تکلیف سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ مجھے ان لوگوں سے کوئی توقع نہیں لہذا میں سیکرٹری اور روپیہ ناؤں کا کیس عوام کی عدالت میں رکھتا ہوں اور عوام سے درخواست کرتا ہوں کیا اس ملک میں کوئی ایک ایسا شخص موجود ہے جو چھپا پائش کے شکار پانچ بچوں کا علاج کرا سکے، جو اللہ کے لئے چل کر ان بچوں کے گھر جا سکے، جو اللہ کی رضا کیلئے 18 سال کی ایک بچی کو بکنے سے بچا سکے، کوئی ہے..... میرا خیال ہے کوئی نہیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com



## خدا کیلئے کچھ کریں

ہم نے بلیر ایریا سے تلاش شروع کی۔ ایوان صدر سے پیمس (پی آئی ایم ایس) تک ادویات کی حیرہ دکانیں ہیں۔ ہم جس دکان پر گئے ہمیں انکار ہوا ہم وہاں سے پرمارکیٹ آگئے یہاں دواؤں کے چار بڑے سٹور ہیں وہاں سے بھی ہمیں نفی میں جواب ملا۔ ہم راولپنڈی مری روڈ پر آ گئے۔ ایک سرے سے کوشش شروع کی اور دوسرے سرے تک پہنچ گئے لیکن کسی کیسٹ میڈیکل سٹور کے کسی ملازم اور کسی دکان کے کسی کپڑا کرنے ہمیں مثبت جواب نہ دیا۔ شیخ صاحب کی طبیعت خراب ہو رہی تھی ان کی کپٹیاں سو جھبکی تھیں سانس چڑھ گیا تھا اور ان کے ہاتھ کا پینے لگے تھے۔ میں انہیں لے کر واپس آ گیا انہیں مگر چھوڑا اور ایک بار پھر تلاش میں نکل کھڑا ہوا اس بار میں نے دوسرے اور چھوٹے سٹوروں کا رخ کیا میں عام گلی خلوں میں گھس گیا یہ ترکیب کامیاب رہی اور مجھے وارث خان کے ایک چھوٹے سے سٹور سے دس گولیوں کا ایک پتلہ مل گیا۔ میں گھر واپس آیا تو شیخ صاحب باہر گلی میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے خوش دیکھ کر ان کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔

شیخ صاحب ہمارے بزرگ ہیں وسطی پنجاب کے رہنے والے ہیں کبھی کبھار سال چھ مہینے میں ایک آدھ دن کیلئے میرے پاس اسلام آباد آ جاتے ہیں۔ ڈیپریشن کے مریض ہیں۔ رات رات بھر جاگتے رہتے ہیں۔ وہ کھانے کے بغیر رہ سکتے ہیں لیکن سکون آور گولیوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے۔ وہ چند روز پہلے میرے پاس آئے تو ان کی گولیاں ختم ہو گئیں۔ ہم دونوں گولیوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ہم دو گھنٹے بھرتے رہے اسلام آباد کے زیادہ تر سٹور کھنگال لئے راولپنڈی بھر کر دیکھ لیا لیکن شیخ صاحب کی گولیاں نہیں ملیں۔ میرا خیال تھا شاید ہو گئی ہونے کے باعث دکاندار یہ گولیاں نہیں رکھتے ہوں گے لیکن جب ملیں تو معلوم ہوا دس گولیوں کی قیمت صرف نو روپے تھی مجھے حیرت ہوئی دوسرے دن میں نے اپنے ایک دوست سے تذکرہ کیا تو اس نے بتایا صرف ڈیپریشن نہیں پاکستان میں ٹینشن، اعصابی دردوں، بلڈ پریشر اور امراض قلب کی دوائیں تک ٹائیڈ ہو چکی ہیں۔ یہ میرے لئے انکشاف تھا میں نے اپنے دوست سے پوچھا "کیا یہ دوائیں ذخیرہ ہو جاتی ہیں" اس نے مسکرا کر جواب دیا "نہیں تم غلط سوچ رہے ہو یہ دوائیں کم نہیں ہوئیں ذخیرہ اندوزی والا معاملہ بھی نہیں سپلائی میں بھی کوئی تعطل نہیں آیا ملک میں دراصل ڈیپریشن، افسردگی اور بالٹو لیا کے مریض بڑھ چکے ہیں ان کی تعداد میں چار گنا

اضافہ ہو چکا ہے اور ہر آنے والے دن ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ میں نے انکار میں سر ہلا دیا لیکن میرے دوست نے کہا ”ابھی چند سال پہلے کی بات ہے ملک میں وقتی امراض کے ماہر نہ ہونے کے برابر تھے۔ پاگل خانوں تک میں عام میڈیکل پریکٹیشنر سے کام چلایا جاتا تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف سرکاری ہسپتالوں میں نفسیاتی امراض کے شعبے کھل گئے بلکہ جگہ جگہ ماہر نفسیات، ماہر وقتی امراض، سائیکا لو جسٹ اور سائیکا ٹرسٹ کے پورے دکھائی دینے لگے اور اب یہ عالم ہے تمام بڑے سرکاری ہسپتالوں میں ایسے سینکڑوں لوگ آتے ہیں جو کسی نہ کسی دماغی عارضے کا شکار ہیں جبکہ بڑے سائیکا ٹرسٹ، سائیکا لو جسٹوں اور نیورالوجسٹوں سے دس دس پندرہ پندرہ دن پہلے سے وقت لیتا پڑتا ہے۔ یہ ہے ایک صورتحال! اس کے علاوہ بھی ایک صورتحال ہے جو بہت الارمنگ ہے۔ میں خاموشی سے منتظر ہاؤ وہ بولا ”یہ تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی شدید عارضے کے باعث ڈاکٹر کے پاس پہنچ جاتے ہیں جبکہ ملک میں ایسے مریضوں کی تعداد بھی کسی طرح دس بارہ کروڑ سے کم نہیں جو دماغی امراض کی ابتدائی سطح پر ہیں۔ آپ کسی سڑک پر کھڑے ہو جائیں اور اپنے ارد گرد نظر دوڑائیں آپ کو ہر گزرتے چہرے پر ایک وحشت نظر آئے گی۔ آپ دیکھیں گے لوگ خود اپنے آپ سے باتیں کرتے جا رہے ہیں، سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں غلطیاں ہیں، ذرا بخیر اشارے پر رک کر چلتا بھول گیا، موٹر سائیکل سوار اشارہ تو ڈک کر کھل گیا، مسابہ مسابے کی چھت پر پتھر مار رہے، گاؤں کا گندار سے الجھ رہا ہے، دوکاندار میز مین سے لڑ رہا ہے، افسر ماتحت کو ڈانٹ رہا ہے، ماتحت افسر کو گالیاں دے رہا ہے، سنی ٹانگی لگانے سے دوسو حامدین پیدا ہو جاتے ہیں، امتحان میں فہم کم آنے پر طالب علم زہری رہے ہیں، مرضی کی شادی نہ ہونے پر نو جوان دریا میں کود رہے ہیں، بچوں کی معمولی لڑائی پر پورے کا پورا محلہ پلاسی کا میدان بن جاتا ہے، اذانیں دینے، استسجائے استعمال کرنے اور نعیش پڑھنے پر مسجدوں میں لڑائیاں ہورہی ہیں، رکشہ گزرنے، جہاز اڑنے، ٹرین آنے یا ریلوئی دی کی ڈرامی ادھمی آواز سے ہزاروں لوگوں کے اعصاب جھنجھلا جاتے ہیں اور جب بھی کوئی بات کرتا ہے تو اس کی زبان پر شکوے اور شکایت کے سوا کوئی لفظ کوئی حرف نہیں ہوتا اور سوسائٹی سے شکر، مہربانی اور فضل جیسے لفظ اڑ چکے ہیں۔“

وہ خاموش ہو گیا، میرا دوست بولا ”تم مہربانی کر کے حکومت سے کہو لوگ مایوس ہو چکے ہیں خدا کیلئے کہیں سے ان لوگوں کیلئے امید کا کوئی چراغ لائیں، کوئی ایک آدھا ایسا سوچ کاشت کریں جس کی روشنی چند لمحوں کیلئے ہی سہی ان لوگوں کے ذہنوں میں نور بھردے، کہیں سے ہوا کا کوئی جھونکا ادھار لے آئیں، کچھ تو کریں ان لوگوں کیلئے کچھ تو کریں ایسا نہ ہو آپ ایک جیتے جاگتے ملک کے حکمران کی بجائے پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ بن کر رہ جائیں اور آپ کو انسانوں کی جگہ مریضوں پر حکومت کرنا پڑ جائے، ان سے کہو کچھ کریں، خدا کیلئے کچھ کریں۔“





## پستول کی عدالت

ڈاکٹر طارق مسعود اور اپنڈی میڈیکل کالج میں سینئر لیچرار تھے انہوں نے گلشن آباد ہائوسنگ سوسائٹی میں گھر خریدا مکان کے بیس منٹ میں پانی جمع ہو جاتا تھا ڈاکٹر صاحب نے سوسائٹی کی انتظامیہ سے تدارک کی درخواست کی انتظامیہ سستی کا مظاہرہ کرنے لگی اسی دوران میڈیکل کالج سے ان کا تبادلہ ہو گیا وہ تبادلے کی وجہ سے پریشان تھے وہ 23 دسمبر کی صبح اٹھے تو بیس منٹ پانی سے بھر چکا تھا ڈاکٹر صاحب طیش میں آ گئے انہوں نے پستول لیا اور سوسائٹی کے دفتر چلے گئے دفتر میں سوسائٹی کے سیکرٹری طارق محمود اطہر اور ممبر تنویر عالم بیٹھے تھے ڈاکٹر صاحب کی ان دونوں کے ساتھ تو تھکار ہو گئی ڈاکٹر صاحب نے پستول نکالا اور فائر کھول دیا طارق محمود اطہر موقع پر جاں بحق اور تنویر عالم شدید زخمی ہو گئے ڈاکٹر صاحب نے اس کے بعد پستول اپنی کینٹی پر رکھا اور گولی چلا دی چوتھا دھماکا ہوا اور ڈاکٹر صاحب بھی وہیں ڈبیر ہو گئے آدھ گھنٹے میں سوسائٹی کے دفتر میں دو خنیش اور ایک زخمی پڑا تھا اگر دیکھا جائے تو بیس منٹ میں پانی بھرنا یا تبادلہ ہو جاتا اتنا حکمین مسئلہ نہیں جس سے مجبور ہو کر ایک استاد ڈاکٹر دوزندہ انسانوں پر گولیاں برسا دے اور آخر میں خودکشی کرنے دنیا کے نوے فیصد میں منٹس میں ہم آتی ہے اور دنیا کے تمام سرکاری ملازمین کے تبادلے ہوتے ہیں لیکن کرہ ارض کے کسی کو نے میں کوئی شخص خودکشی کرتا ہے اور نہ ہی دوسرے کو گولی مارتا ہے لہذا پھر سوال پیدا ہوتا ہے وہ کون سے عوامل تھے جن کے باعث ایک سینئر میڈیکل آفیسر انتہائی اقدام پر مجبور ہو گیا یہ آج کا بنیادی سوال ہے آپ ذرا دائیں بائیں اور آگے پیچھے جھانک کر دیکھیں آپ کو محسوس ہوگا ہمارے زیادہ تر لوگ ڈاکٹر طارق مسعود کی کیفیت سے گزر رہے ہیں ہم لوگوں میں برداشت اور تحمل ختم ہو چکا ہے لوگ اب نہایت معمولی اختلاف پر پستول نکال لیتے ہیں آپ اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑا کر دیکھ لیں آپ کو پاکستان کا ہر شخص دوسرے سے الجھتا ہوا نظر آئے گا آپ کو ہر شخص کے چہرے پر ناراضی نفرت اور شکوے کے تاثرات ملیں گے آپ کو کوئی مسکراتا ہوا شخص نظر نہیں آئے گا بچہ بچے کے ساتھ دست و گریبان ہوگا بیٹا باپ سے الجھ رہا ہوگا بیوی خاوند اور خاوند بیوی سے تو تھکار کر رہا ہوگا ذرا تھکر کنڈیکٹر کو گالی دے رہا ہوگا اور کنڈیکٹر مسافروں کے ساتھ بدتمیزی کر رہا ہوگا گا بک دکاندار کو گھوڑا ہوگا اور دکاندار گا بک کو نفرت



سے دیکھ رہا ہوگا، طالب علم کا سینہ استاد کے خلاف اٹل رہا ہوگا اور استاد شاگردوں کے خلاف سازش کر رہا ہوگا۔ آپ غور کیجئے ان تمام لوگوں کا اختلاف محض اختلاف نہیں یہ دشمنی ہے اس معاشرے کا ہر شخص دوسرے شخص کی جان لینا چاہتا ہے۔ پاکستان کا شمار دنیا کے ان پانچ ممالک میں ہوتا ہے جن میں جرائم کی شرح انتہا کو چھو رہی ہے آپ کسی دن اخبار اٹھا کر دیکھ لیں آپ کو اس میں آبروریزی، ڈاکے اور قتل کی پانچ چار ہزار خبریں ملیں گی دنیا میں اس وقت قتل کے سب سے زیادہ مجرم پاکستان میں ہیں ہماری جیلوں میں اس وقت 55 ہزار قاتل بند ہیں جبکہ اس سے کہیں زیادہ تعداد باہر پھری رہی ہے ہم میں سے ہر شخص روزانہ کسی کو قتل کرنے کی دھمکی دیتا ہے یا پھر خودکشی کا ارادہ کرتا ہے ہم لوگ گیس، بجلی اور ٹیلی فون کا کنکشن تک حاصل کرنے کے لئے خود دوسری یا خود کش حملے کی دھمکی دے دیتے ہیں ہمارے لوگ تیل کی بوتل سے لے کر عدالت اور پارلیمنٹ ہاؤس پہنچ جاتے ہیں لوگ جس منٹ میں پانی بھر جانے یا کھڑکی پر گیند لگنے کے ”جرم“ میں پانچ پانچ لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں اور ہمارے ملک میں لوگ ماچس نہ ملنے یا امتحان میں نمبر کم آنے پر خودکشی کر لیتے ہیں آپ غور کریں تو اس وقت اس معاشرے میں غصے، شرم، توبہ پھوڑا، نفرت، شکوے اور اختلاف کے سوا کچھ نہیں بچا اس وقت دنیا میں پاکستان کے سوا شاید ہی کوئی دوسرا ملک ہو جس میں موت کی اتنی خواہش، ذکر یا کوشش کی جاتی ہو ایک اعزاز سے کے مطابق ہمارے ملک میں ہر شخص روزانہ دس مرتبہ موت کا ذکر کرتا ہے اور اس میں سات مرتبہ قتل اور خودکشی کے لفظ استعمال ہوتے ہیں۔

ہمارے دانشور، بڑا اور پالیسی ساز اس کی مختلف توجیہات بیان کرتے ہیں یہ لوگ مہنگائی، بے روزگاری، ”ڈپریشن“، ماحولیاتی آلودگی، شہر اور مارشل لاء کو اس کی وجہ قرار دیتے ہیں لیکن میرا خیال ہے اس کی ذمہ داری صرف اور صرف ہمارے عدالتی نظام پر استوار ہوتی ہے ہم میں سے ہر شخص انصاف سے مایوس ہو چکا ہے لہذا اس نے اپنا انصاف اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص سمجھتا ہے پولیس اس کی بات سننے کی اور نہ ہی عدالت لہذا اسے وہ ہزار روپے کا پستول خریدتا چاہئے، ظالم کو دہلیز پر ڈھیر کر دینا چاہئے اور اپنی کشتی پر بہتول رکھ کر دنیا کے دھکوں سے آزاد ہو جانا چاہئے ہم لوگوں نے پستول کو ہر ظلم، ہر زیادتی کا حل تسلیم کر لیا ہے لہذا آج اس معاشرے میں جس کو دوا چاہئے وہ پستول لے کر گھر سے نکل کھڑا ہوتا ہے جس کو روزگار درد کا رہے وہ جیب میں پستول ڈال کر سڑک پر آ جاتا ہے جیسے انصاف اور عزت چاہئے وہ بھی ایک آدھ رات قبل بردار کا بندوبست کرتا ہے اور عزت اور انصاف لے کر گھر چلا جاتا ہے۔ یہ سب ہمارے عدالتی نظام کی کمزوری اور خامیوں کا نتیجہ ہے میرا خیال ہے اگر ڈاکٹر طارق مسعود کو یقین ہوتا کہ وہ عدالت جائے گا اور عدالت اگلے ہی دن ہاؤسنگ سوسائٹی اور میڈیکل کالج کی انتظامیہ کو طلب کر لے گی اور اس کے ساتھ سو فیصد انصاف ہوگا تو ڈاکٹر طارق مسعود پستول لے کر سوسائٹی کے دفتر جانے کی بجائے سیدھا عدالت جاتا، وہ دو لوگوں کو گولی مارنے اور خودکشی کرنے کی بجائے وکیل کا بندوبست کرتا لیکن کیونکہ وہ جانتا تھا وہ پوری عمر کھپا کر بھی عدالت سے انصاف نہیں لے سکے گا لہذا اس نے اپنا فیصلہ خود کرنے کا فیصلہ کیا اس نے پستول کی عدالت سجائی اس نے اسے مجرم کو گولی ماری اور خود بھی زندہ گئے کے خدا... سہ آ زادہ

گیا۔ اس وقت پاکستان کے زیادہ تر لوگ ڈاکٹر طارق مسعود کی کیفیت اور صورتحال سے گزر رہے ہیں؟ یہ لوگ اسی طرح سوچ رہے ہیں۔ ہم لوگ اگر عدالتی نظام کی خامیوں پر غور کریں تو اس کی بڑی وجہ ہماری غیر قانونی حکومتیں ہیں۔ یہ حقیقت ہے دنیا کی غیر قانونی حکومتیں ہمیشہ عدالت اور قانون کے گمبھوں میں پروان چڑھتی ہیں اور انہیں اپنے دوام کیلئے جوں کی ضرورت پڑتی ہے ہم لوگ پچھلے 40 برسوں سے غیر قانونی اور کرپٹ حکومتیں کاشت کر رہے ہیں چنانچہ یہ حکومتیں اس ملک کے عدالتی نظام کو ٹھیک نہیں ہونے دیتیں یہ حکومتیں جانتی ہیں جس دن عدالتی نظام حاکم ہو جائے گا اس دن گریڈ 22 کا کوئی جرنیل صدر نہیں بن سکے گا اس وقت ملک میں کوئی باوردی جمہوریت جنم نہیں لے گی چنانچہ یہ لوگ اپنے مفادات کیلئے انصاف اور قانون کو اپنی ٹھٹی سے باہر نہیں نکلنے دے رہے ہماری حکومتوں کی اس سفاکی کا نتیجہ ڈاکٹر طارق مسعود جیسے لوگ بھگت رہے اس کی سزا پورے معاشرے کو مل رہی ہے اس کے رد عمل میں ہمارے پورے معاشرے کی قوت برداشت جواب دے گئی ہے۔

اگر ہم اپنی پالیسی میں تھوڑی سی ترمیم کر لیں تو میرا دعویٰ ہے ہمارے حکمران بھی محفوظ رہ سکتے ہیں اور پورا معاشرہ بھی ہم آج اپنے تین بڑے عہدیداروں صدر، وزیراعظم اور چیف آف آرمی سٹاف کو ہر قسم کی عدالتی کارروائیوں سے پاک قرار دے دیں ہم یہ قانون بنالیں آج کے بعد ان تینوں شخصیات کے کسی ذاتی فعل کو عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکے گا لیکن ان کے علاوہ پاکستان کا ہر عہدیدار اور ہر ادارہ قابل احتساب ہوگا ہماری عدالتیں ہر شخص کو طلب کریں گی اور صرف 24 گھنٹوں میں ان کے خلاف فیصلہ دے دیں گی تو میرا خیال ہے ہم لوگ قتل اور خودکشی سے بچ جائیں گے ہماری عدالتیں فیصلہ کر لیں پاکستان میں کوئی کیس ایک ہفتے سے آگے نہیں جائے گا اور جس منٹ میں پانی بھرنے سے لے کر تباہی تک ہر کیس کا فیصلہ میرٹ پر اور فوری ہوگا تو مجھے یقین ہے پاکستان میں پستول کی کوئی عدالت لگے گی اور نہ ہی کوئی شخص اپنا فیصلہ خود کرے گا اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یقین کیجئے یہ آگ کسی نہ کسی دن الہوان صدر تک پہنچ جائے گی اور اس کے بعد ملک میں کوئی عہدہ بچے گا اور نہ ہی عہدہ دار۔





## بے عزت

شیخ صاحب غمزدہ تھے ان کی آواز میں تھر تھراہٹ اور آنکھوں میں آنسو تھے وہ بار بار انیسویں سے گردن ہلاتے تھے اور ان کے منہ سے سرد آہیں نکلتی تھیں ان کا خیال تھا امریکہ نے عید کے دن ہمدام حسین کو پھانسی دے کر پودے عالم اسلام کی بے عزتی کی ان کا کہنا تھا یہ پھانسی محض پھانسی نہیں یہ مسلمانوں کی فیرت پر حملہ ہے اور ہمیں اس حملے کا بھرپور جواب دینا چاہئے میں نے ان سے عرض کیا "ہمدام حسین سلطان صلاح الدین ابوہی محمد بن قاسم یا محمود غزنوی نہیں تھا وہ ایک آمر تھا اور اس نے 25 برس تک عراق میں امریکی مفادات کی کاشنگاری کی تھی اس نے اپنے ہاتھوں سے ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے حقوق کا گھگھوٹا تھا اور اس نے ملک میں بیبیوں اجتماعی قبریں بنائی تھیں" شیخ صاحب کو مجھ سے اختلاف تھا ان کا فرمانا تھا "ہمدام حسین کتنا ہی ظالم اور چارہ سبھی مگر وہ عالم اسلام کا ہیرو تھا ہمدام حسین سے 58 اسلامی ممالک کے کروڑوں لوگوں کی ہمدردیاں وابستہ تھیں لہذا امریکہ کو اس سے رعایت برتنی چاہئے تھی" اگر یہ ممکن نہیں تھا تو بھی ہمدام حسین کو کم از کم اس دن پھانسی نہ دی جاتی جس دن پچاس لاکھ مسلمان حج ادا کر رہے تھے اور ایک ارب 48 کروڑ مسلمان عید الاضحیٰ منارہے تھے

میں نے ان سے پوچھا "امریکہ ہماری توہین کر چکا ہے لہذا ہمیں اب کیا کرنا چاہئے" شیخ صاحب نے میز پر کھمارا اور اونچی آواز میں بولے "ہمیں اس اقدام کے خلاف پوری دنیا میں احتجاج کرنا چاہئے" ہمیں امریکہ مردہ ہاد کے لعرے لگانے چاہئیں اور ہمیں جلوس نکالنے چاہئیں" میں نے ان کی اس معمولانہ خواہش پر قہقہہ لگایا انہوں نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا میں نے فائل میں سے اخبار کا ایک صفحہ نکالا اور وہ صفحہ ان کے سامنے پھیلا دیا اخبار کے عین درمیان میں پانچ چھ تصاویر چھپی تھیں ایک تصویر میں پولیس کا ٹینبل کے سامنے پانچ چھ سال کی ایک بچی ہاتھ جوڑ کر کھڑی تھی بچی کی آنکھوں میں آنسو اور ہر سہ پر بے چارگی تھی دوسری تصویر میں سات آٹھ پولیس کا ٹینبل چند روزہ سال کے ایک بچے پر ڈنڈے برسا رہے تھے بچے کی شلوار اتر کر اس کے جوتوں پر پڑی تھی اس کی قمیص پھٹ چکی تھی اور وہ سرے عام الف نکا کھڑا تھا تیسری تصویر میں لیڈی کا ٹینبل بے شمار خواتین کو ہانک کر لے جا رہی تھیں اور چوتھی تصویر میں پولیس بے شمار بچوں خواتین اور مردوں کو سڑک پر گھسیٹ رہی تھی میں نے ان تصویروں پر انگلی رکھی اور شیخ صاحب سے پوچھا "آپ جانتے ہیں یہ کس ملک کے منظر ہیں"



انہوں نے انکار میں سر ہلا دیا، میں نے عرض کیا "یہ پاکستان کی راولپنڈی کا مال روڈ ہے" یہ 28 دسمبر 2006ء کا دن تھا اور یہ جج اکبر سے صرف ایک دن پہلے کے منظر ہیں "شیخ صاحب حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے" میں نے عرض کیا "کیا آپ جانتے ہیں یہ کون لوگ ہیں" شیخ صاحب نے دوبارہ انکار میں سر ہلا دیا، میں نے عرض کیا "یہ پاکستان کے انتہائی مظلوم لوگ ہیں یہ وہ 106 خاندان ہیں جن کے مرد بچھلے تین چار برسوں سے غائب ہیں" یہ بچی جو ہاتھ باندھ کر پولیس کانسٹیبل کے سامنے کھڑی ہے اس کا والد تین برس سے غائب ہے یہ بچی جس کی شلوار اس کے جوتوں پر پڑی ہے اس کا والد مسعود خواجہ اڑھائی سال سے غائب ہے اور یہ خاتون جسے لیڈی کانسٹیبل ہانک کر لے جا رہی ہیں اس کا خاوند بچھلے تین سال سے گھر نہیں آیا۔

شیخ صاحب خاموشی سے سنتے رہے، میں نے عرض کیا "سر ان 106 خاندانوں کا خیال ہے ان کے خاوند بھائی اور والدہ بچسیوں کی حراست میں ہیں انہیں خفیہ والوں نے اٹھایا اور کسی سیف ہاؤس میں پھینک دیا" یہ لوگ بچھلے تین چار برسوں سے اپنے پیاروں کی راہ دیکھ رہے ہیں ان لوگوں نے پولیس سے لے کر عدالت تک ہر دروازے پر دستک دی لیکن انہیں کسی دروازے سے انصاف نہیں ملا پاکستان کے کسی ادارے اور کسی شخصیت نے ان کے سر پر ہاتھ نہیں رکھا، کسی نے ان کے آنسو نہیں پونچھے لہذا ان لوگوں نے جمرات 28 دسمبر کو جی ایچ کیو کے سامنے مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا یہ لوگ مری روڈ پر لیلیش مین ہوٹل کے چوک پر پہنچے تو پولیس نے ان کا راستہ روک لیا انہوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور پولیس نے ان پر لاشی چارج شروع کر دیا اس لاشی چارج کے دوران محمد بن مسعود کی شلوار اتر گئی جبکہ لاشی چارج اور دھکم پیل میں ایک بچی اور ایک خاتون بے ہوش ہو گئی، خواتین کے سروں سے سر عام چادریں گریں اور ان کی بے پردگی ہوئی "شیخ صاحب خاموش رہے، میں نے عرض کیا "آپ جانتے ہیں گھروں سے غائب ہونے والے یہ لوگ کون ہیں اور ان کا جرم کیا تھا" وہ چپ چاپ سنتے رہے، میں نے عرض کیا "یہ لوگ باریش اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے اور صدر پیش کو ان کے ارادوں سے خطرے کی بو آتی تھی لہذا یہ لوگ گھروں سے غائب ہوئے اور اس کے بعد کسی کو ان کی خبر نہ ملی، ان کے گھر والے ان کی یاد میں روز جیتے اور روز مرتے ہیں۔ یہ لوگ جب عدالتوں کے دروازے بجا بجا کر تھک گئے تو انہوں نے پرامن احتجاج کا راستہ چننا اور آپ اس راستے کا انجام ان تصویروں سے دیکھ لیجئے" شیخ صاحب نے ہاں میں گردن ہلائی اور شرمندہ شرمندہ ہی مسکراہٹ کے ساتھ بولے "لیکن ان کا صدام حسین کی پھانسی کے ساتھ کیا تعلق" میں نے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھا اور سیدھا ہو کر جواب دیا "ان لوگوں کا صدام حسین کی پھانسی کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے، امریکہ عالم اسلام کا دشمن ہے، ہم صدام حسین کی غیر اخلاقی پھانسی پر امریکہ کے سامنے احتجاج کرنا چاہتے ہیں، ہم کہتے ہیں امریکہ کو عید کے دن صدام حسین کو پھانسی نہیں دینی چاہیے تھی۔ درست، لیکن سوال پیدا ہوتا ہے ہم غیر مسلم امریکہ کے غیر اخلاقی اقدام کی مذمت کرنا چاہتے ہیں مگر ہمارے اپنے اسلامی ملک کی اخلاقی اقدار کی کیا حالت ہے؟ ہمارے اسلامی ملک سے 106 لوگ داڑھی رکھنے نماز پڑھنے اور اسلامی نشاۃ ثانیہ کے خواب دیکھنے کے جرم

میں اٹھالے گئے اور ہم تین چار برس بعد بھی ان کے اہل خانہ کو احتجاج کا حق نہیں دے رہے۔ ہم سڑک پر ان کے بچوں کی شلواریں اتار رہے ہیں، ان کی ٹانگوں، ان کی جینٹوں پر ڈنڈے برسا رہے ہیں اور پورے ملک میں خاموشی ہے۔

وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ میں نے عرض کیا ”جس ملک میں 106 لوگ چپ چاپ اٹھالے گئے ہوں اور ان لوگوں کے لواحقین کو کسی عدالت، کسی ادارے سے انصاف نہ ملا ہو اس ملک کے لوگوں کو صدام حسین کی پھانسی پر احتجاج کا کوئی حق حاصل نہیں۔ جس ملک میں سرے عام مظلوموں کی شلواریں اترتی ہوں اور جس میں انصاف کے لیے سڑکوں پر نکلنے والے خاندانوں کو ڈنڈے اور گالیاں ملتی ہوں اس ملک کے لوگوں کو صدام حسین کی پھانسی پر احتجاج کا کوئی حق نہیں اور جس ملک میں آپ جیسے باخیر لوگ 106 خاندانوں پر ہونے والے ظلم پر خاموش ہوں اس ملک کے لوگوں کو سمندر پار پھانسی پانے والے صدام حسین کا غم منانے کا کوئی حق نہیں“ شیخ صاحب خاموش رہے۔ میں نے عرض کیا ”جناب صرف انصاف دینے والوں کو انصاف طلب کرنا چاہیے، مگر میں احتجاج کرنے والوں کو گھر سے باہر احتجاج کرنا چاہیے اور گھر میں زیادتی کے خلاف ہاتھ اٹھانے والوں کو باہر کی زیادتی پر آواز بلند کرنی چاہیے، ہمیں یہ تو نظر آ رہا ہے امریکہ نے عید الاضحیٰ کے دن صدام حسین کو پھانسی دے کر شہداء اسلام کی توہین کی لیکن ہمیں اپنی سڑکوں پر مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمان عورتوں، بچوں اور بزرگوں کی توہین اور ذلت دکھائی نہیں دیتی، ہمیں صدام حسین تو نظر آتا ہے لیکن ہمیں محمد بن سعود، عائشہ مسعود اور آمنہ مسعود پر ہونے والا ظلم دکھائی نہیں دیتا، ہمیں عراق کے آنسو رات بھر سونے نہیں دیتے لیکن ہمیں وہ مسعود جنہوہ نظر نہیں آتا جو دواڑھائی برس پہلے گھر سے نکلا تھا اور اس کے بعد واپس نہیں آیا“ میں جذباتی ہو گیا، شیخ صاحب خاموشی سے سنتے رہے، میں نے عرض کیا ”یقین کیجئے جب تک ہم آمنہ مسعود جیسی مظلوم عورتوں کو انصاف نہیں دیں گے ہم اس وقت تک عالمی سطح پر انصاف نہیں پائیں گے۔ ہم جب تک خود جج اور عید الاضحیٰ کا احترام نہیں کریں گے باہر کی دنیا اس وقت تک ہماری عیدوں اور ہمارے حق کی عزت نہیں کرے گی اور جب تک ہم محمد بن سعود کی عزت کو پھانسی گھاٹ سے نہیں اتاریں گے اس وقت تک ہمارے صدام حسین اسی طرح پھانسیوں پر نکلے رہیں گے، ہم اسی طرح پوری دنیا میں بے عزت ہوتے رہیں گے۔“





## مرجانا اور مارو دینا

وحید ظفر کے والد اس کے بچپن میں فوت ہو گئے اس کی والدہ نے لوگوں کے کپڑے اور برتن دھو کر پانچ بچوں کی پرورش کی 'وحید و بین بچہ تھا' وہ سرکاری سکول سے میٹرک کر گیا 'وہ کالج میں داخلہ لینا چاہتا تھا لیکن وسائل کی کمی آڑے آئی لہذا اس نے والدہ کا ہاتھ بنانے کا فیصلہ کیا 'وہ نوکری کی تلاش میں نکلا' آج 5 برس ہو چکے ہیں لیکن اسے کسی جگہ نوکری نہیں ملی 'اس دوران اس نے مزدوروں کے ساتھ مزدوری 'ہیٹروں کے ساتھ بینٹ اور وٹروں کے ساتھ وٹری کی لیکن وہ کسی جگہ تک نہیں سکا 'کوئی نوکری اس کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی تھی 'کسی جگہ وہ جسمانی لحاظ سے کمزور تھا اور کسی کام میں اس کا ہاتھ نہیں بیٹھتا تھا چنانچہ وہ بے روزگار رہا بے روزگار رہا۔ وہ چند روز قبل میرے پاس آیا اور اس نے مجھ سے پوچھا "میں کیا کروں؟" میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں خاموش رہا 'ذرا دیر تک کر بولا "میرا دل چاہتا ہے" میں ہم باندھ کر باہر نکلوں 'خود بھی مر جاؤں اور دوسروں کو بھی مار دوں' میرے ماتھے پر پسینا گھیا 'میں نے اسے سمجھا بھلا کر سمجھا دیا لیکن میں سوچتا رہا "کیا وحید ظفر اکیلا ہے" مجھے محسوس ہوا 'نہیں وہ اس سوچ میں اکیلا نہیں 'اس وقت پاکستان کے بے شمار نوجوان اسی طرح سوچ رہے ہیں"

پاکستان میں اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ نوجوان ہیں 'پاکستان کی 35 فیصد آبادی کی عمر 16 سے 22 سال ہے 'آپ اس کا تقابل چین 'امریکہ اور یورپ سے کیجئے 'چین کی 17 فیصد آبادی نوجوانوں پر مشتمل ہے 'امریکہ میں 15 فیصد لوگ نوجوان ہیں جبکہ یورپ میں صرف 21 فیصد نوجوان پائے جاتے ہیں لہذا پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس میں چھ کروڑ نوجوان ہیں اور ان میں زیادہ تر نوجوان وحید ظفر جیسے لوگ ہیں اور آج ان سب کی زبانوں پر یہی سوال ہے "میں کیا کروں" یہ نوجوان جذبے 'صلاحیت اور آگے بڑھنے کی امنگیں سے لبریز ہیں لیکن بد قسمتی سے اس ملک میں ان کے لئے کوئی راستہ 'کوئی منزل نہیں 'یہ لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں اور نہ ہی ملک میں ان کے لئے جابز ہیں چنانچہ یہ لوگ گھروں میں چار پائیاں توڑتے ہیں 'گلیوں اور بازاروں میں آوارہ پھرتے ہیں یا بھر شدت کی اس وادی میں نکل جاتے ہیں جس کے آخر میں موت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ پاکستان میں اس وقت ایک کروڑ 45 لاکھ تعلیم یافتہ بے روزگار موجود ہیں اور عالمی اندازوں کے مطابق جس ملک



میں 50 لاکھ ڈین اعلیٰ تعلیم یافتہ اور متحرک نوجوان ہے روزگار ہوں اس ملک کا لاء اینڈ آرڈر خطرے کا شکار ہو جاتا ہے کیپیٹر ماہرین کا کہنا ہے جب کسی کیپیٹر یا سیکھڑ کو کوکری نہیں ملتی تو وہ کیپیٹر "ہیکر" بن جاتا ہے وہ ایسے وائرس ایجاد کرتا ہے جو پوری دنیا کے کیپیٹرز تباہ کر سکتے ہیں امریکہ کی ایک سافٹ ویئر کمپنی صرف ہیکرز کو کوکری دیتی ہے اس کمپنی کا کہنا ہے ایک ہیکر سوسائٹ ویئر انجینئرز کے برابر ہوتا ہے نوجوانوں کو ہم ڈیٹا اینڈ سلائی کے پیمانے سے بھی دیکھ سکتے ہیں پوری دنیا میں ڈیٹا اینڈ سلائی کا خیال رکھا جاتا ہے امریکہ میں اگر مارکیٹ کو دو دلو جوانوں کی ضرورت ہے تو وہ تیسرے نوجوان کو مارکیٹ میں نہیں آنے دیتے کیونکہ وہ جانتے ہیں یہ تیسرا نوجوان پوری مارکیٹ کی نفسیات خراب کر دے گا 1960ء تک یورپ میں بھی پاکستان جیسا تعلیمی نظام تھا وہاں بھی سیکنڈری بورڈ نہ ہوتے تھے اور یہ بورڈ ہر سال لاکھوں بچوں کو میٹرک کی سند دے کر معاشرے میں پھینک دیتے تھے ان میں سے نصف نوجوان فیکٹریوں میں چلے جاتے تھے اور نصف کالجوں کا رخ کرتے تھے کالجوں سے فارغ ہونے والے بچوں میں سے چند یونیورسٹیوں میں جھنجھٹے تھے اور باقی عملی زندگی شروع کر دیتے تھے لیکن پھر انہیں معاشرتی مسائل کا سامنا کرنا پڑا یورپ میں لاء اینڈ آرڈر اور بے روزگاری کا مسئلہ پیدا ہو گیا چنانچہ یورپ نے اپنا نظام بدل دیا یورپ نے سکول کی تعلیم کو کالج تک پھیلا دیا اور کالج کو یونیورسٹی میں ضم کر دیا انہوں نے یونیورسٹیوں کو حالاتِ حاضرہ کے مطابق اپنا سلیبس تبدیل کرنے اور تعلیم کا دورانیہ طے کرنے کا اختیار بھی دے دیا انہوں نے عملی تربیت کو تعلیم کا حصہ بنا دیا اس کے دو نتائج نکلے یونیورسٹیاں مارکیٹ کی ڈیمانڈ دیکھ کر سلیبس میں ترمیمیں کرنے لگیں اگر مارکیٹ میں منجائش موجود ہے تو یورپ کی یونیورسٹیاں کورس کا دورانیہ کم کر دیتی ہیں اور اگر مارکیٹ میں منجائش کم ہو رہی ہے تو وہ ڈگری کے عمل کو لمبا کر دیتی ہیں اور دوسرا وہاں کے طالب علم ریسرچ اور ایٹرن شپ کے نام پر تعلیم کے دوران مختلف کمپنیوں اور اداروں کے ساتھ کام شروع کر دیتے ہیں یہ ایٹرن شپ بعد ازاں ان کا تجربہ بھی جاتی ہے اس سسٹم سے طالب علموں کو اپنی صلاحیتوں اور کمپنیوں کو طالب علموں کے معیار کا پتہ چلتا رہتا ہے چنانچہ وہاں کوئی طالب علم یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد فارغ نہیں رہتا جبکہ پاکستان میں اس سے بالکل الٹ ہے ہمارا تعلیمی نظام تین حصوں میں تقسیم ہے سکول کالج اور یونیورسٹی ان تینوں حصوں کا نظام اس قدر تیز اور آسان ہے کہ اس میں ایک طرف سے پچھڑا لایا جاتا ہے اور دوسری سے ڈگری لے کر باہر آ جاتا ہے۔ جب وہ مارکیٹ میں آتا ہے تو اس کے پاس علم ہوتا ہے اور نہ ہی تجربہ لہذا کوئی کمپنی اسے نوکری دینے کے لئے تیار نہیں ہوتی آج سے دس برس پہلے تک گورنمنٹ سیکٹر نوکری کا سب سے بڑا ذریعہ ہوتا تھا لیکن اب یہ سیکٹر سکڑتا چلا جا رہا ہے سرکاری اداروں میں نوکریاں کم ہوتی چلی جا رہی ہیں دس دس سال تک کسی بھٹے میں کوئی آسامی نہیں نکلتی اور اگر نکلتی ہے تو ایک نشست کیلئے ایک ایک لاکھ درخواستیں آ جاتی ہیں پچھلے سال پشاور شہر میں خاکریو یوں کی آسامیاں نکلی تھیں۔ اس کے لیے 42 ہزار درخواستیں جمع ہوئیں اور ان میں بی اے اور ایم اے نوجوان تک شامل تھے موثر دے پولیس کیلئے آسامیاں نکلیں تو ان کے لیے ایم اے، ایل ایل بی اور ایم بی اے نوجوانوں نے

درخواستیں دیں، اسی طرح سی ایس ایس اور پی سی ایس کے امتحانات میں ڈاکٹر اور انجینئر اپلائی کرتے ہیں اور یہ لوگ امتحان پاس کر کے غیر متعلقہ شعبوں میں نوکریاں کرتے ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے ہمارے ملک میں کالجوں، یونیورسٹیوں اور سرکاری ملازمتوں تک پہنچنے والے خوش نصیبوں کی تعداد کتنی ہوتی ہے؟ صرف پانچ فیصد ایسی ہاں ہماری آبادی کے صرف پانچ فیصد لوگ اعلیٰ تعلیم اور سرکاری نوکریوں تک پہنچ پاتے ہیں اب سوال پیدا ہوتا ہے باقی 95 فیصد لوگ اور 30 فیصد نوجوان کیا کرتے ہیں؟ یہ وہ حقیقت ہے جس کے وطن سے ہمارے مسائل پیدا ہوتے ہیں، جس کی کوکھ سے لاکھوں حقیقی جہنم لہتی ہیں۔ اس وقت اس ملک کی 35 فیصد آبادی وحید ظفر جیسے لوگوں پر مشتمل ہے جن کی زندگی کی نسل کے آخر میں کوئی روشنی نہیں، جن کی زندگی کا کوئی مقصد، کوئی نظریہ نہیں لہذا یہ لوگ خود کش حملہ آور بن رہے ہیں، نشے کی لت میں جٹا ہو رہے ہیں، ماڈرن ازم کی سیڑھیاں چڑھتے جا رہے ہیں، ڈکیتیوں، اغواء برائے تالوان اور چوریوں میں ملوث ہو رہے ہیں یا پھر مذہب کی اس حد کو چھو رہے ہیں جس پر پہنچنے والے لوگ اپنے نظریے، اپنے خیال اور اپنے مکتبہ فکر کو لازوال سمجھ جہکے دوسروں کے مکتبہ فکر، دوسروں کے خیال اور دوسروں کے نظریات کو باطل عظیم سمجھتے ہیں، جس پر پہنچنے والوں کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے، مر جانا اور مار دینا۔ یہ حقیقت ہے ہم معاشرتی توازن کو بچکے ہیں، ہم لوگ انتہا پسندی میں جٹا ہو چکے ہیں، ہم میں سے کچھ لوگ انتہا درجے کے لیبرل ہیں اور کچھ لوگ جنون کی حد تک فرقہ پرست لیکن دونوں میں برداشت نہیں، ہمارے لیبرل لوگ مذہبی طبقے کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور ہمارا مذہبی طبقہ لیبرل لوگوں کا وجود تسلیم کرنے پر راضی نہیں، اس انتہا پسندی کا یہ نتیجہ نکل رہا ہے آج پورا معاشرہ خوف کا شکار ہے، ہم میں سے ہر شخص خطرے کا شکار ہو چکا ہے، مجھے بعض اوقات محسوس ہوتا ہے ہم خود کش معاشرہ بن چکے ہیں۔

ہم اس بخار سے کیسے نکل سکتے ہیں، یہ میں آپ کو کل بتاؤں گا۔



## ”ہوٹل اور مسجد“

پاکستان میں اس وقت چھ کروڑ نو جوان ہیں یہ چھ کروڑ نو جوان پلتے پھرتے ہم ہیں، جوانی ایک توانائی کا نام ہوتا ہے اور توانائی ہمیشہ بے لگام ہوتی ہے اس کو رخ، منزل اور لگام نکوشیں، معاشرے اور لوگ دیا کرتے ہیں لیکن بد قسمتی سے ہم نے آج تک ان نو جوانوں کی توانائیوں کو کوئی رخ دینے یا ان سے کوئی اجتماعی کام لینے کی کوشش نہیں کی چنانچہ یہ توانائی اب اپنا راستہ خود تلاش کر رہی ہے ہمارے نو جوانوں میں سے کچھ سیدھا راستہ اختیار کر لیتے ہیں اور وہ ترقی، خوشحالی اور امن کی ہٹاری پر آ جاتے ہیں جبکہ باقی نو جوان نشے کی دلدل میں جھنس جاتے ہیں، وہ جرائم کا راستہ منتخب کرتے ہیں یا پھر فرقہ واریت کو اپنا مذہب بنا لیتے ہیں۔

پوری دنیا کے ماہرین تحقیق ہیں انسان میں 16 سال کی عمر سے لے کر 25 سال تک موت کا خوف انتہائی کم ہوتا ہے اس عمر میں انسان پیچھے پاؤں، ماؤنٹ ایوریسٹ پر چڑھ جاتا ہے اور ہزاروں ہزار میٹر کی بلندی سے سمندر میں چھلانگ لگا دیتا ہے لیکن جوں ہی انسان 25 سال کی حد عبور کرتا ہے تو موت کا خوف اس کے دردناک سے پردہ نکال دیتا ہے اور وہ سر پر ٹوپی اور گلے پر مٹکا لپیٹے بغیر باہر نہیں نکلتا، شاید یہی وجہ ہے پوری دنیا میں صرف ان فوجیوں کو محاذ پر بھیجا جاتا ہے جن کی عمریں 25 سال سے کم ہوتی ہیں، فوج میں انسان جوں جوں سینئر ہوتا جاتا ہے وہ محاذ سے پیچھے ہٹتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ جرنیل بن جاتا ہے، جرنیلوں کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ لوگ جگہ لڑا سکتے ہیں، لڑا نہیں سکتے، اسی طرح آپ مہلک نشوں کو لے لیجئے مہلک نشوں کے شکار 90 فیصد لوگوں کی عمریں 25 سال سے کم ہوتی ہیں، یہی صورت حال خود کش حملہ آوروں کی ہے، دنیا میں خود کش حملہ آوروں کا پہلا سکواڈ جاپان نے بنایا تھا، یہ لوگ ”کامی کا زی“ کہلاتے تھے، یہ جسم پر بم باندھ کر امریکہ کے بحری جہازوں کی چٹنیوں میں کود جاتے تھے، ان تمام لوگوں کی عمریں 17 سے 21 برس کے درمیان تھیں، اس تجربے کی بنا پر ثابت ہوا خود کش حملوں کیلئے آئیڈیل عمر 16 سے 22 سال ہوتی ہے، لہذا آج دنیا میں جہاں بھی خود کش حملہ ہوتا ہے اس میں استعمال ہونے والے 98 فیصد نو جوانوں کی عمریں 22 سال سے کم ہوتی ہیں۔ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس کی 35 فیصد آبادی خود کش عمراور خود کش دور سے گزر رہی ہے ہمارے ملک میں 6 کروڑ نو جوان ہیں اور یہ نو جوان



وحید ظفر کی طرح اندر سے اہل رہے ہیں یہ روز ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں ”میں کیا کروں“ اور انہیں اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملتا ان نوجوانوں میں سے نصف کو درغلانہ انتہائی آسان ہے چنانچہ یہ لوگ کسی بھی وقت بہت بڑا بحران پیدا کر سکتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے ”کیا دنیا میں ہم پہلی قوم ہیں جو اس مسئلہ کا شکار ہوئی؟ اس کا جواب تقیہ نہیں ہوگا دوسرا سوال یہ ہے دنیا کے دیگر ممالک نے اپنے آپ کو اس صورتحال سے کیسے بچایا تھا؟ یہ ایک دلچسپ سنڈی ہے دنیا کی دس ہزار سالہ سائنسی تاریخ کا حفظ فیصلہ ہے جو معاشرے اور جو ملک اپنے بچوں اپنے نوجوانوں کیلئے سرگرمیاں تخلیق نہیں کرتے وہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتے انسان کی دس ہزار سالہ تاریخ یہ فیصلہ بھی دے چکی ہے کہ انسان کو جسمانی، ذہنی اور روحانی تین قسم کی سرگرمیاں درکار ہوتی ہیں اور جن معاشروں میں ایک امتحان تینوں سرگرمیوں پر توجہ نہیں دی جاتی وہ معاشرے بھی اپنا توازن کھو بیٹھتے ہیں یورپ امریکہ اور مشرق بعید کے تمام ترقی یافتہ ممالک نے انسانی تاریخ اور تجربے سے فائدہ اٹھایا اور انسانی سرگرمیوں کو تین شعبوں میں تقسیم کر دیا یہ سرگرمیاں سپورٹس، مطالعہ اور آرٹ تھیں ان لوگوں نے سپورٹس کو جسمانی، مطالعہ کو ذہنی اور موسیقی، آرٹ، ڈرامہ، تھیٹر اور فلم کو روحانی سرگرمی قرار دیا اور ان تینوں شعبوں کو بچوں اور بالخصوص نوجوانوں کی زندگی کا حصہ بنادیا یورپ اور امریکہ میں اس وقت کوئی ایسا تعلیمی ادارہ نہیں جس میں کھیل کا میدان، لائبریری اور آرٹ یونٹ نہ ہو یہ تینوں چیزیں یورپ، امریکہ اور مشرق بعید کے بچوں کے سلیبس کا باقاعدہ حصہ ہیں وہاں کا ہر بچہ کوئی نہ کوئی کھیل ضرور کھیلتا ہے وہ روزانہ لائبریری ضرور جاتا ہے اور وہ آرٹ کی کسی نہ کسی صنف میں ضرور دلچسپی رکھتا ہے اسی طرح یورپ اور امریکہ کے کسی شہر یا قصبے کو اس وقت تک ناؤن کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی جب تک اس میں آبادی کے مطابق کھیل کے میدان، پارکس، لائبریریاں اور تھیٹر ہال نہ ہوں امریکہ میں پانچ لاکھ سے کم تعداد میں کتاب شائع نہیں ہوتی اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں چھوٹی بڑی پانچ لاکھ لائبریریاں ہیں اور امریکہ میں چھپنے والی تمام کتابیں ان تمام لائبریریوں تک ضرور پہنچتی ہیں امریکہ کے شہری اوسطاً چھ ہزار صفحات سالانہ پڑھتے ہیں اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ اخبارات اور رسائل امریکہ میں شائع ہوتے ہیں اور یہ تمام رسائل اور اخبارات خریدے اور پڑھے جاتے ہیں امریکہ اور یورپ کے تمام سکولوں میں لائبریری کا چرچا ہوتا ہے اس عہدے میں ہر طالب علم لائبریری جاتا ہے اور اپنی پسند کی کتاب پڑھتا ہے امریکہ میں طالب علموں کیلئے لائبریری سے کتاب ایئر کرنا ضروری ہوتا ہے اگر کوئی طالب علم کتاب جاری نہ کرائے تو اس کے نمبر کٹ جاتے ہیں امریکہ اور یورپ کے سکولوں اور یونیورسٹیوں میں سپورٹس بھی لازمی ہیں وہاں اس طالب علم کو ادھور اور پیار سمجھا جاتا ہے جس کے پاس ٹریک سوٹ اور جاگزنڈ ہوں اور جس کی صبح یا شام کا آغاز کھیل سے نہ ہو امریکہ کی تمام چھوٹی بڑی کینپسوں نے دفاتروں میں جم بناد رکھے ہیں کینپسوں کے ورکرز ان ”نچو“ میں روزانہ ورزش کرتے ہیں، تمام تعلیمی اداروں میں تھیٹر ز اور آرٹ یونٹس ہوتے ہیں اور ان میں ڈرامے، موسیقی کے پروگرام اور مہا جئے ہوتے ہیں اور وہاں معیاری

قلیس دکھائی جاتی ہیں، امریکہ اور یورپ کے تمام شہروں میں سینا گھر اور تھیمز ہال بھی ہیں اور زیادہ تر لوگ وہاں ضرور جاتے ہیں، اگر ہم پاکستان کا مقابلہ امریکہ اور یورپ سے کریں تو خود بتائیے ہمارے ملک میں کتنے تعلیمی ادارے ہیں جن میں یہ سولتیس موجود ہیں؟ حقیقت یہ ہے ہماری نصف پونڈر سٹیوں میں سپورٹس کلبس اور آڈیٹوریم نہیں ہیں، ہمارے 95 فیصد ہائی سکولوں میں کھیل کے میدان اور لائبریریاں نہیں ہیں جبکہ گورنمنٹ کالج کے سوا کسی تعلیمی ادارے میں ڈرائنگ سوسائٹی یا آرٹ اینڈ کچجر کی کوئی باڈی نہیں، ہمارے 95 فیصد طالب علم سلیبس کے سوا کوئی کتاب نہیں پڑھتے اور ہمارے 98 فیصد بچے زندگی میں کوئی کھیل نہیں کھیلتے، پاکستان کے صرف 9 شہروں میں تھیمز ہیں اور ان تھیمزوں میں بھی انتہائی اخلاق باختہ ور اسے دکھائے جاتے ہیں، پاکستان کے کسی شہر میں آبادی کے مطابق کھیل کے میدان اور لائبریریاں نہیں ہیں، پاکستان کا شمار دنیا کے ان پانچ ملکوں میں ہوتا ہے جن میں اخبارات، رسائل اور کتابوں کا بزنس زوال کا شکار ہے اور جن میں سینماؤں کی جگہ پلازے اور ریسٹوران بن رہے ہیں اور اسلام آباد دنیا کا دوسرا دار الحکومت ہے جس میں کوئی سینما نہیں لہذا پھر سوال پیدا ہوتا ہے پاکستان کے یہ چھ کروڑ نو جوان کیا کریں؟ خود سوچنے اگر یہ لوگ خود کش حملہ آور نہیں بنیں گے تو ان کے جذبے، ان کی انگلیں اور ان کی ذہانتیں کس کام آئیں گی، اس میں کوئی شک نہیں ہم ایک اسلامی ملک ہیں، ہم تعلیمی اداروں میں آرٹ اینڈ کچجر اور سینما کی اجازت نہیں دے سکتے لیکن کیا اسلام لائبریریوں، ورزش اور کھیل سے بھی منع کرتا ہے؟ کیا وہ آڈیٹوریم، سناٹے اور تقریری مقابلوں سے بھی روکتا ہے۔ کیا ہمارے پاس اتنا بھی وقت نہیں کہ ہم سپورٹس اور مطالعے کو تعلیم کا لازمی جزو بنا سکیں، ہم پاکستان کے تمام شہروں میں کھیل کے میدان اور لائبریریاں بنا سکیں اور ہماری ضلعی حکومتیں جنگی بنیادوں پر کھیل اور مطالعے کی ترویج شروع کر سکیں کیا ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ ہم ہر تحصیل آفس میں ہال بنائیں اور اس ہال میں ہر ہفتے کوئی نہ کوئی معیاری پروگرام کیا جائے، اس میں سینما، جمائٹیں اور کھیل دکھائے جائیں۔ کیا ہمارے پاس اس ملک کے چھ کروڑ نو جوانوں کیلئے اتنا وقت اور اتنے وسائل نہیں ہیں! میرا خیال ہے اگر ہم نے اس طرف توجہ نہ دی تو جلد وہ وقت آ جائے گا جب ”میں کیا کروں“ جیسے سوال پوچھنے والے تمام نو جوان اپنے جسم سے ہم باندھ لیں گے اور وہ ہر برس روزگار اور خوشحال شخص کو اپنا دشمن سمجھنے لگیں گے خواہ وہ خوشحال شخص اس کا بھائی یا والد ہی کیوں نہ ہو اگر ہم نے وقت سے پہلے بند نہ باندھا تو اس ملک میں ایک ایسی جنگ شروع ہو جائے گی جس کے آخر میں کوئی مولانا بچے گا اور نہ ہی مسٹر جس میں کوئی ہوگی سلامت رہے گا اور نہ ہی مسجد۔





## ہم دنیا کی طرح کب سوچیں گے

وہ ٹاؤن شپ لاہور میں گارمنٹس کا کاروبار کرتا تھا، وہ سوموار کے دن اپنے بھائی احمد علی کے ساتھ موٹر سائیکل پر گھر سے نکلا، گھر سے تھوڑی دور پٹرول ختم ہو گیا، وہ غازی آباد کے ایک پٹرول پمپ پر رک گیا، اس نے پٹرول ڈلوایا، مل دینے کا وقت آیا تو "پٹرول بوائے" کے ساتھ اس کی تلخ کلامی ہو گئی، محمد علی کا خیال تھا وہ زیادہ پیسے طلب کر رہا ہے جبکہ پٹرول بوائے کا کہنا تھا رات کو پٹرول دو روپے لیٹر مہنگا ہو گیا ہے، ان دونوں کی توں ٹکارسن کر پٹرول پمپ کے دوسرے ملازمین بھی جمع ہو گئے یوں یہ معمولی جھگڑا تھا پانی اور لڑائی میں تبدیل ہو گیا، اس دوران پمپ کا گارڈ آگے بڑھا، اس نے محمد علی کو گرجیاں سے پکڑ لیا، معاملہ مزید بگڑ گیا، اس کا ڈاکو کے دوران سکیورٹی گارڈ نے محمد علی کو گولی مار دی، 23 برس کا یہ خوبصورت نوجوان فرش پر گر اور اس نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

محمد علی مہنگائی کی تازہ ترین لہر کا پہلا شہید ہے، اس ملک میں پچھلے دس برسوں میں مہنگائی میں 4 گنا اضافہ ہوا جبکہ لوگوں کی قوت خرید میں آٹھ گنا کی واقع ہوئی، اس ملک میں چند روپے سولہ کروڑ لوگ لیتے ہیں، ان سولہ کروڑ لوگوں میں کوئی ایسا شخص نہیں جو مہنگائی سے براہ راست متاثر نہ ہوا ہو، اس ملک میں آنے سے دو اسک ضرورت کی ہر چیز حوام کے ہاتھ سے نکل چکی ہے، مرغی گوشت کا سستا ترین ذریعہ تھی لیکن برڈ فلو کی وجہ سے یہ سستا ترین ذریعہ بھی اب حوام کے پاس نہیں رہا، مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے حکومت مغرب پولٹری کی صنعت کو بچانے کے لئے شادی بیاہ پروڈکٹس کی اجازت دے دے گی، بھینا اس اجازت سے پولٹری کی دم توڑتی صنعت کو سہارا ملے گا لیکن صرف گوشت تو سب کچھ نہیں ہوتا، انسانی زندگی کے اور بھی سینکڑوں ہزاروں تقاضے ہوتے ہیں اور یہ سارے تقاضے بازار سے مول ملتے ہیں اور اس وقت بازار سے ملنے والی ہر چیز مہنگی ہو چکی ہے، مہنگائی کا یہ عالم ہے آج ہزار روپے کا ٹٹو چھوٹا ہو گیا ہے اور حکومت پانچ ہزار کا ٹٹو "لاٹج" کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے، اگر یہ صورت حال اسی طرح جاری رہی تو شاید آنے والے والے برسوں میں حکومت کو ایک لاکھ روپے کا ٹٹو بھی متعارف کرانا پڑ جائے، لوگ جھیلوں میں ٹٹو بھر کر بازار جائیں اور اس کے بدلے ایک کلو آلو لے کر واپس آئیں۔

معیشت دانوں کا خیال ہے آج کے دور میں پٹرول مہنگائی کی ماں ہے، اگر کسی ملک میں پٹرول مہنگا ہو جائے تو اس ملک میں پانی کے ریش بھی بڑھ جاتے ہیں، ہماری آج کی زندگی کا 80 فیصد دارو و ادویہ پٹرول پر ہے



ہٹرول نہ ہونے والے سے کپڑے تک ہر چیز شہریوں کی زندگی سے خارج ہو جاتی ہے یورپ اور امریکہ کو 1972ء میں اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا وہ جان گئے تھے آئے والے وقت میں صرف وہی ملک سپر پاور ہیں گے جن کے قبضے میں تل ہوگا جو تل کی قیمتیں طے کرنے کے قابل ہوں گے مجھے پچھلے دنوں سعودیت یونین کے زوال کے بارے میں ایک تحقیقی مقالہ پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا اس مضمون میں محقق نے انکشاف کیا تھا سعودیت یونین دنیا کا واحد غلط تھا جس کے پاس ہٹرول کی مارکیٹ نہیں تھی جبکہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے پاس آئل کمپنیاں بھی تھیں اور آئل کی شاخ آپہنچ بھی لہذا روس کی اس کی کے باعث سعودیت یونین ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تل کتنی بڑی اور حساس ضرورت ہے یہ جاننے کیلئے آپ امریکہ اور یورپ میں تل کی قیمتوں کا تجربہ کیجئے آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی یورپ اور امریکہ ہٹرول کی قیمتیں کبھی عوام کی قوت خرید سے باہر نہیں ہونے دیتے کل میرے ایک "سرکاری" دوست نے فرمایا "یورپ میں ہٹرول کی قیمت ایک یورو سے زیادہ ہے پاکستان میں اس کے مقابلے میں سستا ہٹرول مل رہا ہے" میں نے اس سے عرض کیا "یورپ میں پست ترین آمدنی ہزار یورو ماہانہ ہے چنانچہ وہاں ایک ہزار یورو لینے والا شخص بڑی آسانی سے ایک یورپی لیٹر ہٹرول انفرڈ کر لیتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں پاکستان کے چالیس فیصد لوگ خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں اور 40 فیصد لوگ تین ہزار روپے ماہانہ سے کم کما رہے ہیں تم بتاؤ کیا تین ہزار روپے کمانے والا شخص 60 روپے لیٹر ہٹرول انفرڈ کر سکتا ہے" میرے سرکاری دوست کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

ہٹرول آج کی ایک بڑی سچائی ہے پاکستان میں ہٹرول عوام کی قوت خرید سے نکل چکا ہے، ہٹرول کی قیمت میں مزید اضافہ ہوگا یہ دوسری بڑی سچائی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے دنیا کے دوسرے ممالک اس مسئلے سے کیسے نمٹ رہے ہیں ہٹرول وہاں کے عام شہری کی زندگی پر اثر انداز کیوں نہیں ہوتا؟ اس سوال کا جواب بہت دلچسپ ہے دنیا نے پبلک ٹرانسپورٹ کے شعبے کو ترقی دے کر ہٹرول کا مسئلہ حل کر لیا ہے اس وقت پوری "فرسٹ ورلڈ" میں ریل گاڑی زمین نظام موجود ہے شہروں کے درمیان ریل اور بسوں کا انتہائی شاندار سسٹم کام کر رہا ہے امریکہ یورپ جاپان مشرق وسطیٰ اور چین میں لوگ ذاتی گاڑی بجائے میٹرو ریل اور بس پر سفر کرتے ہیں وہاں ہر وقت پبلک ٹرانسپورٹ دستیاب ہوتی ہے یہ ٹرانسپورٹ ذاتی گاڑیوں سے کہیں زیادہ آرام دہ اور محفوظ ہوتی ہے برطانیہ میں ایسے بے شمار سیاستدان وزراء، بیوروکریٹس اور ارب پتی بزنس مین ہیں جنہوں نے پوری زندگی گاڑی نہیں خریدی یہ لوگ ہمیشہ ٹرین اور بس پر سفر کرتے ہیں اس سفر سے ان کا وقت بھی بچتا ہے اور یہ رش اور پارکنگ کی کوفت سے بھی محفوظ رہتے ہیں لہذا دنیا نے اس شعبے کو ترقی دے کر ہٹرول کے مسئلے سے جان چھڑائی جس دن ہم نے پاکستان میں ہٹرول کی قیمت میں اضافہ کیا تھا اس دن چین نے مضافی قوت سے چلنے والی ٹرین کا تجربہ کیا تھا یہ 18 میٹرک ٹن کی ٹرین تھی جو 160 کلومیٹر کی رفتار سے چل سکتی ہے اور اس میں 60 مسافر بیٹھ سکتے ہیں یہ ٹرین چنگ ڈ شہر میں 425 کلومیٹر لمبی ریلوے لائن پر چلائی گئی تھی اسی طرح میں نے کسی جگہ پڑھا تھا بھارتی حکومت نے کسی غیر ملکی فرم کو مدلی شہر میں زیر زمین ٹرین سسٹم بچھانے کا ٹھیکہ دے دیا ہے یہ کئی یورپ کے شہر کے نیچے پڑی بچھائے گی اور اس پر میٹرو چلائے گی سفر کا یہ ذریعہ سستا بھی ہوگا آرام دہ بھی اور اس سے ہٹرول کی بچت بھی ہوگی

لہذا کہنے کا مطلب ہے اگر دنیا اس ذریعے سے اپنے پٹرول کا بجٹ کم کر سکتی ہے تو ہم کیوں نہیں کر سکتے؟ حکومت ہر سال نعرے لگاتی ہے اسے پٹرول کی سبسڈی کی مد میں 64 ارب کا نقصان ہو رہا ہے اور اس کا نقصان دو ارب ڈالر سے بڑھ چکا ہے وغیرہ وغیرہ لیکن سوال یہ ہے اگر حکومت یہ قدم زیر زمین ریلوے سسٹم پر لگا دے تو کیا پاکستان کی پٹرول کی ضرورت میں پچاس فیصد کمی نہیں آ جائے گی اور حکومت کا خسارہ بھی کم نہیں ہو جائے گا اس کے بعد پٹرول خواہ دو سو روپے لیٹر ہو جائے عوام کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا اسی طرح اگر حکومت ریلوے کا نظام بہتر بنا کر کارگو ٹرانسپورٹ اس پر شفٹ کر دے اگر حکومت کارگو ٹرینیں اور کارگو جہاز چلائے تو اس سے بھی پٹرول کی لاگت میں کمی آئے گی کرائے بھی کم ہوں گے اور چیزیں بھی سستی ہو جائیں گی۔ اسی طرح اگر حکومت شہروں کے ارد گرد موجود زرعی زمینوں کی حفاظت کا قانون پاس کر دے اگر حکومت وہاں ہاؤسنگ سیکمیں نہ بنے دے اگر وہ وہاں کے کسانوں کو قرضے اور سہولتیں دے تو انتظامیہ کو شہروں کے لئے خورد و نوش کی اشیاء دور سے نہیں منگوانی پڑیں گی جس کے نتیجے میں شہروں میں کھانے کی اشیاء سستی ہو جائیں گی یوں مہنگائی کنٹرول ہو جائے گی اس وقت لوگوں کو ہزار ہزار کلومیٹر کے فاصلے سے ترکاریاں منگوانا پڑتی ہیں جس کی وجہ سے ان کی قیمت میں دس دس گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ جناب شیخ رشید ریلوے کے وفاقی وزیر بن چکے ہیں وہ ایک ہنرمند اور ذہین شخص ہیں وہ جس وزارت میں جاتے ہیں وہاں اپنی گنجائش نکال لیتے ہیں شیخ صاحب اگر جدید تقاضوں کو سامنے رکھ کر ریلوے کے نظام کی اصلاح کریں وہ اگر چار بڑے شہروں میں زیر زمین میٹرو بچھادیں وہ اگر کارگو ٹرینوں میں اضافہ کر دیں اور لوگوں کو ٹرین استعمال کرنے کی ترغیب دیں تو بھی ملک کے زیادہ تر مسائل حل ہو جائیں۔ ہم پچھلے دنوں چین گئے تھے وہاں سکیا ٹنگ کے گورنر نے انکشاف کیا تھا چین نے شاہراہ ریشم کے ساتھ ساتھ کاشغر سے اسلام آباد تک ٹرین کی پٹری بچھانے کا فیصلہ کیا ہے انہوں نے بتایا تھا یہ پٹری چین کی جمہوری ہے اگر کوئی شخص کاشغر سے ارچی آتا ہے تو اسے 15 گھنٹے لگتے ہیں جبکہ وہ شخص دس گھنٹوں میں اسلام آباد پہنچ سکتا ہے انہوں نے بتایا چین کی قریب ترین بندرگاہ ارچی سے 4500 کلومیٹر دور ہے جبکہ گوادرام سے محض 2500 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے لہذا اگر ہم سکیا ٹنگ کو ریل کے ذریعے پاکستان سے جوڑ دیں تو ہمیں ہار یوں ڈال کر کاٹنا ہوگا۔

دنیا اس وقت اس طرح سوچ رہی ہے لیکن ہم دنیا سے مخالف سمت میں بھاگ رہے ہیں ہم 21 ویں صدی میں ریل کو چھوڑ کر کاروں میں اضافہ کر رہے ہیں اس وقت اسلام آباد میں دوسو نئی گاڑیاں روزانہ رجسٹر ہوتی ہیں یہ دوسو گاڑیاں اس ملک میں پٹرول کی قیمتوں میں اضافہ کر رہی ہیں لہذا اگر ہم پبلک ٹرانسپورٹ کو بہتر بنائیں تو لوگ گاڑیاں خریدنا بند کر دیں گے اور اس کے نتیجے میں پاکستان میں پٹرول کا مسئلہ حل ہو جائے گا اس وقت دنیا میں پبلک ٹرانسپورٹ ملکوں کی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لوگ ٹرین، بسوں اور ٹیکسیوں کے نظام سے ملکوں کی ترقی مانتے ہیں لیکن اس میں ہم لوگوں نے کادوں اور پٹرول کے زیاں کو اپنا معیار بنالیا ہے لہذا اس کا یہ نتیجہ نکل رہا ہے محمد علی جیسے نوجوان پٹرول کی قیمت میں اضافے کے بعد پٹرول پمپ کے فرش پر ترپ ترپ کر جان دے رہے ہیں چہ نہیں ہم ہمالیہ کو موسم قی کے ساتھ پگھلانے کا سلسلہ کب بند کریں گے ہم دنیا کی طرح کب سوچنا شروع کریں گے۔





## بم ایڈیشن

شوکت علی کا تعلق میاں جنوں کے بورڈ ٹاؤن سے تھا، وہ ایک برس پہلے تک بکری کا مالک تھا لیکن اس پر مشکل وقت آیا اور وہ پیسے کیلئے محتاج ہو گیا، اس نے اس محتاجی کا عجیب حل نکالا، اس نے 12 فروری 2007ء کو اپنے تین بچے فروخت کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس نے میاں جنوں بازار میں بچوں کی فروخت کا بورڈ لگوا دیا اور خود اس بورڈ کے نیچے بیٹھ گیا۔ یہ بورڈ دیکھ کر شہر کے لوگ جمع ہو گئے، میڈیا کو علم ہوا تو شوکت علی کو صحافیوں نے گھیر لیا۔ شوکت علی کی خبر اخبارات تک پہنچی، اخبارات سے ٹیلی ویژن چینلز پر آئی اور وہاں سے عالمی شکل اختیار کر گئی یوں شوکت علی ایک ہی رات میں بین الاقوامی شخصیت بن گیا۔ شوکت علی کے حالات کی خبر میڈیا سے ہوتی ہوئی ہماری حکومت تک پہنچی اور حکومت فوراً حرکت میں آ گئی۔ وزیراعظم شوکت عزیز نے شوکت علی کو میاں جنوں کے ایک بینک میں سکیورٹی گارڈ کی ملازمت کی پیش کش کر دی، ضلعی ناظم نے اسے مالی مدد سے دی، پولیس افسروں نے اسے سوبائل لے دیا اور تحریک شہریوں نے اس کا اکاؤنٹ کھلوادیا۔ اسلام آباد اور لاہور کے این جی او ز کا ضمیر بیدار ہوا۔ وہ اس کی مدد کے لیے میاں جنوں روانہ ہو گئیں۔ ملک سے باہر موجود پاکستانیوں نے شوکت علی سے رابطہ کیا اور یوں شوکت علی کے مسائل حل ہونے لگے۔ تاہم ترین اطلاعات کے مطابق اب تک شوکت علی کے پاس اتنی رقم جمع ہو چکی ہے کہ وہ نہ صرف اپنے جیسے دس بیس لوگوں کی مدد کر سکتا ہے بلکہ اس نے دوسری شادی اور نوکری کی جگہ کاڑھا کر کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا ہے۔ ہم سب پاکستانی شوکت علی کی اس کامیابی پر خوش ہیں مگر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے اگر شوکت علی میاں جنوں کے بازار میں اپنے بچوں کی فروخت کا بورڈ نہ لگاتا۔ اگر شہر کے لوگ اس بورڈ کے ارد گرد جمع نہ ہوتے، اگر یہ واقعہ مقامی صحافیوں کے نوٹس میں نہ آتا، اگر صحافی یہ خبر اخبارات کو نہ بھجواتے، اگر نیوز ایڈیٹر اس خبر کو اہمیت نہ دیتے، اگر یہ خبر اخبارات کے صفحہ اول پر شائع نہ ہوتی، اگر ٹیلی ویژن چینلز کو اس میں ”کیمرا چیوٹی“ نظر نہ آتی، اگر شوکت علی کا مسئلہ ٹی وی سکرین تک نہ پہنچتا اور اگر اس دن وزیراعظم ملک میں نہ ہوتے، اگر وزیراعظم کا شاف انہیں اس خبر کی ”کننگ“ فراہم نہ کرتا، اگر وزیراعظم اس انشوکو تنجید نہ لیتے، اگر وزیراعظم اپنے عملے کو ہدایات جاری نہ کرتے اور اگر بورڈ کو ایسی فوری طور پر حرکت نہ آتا، تو شوکت



علی کا کیا بننا؟ اس کے مسائل کیسے حل ہوتے؟ سوال پیدا ہوتا ہے اگر اس دن بارش ہو جاتی، اگر اس دن میاں چنوں میں کوئی سیاسی جلسہ ہوتا، اس دن ڈی آئی جی یا آئی جی صاحب شہر کے دورے پر ہوتے، اس دن شہر کے سارے لوگ اور سارے صحافی بڑے صاحب کی تقریر سننے میں مصروف ہوتے۔ اگر اس دن اخبارات کی چھٹی ہوتی، اگر اس دن کوئی بڑا حادثہ ہو جاتا، اگر اس دن کوئی بڑا "ہم بلاست" ہو جاتا، اگر اس دن ہماری حکومت صدر مینس، وزیراعظم ٹونی بلینئر یا شاہ عبداللہ کے استقبال میں مصروف ہوتی یا اس دن بسنت، دیپنکائن ڈے یا نیو ایئر ٹائٹ ہوتی اور اس دن ہماری حکومت "ڈے اینڈ ٹائٹ" تقریرات میں مصروف ہوتی تو شوکت علی کا کیا بننا؟ اس کے بچوں کو روٹی اور آسرا کون دیتا؟ سوال پیدا ہوتا ہے اگر شوکت علی کے ذہن میں توجہ حاصل کرنے کا یہ اچھوتا خیال نہ آتا، اگر شوکت علی مینس موقع پر شرما جاتا، اگر وہ بورڈ نہ لکھواتا، اگر اس کے عزیز ارشتے دار اور دوست اسے سمجھا بھالیتے، اگر اس کی بیوی اور اس کے بچے اس "نیک کام" میں اس کی مدد نہ کرتے، اگر شہر کا کوئی شخص اس کا بورڈ لکھنے پر راضی نہ ہوتا، اگر لوگ اسے بورڈ لگانے کی اجازت نہ دیتے اور اگر شہر کے لوگ یہ بورڈ پڑھنے کے لیے وہاں کھڑے نہ ہوتے تو شوکت علی کا کیا بننا؟

یہ سارے اگر، یہ سارے سوال بھی شوکت علی اور اس کی کہانی جتنے سفاک اور خوفناک ہیں اور یہ وہ "سوال" اور وہ "اگر" ہیں جن کے نیچے اس ملک کا مقدر ڈلن ہے۔ جس کے پیچھے شوکت علی جیسے بے شمار لوگوں کا نصیب چھپا ہے لیکن ہم اس نصیب، اس مقدر پر گفتگو سے پہلے اگر چند مزید سوالوں پر غور کر لیں، اگر ہم چند مزید "اگر" کی گرد جھاڑ لیں تو ہم اس مسئلے کی گہرائی تک پہنچ سکتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے اس ملک میں اس وقت ساڑھے چھ کروڑ شوکت علی ہیں، یہ شوکت علی غیر انسانی زندگی گزار رہے ہیں، ان کے پاس روزگار ہے، روٹی ہے اور نہ ہی سر چھپانے کا ٹھکانہ۔ اقوام متحدہ، حکومت پاکستان اور ہمارے زمینوں ان شوکت علیوں کا وجود تسلیم کر چکا ہے، اس ملک میں شوکت علی جیسے ایک کروڑ 45 لاکھ پڑھے لکھے بے روزگار رہی ہیں۔ یہ سارے بے روزگار شوکت علی، بچھلے کئی برسوں سے لوکری کیلے دھکے کھا رہے ہیں۔ یہ ملک شوکت علی جیسے انسانوں کے پیئیر پارٹس کی مارکیٹ بن چکا ہے، ہمارے سینکڑوں ہزاروں شوکت علی اپنا ایک ایک گروہ، ایک ایک آنکھ اور ایک ایک آنٹ بچ کر زندگی گزار رہے ہیں۔ اس ملک کے سینکڑوں ہزاروں شوکت علی عدالت میں جانے کی بجائے خودکشی کا راستہ منتخب کرتے ہیں اور اس ملک میں لوگ بجلی کا بل دینے کیلئے ڈاکے مارنے پر مجبور ہیں اور ضروریات زندگی تک پہنچنے کیلئے تالان کا طریقہ استعمال کر رہے ہیں۔ سوال یہ ہے ان لوگوں کا کیا تصور ہے؟ اور حکومت تک ان لوگوں کے مسائل، ان لوگوں کی تنخیاں اور ان لوگوں پر ہونے والے ظلم کب پہنچیں گے اور کیا حکومت ان لوگوں کی طرف سے بورڈ لگنے کا انتظار نہیں کر رہی؟ کیا حکومت ان لوگوں کے شوکت علی بننے کا انتظار نہیں کر رہی؟ اور کیا جب تک یہ لوگ اپنے اپنے بیچ پیلا کر کے کا اعلان نہیں کرتے اس وقت تک حکومت کے کالوں پر جوں نہیں رینگے گی، کیا اس وقت تک ان کی آواز جناب وزیراعظم شوکت عزیز اور صدر جنرل پرویز مشرف تک نہیں پہنچے گی؟ کیا ان لوگوں کا تصور ان کی شرم، ان کی حیا، ان کی سفید پوشی اور ان کا ضمیر ہے؟ کیا ان کی چپ اور ان کا صبر ان کا جرم ہے؟ اور

کیا اس ملک میں حکومت تک پہنچنے کیلئے خود سوزی، خود کشی، بچوں کی نیلامی اور میڈیا کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا؟ اور کیا لوگ اب تھانے، عدالت اور حکومت تک پہنچنے کیلئے صرف اخبارات اور ٹیلی ویژن کا راستہ استعمال کریں گے؟ کیا ہماری عدالتیں اور ہماری حکومتیں اخبارات اور ٹیلی ویژن دیکھ کر لوگوں کی مظلومیت اور ضروریات کا اندازہ کریں گی؟ سوال یہ ہے اگر ڈگری شوکت علی کا حق تھا تو اسے یہ حق بچوں کی نیلامی کے بعد کیوں ملا؟ اور اگر شوکت علی اور اس کے مسائل حکومت اور اس ملک کی ذمہ داری نہیں تھی تو ہمارے وزیر اعظم نے شوکت علی کی دادرسی کیوں کی؟ یہ سوال اور یہ اگر وہ بنیادی نقطے ہیں جن میں ہمارے آنے والے نکل کے تمام سو راج چھپے ہیں، یقین کیجئے اگر ہم نے آج ان سوالوں کا جواب تلاش نہ کیا تو ہمارے لیے کل گزرا مشکل ہو جائے گا۔

میں اس معاشرے کا ایک ادنیٰ شہری ہوں، میں جو نہیں سمجھتا اپنے جیسے ادنیٰ شہریوں کے درمیان رہتا ہوں لہذا میں روز اس معاشرے میں آنے والی تبدیلیاں نوٹ کرتا ہوں، میں دیکھ رہا ہوں لوگ اب جائز حق کیلئے عدالت کی بجائے اخبار کے دفتر جاتے ہیں، لوگ جج کے بجائے صحافی کا دروازہ بجاتے ہیں اور لوگ حکومت تک رسائی کیلئے اخباروں اور ٹیلی ویژن چینلوں کا رخ کرتے ہیں، لوگوں کا یہ رویہ ثابت کرتا ہے ہماری سرکاری اور قانونی مشینری جواب دے چکی ہے، حکومت کے دل سے ضمیر اور ذمہ داری ختم ہو چکی ہے اور اب حکومت سے کام لینے کا صرف اور صرف ایک ہی طریقہ بچا ہے اور وہ طریقہ شوکت علی فارمولا ہے۔ یہ صورتحال انتہائی خطرناک ہے کیونکہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو شاید وہ وقت آتے دیر نہ لگے جب لوگ ڈاکٹر سے دوا لینے، دکاندار سے چینی خریدنے، بجلی کا میٹر لگوانے، تھانے دار سے رہت لکھوانے، جج صاحب سے انصاف لینے اور وزیر کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے جسم پریم باندھیں۔ ان کے دفتر میں داخل ہوں، صاحب کو ہم کی ہن دکھائیں، اپنی فائل پر دستخط کرائیں اور گھر واپس آ جائیں، یقین کیجئے اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو لوگ روزانہ جیل کی بوتلیں لیکر گھر سے نکلیں گے اور انہیں جہاں کوئی مشکل پیش آئے گی وہ اپنے جسم پر تیل چھڑکیں گے اور ماچس لہرا کر آگے بڑھ جائیں گے۔ آج شوکت علی جج جج کر اس معاشرے کو یہ پیغام دے رہا ہے جس ملک میں ضمیر مر جاتا ہے اس ملک کے فیصلے جیل کی بوتلیں اور ہم کرتے ہیں ہماری حکومت خود کش دھماکے کرنے والے نوجوانوں کے ہارے میں منکر ہے، ہمارے وزراء ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں "یہ لوگ کون ہیں اور یہ کہاں سے آرہے ہیں" انہیں کون بتائے یہ لوگ عظیم کی کوکھ سے جنم لے رہے ہیں اور یہ سب شوکت علی جیسے لوگوں کا ہم ایڈمنسٹریشن ہیں۔ انہیں کون بتائے اگر انہوں نے اپنی سمت درست نہ کی تو یہ سلسلہ بچوں کی فروخت سے، مبارکی تک وسیع ہو جائے گا اور ہمارا ہر شہریاں چنوں بن جائے گا۔





## پاؤں سے گلے تک

یہ 27 مارچ 2007ء کا دن تھا اور لیاقت باغ راولپنڈی میں صدارتی جلسہ ہو رہا تھا، اچانک ایک خاتون جلسہ گاہ کی درمیانی صفوں سے اٹھی اور وہ سٹیج کی طرف بڑھنے لگی، سیکورٹی اہلکاروں میں سرایتی سیجی بھیل گئی، جلسہ گاہ کے مختلف کونوں میں کھڑے "سفید لباس" والے آگے بڑھے اور انہوں نے غیر محسوس طریقے سے خاتون کو گھیرنا شروع کر دیا لیکن خاتون ان کے گھیرے سے باہر نکل گئی، سفید لباس کے بعد پولیس کا سیکورٹی سرکل تھا، پولیس نے بھی خاتون کے راستے میں مزاحم ہونے کی کوشش کی لیکن خاتون پولیس اہلکاروں کو بھی دھکیل کر آگے بڑھ گئی اس کے بعد آری کا سرکل تھا، خاتون نے آری کا سرکل بھی توڑ دیا اور اس کے بعد صدر کی پیشکش سیکورٹی تھی، یہ صدر کے ذاتی کمانڈوز ہیں اور صدر ان سب کے ناموں تک سے واقف ہیں، خاتون کمانڈوز کا حلقہ نہیں توڑ سکتی تھی کیونکہ ان لوگوں کو خصوصی اختیارات حاصل ہیں، یہ لوگ وفاقی وزراء سے وزیراعظم تک کو روک سکتے ہیں اور جب تک ان کی تسلی نہیں ہوتی یہ کسی شخص کو صدر کے قریب نہیں پہنچنے دیتے، کمانڈوز نے خاتون کو گھیر لیا اور اسے سٹیج سے دور دھکیلے گئے لیکن خاتون نے پیچھے ہٹنے سے انکار کر دیا، صدر تقریر کیلئے ڈائس پر پہنچ چکے تھے صدر نے یہ منظر دیکھا تو انہوں نے کمانڈو کو آواز لگائی، "بابر اس کو چھوڑ دو اس کو آئے دو اس سے کاغذ لے لو" لیکن صدر کے حکم کے باوجود بابر خاتون کو چھوڑنے پر رضامند نہ ہوا، صدر نے دوبارہ حکم دیا جس کے بعد بابر خاتون کو لے کر سٹیج پر پہنچ گیا، خاتون صدر کے پاس پہنچی اور ان کے قدموں میں گر گئی، صدر نے اسے اوپر اٹھایا، اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس سے اس کا مسئلہ پوچھنے لگے، خاتون دو منٹ تک انہیں اپنا مسئلہ سمجھاتی رہی، وہ ساتھ ساتھ اپنے آپ تسو بھی پوچھتی جاتی تھی۔

یہ خاتون کون تھی؟ یہ صدر کے پاؤں میں کیوں گری؟ اس نے صدر کے ساتھ کیا گفتگو کی اور صدر کے ساتھ ملاقات کے بعد یہ خاتون کہاں چلی گئی؟ 28 مارچ تک کسی شخص کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا، تاہم 28 مارچ کے تمام اخبارات میں اس منظر کی تصاویر ضرور شائع ہوئیں، ان تصاویر میں خاتون صدر کی طرف بڑھ رہی تھی، وہ صدر کے پاؤں میں بھی جھکی ہوئی تھی، صدر اسے اٹھا بھی رہے تھے اور اسے دلاس بھی دے رہے تھے، 28 مارچ کو یہ خاتون راولپنڈی پولیس کلب پہنچی، اور اس نے اپنا مسئلہ صحافیوں کے سامنے رکھ دیا، یہ خاتون فہمیدہ اعظم خٹمی، فہمیدہ کا بھائی اشرف محمود کیانی پولیس کی حراست میں لقل ہو گیا تھا، فہمیدہ اور اس کی بہن محمود نے انصاف کیلئے تمام



مستحق دروازوں پر دستک دی تھی لیکن ان کی سنوآئی نہیں ہوئی تھی لہذا انہوں نے 27 مارچ کو لیاقت باغ کے جلسہ عام میں صدر تک پہنچنے کا فیصلہ کیا، فہمیدہ سیکورٹی کے سارے سرکل تو ذکر صدر تک پہنچ گئی، صدر نے اس کی بات غور سے سنی، اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اسے یقین دہانی کرائی، ”میں ذاتی دلچسپی لے کر آپ کا مسئلہ حل کراؤں گا اور مڑمان خواہ کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہوں، میں انہیں سزا کے عمل سے ضرور گزراؤں گا“ صدر نے فہمیدہ کو یقین دلایا، ”وزیر اعلیٰ اور آئی جی پنجاب اس کیس پر خصوصی توجہ دیں گے اور میں اس سارے عمل کی براہ راست نگرانی کروں گا“ فہمیدہ اظہر کا کہنا تھا، وہ صدر کی یقین دہانی سے مطمئن ہیں۔

مجھے یقین ہے فہمیدہ اظہر کی یہ کوشش رنگ لائے گی اور صدر صاحب ذاتی دلچسپی لے کر قاتلوں کو کفر کردار تک پہنچا دیں گے لیکن سوچنے کا مقام ہے، کیا کسی شخص کے قاتلوں کو گرفتار کرنا صدر کا کام ہے؟ اور اگر یہ صدر کا کام ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے اگر اس دن فہمیدہ اظہر سیکورٹی کے پانچ سرکل توڑنے میں کامیاب نہ ہوتی تو اشرف محمود کیانی کے قتل کا کیا بنتا؟ کیا اس کے باوجود قاتل پکڑے جاتے؟ اور کیا فہمیدہ کو اس زندگی میں انصاف مل جاتا؟ سوچنے کا مقام ہے کیا صدر معظم کے قدموں میں فہمیدہ کا جھکا ہوا سر یہ ثابت نہیں کرتا اس ملک میں انصاف کا کوئی نظام نہیں اور اس ملک میں جس شخص نے بھی انصاف لینا ہے اسے صدر تک پہنچنا پڑے گا، اسے صدر کے پاؤں میں گرنا پڑے گا اور اگر صدر اس کی بات غور سے نہیں سنتے تو اسے اس مملکت خدا داد میں انصاف نہیں مل سکتا، کیا یہ خاتون اور اس کا یہ عمل ثابت نہیں کرتا پاکستان کے ادارے اپنا وقار اپنی قوت اور تحریک کھو چکے ہیں اور اب لوگ تھانے یا عدالت کا رخ کرنے کی بجائے صدر کے پاؤں پڑنا مناسب سمجھتے ہیں اور کیا فہمیدہ اظہر اور اس کا جھکا ہوا سر پاکستان کو ایک ”ملکل منیٹ“ ثابت نہیں کرتا، کل میرے ایک دوست نے کینیڈا سے فون کیا، یہ صاحب اس قسم کے منظر دیکھ کر پانچ برس پہلے ملک چھوڑ گئے تھے انہوں نے مجھے فون کیا اور دیکھی لہجہ میں بولے ”کینیڈا میں چیف جسٹس سب سے محترم اور با اختیار شخص ہوتا ہے، کینیڈا کی پوری پارلیمنٹ، پوری کابینہ، صدر اور ساری سیاسی جماعتیں مل کر چیف جسٹس کی طرف انگلی نہیں اٹھا سکتیں، چیف جسٹس کسی بھی وقت صدر کو عدالت میں طلب کر سکتا ہے اور صدر کو اس کے سامنے سرتابی کی جرأت نہیں ہو سکتی“ میرے دوست کا کہنا تھا ”وس مارچ کو کینیڈا میں پاکستان کے چیف جسٹس کی غیر فعالیت اور ہاؤس آریسٹ کی خبر پہنچی تو کینیڈا کے لوگ حیران رہ گئے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا شروع کر دیا، کیا آپ کے ملک میں صدر چیف جسٹس سے زیادہ با اختیار ہے؟ اور کیا پاکستان میں صدر چیف جسٹس کو غیر فعال کر سکتا ہے؟“ میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا، میرے دوست نے ذرا سے توقف کے بعد کہا ”ترقی یافتہ قوموں نے عدالت کو جان بوجھ کر حلقہ بادشاہ صدر، وزیر اعظم، کابینہ اور چودہ برسوں سے زیادہ اختیارات دے رکھے ہیں، یہ لوگ جانتے ہیں عدالت معاشرے کا وہ فورم ہوتا ہے جس تک تمام لوگ پہنچ سکتے ہیں لہذا اگر ان کی عدالت ملک کے تمام عہدوں سے بلند ہوگی تو عوام کا عدالت پر اعتماد قائم ہوگا، عدالت پر اعتماد نظام کو طاقتور بنائے گا اور ایک طاقتور نظام ملک کو ترقی دے گا“ میرے دوست کا کہنا تھا ”تم دنیا بھر کے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کا مطالعہ کر لو تمہیں اقوام عالم میں ہر وہ ملک ترقی یافتہ اور مضبوط ملے گا جس میں

عدالت آزاد اور عدالتی نظام طاقتور ہوگا اور تم ہر اس ملک کو پس ماندہ پاؤ گے جس کا عدالتی نظام کمزور اور حکمران مضبوط ہوں گے۔ میرے دوست کا کہنا تھا ”حکومت کی رٹ عدالتوں سے شروع ہوتی ہے اور عدالتوں پر ختم ہوتی ہے“

مجھے اس کی بات میں بڑا وزن محسوس ہوا یہ حقیقت ہے پاکستان کا عدالتی نظام نہ صرف کمزور ہے بلکہ اس سے عوام کی توقعات تک ختم ہو چکی ہیں اب سوال پیدا ہوتا ہے اس نظام کو کس نے کمزور بنایا؟ پاکستان میں بدحتمی سے 40 برس فوجی حکمران رہے ہیں لہذا اس بگاڑ کی زیادہ تر ذمہ داری فوجی حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے تاریخ بتاتی ہے دنیا میں جب بھی کوئی آمر غیر قانونی اور غیر آئینی طریقے سے اقتدار پر قابض ہوتا ہے تو وہ سب سے پہلے عدالت پر قبضہ کرتا ہے وہ قانون فہم انصاف پسند اور ایماندار جوں کو قمارغ کرتا ہے اور ان کی جگہ کمزور اور ”معاذہ فہم“ بیج تعلیمات کر دیتا ہے اس کے بعد وہ جوں اور عدالتی نظام کو کرپٹ کرتا ہے اس ساری انکسار ساز کے نتیجے میں عدالتیں اس آمر کو روک نہیں دیتی ہیں وہ اس حکمران کو آئینی شکل دیتی ہیں اور جوں ہی یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے عدالتیں حکمرانوں کا فیصلی ادارہ بن کر رہ جاتی ہیں اور حکمران جوں اور چیف جسٹس حضرات سے بھی اسی لہجے میں بات کرتا ہے جس میں وہ اپنے ٹیلی فون آپریٹر سے مخاطب ہوتا ہے تاریخ ثابت کرتی ہے جب یہ صورتحال پیش آتی ہے تو عوام کا عدالت سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور وہ جج کی بجائے حکمرانوں کے پاؤں میں انصاف تلاش کرنے لگتے ہیں آپ پوری دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی جس جس ملک میں عدالتیں مضبوط تھیں اس ملک میں کبھی مارشل لا لگائی اور نہ ہی کسی شخص کو اقتدار پر قبضے کی جرأت ہوئی مزید آج تک جس ملک میں مارشل لا لگتے رہے وہ ملک سماجی اور معاشی لحاظ سے دوسرے ملکوں سے پیچھے رہ گئے آپ یورپ کو دیکھ لیجئے مشرقی یورپ مغربی یورپ سے معاشی اور سماجی لحاظ سے پیچھے ہے کیوں؟ اس کی واحد وجہ فوجی حکمران تھے مشرقی یورپ میں بچاس ساٹھ برس تک آمریت رہی جبکہ اس کے مقابلے میں فرانس، برطانیہ، جرمنی اور آسٹریا میں جمہوریت اور قانون کی حکمرانی تھی آپ یورپ میں چین اٹلی اور پرچل کو دیکھ لیجئے یہ تینوں ملک بھی ترقی کی روڑ میں دوسرے یورپی ملکوں سے پیچھے ہیں اس کی وجہ بھی آمریت اور مارشل لا تھی یہ ملک بھی آج سے تیس چالیس برس پہلے تک یو نظام کا فکار تھے چنانچہ یہ یورپ کے دوسرے ملکوں سے پیچھے رہ گئے آج سے تیس چالیس برس پہلے ان ملکوں کے حکمران عدالت کے زیرِ انتظام آگئے چنانچہ اب یہ ملک بھی ترقی کر رہے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں 2007ء میں صدر چیف جسٹس کو گھر بلا لیتے ہیں اور اسے غیر فعال کر کے گھر میں پھینک دیا جاتا ہے چنانچہ آج اس کا یہ نتیجہ ہے لوگوں کو انصاف کیلئے صدر کے پاؤں میں جھٹکا پڑ رہا ہے یا پھر جامعہ خلیفہ کی طالبات انصاف کیلئے ڈنڈے لے کر مرکز پر نکلے پر مجبور ہیں۔

اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو ثابت ہوتا ہے یہ وہ حالات ہیں جو کامیاب ریاستوں کو ”فیل ٹیٹ“ بنا دیتے ہیں انصاف کے راستے میں حائل یہ وہ رکاوٹیں ہیں جو خونی انقلاب کو راستہ دیتی ہیں اور پہلے وہ المیہ جیسی خواتین ہوتی ہیں جو حکمرانوں کے پاؤں سے اٹھ کر ان کے گلے تک پہنچ جاتی ہیں۔





# حاشیہ آزاد

## ہم بد دعاؤں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے

محمد اصغر فاروقی کی کہانی بھی بہت دلچسپ ہے، اصغر فاروقی جلال پور بھراں والد کے گاؤں بیٹ کمر سے تعلق رکھتے ہیں ان کے بھائی صدیق اکبر کے ساتھ 2004ء میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا یہ 24 مارچ کا دن تھا، صدیق اکبر اپنے کھیتوں میں پانی لگا رہا تھا، سامنے سڑک پر تین ٹیکسیاں رکیں ان میں سے سادہ کپڑوں میں چند افراد نکلے انہوں نے صدیق اکبر کو بلایا اور خود کو زرعی آفیسر ظاہر کرتے ہوئے مندم کے خوشے توڑنے اور زمین سے مٹی اٹھا کر شاہروں میں ڈالنے لگے۔ جب صدیق اکبر ان کے قریب گیا تو ان سب نے اسے گھبرے میں لے لیا اور اس سے رقبہ کے متعلق سوالات کرنے لگے، صدیق نے ان کو بتایا زمین کی پیداوار کے متعلق صحیح معلومات اس کے چچا دے سکتے ہیں، میں ان کو جانتا ہوں۔ صدیق اکبر جانے لگا تو ان لوگوں نے اسے دبوچ لیا، اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی، اسے گاڑی میں بٹھایا اور اسے پندرہ کلومیٹر دور ملک مشرق احمد لاہک کے ڈیرے پر لے گئے، وہاں ایلینٹ فورس کے چالیس افراد موجود تھے۔ یہ لوگ صدیق اکبر کو کھلی پور سادات کے قریب ایک باغیچے میں لے گئے، اسے آم کے درخت سے باندھا اور اس کے جسم پر لاشعیاں برساتنا شروع کر دیں، سڑک پر موجود سیڑیوں آدمیوں نے صدیق اکبر کی چھینیں سنیں اور چھینیں سن کر رو پڑے، وہ لوگ صدیق اکبر کو چھڑانے کیلئے آگے بڑھنے لگے تو ایلینٹ فورس نے ان لوگوں کو دھمکا کر پیچھے دھکیل دیا۔ بعد ازاں پولیس نے ان کے گھر پر دھاوا بول دیا اور گھر میں گھس کر اڑھائی گھنٹے تک تلاشی لیتے رہے۔ جب ان سے وجہ پوچھی گئی تو وہ کہنے لگے، قانون کو اپنا کام کرنے دیں۔ گھر کے کیمین بے بس اور خوفزدہ ہو کر اپنے گھر کی پامانی دیکھتے رہے۔ اس دوران چھوٹا بھائی مصدر علی سامنے آ گیا تو اس کو بھی اغواء کر لیا گیا۔ صدیق اکبر کے اغواء کے بعد پورے علاقے میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ محمد اصغر فاروقی کے گھر والے سہم سے گئے، ماں کی متاثرہ گئی والد صاحب کا دل اجڑ گیا، صدیق اکبر کی اہلیہ پر غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور ان کے چار بیچے باپ کی شفقت سے محروم ہو گئے۔

صدیق اکبر کے لواحقین نے مقامی تھانے سے رابطہ کیا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا، اسی شب ملتان پکھری روڈ پر واقع انوسٹی گیشن پر رابطہ کیا گیا تو انہوں نے بھی چپ سادھ لی ان لوگوں نے ادنیٰ سے لے کر مٹی



افسران تک سے پوچھا لیکن کسی نے انہیں صدیق اکبر کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ سیاسی زعماء کے دروازے کھٹکھٹائے گئے۔ قاضی حسین احمد لیاقت بلوچ، مولانا عبدالغفور حیدری، مولانا فضل الرحمان وغیرہ سے بھی درخواست کی گئی مگر یہ سب کوششیں صدمہ بھرا اثبات ہوئیں۔ صرف عدالت کا دروازہ جبین حزیں سے ناآشکارا پہنچہ غربت تھی یہ لوگ دکلاء کی فیس ادا نہیں کر سکتے تھے دریاے چناب کے کنارے بیٹھا خاک بھانکنے والا بڑھا کسان سرد آہوں کے سوا دکلاء کو کیا دے سکتا تھا؟ 26 مارچ 2004ء کی رات ان لوگوں کے فون کی گھنٹی بجی، ریسورٹ اٹھایا تو کوئی بولا، "نانی امی! میں صدیق اکبر ہوں مجھے ابجنسی والے لے آئے ہیں" بس بات کٹ گئی صدیق اکبر کی آواز ہلکی ہلکی آ رہی تھی جیسے مریض کی آواز ہو۔ قریباً ڈیڑھ ماہ بعد چھوٹے بھائی صغیر کو روکا کر دیا گیا اور اسے پنڈی سے ملتان والی بس پر بٹھادیا گیا۔ اس نے بڑے بھائی صدیق اکبر کا پیغام ان الفاظ میں سنایا، "سب کو سلام کہنا امی اور ابو کو کہنا میں آپ کی خدمت نہیں کر سکا مجھے معاف کر دیں میرے لئے دعا کریں" یہ الفاظ زندگی سے مایوسی کا اظہار تھے اور ان الفاظ نے والدین اور عزیز و اقارب کو لرزادیا۔ مزید ڈیڑھ ماہ گزرا تو ایک بار پھر صدیق اکبر کی خاندان سے بات کرائی گئی۔ اس وقت صدیق اکبر نے کہا، "سب نماز پڑھا کریں میں سانس کے پاس ہوں جب وہ چاہیں گے چھوڑ دیں گے۔"

اس کے بعد محمد اصغر فاروقی میرے ساتھ خطاب ہوئے اور انہوں نے کہا، "ہم لوگوں نے اس سال بھائی کے بغیر عید گزاری تھی میں نے عید کے دن کچے کرے کے ایک کونے میں اپنی ماں کو پرانے مصلے پر بیٹھے دیکھا تھا وہ صدیق اکبر کی تصویر دونوں ہاتھوں میں تھا سے کہہ رہی تھیں۔ صدیق اکبر بیٹے! آج عید کا دن ہے آج تو منہ دکھا جاتے۔ وہ تصویر کو تکتے تکتے سسکیاں لینے لگتی تھیں اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں پھر بوتلیں: خدایا میرے بیٹے کی عید کا کیا ہوا؟ باپ سے دور دوستوں سے محروم بے تصویر قیدی کے ساتھ کیا جیتی ہوگی؟ رہا! میرے بیٹے کی مدد کرو جو میرے بیٹے کی مدد کرے یا میرے پروردگار تو اس پر بھی آسانیاں پیدا کر دے عید گاہ سے والہی پر میرے ابو نے جھر جھری سی لی اور بولے، "صدیق بیٹا! تیرے بغیر ہماری عیدیں پھینکی گز رہی ہیں۔ تم والہیں آ جاؤ" اصغر فاروقی کا کہنا تھا، "میرے والد صاحب دوسرے بارٹ ایک کا شکار ہو چکے ہیں۔ صدیق اکبر کا بیٹا رحمان! عید کے لئے تیار ہو کر میرے ساتھ گھر سے باہر نکلا تو اس نے سامنے دیکھا اس کا دوست عثمان باپ کے کندھے پر بیٹھا عید گاہ جا رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا، "چاچا اگر آج میرے ابو گھر پر ہوتے تو کیا میں بھی ان کے کندھے پر بیٹھ کر عید گاہ جاتا" ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو پھٹک پڑے۔

اصغر فاروقی کا کہنا تھا، "اس کا بھائی مجرم ہو گا لیکن کیا مجرم کو عدالت میں پیش نہ کرنا اس سے بڑا جرم نہیں؟" اس کا کہنا تھا، "خدا کیلئے ہمیں ہمارے بھائی کی زندگی یا موت کی اطلاع تو دے دیں! اگر وہ مر چکا ہے تو ہمیں بتا دیں تاکہ ہم اپنے دل پر پتھر رکھ لیں، ہم اس کے بچوں کے نام کے سامنے جیم لکھ دیں اور اگر وہ زندہ ہے تو ہمیں اتنا بتا دیں، کیا ہم زندگی میں دوبارہ اس کی شکل دیکھ سکیں گے؟" میرے پاس اصغر فاروقی کے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا، میں اسے کیا بتاتا ہمارا اپنا ایک کو لیگ سہیل قلندر دو ماہ غائب رہا تھا اور پورے ملک کے صفائی مل کرا سے

باز یاب نہیں کرا سکے تھے یہ تو افراد کاروں کی "مہربانی" تھی جس کی وجہ سے سہیل قلندر باہر آ گیا۔ میں اس کو کیا بتاتا 21 جنوری کو سہیل قلندر کے بیٹے کی سالگرہ تھی وہ سالگرہ کا ایک لینے گیا تھا اور راستے میں عائب ہو گیا تھا سہیل قلندر کے دوستوں نے اس کے بیٹے جبرک کی سالگرہ 22 فروری کو اس کی رہائی کے بعد سنا لی تھی ہم لوگ تو خود بے بس اور لاچار ہیں۔ میں اسے کیا بتاتا ہم جیسے لاچار لوگ صدیق اکبر جیسے لوگوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتے؟ ہم لوگ اب اس ملک کے حکمرانوں کیلئے صرف بددعا کر سکتے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے صرف اتنا عرض کر سکتے ہیں یا باری تعالیٰ جو لوگ تمہارے بندوں کو تکلیف دیتے ہیں تو انہیں زندگی میں ایک بار ایسی اذیت سے ضرور گزار تو انہیں ایک بار اتنا ضرور بتا دے جب کوئی بیٹا شام کو گھر نہیں آتا تو ماں کے کبچے کے کون کون سے حصے پر ہلینڈ چلتے ہیں اور باپ کے جگر کا کون کون سا حصہ کٹتا ہے۔ یا باری تعالیٰ زندگی میں کم از کم ایک بار ان کے بچے بھی ماں کا ہاتھ پکڑ کر اتنا ضرور پوچھیں "ماما پاپا کب آئیں گے" یا باری تعالیٰ ان کے بچے بھی زندگی کی عیدیں اور شب براتیں ان کے کندھوں کی محرومی میں بسر کریں۔ میں اسے کیا بتاتا ہم جیسے بے زبان لوگ بددعاؤں کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ میں اسے کیا بتاتا ہمارے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری نے صدیق اکبر جیسے لوگوں کیلئے کچھ کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش کے نتیجے میں وہ آج خود انصاف تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں اسے کیسے بتاتا چیف جسٹس کے بعد اب کسی شخص کی زبان میں صدیق اکبر جیسے لوگوں کیلئے آواز بلند کرنے کی ہمت نہیں۔ میں اسے کیسے بتاتا اقتدار کے چہرے پر آنکھیں ہوتی ہیں اور نہ ہی سینے میں دل اور جس کے پاس دل ہوا وہ بھی آنکھیں ان کی کتاب میں رحم کے لفظ نہیں ہوتے۔"



## خوف الہی کی نعمت

حاجی عبدالرؤف کا سفر 2004ء میں شروع ہوا 16 فروری 2004ء کو ان کے ہاں دو جڑواں بچے پیدا ہوئے تھے۔ بچے لہذا کمزور تھے، لوگوں کا خیال تھا جڑواں بچے عام بچوں کے مقابلے میں کمزور ہوتے ہیں، یہ بچے بڑے ہو کر ٹھیک ہو جائیں گے لیکن دو ہفتے بعد بچوں کا رنگ پیلا ہو گیا، حاجی صاحب انہیں مقامی ڈاکٹر کے پاس لے گئے، ڈاکٹر نے بچوں کو خون لگوا دیا، بچے ٹھیک ہو گئے لیکن پندرہ دن بعد بچے دوبارہ پیلے پڑ گئے، حاجی صاحب نے ایک بار پھر خون لگوا دیا، اس دوران کسی نے مشورہ دیا، آپ بچوں کا میڈیکل چیک اپ کرائیں، حاجی صاحب بچوں کو راولپنڈی لے گئے، انہوں نے ”اے ایف آئی بی“ سے بچوں کا ٹیسٹ کرایا، پتہ چلا بچے مصلیسیما کے موزی مرض میں مبتلا ہیں، حاجی صاحب کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا دیا گیا اور اس ٹکڑے کے بعد ان کا سفر شروع ہو گیا، وہ سرائے عالمگیر کے ایک سابق ایم بی اے ملک حنیف اعوان کے پاس گئے، ملک صاحب انہیں گجرات کے ضلعی ناظم چوہدری شفاعت حسین کے پاس لے گئے، چوہدری صاحب نے انہیں راولپنڈی کے آرٹھرورسز یون میر وٹانس پلانٹ سنٹر بھجوا دیا، ڈاکٹروں نے معائنے کے بعد فیصلہ دیا اگر میں لاکھ روپے کا بندوبست ہو جائے تو بچے ٹھیک ہو سکتے ہیں، حاجی صاحب واپس گجرات چلے گئے، چوہدری شفاعت حسین نے ان کے لئے میں لاکھ روپے کا بندوبست کر دیا، وہ چیک اور سچے لے کر راولپنڈی آ گئے، ڈاکٹروں نے حاجی صاحب کے دوسرے بچوں کا یون میر وٹانس چیک کیا لیکن بد قسمتی سے بچوں کا یون میر وٹانس نہ کر سکا، ڈاکٹروں نے جواب دے دیا، حاجی صاحب چوہدری شفاعت حسین کا چیک اور سچے لے کر واپس کھاریاں چلے گئے، اس کے بعد ان کا ایک نیا سفر شروع ہو گیا۔

بریگیڈر ظہیر اللہ آرٹھرورسز یون میر وٹانس پلانٹ کے سینئر ڈاکٹر ہیں، بریگیڈر صاحب نے کمپیوٹر پر سرچ کی، پتہ چلا اٹلی میں ان بچوں کا علاج ہو سکتا ہے، حاجی عبدالرؤف بریگیڈر صاحب کا خط لے کر چوہدری شفاعت کے پاس چلے گئے، چوہدری صاحب نے انہیں کہا ”تم اٹلی سے خرچ کا تخمینہ لگواؤ، ہم جیسوں کیلئے کوشش کریں گے“ حاجی صاحب نے بچوں کی رپورٹیں روم بھجوا دیں، وہاں سے جواب آیا تو اس جواب نے حاجی صاحب کو جڑوں سے ہلا دیا، روم کے انسٹی ٹیوٹ نے بتایا ”ہم بچوں کا علاج کر سکتے ہیں لیکن اس پر دو لاکھ 91 ہزار 5 سوسو پور روپے آئے گا“ یہ رقم دو کروڑ روپے بنتی تھی اس میں آمد و رفت اور چار ماہ تک اٹلی میں رہائش کے



اخراجات شامل نہیں تھے، اب حاجی عبدالرؤف کی مالی حالت یہ تھی کہ وہ اپنی جیب سے لاکھوں روپے لے کر لائسنس نہیں جاسکتے تھے، چودھری شفاعت صاحب نے حاجی صاحب کو بتایا، اتنی بڑی رقم کا بندوبست ممکن نہیں تاہم میں وفاقی وزیر محبت محمد نصیر خان کے نام رقعہ دے دیتا ہوں، تم ان سے مل لو، حاجی صاحب رقعہ لے کر اسلام آباد آ گئے، انہیں نصیر خان جیسے معروف وزیر یک پہنچنے میں کتنے دن لگ گئے اور اس ملاقات کے لئے انہیں کیا کیا پاپڑ پٹینے پڑے یہ ایک الگ داستان ہے، بہر حال پانچ چھ دنوں کی لگا تار کوششوں کے بعد ان کی نصیر خان سے ملاقات ہو گئی، نصیر خان نے انہیں بڑے اگیز یکنوڈ انریکٹر فضل ہادی کے پاس بھجوا دیا، حاجی عبدالرؤف تین دن فضل ہادی کے پیچھے بھاگتے رہے آخر میں ان کے ساتھ ملاقات ہوئی تو انہوں نے انہیں تھیلیسیما سنٹر بھجوا دیا، وہ سنٹر چلے گئے وہاں وہ ڈاکٹر طاہرہ ظفر سے ملے، ڈاکٹر صاحبہ نے انکشاف کیا، اس سنٹر میں تھیلیسیما کا علاج نہیں ہوتا، یہ لوگ مریضوں کو محض خون لگاتے ہیں، حاجی صاحب ایک بار پھر نصیر خان کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے لیکن اب نصیر خان سے ملاقات مشکل ہو چکی تھی، وہ بچوں کو لے کر ”جیو“ ٹیلی ویژن چلے گئے، جیو نے ان پر ایک ”نیزو ٹیک“ بنادیا، یہ ٹیک دو بار نشر ہوا لیکن بد قسمتی سے یہ ٹیک صدر ریاض و وزیراعظم دونوں کے فون میں نہ آ سکا، جیو کے ایک رپورٹر نے انہیں کشمالہ طارق کا نمبر دے دیا، حاجی عبدالرؤف نے کشمالہ کو فون کیا، ٹیلی فون پر ان سے بات ہوئی، انہوں نے حاجی صاحب سے ”رنگ یک“ کا وعدہ کیا لیکن بعد ازاں وہ بھی ان بے شمار اہم کاموں میں الجھ گئیں جن میں آج کل ہماری حکومت الجھی ہوئی ہے۔ وہاں سے مایوسی ہو کر حاجی صاحب نے میڈیا سے رابطہ کیا، وہ بچوں کو لے کر تمام چھوٹے بڑے اخبارات کے دفاتر گئے، وہ تمام ٹیلی ویژن چینلوں کے سنڈویچ پیچھے میڈیا پر خبریں، مضامین اور تصویری رپورٹیں چلیں لیکن کسی طرف سے کوئی خوشخبری نہ ملی، وہ مایوسی ہو گئے، مایوسی کے اس عالم میں انہوں نے مجھے فون کیا، ان کا خیال تھا وہ اگر بچوں کے کہیں کی فائل مٹائیں، یہ فائل ساڑھے چار سو ارکان اسمبلی اور سینیٹر کو بھجوا دیں اور میں ان تمام سینیٹروں اور ارکان اسمبلی سے درخواست کروں اور وہ اپنی مراعات اور تنخواہوں میں سے صرف پچاس پچاس ہزار روپے ان بچوں کو دے دیں تو بچوں کی زندگی بچ سکتی ہے لیکن میں نے ان سے عرض کیا، آپ ابھی چند سیاستدانوں سے ملے ہیں، آپ کو ان چند سیاستدانوں کے دروازے سے مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملا لیکن جب آپ ایسے ساڑھے چار سو لوگوں کے دروازوں پر جائیں گے تو آپ کی مایوسی میں ساڑھے چار سو گنا اضافہ ہو جائے گا، وہ خاموش ہو گئے، اگلے دنوں انہوں نے مجھے اپنے دونوں بچوں کی تصویر بھجوا دی۔

یہ تصویر اس وقت میری رائٹنگ ٹیبل پر پڑی ہے، میں جب بھی اس تصویر کو دیکھتا ہوں تو مجھے ان بچوں کی پہلی رنگت میں زندگی کی ہلکی ہلکی سرنخی نظر آتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے ان بچوں کی آنکھوں میں امید کی چمک ابھی سلامت ہے، ان کے ہونٹ ابھی دعا کی طرح کھلے ہیں اور ان کے چہروں پر ابھی خواہشوں کے رنگ چپکے نہیں پڑے، میں یہ تصویر دیکھتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں ابھی چند دنوں کی بات ہے یہ دعائیں یہ چمک اور یہ سرنخی مجھ جائے گی، یہ بچے ایک لاکھڑا تاتا ہوا قدم اٹھائیں گے اور زندگی کی حد عبور کر جائیں گے، اس کے ساتھ ہی مجھے محسوس ہوتا

ہے یہ بچے جاتے جاتے اس سماج، اس نظام، اس ملک اور اس ملک کے سولہ کروڑ لوگوں کے دامن پر دھبہ چھوڑ جائیں گے، یہ بچے ہمارے رزق، ہماری خوشیوں اور ہماری کامیابیوں پر ایک ایسا سیاہ دھبہ لگا جائیں گے جسے کروڑوں نیکیاں اور اربوں دعائیں نہیں دھو سکیں گی، پیارے بچے اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاشرہ کا امتحان ہوتے ہیں اور جو معاشرے اس امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں وہ اللہ کی رحمت کی فہرست سے خارج ہو جاتے ہیں اللہ ان سے اپنا رخ پھیر لیتا ہے اس وقت اس ملک میں ہزاروں ارب پتی ہیں ایسی سینکڑوں ہزاروں فرمیں ہیں جو ہر مینے اربوں روپے کا کاروبار کرتی ہیں ان فرموں میں سے اگر سو بائل فون کی کوئی ایک کمپنی ان بچوں کا علاج کرا دے، کوئی ایک ہاؤسنگ سکیم اپنے دو پلاٹ ان بچوں کے نام وقف کر دے، خالد اسحاق، ایس ایم ظفر اور ملک قیوم جیسا کوئی ایک وکیل اپنے دو سو کلن کی فیس ان بچوں کو دے دے، کوئی ایک انیورسٹی، کوئی ایک چیئر مین، ف کاسرس، ریلوے، واپڈ، دوائیں بنانے والی کوئی کمپنی یا پھر نیب جیسا کوئی ادارہ ان بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ دے، محکمہ ڈاک ان بچوں کے نام کا ایک لفافہ جاری کر دے اور عوام سے درخواست کرے وہ صرف ایک ایک لفافہ خرید لیں تو مجھے یقین ہے ایک دن میں دو کروڑ روپے جمع ہو جائیں گے، شاید آفریدی، شعیب، اختر یا انعام الحق ان بچوں کے لئے دو گھنٹے کرکٹ کھیل لیں، چار ادا کارائیں ان بچوں کے لئے شہر میں نکل آئیں، جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت اور جماعت الدعوة ان بچوں کے علاج کی ذمہ داری لے لے اور مولانا طارق جمیل اپنے خطاب میں ان بچوں کو صرف ایک منٹ دے دیں تو ان بچوں کے چہرے کی پیلاہٹ سرفی میں بدل نکلتی ہے، یہ بچے صحت مند ہو سکتے ہیں لیکن شاید ہمارے پاس دو بیمار بچوں کی زندگی کے لئے کوئی وقت نہیں، ہماری روزمرہ کی ترجیحات میں کسی غریب، کسی بے سہارا اور کسی محسوم بچے کیلئے کوئی گنجائش نہیں، میں سوچتا ہوں کل جب ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں گے اور ہمارے دامن پر ان دو بچوں کی موت کا دھبہ ہو گا تو ہم اپنے اللہ کا سامنا کیسے کریں گے، ہم اپنے رب کو اس غفلت کی کیا، جسٹی کلکیشن، 'دیں گے۔ میرا خیال ہے ہم غفلت اور بے حسی کے اس دور میں داخل ہو چکے ہیں جس میں انسان اللہ کے خوف جیسی نعمت سے بھی محروم ہو جاتا ہے جس میں انسان اور پھر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔





## اپنی چنگاریاں اپنا دامن

وہ 1990ء میں یونیورسٹی سے فارغ ہوا تھا اور اس کے بعد اس نے 2005ء تک ملویل بے روزگاری کاٹی 'ان پندرہ برسوں میں اس نے نوکری کیلئے سینکڑوں ہزاروں درخواستیں دیں، میسجوں جگہ انٹرویو دیئے بے شمار چھوٹے موٹے کاروبار کئے وہ دو سال سعودی عرب بھی رہا اور اس نے شیئرز مارکیٹ اور پراپرٹی کے کاروبار کو بھی اپنا ذریعہ بنایا لیکن اس کے مقدر کا ستارہ نہ چمکا اس کا ہر آنے والا دن پہلے سے بدتر ثابت ہوا میں اسے 1995ء سے جانتا تھا وہ ایک نہایت پڑھا لکھا ایماندار 'حساس' محنتی اور جیت شخص تھا وہ لاہور کی چار لاکھ بریروں کا ممبر تھا اور اسے ہزاروں کی تعداد میں کتابیں انڈر تحسین اس میں عاجزی اور انکساری بھی تھی اور وہ میری زندگی کا واحد شخص تھا جو 15 سال تک جبر کی جگہ میں پسے کے باوجود حالات کے سامنے نہیں جھکا تھا جس نے شکست تسلیم نہیں کی اور جس نے امید کا دامن نہیں چھوڑا تھا 2005ء جون میں اس کے ساتھ میری تواتر سے ملاقاتیں شروع ہو گئیں وہ ہر دفعہ لاہور سے اسلام آباد آتا اور میرے ساتھ گپ شپ کر کے واپس چلا جاتا تھا میں اس ملاقات کے دوران اس سے بہت کچھ سیکھتا تھا وہ مجھے بے شمار نئی کتابوں کے حوالے دیتا تھا وہ میرے لئے بے شمار نئے مضامین اور خبریں لے کر آتا تھا اور میں بعد ازاں ان خبروں ان مضامین کو بنیاد بنا کر کالم لکھتا تھا یہ سلسلہ چلتا رہا ایک بار وہ میرے پاس آیا تو وہ مجھے ذرا سا پریشان ذرا سا شکر کا اس کی گفتگو میں رہا کم تھا اور وہ بے چینی سے بار بار پرپلو بدلتا تھا میں نے وجہ پوچھی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے رونمائی ہوئی آواز میں بتایا اب اس کا حوصلہ ٹوٹا شروع ہو گیا ہے وہ اب حریذ ملت اور بے روزگاری برداشت نہیں کر سکتا میں اس کا دکھ سمجھتا تھا ذرا سوچنے جس شخص نے یونیورسٹی سے گولڈ میڈل لیا ہو چند رہ سال تک بے روزگار رہا ہو اور جس کی تنیم تین بچے ماں باپ اور بہن بھائی بھی اس کے ساتھ چکی میں پس رہے ہوں اس کا دکھ کتنا بڑا ہو گا؟ میں نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی لیکن وہ میرے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا میں اسے تسلی دیتا رہا مجھے اس وقت معلوم ہوا تسلی ہر دکھ کا دوا نہیں ہوتی جب اس کے جذبات ذرا دیر کیلئے ٹھنڈے ہو گئے تو میں نے اس سے کہا "یا ظلیل تم اپنا کام شروع کیوں نہیں کرتے" اس سوال کے جواب میں اس نے وہ تمام کام گنونا شروع کر دیئے جو اس نے ماضی



میں کئے تھے اور ان میں اسے بری طرح کھانا پڑا تھا، میں نے اس سے کہا تم ایک بار مزید کوشش کرو مجھے یقین ہے تم اس بار ضرور کامیاب ہو جاؤ گے اس نے نفی میں سر ہلادیا لیکن میں نے اصرار جاری رکھا، ہم مسلسل بحث کرتے رہے یہاں تک کہ وہ قائل ہو گیا، اس کے بعد دوسرا مرحلہ آیا ہم نے سوچنا شروع کیا کہ وہ کیا کام کر سکتا ہے اس نے بتایا وہ ڈرائیونگ کا ماہر ہے، اس نے پندرہ سال کی عمر میں گاڑی چلاتا سیکھی تھی اور وہ آنکھیں بند کر کے بھی ڈرائیونگ کر سکتا ہے، میرے ذہن میں آئیڈیا آیا میں نے اسے مشورہ دیا، تم دین خرید لو ایک کنڈیکٹر کھو خود گاڑی چلاؤ اللہ کرم کرے گا، وہ خیمہ رضامند ہو گیا، اس کے بعد دین خریدنے کا مسئلہ تھا، وہ ایک مظلوم الحال شخص تھا، اس کا کل اثاثہ بیوی کے زیورات والدین کے حج کے پیسے اور چند ہزاروں روپے کا فرنیچر تھا، اس نے کہا وہ چند لاکھ روپے جمع کر لے گا، میں نے اپنے اٹاٹوں کا تخمینہ لگایا، میری حالت بھی بہتر نہیں تھی لیکن اس کے باوجود میں نے دو لاکھ روپے کے بندوبست کا وعدہ کر لیا، وہ لاہور واپس چلا گیا۔

میں نے اسلام آباد میں ایک دوست سے بات کی، اس کے پاس ایک سیکنڈ ہینڈ دین کھڑی تھی، میں نے اس کے ساتھ دین کا سودا کیا، گیارہ لاکھ روپے میں سودا ہو گیا، اگلے ہفتے ظلیل اور میں نے اپنی اپنی "دولت" ایک جگہ جمع کی تو وہ بمشکل ساڑھے چھ لاکھ روپے بنے، ہمیں حریہ ساڑھے چار لاکھ روپے درکار تھے، ظلیل اور میں دوبارہ کوششوں میں لگ گئے لیکن ہمیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی، اس افراتفری اور بے عملی میں پندرہ دن گزر گئے، اس کے بعد ظلیل اچانک غائب ہو گیا، وہ ایک ہفتے بعد واپس آیا تو مجھے کمزور سا دکھائی دیا، اس کے ہاتھ میں چڑے کا ایک تھیلہ تھا، اس نے تھیلے کی زپ کھولی اور تھیلہ میری میز پر الٹ دیا، میری میز پر توٹوں کے پکٹ آ گئے، میں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا، وہ مسکرا کر بولا "میں بیسوں کا بندوبست کرنے گیا تھا، گن لو پورے ساڑھے چار لاکھ روپے ہیں" میں نے پریشانی کے عالم میں توٹوں کی طرف دیکھا اور اس کے بعد اس کی طرف دیکھ کر پوچھا "تم نے یہ ساری رقم کہاں سے حاصل کی؟" وہ ہر پلے انداز میں بولا "میں نے اپنا گروہ بیچ دیا" مجھے ہوں محسوس ہوا میرے سر پر کمرے کی چھت آ گری ہو، اس رات میری آنکھوں کی نمی نے مجھے سونے نہیں دیا، مجھے محسوس ہوا میں نے دین کا مشورہ دے کر ظلیل کے ساتھ ظلم کیا ہے، میں اس کا قائل ہوں۔

میں واپس اصل کہانی کی طرف آتا ہوں، ظلیل نے دسمبر 2005ء میں دین خرید لی وہ یہ دین لاہور لے گیا اور اس نے دین چلاتا شروع کر دی، وہ اٹھارہ گھنٹے دین چلاتا تھا، اللہ نے کرم کیا، اس کے دن بھرنا شروع ہو گئے، اسے روزانہ پندرہ سو سے دو ہزار روپے پہنچتے گئے، میں، ظلیل اور اس کا خاندان مطمئن ہو گئے، میرا خیال تھا ظلیل کا پندرہ سال کا بچران ختم ہو چکا ہے لیکن آنے والے دنوں میں میرا خیال غلط ثابت ہوا، فروری کے شروع میں ڈنمارک کے ایک اخبار یولانڈ پوسٹن نے نیما اکرم کی ذات اقدس کے بارے میں گستاخانہ خاکے شائع کر دیے اور دنیا میں خاکوں کا مسئلہ کھڑا ہو گیا، اسلامی دنیا میں احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا، یہ احتجاج پاکستان، بھارت اور لوگ لاطینیاں اور تیل کی بوتلیں لے کر سڑکوں پر آ گئے، یہاں تک کہ 14 فروری کا دن طلوع ہو گیا، یہ ظلیل کی چھوٹی بیٹی کی سالگرہ کا

دن تھا، غلیل نے بچی اور اس کی ماں سے وعدہ کیا وہ صرف 2 بجے تک دین چلائے گا اور اس کے بعد سارا خاندان شالیمار باغ میں پکنک منائے گا، غلیل گھر سے نکل گیا لیکن اس کے بعد وہ ابس گھر نہیں آیا، چودہ فروری کی شام غلیل کی بیوی نے مجھے فون کیا وہ ادھنی آواز میں رورہی تھی اس کا کہنا تھا جب غلیل پنجاب اسمبلی کے سامنے پہنچا تھا تو ہجوم نے اس کی دین کو گھیر لیا تھا وہ لوگ امریکہ اور ڈنمارک کے خلاف نعرے لگا رہے تھے، غلیل نے راستہ لینے کیلئے ہارن بجایا تو چند جو شیٹے فوجیوں کو ہارن کی آواز ناگوار گزری وہ دین پر چڑھ گئے انہوں نے سب سے پہلے دین کے شیشے توڑے اس کے بعد اس کے لیول ٹینک کا پائپ کھینچا اور اس کے بعد دین کو آگ لگا دی، غلیل بیوی دیر تک اپنی لمبٹھ سے یہ آگ بجھاتا رہا لیکن جب یہ آگ دوزخ کی شکل اختیار کر گئی تو اس نے اپنی لمبٹھ جلتی ہوئی دین پر پھینکی اور چپ چاپ ہجوم میں گم ہو گیا اس کے بعد وہ واپس نہیں آیا۔

میرے سامنے 15، 16 اور 17 فروری کے اخبارات بکھرے پڑے ہیں ان تمام اخبارات میں جلتی ہوئی گاڑیوں کی بے شمار تصویریں ہیں میں جب بھی یہ تصویریں دیکھتا ہوں تو میرے سامنے غلیل کا چہرہ آ جاتا ہے غلیل کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ آتی ہے وہ اپنے پیٹ سے دامن اٹھاتا ہے، گروے کی جگہ پر انگلی پھیرتا ہے اس کے بعد دھوئیں کی گھیر کی طرف اشارہ کرتا ہے اور پھر مسکرا کر کہتا ہے یہ پٹرول نہیں، یہ میرے گروے کا دھواں ہے اس آگ میں میرا پیٹ، میرا جسم، میرے بچوں کی بھوک، میرے خاندان کی خوشحالی اور میرے مستقبل کے خواب جل رہے ہیں یہ میری بیٹائی، میری سوچ کا دھواں ہے وہ کہتا ہے گستاخی ڈنمارک نے کی تھی لیکن مرزا مجھے ملی، گروے میرے جملے، نفٹس میرے خوابوں، میرے آنسوؤں کی گری، برباد میں ہوا وہ مجھ سے پوچھتا ہے میرا کیا قصور تھا، میں بھی ان لوگوں کی طرح ایک مسلمان ہوں میں بھی پاکستانی ہوں میں بھی مظلوم ہوں اور میں بھی ایک سچا عاشق رسول ہوں لیکن ان لوگوں نے میری دین جلا دی، میرے پاس غلیل کے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں لہذا میں یہ سوال لاہور کے تمام زندہ ضمیر خواتین و حضرات کے سامنے رکھتا ہوں میں ان سے پوچھتا ہوں ہم لوگ دشمنوں کی گستاخیوں کا بدلہ اپنے آپ سے کیوں لیتے ہیں ہمارا غصہ صرف غلیل جیسے لوگوں پر کیوں نکلتا ہے ہم اپنی چنگاریوں سے صرف اپنے دامن کیوں جلاتے ہیں؟





## کوفی برے ہوتے ہیں کوفہ نہیں

اس کا کہنا تھا ”میرے اندر آگ لگی ہے اس آگ نے میرے اندر کی وفا، میری شفقت، میری محبت اور میری وفاداری کو جلا کر رکھ کر دیا ہے“ میں جب بھی اس ملک، اس ملک کی رولنگ ایلیٹ اور اس ملک کی سٹیبلشمنٹ کے بارے میں سوچتا ہوں تو میرا جسم بھاتیز بن جاتا ہے اور میرے اندر آتش فشاں دھکے لگتا ہے ”مبشر بٹ کے منہ سے جھپٹا آگ نکل رہی تھی اس کا ہاتھ اپنے سے شراہور تھا اور شدت جذبات سے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، میں سکتے کے عالم میں اس کی گفتگو سن رہا تھا۔

اس نے کہا ”میں نے پوری زندگی اپنے دادا، اپنی دادی، اپنے تایا جی اور اپنے والد کو جتنے نہیں دیکھا“ میں اس بات پر ہمیشہ حیران ہوتا تھا ”ایک دن میں نے اپنے تایا جی سے اس کی وجہ پوچھی تو جانتے ہوا ہوں نے کیا جواب دیا ”وہ چند سیکنڈ کے لئے رکا“ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے ”میرے تایا جی نے بتایا ہم لوگ اپنی بیٹی 1947ء میں امرتسر چھوڑ آئے تھے اور اس کے بعد ہم نے جب بھی چنے کی کوشش کی ہمارے منہ سے سسکی اور چیخ کے سوا کچھ نہ نکلا“ میرے تایا جی نے بتایا ”ہم لوگ 1947ء میں چھ سات سات سال کے بچے تھے ہماری ایک جوان بہن تھی جب امرتسر میں فسادات شروع ہوئے اور مسلمان لڑکیاں اغواء ہونے لگیں تو تمہارے دادا کو محسوس ہوا شاید ہم زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکیں ان کو خطرہ تھا ان کے بعد سکھان کی بیٹی کی بے حرمتی بھی کریں گے لہذا ایک دن وہ ہماری بڑی بہن کو کھڑکی میں لے گئے وہاں وہ دونوں باپ، بیٹی دیر تک گفتگو کرتے رہے جب وہ باہر آئے تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے ہمارے والد نے ہماری ماں اور ہم سب کو کمرے میں بند کیا اور ہماری بہن کو لے کر محن میں چلے گئے“ میں دروازے کی درز سے باہر جھانکنے لگا ”ہمارے والد نے ہماری بہن کو محن میں لٹایا“ اس کے کندھے پر گھنٹا رکھا اور چھری سے اس کا گلا کاٹ دیا ہماری بہن نے ایک دردناک چیخ ماری اور اس کے بعد فرش پر پڑ پڑنے لگی ”ہمارا والد مجھ سے گر گیا اور جب تک بہن کی جان نہ نکلی وہ مجھ سے مس پڑے رہے“ وہ اللہ تعالیٰ سے پاکستان کے استحکام کی دعا مانگتے رہے اس کے بعد جب انہوں نے دروازہ کھولا تو ان کا منہ تک ہماری بہن کے لبوں سے رنگا ہوا تھا ”ہماری ماں نے بیٹی کی نعش دیکھی تو وہ بے ہوش ہو کر دلیر پر گر گئی“ اس کے بعد وہ دن ہے اور



آج کا دن ہے ہم جب بھی ہنسنے لگتے ہیں تو ہمیں اپنی بہن کی بیچ یاد آ جاتی ہے اور ہماری آنکھیں میلی ہو جاتی ہیں۔  
 میشریٹ نے آنکھوں پر ہاتھ رکھے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ کمرے کی فضاء سوگوار ہو گئی، مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی نے میرے سانس کی تالی پر ہتھ رکھ دیا ہو، تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور کاہلی ہوئی آواز میں بولا، ”کیا تم لوگوں میں سے کسی نے اس ملک کے لئے اتنی قربانی دی تھی؟“ ہم چپ رہے، وہ چند لمبے خاموش رہا اور اس کے بعد بولا، ”میرے تایا جی کا کہنا تھا پاکستان ہماری بہن کی فحش پر بنا تھا، میں نے اپنے تایا جی کی بات پہلے باندھ لی اور اس کے بعد اس ملک کو حقیقتاً اپنا ملک سمجھنے لگے لیکن پھر 1977ء آ گیا۔“ ایک دن ہمارے گھر پولیس آئی، ہمارے ڈرائیونگ روم میں بھٹو صاحب کی تصویر لگی تھی، انہوں نے یہ تصویر اتاری اور میرے والد کو گرفتار کر کے لے گئے، میرے والد پر مقدمہ چلا اور میرے والد نے بھٹو کے ساتھ عقیدت کا جرم تسلیم کر لیا، فوجی عدالت نے انہیں سرعام کوڑے مارنے کا حکم جاری کر دیا، ”میشریٹ ذرا دیر کے لئے رکا اور ایک لمبا ہوا کا بھر کر بولا، ”میں اس وقت سات برس کا بچہ تھا، ایک دن شہر میں اعلان ہوا، محمد اکرم کو شہر کے مرکزی چوک میں کوڑے مارے جائیں گے، ہمارے گھر میں صاف ماتم بچھ گئی، میں گھر والوں سے چپ کر چوک میں چلا گیا، چوک میں پورا شہر جمع تھا، میرے والد کو لایا گیا، ان کے کپڑے اتارے گئے، انہیں ٹنگی پر چڑھایا گیا اور میرے سامنے انہیں کوڑے مارے گئے، میرے والد کے منہ سے ہر کوڑے پر چیخ نکلتی تھی، میں نے اپنے کانوں، اپنی آنکھوں سے اپنے والد کو چھپتے دیکھا، یہ ساری چیزیں آج تک میرے اندر رہیں گے، لوگ میرے والد کو اٹھا کر گھر لائے اور اسے چار پائی پر ڈال کر چلے گئے، میں اگلے دس دن اپنے ہاتھوں سے اپنے والد کے زخموں پر برف لگا تا رہا، لہذا آپ لوگ مجھ سے پوچھو کوڑے کیا ہوتے ہیں؟ تم مجھ سے پوچھو زخم کیا ہوتے ہیں اور جب ان زخموں پر برف رکھی جاتی ہے تو زخمی کے منہ سے کس قسم کی سسکی نکلتی ہے؟“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔

میشریٹ نے نفرت سے ہماری طرف دیکھا اور کڑکتے لہجے میں بولا، ”مجھے بتاؤ ایک ایسا شخص جس نے اس ملک کی تشکیل کے لئے اپنی جوان بہن کی قربانی دی ہو کیا وہ اس ملک میں اس سلوک کا حق دار تھا؟ مجھے بتاؤ جس شخص کے والد نے غیرت اور بے حسیتی سے بچنے کے لئے اپنی جوان بیٹی کو بھوکری تھی کیا اس کا بیٹا اس سلوک کا روادار تھا؟“ ہم لوگ خاموش رہے، وہ اسی کڑکتے لہجے میں بولا، ”میرے باپ کا کیا تصور تھا؟ کیا نظریات؟ کسی سیاسی پارٹی کا عہدیدار ہونا اور کسی جمہوری لیڈر کو پسند کرنا جرم ہے اور کیا ڈرائیونگ روم کی دیوار پر کسی لیڈر کی تصویر لگانا گناہ ہے؟ مجھے بتاؤ میرے خاندان، میرے والد اور مجھے اس ملک کا کیا فائدہ ہوا؟“ ہم خاموش رہے، اس نے کہا، ”حکومت نے 1979ء میں ہماری ساری جائیداد ضبط کر لی تھی، میرے والد کی نوکری اور کاروبار پر پابندی لگ گئی تھی اور مجھے خاندان چلانے کیلئے ہوٹل میں ویٹری کرنا پڑی تھی اور تم لوگ کہتے ہو میں حب الوطن شہری کی طرح اس ملک کی خدمت کروں، کیوں کروں؟ مجھے کوئی جواز بتاؤ؟“ وہ خاموش ہو گیا، کمرے میں طویل عرصے تک خاموش رہی، وہ ذرا دیر بعد بولا، ”ایسے بنتے ہیں لوگ، دہشت گرد، میرے اندر جھانک کر دیکھو، میرے اندر ایک

نیردست کنگ بیٹھا ہوا ہے، تم اس دہشت گرد کو مطمئن کرو، میں اس ملک کا سب سے بڑا محب وطن بن جاؤں گا۔“  
 میں نے اس سے عرض کیا ”مزید نے حضرت امام حسینؑ کو شہید کر دیا تھا، کیا اس میں اسلام کا کوئی قصور تھا؟“ اس  
 نے تھوڑی دیر سوچا اور انکار میں سر ہلا دیا، میں نے اس سے پوچھا ”کیا اس میں مکہ مدینہ اور کوفہ کا کوئی قصور تھا، کیا  
 اس میں ساری اسلامی ریاست کا کوئی قصور تھا، کیا اس قتل میں تمام مسلمان شریک تھے“ اس نے انکار میں سر ہلا دیا،  
 میں نے اس سے عرض کیا ”بٹ صاحب ہماری اپروچ ٹھیک نہیں، ہم لوگ دوسرے لوگوں کے لگائے زخموں کا بدلہ  
 ملک، نظریے اور اداروں سے لیتے ہیں، وہ گالی جو ہمیں لوگوں کو دینی چاہنے ہم وہ گالی ملک اور نظریے کو دیتے ہیں،  
 بٹ صاحب یقین کیجئے وقت کا یزید برا ہوتا ہے اس دور کا اسلام نہیں، کوفے والے برے ہوتے ہیں کوفہ نہیں اور  
 ابو جہل ظالم ہوتے ہیں مکہ نہیں یمن، ہم لوگ کئے والوں کے جرموں کی سزا مکہ کو دیتے ہیں اور ہم ابولہب کے  
 جرموں کا بدلہ حضرت بلالؓ جیسے لوگوں سے لیتے ہیں، بٹ صاحب مجھے بتائیے کیا یہ زیادتی نہیں، کیا یہ ظلم نہیں،“ مبشر  
 بٹ نے لمبی سانس بھری، کرسی کے ساتھ ٹک لگائی اور پیچھے کی طرف جھول گیا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

## یہ جنگ کیسے شروع ہوئی

امریکہ اور مسلمانوں کی جنگ کا آغاز 1949ء میں ہوا تھا اور یہ جنگ دو استادوں سے شروع ہوئی تھی۔ 1906ء میں مصر کے صوبے اسسٹو کے ایک گاؤں موشاش ایک بچہ پیدا ہوا، بچے کے والد کا نام حامی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین بنت عثمان تھا، والد کھیتی باڑی کرتے تھے جبکہ والدہ ایک دیندار اور پرہیزگار خاتون تھی، بچے نے دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، 1933ء میں قاہرہ سے بی اے کیا اور اس کے بعد وہ مصر کی وزارت تعلیم میں انسپکٹر آف سکولز بھرتی ہو گیا، 1949ء میں وزارت نے اسے امریکہ کا نظام تعلیم سمجھنے کے لئے کولورڈو بھجوا دیا، وہ امریکہ میں دو سال رہے اور ان دو برسوں میں انہوں نے ولسن فچرس کالج واشنگٹن، لیچرس کالج کولورڈو اور شین فورڈ یونیورسٹی کیلیفورنیا میں تعلیم حاصل کی، امریکہ میں قیام کے دوران انہیں امریکی معاشرے کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ امریکہ میں شدت پسندی کا دور تھا، اس دور میں ایک طرف "ہی ہاؤس" کا آغاز ہو رہا تھا، امریکی معاشرہ بڑی تیزی سے ماؤن اور اعتدال پسند ہو رہا تھا، امریکہ میں غشیات، ڈسکو اور جنس پرستی عام ہو رہی تھی جبکہ دوسری طرف امریکہ میں ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہو رہا تھا جو پوری دنیا میں عیسائیت کا غلبہ چاہتا تھا، اس طبقے کا کہنا تھا ہم نے ناگہا ساگی اور ہیروشیما کو ایٹم بم سے اڑا کر اپنی برتری ثابت کر دی لہذا اب ہمیں پوری دنیا کو عیسائی بنادینا چاہئے، یہ طبقہ سودیت یونین اور مسلمانوں کو اپنا اٹکا ٹارگٹ سمجھتا تھا، مصر کے اس انسپکٹر سکولز نے ان دونوں تحریکوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا۔ وہ 1951ء میں واپس مصر آئے تو وہ مکمل طور پر ایک انقلابی شخصیت بن چکے تھے وہ لیبرل ازم اور عیسائی پادریوں دونوں کے خلاف ہو چکے تھے، ان کا خیال تھا اگر عالم اسلام بیدار نہ ہوا تو اگلے تیس چالیس برسوں میں وہ شدید بحران کا شکار ہو جائے گا، انہوں نے "انخوان المسلمون" جرائد کی اور مصری نوجوانوں میں انقلابی روح پھونکنا شروع کر دی۔ ہم تھوڑی دیر کے لئے اس کہانی کو یہاں روکتے ہیں اور اب دوسرے استاد کی طرف آتے ہیں۔

1949ء میں یوٹرا اس نام کا ایک استاد شکاگو یونیورسٹی میں پڑھاتا تھا، وہ پلٹیکل فلاسفر تھا، اس وقت شکاگو یونیورسٹی میں "پیپس" کا قبضہ تھا، یہ لوگ اسن اور عالمی بھائی چارے کو مذہب قرار دیتے تھے اور ان کا کہنا تھا دنیا کے تمام انسان برابر ہیں اور مذہب ان انسانوں کو تقسیم کرتا ہے لہذا دنیا سے مذہب ختم ہو جائے، چاہئیں، لیو ایک



کمزور عیسائی اور قدامت پسند فلسفی تھا، اسے یہ تحریک پسند نہ آئی لہذا اس نے سوچا یہی ازم کے سامنے قدامت پسندی کا بند باندھنا چاہئے کیونکہ اگر ماڈرن ازم کا راستہ نہ روکا گیا تو عیسائی دنیا اس سے شدید نقصان اٹھائے گی لیو کا خیال تھا آنے والے دنوں میں اشتراکیت اور مسلمان عیسائیت کے سب سے بڑے دشمن ہوں گے اور اسے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک "الشکر" تیار کرنا چاہئے لیو نے 1951ء میں شکاگو یونیورسٹی میں اپنا ایک گروپ بنایا اور اس گروپ نے محدود پیمانے پر کام شروع کر دیا، اس گروپ کے ایجنڈے کے چار نقاط تھے عیسائی تعلیمات کو عام کرنا، ماڈرن ازم کو روکنا، اشتراکی نظریات کا مقابلہ کرنا اور امریکی معاشرے کو مسلمانوں سے خبردار کرنا۔ لیو نے 1951ء سے 1955ء تک شکاگو میں اپنا ایک اچھا خاصا حلقہ پیدا کر لیا، ہم اب تھوڑی دیر کے لئے اس کہانی کو بھی یہاں روکتے ہیں اور وہاں پہلے استاد کی طرف آتے ہیں۔

مصر کے اس استاد کا نام سید قطب تھا، سید قطب کو اللہ تعالیٰ نے تحریر اور گفتگو کے فن سے نوازا رکھا تھا، سید قطب نے ان دونوں فنون سے مصری نوجوانوں کی کردار سازی شروع کر دی، ان دنوں مصر میں شاہ فاروق کی حکومت تھی، شاہ فاروق ایک عیاش طبع بادشاہ تھے لہذا مصری معاشرہ خرابی کی انتہا تک پہنچا ہوا تھا، سید قطب نے لوگوں کو بادشاہ کے خلاف ابھارنا شروع کر دیا، سید قطب کی تبلیغ سے متاثر ہو کر جنرل محمد نجیب اور کرنل جمال عبدالناصر نے 1952ء میں شاہ فاروق کا تختہ الٹ دیا، سید قطب نے شروع میں فوجی بغاوت کی بھرپور حمایت کی لیکن جب فوجی قیادت نے بھی مصر کو لبرل، ماڈرن اور معتدل بنانا شروع کر دیا تو سید قطب حکومت کے خلاف ہو گئے، حکومت نے 1954ء میں انہیں گرفتار کر لیا اور انہیں شدید تشدد کا شکار بنایا گیا، اس وقت تک مصر میں سی آئی اے داخل ہو چکی تھی، سی آئی اے بھی قید خانے میں سید قطب پر تشدد کرتی رہی، حکومت نے سید قطب کو دس سال قید خانے میں رکھا، 1954ء میں عراقی حکومت کی مداخلت پر انہیں رہا کر دیا گیا لیکن ان کے معمولات اور ملاقاتیوں کی کڑی نگرانی ہوتی رہی، وہ شدید علامات کا شکار تھے، ایک سال بعد انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا، ان پر بند کمرے میں مقدمہ چلایا گیا اور 29 اگست 1968ء کو سید قطب کو ان کے دو ساتھیوں سمیت پھانسی دے دی گئی۔ سید قطب شہید ہو گئے لیکن وہ اپنے پیچھے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ چھوڑ گئے، ان شاگردوں میں ان کے عملی شاگرد بھی شامل تھے اور فکری بھی، سید قطب کے فکری شاگردوں میں سے تین حضرات نے آنے والے دنوں میں عالمی شہرت حاصل کی، ان میں سے ایک امام خمینی تھے، غنی خود کو سید قطب کے نظریاتی اور روحانی شاگرد کہتے تھے۔ دوسرے مولانا مودودی تھے اور تیسرے شاگرد القاعدہ کے بانی اور ماسٹر مائنڈ ایمن الظواہری تھے، ایمن الظواہری کے بچپن کا زیادہ تر حصہ سید قطب کی محبت اور محبت میں گزرا تھا اور سید قطب کی شہادت کے بعد ایمن الظواہری نے ان کے نظریات کا علم اٹھایا تھا، ہم تھوڑی دیر کے لئے اس کہانی کو بھی یہاں روکتے ہیں اور وہاں دوسرے استاد کی طرف آتے ہیں۔

لیوسٹراس اور اس کے شاگردوں کی شکاگو کے بیٹوں کے ساتھ لڑائی شروع ہو گئی، یہ لوگ جب یونیورسٹی سے فارغ ہوئے تو قدامت پسند خیالات کے باعث معاشرے نے انہیں مسترد کر دیا اور شکاگو میں ان پر غرور

حیات تک جو گیا لہذا یہ لوگ شکا کو سے نقل مکانی کر کے واشنگٹن آ گئے واشنگٹن میں انہوں نے سوچا جب تک ہم اقتدار کے حلقے میں داخل نہیں ہوتے ہم اپنے نظریات کو عملی شکل نہیں دے پائیں گے انہوں نے ڈیموکریٹک اور ری پبلکن پارٹی کا جائزہ لیا انہیں ری پبلکن پارٹی "سافٹ ٹارگٹ" محسوس ہوئی لہذا یہ لوگ ری پبلکن پارٹی میں شامل ہو گئے اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے اوپر آ گئے لیوسٹراس کو بھی اللہ تعالیٰ نے چارنا موہر شاگرد "عمامت" کئے تھے ان شاگردوں نے آنے والے دنوں میں عالمگیر شہرت پائی ان میں ایک ڈک جینی تھے دوسرے ڈونلڈ رمزفلڈ تھے تیسرے پال وولف وٹنر تھے اور چوتھے ولیم کرسٹول تھے پال وولف وٹنر اور ولیم کرسٹول اس کے شکا کو یونیورسٹی کے شاگرد تھے جبکہ رمزفلڈ اور ڈک جینی اس کے نظریات سے متاثر تھے لیوسٹراس 1973ء میں انتقال کر گیا جس کے بعد اس کے ان چار شاگردوں نے اس کا علم اٹھالیا۔ یہاں سے کہانی کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور دونوں استادوں کے شاگرد میدان میں آتے ہیں اور تیزی سے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اب ہم دونوں استادوں کے شاگردوں کو ایک ساتھ لے کر آ گئے بڑھتے ہیں۔

1972ء میں امریکہ میں ری پبلکن پارٹی کے رچرڈ نکسن کی حکومت آتی ہے نکسن اور ان کے وزیر خارجہ ہنری کسنجر سوویت یونین اور چین کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کا فیصلہ کرتے ہیں لیکن لیوسٹراس کے شاگرد اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں 1974ء میں نکسن کی حکومت ختم ہوتی ہے اور اس کی جگہ جیرالڈ فورڈ صدر بنتے ہیں تو ڈونلڈ رمزفلڈ ان کے وزیر دفاع اور ڈک جینی صدر کے چیف آف سٹاف بن جاتے ہیں یوں لیوسٹراس کے شاگرد حکومت کا حصہ بن جاتے ہیں جبکہ سید قطب کے شاگردوں کو مصر میں باغیوں کا درجہ مل جاتا ہے اور حکومت ان کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیتی ہے اور یوں آنے والے دن اور واقعات بہت دلچسپ شکل اختیار کرتے ہیں جیرالڈ فورڈ روس کا دورہ کرتے ہیں جس کے بعد سرد جنگ نئے دور میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس دوران النور السادات مصر کے صدر بنتے ہیں وہ 1977ء میں اسرائیل کا دورہ کرتے ہیں ٹیمپ ڈیوڈ کا معاہدہ ہوتا ہے اور مصر سمیت پوری اسلامی دنیا میں سادات کے خلاف احتجاج شروع ہو جاتا ہے 1980ء میں ایمن الظواہری اور ان کے ساتھی عملی جہاد کا اعلان کرتے ہیں یہ لوگ فوج میں اپنا رسوخ قائم کرتے ہیں اور 16 اکتوبر 1981ء کو پریٹ کے دوران النور السادات کو گولی مار دی جاتی ہے جس کے بعد ایمن الظواہری عبدالسلام فرج اور ان کے سارے ساتھی گرفتار ہو جاتے ہیں ایک کہانی یہاں ختم ہوتی ہے جبکہ دوسری کہانی صدر ریجن کے دور میں شروع ہوتی ہے اور یہ کہانی میں آپ کو کل سناؤں گا۔





## اس کے بعد کیا ہوا

لیوسٹراس کے شاگرد اس وقت تک "نیو کنزرویٹوز" کے نام سے مشہور ہو چکے تھے "روڈلز ریگن" نے 20 جنوری 1981ء کو صدر کا حلف اٹھایا، ان کے ساتھ جارج ڈبلیو بش (سینٹر) نائب صدر منتخب ہوئے اور صدر ریگن کے دور میں رچرڈ پریل امریکہ کا نائب سیکرٹری دفاع بن گیا، رچرڈ پریل کا تعلق لیوسٹراس گروپ سے تھا اور اس نے افغانستان میں امریکہ کو روس سے لڑانے میں مرکزی کردار ادا کیا تھا 1984ء میں لیوسٹراس کے شاگردوں کو محسوس ہوا چارج بش امریکہ کے اگلے صدر ہوں گے چنانچہ انہوں نے غیر محسوس طریقے سے جارج بش کو گھیر لیا، وہ چارج بش کے قریب ہوتے چلے گئے، آپ اس صورتحال کا ایک دلچسپ پہلو ملاحظہ کیجئے۔ 1984ء میں امریکہ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف برسر پیکار تھا، امریکہ کو اس وقت ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو اس جنگ کو مذہبی فریضہ سمجھ کر لڑیں اور دنیا میں اس وقت سید قطب کا داعی گروپ تھا جو اس جنگ کو جہاد کی شکل دے سکتا تھا چنانچہ "نیو کنزرویٹوز" نے مصری حکومت سے بات چیت کی اور حسی مبارک نے ایمن الظواہری اور ان کے ساتھیوں کو رہا کر دیا۔ یہ لوگ 1985ء میں مصر سے افغانستان چلے گئے یوں سید قطب اور لیوسٹراس کے شاگرد پہلی بار ایک جگہ جمع ہو گئے، 1985ء ہی وہ سال تھا جب ایمن الظواہری کی اسامہ بن لادن سے ملاقات ہوئی، اسامہ بن لادن کے پاس پیسہ اور جذبہ تھا جبکہ ایمن الظواہری منصوبہ بندی کے ماہر تھے چنانچہ ان دونوں نے مل کر کمال کر دیا، 1987ء میں افغانستان کی جنگ عملاً ختم ہو گئی اور امریکہ افغانستان سے واپس چلا گیا امریکہ کی دیکھا دیکھی ایمن الظواہری، اسامہ بن لادن اور عبدالسلام فراج بھی واپس لوٹ گئے، یہ لوگ جب اپنے ملکوں میں پہنچے تو یہ اسلامی دنیا کے ہیرو بن چکے تھے جس کی وجہ سے مصر، الجزائر اور سعودی عرب کی حکومتیں ان لوگوں سے حائف رہنے لگیں، ان لوگوں نے بھی جلد ہی حکومتوں پر کئی جتنی شروع کر دی، جس کے نتیجے میں ان کا اپنی اپنی حکومتوں سے ٹکراؤ شروع ہو گیا، ہم ایک بار پھر اس کہانی کو اس جگہ روکتے ہیں اور لیوسٹراس کے شاگردوں کی طرف واپس آتے ہیں۔

20 جنوری 1989ء کو امریکہ میں چارج بش سینٹر نے حلف اٹھایا جس کے بعد لیوسٹراس کا براہ راست شاگرد پال وولف صدر بش کی وزارت خارجہ کا اڈر سیکرٹری بن گیا، ولیم کرستول نائب صدر کا چیف آف سٹاف ہو گیا



جبکہ ڈک جینی کو امریکہ کا وزیر دفاع بنا دیا گیا اس دور میں عراقی ان لوگوں کا فوکس تھا ان لوگوں نے عراق میں موجود امریکی سفیر اپرل گلیس پی کے ذریعے صدام حسین کو "ٹریپ" کیا صدام سے کویت پر قبضہ کرایا اور اس کے بعد بٹل سینٹر سے 17 جنوری 1991 کو عراق پر حملہ کر دیا اس وقت جنرل کوئن پاول چیئر مین جو اے جیٹس آف سٹاف تھا 26 فروری 1991 کو جب صدام حسین نے کویت خالی کر دیا تو اس وقت نیو کزن روئیٹز اور کوئن پاول میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ نیو کزن روئیٹز کی خواہش تھی صدر بٹل عراق پر باقاعدہ قبضہ کر لیں جبکہ کوئن پاول کا کہنا تھا ہم صدام حسین سے کویت خالی کرانے آئے ہیں کویت خالی ہو چکا ہے لہذا ہمیں اب واپس جانا چاہیے۔ صدر بٹل سینٹر نے کوئن پاول کی بات مان لی جس کے بعد ان کی کوئن پاول سے ٹھن گئی۔ ہم ایک بار پھر اس کہانی کو یہاں روکتے ہیں اور سید قطب کے شاگردوں کی طرف واپس آتے ہیں

1991ء کی گلف وار کے دوران امریکہ نے سعودی عرب کو فوجی "حفاظت" کی پیش کش کی شاہ فہد نے یہ آفر قبول کر لی اس وقت اسامہ بن لادن شاہ سے ملے اور انہیں افغان اور عرب مجاہدین کے ذریعے سعودی عرب کی حفاظت کرنے کی پیش کش کی لیکن شاہ نے ان کی یہ آفر مسترد کر دی جس کے نتیجے میں اسامہ بن لادن نے حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا اس کے رد عمل میں حکومت نے ان کی شہریت منسوخ کی اور انہیں ملک سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ اسامہ سعودی عرب سے سوڈان چلے گئے ایمین القواہری بھی اس دوران مصر سے نکلے اور ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور ان لوگوں نے سوڈان میں القاعدہ کو متحرک کر دیا اور القاعدہ نے 1993ء میں نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور صوبائیہ میں اقوام متحدہ کے فوجیوں پر حملے کر دیئے۔ 26 جون 1995ء میں ان لوگوں نے مصری صدر حسنی مبارک پر بھی حملہ کر دیا حسنی مبارک اس وقت استقویا کے دورے پر تھے ان حملوں کے رد عمل میں امریکہ نے سوڈان پر شدید باؤڈالتا شروع کر دیا سوڈان امریکی دباؤ میں آ گیا اور اس نے ان لوگوں کو نکل جانے کا حکم دے دیا اسامہ بن لادن نے اپنے خاندان کے دوسو افراد لئے اور وہ 1996ء میں جلال آباد آ گئے ساگلے سال کے شروع میں ایمین القواہری بھی اپنے مجاہدین کے ساتھ افغانستان آ گئے ہم ایک بار پھر اس کہانی کو روکتے ہیں اور لیونٹس کے شاگردوں کی طرف واپس آتے ہیں۔

20 جنوری 1993ء کو بٹل کلشن نے صدر کا حلف اٹھایا وہ ڈیموکریٹک پارٹی سے تعلق رکھتے تھے اور دل سے نیو کزن روئیٹز کو ناپسند کرتے تھے کلشن دور میں ان لوگوں کا ڈائریکٹ ہاؤس میں داخلہ بند ہو گیا لیکن یہ اس سارا عرصہ صدر کلشن کو مسلمانوں کے خلاف اکساتے رہے اس دوران یہ لوگ بٹل جیلی اور امریکہ کے پادریوں کے ساتھ بھی رابطے میں رہے ان لوگوں نے پادریوں کو بٹل کے بیٹے بٹل جونیئر کی حمایت پر تیار کر لیا اسی دوران نیو کزن روئیٹز نے جون 1997ء میں واشنگٹن میں پراجیکٹ آف نیو امریکن پٹری (پی این اے سی) کے نام سے ایک ٹھیک ٹھیک کی بنیاد رکھی، اس ٹھیک ٹھیک کا تین تھاپی ایجنڈا تھا، امریکہ کیلئے خلائی فوج تشکیل دینا، امریکہ کا دفاعی بجٹ بڑھانا اور امریکہ کی دفاعی پالیسی تبدیل کرنا ابتداء میں اس ٹھیک ٹھیک کے 25 ارکان تھے اور اس کا

چیمبر میں ولیم کرسٹول تھا، جارج بش کا بیٹا جیب بش، ڈک چینی، ڈونلڈ رملفلڈ، پال وولف، ونٹر اور زائے غلیل زاد بھی اس تھمک ٹینک میں شامل تھے، ہم یہاں ایک بار پھر کہتے ہیں اور واپس افغانستان جاتے ہیں۔ 1998ء میں اسامہ بن لادن اور ایمن الظواہری نے قذافی میں پریس کانفرنس کی اور اس پریس کانفرنس میں اس نے امریکہ کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا اس اعلان کے دو نتائج ظاہر ہوئے، نیو کٹر روینڈ کوئل کائنات پر دباؤ ڈالنے کا موقع مل گیا اور دوسرا صدام حسین کو القاعدہ میں روشنی کی کرن دکھائی دیے گئے۔ صدام حسین نے اسامہ بن لادن سے رابطہ کیا اور انہیں عراق میں منتقل ہونے کی پیش کش کر دی اسامہ نے افغانستان چھوڑنے سے انکار کر دیا تاہم ان کے صدام کے ساتھ رابطے استوار ہو گئے۔ 1998ء ہی میں القاعدہ نے ایران کے ساتھ تعلقات استوار کئے اور یوں یہ لوگ ایران اور عراق کی مدد سے حزب اللہ تک پہنچ گئے اور حزب اللہ نے لبنان میں القاعدہ کے مجاہدین کو ٹریننگ دینا شروع کر دی القاعدہ کے مجاہدین نے حزب اللہ سے ٹریننگ لینے کے بعد نیروبی اور دارالسلام میں امریکی سفارتخانے اڑا دیئے اس وقت تک ایران، عراق اور حزب اللہ کا خیال تھا القاعدہ کی سرگرمیاں صرف یہیں تک محدود ہیں مگر لیکن القاعدہ نائن الیون کی منصوبہ بندی کر رہی تھی سید قطب کے مجاہد بڑی تیزی سے نائن الیون کی طرف بڑھ رہے تھے دوسری طرف ”نیو کٹر روینڈ“ کسی ایسے بہانے کی تلاش میں تھے جس کی مدد سے وہ امریکہ کو عالم اسلام کے سامنے کھڑا کر سکیں ان لوگوں کے تھمک ٹینک پی این اے سی نے 2000ء میں اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا ”انہوں نے اپنی میننگ میں اعلان کیا تھا ”ہمیں نئے خطرات (مسلمانوں) سے ہنسنے کیلئے ایک نئی پرل ہاربر کی ضرورت ہے۔“ اب صورتحال بہت دلچسپ ہو گئی سید قطب کے مجاہد افغانستان اور لبنان میں بیٹھ کر نائن الیون کا انتظار کر رہے تھے جبکہ لیوسٹراس کے شاگرد کسی ایسی پرل ہاربر کی تلاش میں مصروف تھے جس کی آڑ میں وہ اسلامی دنیا پر حملہ کر سکیں اسی دوران 2000ء کے الیکشن ہوئے جارج بش جو نیئر صدر منتخب ہوئے اور ان کے ساتھ ساتھ لیوسٹراس کا سارا گروپ اقتدار میں آ گیا، ڈک چینی نائب صدر بن گئے، رملفلڈ وزیر دفاع ہو گئے اور پال وولف ونٹر کو نائب وزیر دفاع کا عہدہ مل گیا یوں سید قطب اور لیوسٹراس کے شاگرد آئے سامنے کھڑے گئے اور دونوں کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے لگے اس کے بعد کیا ہوا یہ میں آپ کو کل بتاؤں گا۔ (کالم کا باقی حصہ اگلے صفحات میں ملاحظہ کیجئے)





## اب کس کی باری ہے

اور پھر نائن الیون کا دن آ گیا۔ امریکہ کے ہوائی اڈوں سے چار جہاز اڑے دو نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکرائے ایک واشنگٹن میں بیٹھا گان پر گر اور ایک وائٹ ہاؤس کی طرف بڑھا لیکن اسے راستے ہی میں گرا دیا گیا۔ سید قطب کے مجاہدین نے امریکہ کو جڑوں سے ہلا دیا۔ یہ آپریشن حزب اللہ عراق اور ایران تک کیلئے غیر متوقع تھا چنانچہ یہ قیوں ممالک فوری طور پر القاعدہ سے الگ ہو گئے ۱۴ ستمبر کو صدر بٹش نے اس حملے کو ”صلیبی جنگ“ قرار دے دیا اس وقت چھ اسلامی ملک افغانستان عراق شام ایران پاکستان اور سعودی عرب امریکہ کے ٹارگٹ تھے نائن الیون کے بعد دنیا ایک نئے دور میں داخل ہو گئی نیو کنزرویٹوز آگے بڑھے اور انہوں نے صدر بٹش سے اسلامی دنیا پر حملہ کرا دیا۔ امریکی فوج نے افغانستان پر حملہ کیا اور افغانستان کی اینٹ سے اینٹ مجاہدی۔ افغانستان کے بعد یہ لوگ عراق کی طرف بڑھے اور انہوں نے عراق میں کوئی بچہ چھوڑا کوئی عورت چھوڑی اور نہ ہی کوئی بزرگ۔ بٹش انتظامیہ میں وزیر خارجہ کولن پاول واحد شخص تھا جو ان حملوں کے خلاف تھا۔ اس نے کابینہ کے اجلاس میں ”کنزرویٹوز“ کی مخالفت کی۔ یہ لوگ بھی کولن پاول سے خائف تھے لہذا دونوں کے درمیان ایک بار پھر جنگ چھڑ گئی۔ ان دنوں کولن پاول نے فلیج کی صورت حال پر چند ایسے بیانات جاری کر دیئے جو امریکی پالیسی سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے ان بیانات کو ہوا بنا دیا جس کے نتیجے میں کولن پاول نے اعلان کر دیا وہ بٹش کے اگلے دور میں کابینہ کا حصہ نہیں بنے گا۔ بٹش کو یہ بیان برا لگا لہذا صدر نے ۱۵ نومبر 2004ء کو کولن پاول سے استعفیٰ لے لیا اور اس کی جگہ ”نیو کنزرویٹوز“ کی رکن کوئٹہ وزیر اعلیٰ کو وزیر خارجہ بنا دیا جس کے بعد امریکہ کا تمام تر اختیار نیو کنزرویٹوز کے ہاتھ میں چلا گیا۔

عراق کے بعد شام اور ایران کی باری تھی لیکن 2005ء میں صدر بٹش کیلئے تین بڑے مسائل پیدا ہو گئے ایک امریکہ افغانستان اور عراق میں بری طرح پھنس گیا دو یورپ سمیت پوری دنیا میں صدر بٹش کا بیج خراب ہو گیا اور یورپ روس اور جاپان نیو کنزرویٹوز پر اٹھلی اٹھانے لگے۔ بٹش کا خیال تھا یورپ مسلمانوں کے خلاف اس جنگ میں امریکہ کا کھل کر ساتھ دے گا لیکن میڈیٹرین اور لندن کے ہم دھماکوں کے باوجود یورپ نے عالم اسلام کے



خلاف اعلان جنگ نہ کیا اور تین صدر بش اور نیوکیزروینڈز باقی اسلامی ممالک پر حملے کیلئے دفاعی بجٹ میں 40 فیصد اضافہ کرنا چاہتے تھے لیکن کانگریس نے ان کی درخواست مسترد کر دی چنانچہ اس صورتحال میں "نیوکیزروینڈز" اپنی پالیسی کی تشکیل نو پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے جنگ کے نئے فیر کیلئے اسرائیل اور بھارت کو "فرنٹ لائن سٹیٹس" بنانے کا فیصلہ کیا۔ آپ کیلئے یہ اطلاع حیران کن ہوگی کیونکہ اس کی "نیوکیزروینڈز" کے بااثر ارکان کی تعداد پچاس ہے اور ان پچاس ارکان میں سے 25 یہودی ہیں۔ نیوکیزروینڈز نے جن 2006ء میں شرمج کے مہرے تبدیل کئے اور اسرائیل سے حماس پر حملے شروع کرادیئے 12 جولائی کی صبح اسرائیل کے دو فوجی اغواء ہوئے اور اسی شام اسرائیل نے لبنان پر بھی حملہ کر دیا۔ میں پچھلے ایک ماہ سے لبنان پر اسرائیلی حملوں کا مطالعہ کر رہا ہوں اور مجھے محسوس ہو رہا ہے ان اسرائیلی فوجیوں کا اغواء "نیوکیزروینڈز" کی چال تھی اور اس کا مقصد اسرائیل کو لبنان پر حملے کا جواز فراہم کرنا تھا۔ آج لبنان پر اسرائیلی حملے دوسرے مہینے میں داخل ہو چکے ہیں۔ گزشتہ ایک ماہ کے دوران اسرائیل نے لبنان پر اڑھائی ہزار حملے کئے ہیں جن کے نتیجے میں پورا لبنان تباہ ہو گیا ہے لیکن حزب اللہ کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا کیوں؟ آج یہ سوال پوری دنیا کے سوچنے والوں کو حیران کر رہا ہے۔ ہم خوش فہم مسلمان اسے حزب اللہ کی کامیابی سمجھ رہے ہیں لیکن میرا خیال اس سے قدرے مختلف ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے اسرائیل اور امریکہ حزب اللہ کی اس "فتح" کی آڑ میں ایک خطرناک کھیل کھیل رہے ہیں۔ امریکہ کا یہودی میڈیا دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے شام اور ایران حزب اللہ کو مسکری مالی اور افرادی قوت فراہم کر رہے ہیں اور حزب اللہ کے مجاہدین جو میزائل داغ رہے ہیں وہ انہیں ایران اور شام نے دیئے تھے انہیں محسوس ہوتا ہے اسرائیل اس پروپیگنڈے کی آڑ میں شام اور ایران پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور اگر یہ حملہ ہو گیا تو امریکہ اسے بھرپور عسکری اور سفارتی سپورٹ دے گا نیوکیزروینڈز کا ماضی اور موجودہ حالات بتاتے ہیں اگر اسرائیل اور لبنان کی یہ جنگ بند ہوگئی تو بھی آنے والے چند برسوں میں یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوگا اور امریکہ اسرائیل کو سامنے رکھ کر کبھی نہ کبھی ان دونوں ممالک پر ضرور حملہ کرے گا۔ شام اور ایران کے بعد یا شام اور ایران کے ساتھ ساتھ پاکستان اور سعودی عرب پر بھی مشکل وقت آسکتا ہے۔ امریکہ پاکستان کیلئے بھارت کو استعمال کر سکتا ہے پچھلے دو ماہ میں اس کے ہلکے ہلکے آجڑ بھی دکھائی دے رہے ہیں۔ آپ اگر مئی 2006ء سے اگست 2006ء کے دوران پاک بھارت تعلقات میں آنے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیں تو آپ کو مودرتعال واضح ہوتی نظر آئے گی۔ مئی 2006ء میں بھارت نے اچانک دواغلا شروع کر دیا تھا "پاکستان میں اب بھی دہشت گردوں کے 59 ٹریننگ کیمپ چل رہے ہیں" جولائی میں ممبئی میں بم دھماکے ہوئے اور بھارت نے سیکرٹری خارجہ سطح کے مذاکرات معطل کر دیئے۔ بھارتی وزیراعظم نے پاکستان کو "گرم تعاقب" کی دھمکی دی اور 7 اگست 2006ء کو امریکہ کے نائب وزیر خارجہ رچرڈ ہاؤس نے نئی دہلی میں بھارتی سیکرٹری خارجہ شیا م سرن سے تین گھنٹے مذاکرات کئے اور ان مذاکرات کے بعد اعلان کیا "امریکہ بھارت کے ساتھ مل کر دہشت گردی کا مقابلہ کرے گا" ہاؤس کے اس بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے شاید بھارت

پاکستانی علاقوں میں مجاہدین کے فرضی کیہوں پر حملے کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے اور امریکہ ان حملوں میں بھارت کی مدد کرے گا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے اگر خدا نخواستہ کبھی بھارت نے پاکستانی علاقوں پر حملے شروع کئے تو شاید امریکہ پاکستان کے ساتھ وہی سلوک کرے جو اس نے 1971ء کی جنگ میں کیا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے ایک طرف بھارت ہم پر حملے کرے گا اور دوسری طرف امریکہ ہمیں یہ یقین دہانی کراتا رہے گا "یہ حملے صرف شدت پسندوں کے خلاف ہیں اور حکومت پاکستان کو ان سے پریشان نہیں ہونا چاہیے" اور جب کبھی ہم "پریشان" ہونے کی کوشش کریں گے تو امریکہ ہمیں دھمکی لگا کر بٹھا دے گا۔ ہو سکتا ہے میرا خدشہ سو فیصد غلط ثابت ہو لیکن اس کے باوجود دل ڈرتا ہے حالات سے محسوس ہوتا ہے شاید پاکستان کے بعد سعودی عرب "نیکو کنزرویٹوز" کا ٹارگٹ بن جائے۔ یہ لوگ کوشش کریں گے حرمین شریفین اور سعودی حکومت کو الگ الگ کر دیا جائے تاکہ اسلامی دنیا اس حملے کو دور ریاستوں کا باہمی جھگڑا سمجھ کر خاموش رہے اور امریکہ سعودی جنگ "صلیبی جنگ" نہ بن سکے۔

یہ لیوسٹراس کے بیروکاروں کا منصوبہ ہے جبکہ سید قطب کے مجاہدین کیا سوچ رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی کیا پلاننگ ہے سردست اسکے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن ایک بات طے ہے دنیا اس وقت دو شدت پسند گروہوں میں بری طرح پھنس چکی ہے۔ لیوسٹراس کے بیروکاروں کے پاس فوج طاقت اور ٹیکنالوجی ہے جبکہ سید قطب کے مجاہدین کے پاس ذہانت اور جذبہ ہے اور یہ بھی طے ہے یہ دونوں غیر متوازن لوگ ہیں اور یہ لوگ کسی بھی وقت دنیا کو اس انتہا تک لے جاسکتے ہیں جس کے بارے میں آنکھیں سنائیں نے یوحنا کوئی کی تھی "تیسری عالمی جنگ ابھی ہوگی اور اس کے بعد جو لوگ بچیں گے وہ پتھروں اور ڈنڈوں سے لڑا کریں گے"۔

اب ہم نیکو کنزرویٹوز اور مجاہدین کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیتے ہیں لیکن یہ جائزہ ہم کھلیں گے۔



## دوسرا راستہ بھی تھا

نیکوز روٹوز اور مسلم مجاہدین میں چند چیزیں مشترک ہیں مثلاً دونوں شدت پسند ہیں، دونوں ایک دوسرے کو صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں اور دونوں دنیا کو مذہب میں تقسیم کرتے ہیں لیکن اس اشتراک فکر کے باوجود دونوں کے طرز عمل میں زمین آسمان کا فرق ہے، ہم اگر دونوں گروہوں کی 55 سالہ جدوجہد کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو محسوس ہوتا ہے نیکوز روٹوز انتہائی چالاک، مکار اور منظم لوگ ہیں جبکہ مسلم مجاہدین انتہائی جذباتی، جلد باز اور غیر منظم ہیں۔ نیکوز روٹوز ایک ٹیم کی طرح مل کر کام کرتے ہیں جبکہ مسلم مجاہدین کی ساری کوششیں انفرادی ہوتی ہیں۔ یہ ایک واضح اور قابل توجہ فرق ہے اور اس فرق کی وجہ سے ہمارے مجاہدین وہ نتائج حاصل نہیں کر سکے جو پچھلے 55 برسوں میں نیکوز روٹوز نے حاصل کئے۔ نیکوز روٹوز نے 1952ء میں محسوس کر لیا تھا انہیں کامیابی کیلئے بڑی فوج، بڑے پیمانے پر گولہ بارود اور اربوں کھریوں ڈالر چاہئیں اور وہ خواہ صدیوں تک کوشش کر لیں وہ چھوٹے سے چھوٹے اسلامی ملک کے برابر فوج جمع نہیں کر سکیں گے، وہ کسی ملک کے بجٹ کے برابر پیسہ اور کسی ٹرینڈ فوج کے اسلحے کے برابر گولہ بارود جمع نہیں کر سکیں گے چنانچہ انہوں نے اپنے مقصد کے لئے دنیا کی سب سے بڑی فوج، سب سے جدید اسلحہ اور دنیا کا سب سے بڑا بجٹ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا، انہوں نے 1952ء میں فیصلہ کیا وہ کبھی نہ کبھی وائٹ ہاؤس پہنچیں گے۔ وہ امریکہ کا سارا اختیار اپنے ہاتھوں میں لیں گے اور اس کے بعد امریکہ کی ساری طاقت اپنے دشمن کے خلاف استعمال کریں گے، یہ لوگ اس فیصلے کے بعد 1952ء میں امریکہ کے جمہوری نظام میں داخل ہوئے، انہوں نے ری پبلکن پارٹی میں اپنی جگہ بنائی اور 55 برس بعد اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے وہ پوری دنیا کے ساتھ کھیل سکتے ہیں، ان لوگوں نے 55 برسوں میں اپنی نفرت کو ادارے کی شکل دے دی جبکہ اس کے مقابلے میں مسلم مجاہدین نے غیر جمہوری، غیر سیاسی اور غیر منظم راستے منتخب کئے، یہ لوگ اپنی اپنی حکومتوں سے ٹکراتے رہے، قید ہوتے رہے، ہلا وطن ہوتے رہے اور اس کے بعد پوری دنیا میں تہا اور بے گھر ہو کر رہ گئے، آج یہ لوگ اسلامی دنیا کے ہیرو ہیں لیکن اس کے باوجود بے گھر اور بے یار و مددگار ہیں اور آج دنیا میں کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں جو انہیں پناہ دینے کے لئے تیار ہو لہذا یہ لوگ جنگوں، غارتوں اور صحرانوں میں بھٹکتے



پھر رہے ہیں، اگر یہ لوگ بھی ”نیکو کنزرویٹرز“ کی طرح جمہوری راستہ اختیار کرتے، اگر یہ لوگ بھی مختلف اسلامی ممالک میں ہم خیال سیاستدانوں، دانشوروں اور بیوروکریٹس کی کھیپ تیار کرتے اور اگر یہ بھی خاموش انقلاب کے راستے کا انتخاب کرتے تو آج یہ لوگ نہ صرف 8 بڑے اسلامی ممالک میں برسرِ اقتدار ہوتے بلکہ ان ملکوں کی فوجیں، اسلحہ، بجٹ اور تیل بھی ان کے قبضے میں ہوتا اور یہ لوگ ”نیکو کنزرویٹرز“ کو بڑے پیمانے پر ہلف ٹائم دینے کے قابل ہوتے لیکن انیسویں مسلمان مجاہدین میں سے ہر شخص نے انفرادی طور پر جہاد کا کریڈٹ لینے کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ خود بھی تہما ہو گیا اور اس نے عالم اسلام کو بھی ایک ایسی بزدلی میں دھکیل دیا جس کا ایک سراپند ہے اور دوسرے سرے پر ”نیکو کنزرویٹرز“ انیم بم لے کر بیٹھے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں شہادت ہر مسلمان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے لیکن دشمن کو شکست دے کر مرنے والے شہید اور دشمن سے شکست کھا کر جاں بحق ہونے والے شہید کے درجے میں بڑا فرق ہے۔ میں اگر صرف اپنی شہادت پر توجہ دوں۔ میں اگر اکیلا دشمن کے پورے بریگیڈ سے ٹکرا جاؤں، میں اگر خود شہید ہو جاؤں، میں اگر خود جنت میں چلا جاؤں اور اپنے پیچھے رہ جانے والے مسلمانوں کو فراموش کر دوں تو یہ بھی بڑی زیادتی ہوگی، بد قسمتی سے ہمارے مجاہدین نے صرف اپنی جنت اور اپنی شہادت پر توجہ دی اور وہ افغانستان، عراق، لبنان، کشمیر اور فلسطین کے ان مسلمانوں کو بھول گئے جو ان کی شہادت کا تادان ادا کر رہے ہیں، جن پر اسرائیل اور امریکہ نے عرصہ حیات تلک کر دیا ہے۔

میں نے شروع میں عرض کیا تھا سید قطب سے تمہیں لوگوں نے اثر لیا تھا، امام خمینی، مولانا مودودی اور ایمن الظواہری، ایمن الظواہری کی ابتدائی زندگی سید قطب کے ساتھ گزری تھی اور انہوں نے سید قطب پر ہونے والے قلم اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے شاید یہ ان مظالم کا نتیجہ تھا ایمن الظواہری نے آئے والی زندگی میں مشکل راستے کا انتخاب کیا اور انہوں نے چھاپے مار جہاد کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا جبکہ ان کے مقابلے میں امام خمینی اور مولانا مودودی کا طرزِ عمل مختلف تھا، امام خمینی نے جہادی گروپ بنانے کے بجائے خاموش اور فکری انقلاب کا راستہ اختیار کیا، انہوں نے ایران کے عوام کو امریکہ پرست شاہ کے خلاف کھڑا کر دیا۔ ایران میں انقلاب آیا اور امام خمینی اقتدار تک پہنچ گئے۔ امام خمینی کا انقلاب آج تک قائم ہے چنانچہ آپ ایران کے بارے میں امریکہ کی پالیسی دیکھ لیجئے۔ امریکہ پچھلے 27 برس سے ایران کو دھمکیاں دے رہا ہے لیکن اس نے آج تک اس سے براہِ راست ٹکرائے کی جرات نہیں کی۔ کیوں؟ کیونکہ وہ جانتا ہے ایران کے انقلابیوں کے پاس فوج بھی ہے، تیل بھی، پیسہ بھی، لوگ بھی اور کسی حد تک ایٹم بم بھی۔ دوسری شخصیت جو سید قطب کے افکار سے متاثر ہوئی وہ مولانا مودودی تھے۔ مولانا نے جماعت اسلامی کی شکل میں ایک نیم سیاسی اور نیم مذہبی جماعت کی بنیاد رکھی، اس جماعت نے ”نیکو کنزرویٹرز“ کی طرح دانشمندانہ راستہ اختیار کیا۔ گو جماعت اسلامی نے پاکستان میں بے شمار دانشور، ادیب، پروفیسر، بیوروکریٹس اور بزنس مین پیدا کئے لیکن اس کے باوجود یہ جماعت ملک میں کوئی بڑا سیاسی انقلاب نہ لاسکی، گزشتہ 58 برسوں میں جماعت کے بے شمار کارکنوں کو ایوانِ اقتدار تک پہنچنے کا موقع ملا لیکن کسی ”جغرافیائی خرابی“ کے باعث اس کے

کارکنوں نے اقتدار کے اہوانوں میں پہنچ کر پارٹی بدل لی۔ آپ جاوید ہاشمی سے لے کر محمد علی درانی تک ان تمام سیاستدانوں کا ہنسی دیکھ لیجئے جنہوں نے جماعت اسلامی کی کوکھ سے جنم لیا لیکن جب یہ لوگ اقتدار تک پہنچے تو یہ میاں نواز شریف کی پارٹی میں شامل ہو گئے یا پھر مشرب بہ مشرب ہو گئے۔ شاید یہی وہ خانی ہے جس کی وجہ سے جماعت اسلامی نیکوز روینرز جتنی طاقت حاصل نہ کر سکی لہذا ہم اگر سید قطب کے ان تینوں ”شاگردوں“ کی کامیابیوں کا جائزہ لیں تو ہمیں امام فہمی قدرے بہتر پوزیشن میں نظر آتے ہیں۔ میرا خیال ہے اگر یہ لوگ 1950ء میں اسلامی دنیا کے 8 ملکوں کو فوکس کر لیتے اور مہاتر محمد سے لے کر شیخ محمد بن راشد الختم تک مسلمانوں کے تمام مستقل حکمرانوں پر کام کرتے ”اگر یہ لوگ“ ”نیکوز روینرز“ کی طرح غیر محسوس طریقے سے ان تمام لوگوں کو اقتدار میں لے آتے جو ان کی فکر سے متاثر ہیں اور جو امت کے اتحاد اور غلبے پر یقین رکھتے ہیں تو آج صورتحال یکسر مختلف ہوتی، میرا خیال ہے اگر یہ لوگ دوسرا راستہ اختیار کرتے تو آج عالم اسلام کی یہ پوزیشن نہ ہوتی اور ہم آج دنیا میں یوں مار نہ کھا رہے ہوتے لیکن بد قسمتی سے ایسا نہ ہو سکا لہذا آج عالم اسلام نیکوز روینرز اور مجاہدین دونوں کے ہاتھوں نقصان اٹھا رہا ہے اور آج پوری دنیا شدید خطرات میں گھر چکی ہے۔

ہم اب آتے ہیں اس مسئلے کے حل کی طرف اس مسئلے کے دو حل ہیں ہمیں آپ کو یہ حل مل سکتا ہے۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com



## پسپائی کے پچاس سال

مغرب اور عالم اسلام کے اس تصادم کے تین حل ہیں: دنیا کے سارے عیسائی، یہودی، بودھ، ہندو اور کیمونسٹ بیک جنٹس قلم مسلمانوں کے تمام مطالبات مان لیں، تمام غاصب توہیں فلسطین، کشمیر، چین، بنگلہ دیش، عراق اور افغانستان مسلمانوں کے حوالے کر دیں، اپنی فوجیں نکالیں، عالم اسلام سے معافی مانگیں، دونوں فریق مل کر دنیا کی حد بندی کر دیں اور اس کے بعد مغرب کی حد میں مسلمان داخل نہ ہوں اور اسلامی حدود میں کوئی گورا قدم نہ رکھے مگر یہ حل ممکن نہیں، کیوں؟ کیونکہ مسلمانوں سے تصادم تمام توہیں کی گنا طاقتور ہیں اور طاقتور کبھی اپنا قبضہ نہیں چھوڑتا، دوسرا حل جہاد ہے، دنیا کے 61 اسلامی ملک اہل مغرب کے خلاف اعلان جہاد کر دیں، دنیا کے ایک ارب 45 کروڑ مسلمان استعمار کے خلاف کھڑے ہو جائیں، جس کے ہاتھ میں ڈنڈا اور ہودہ ڈنڈا لے کر نکل آئے، جس کے پاس چھری ہو وہ چھری لے کر باہر آ جائے اور جس کے پاس پستول، بندوق، توپ اور انٹیم بم ہے وہ انٹیم بم اور پستول لے کر میدان میں کود پڑے، ہم سب مل کر دشت اور دریاؤں سے بحرہ ظلمات تک گھوڑے دوڑا دیں، ہم سب اپنے اپنے کافر ہمسایوں سے دست و گریبان ہو جائیں اور اس جنگ میں خود بھی مر جائیں اور دشمنوں کو بھی مار دیں لیکن ظاہر ہے یہ حل بھی ممکن نہیں، کیوں؟ کیونکہ اسلامی دنیا اب "امت" نہیں رہی، یہ 61 آزاد اور خود مختار ملک ہیں اور ہر ملک کے اپنے اپنے مفادات ہیں اور کوئی اسلامی ملک کسی برادر اسلامی ملک کیلئے اپنے مفادات کی قربانی دینے کیلئے تیار نہیں، مفادات کی حالت یہ ہے اسرائیل اور لبنان کی موجودہ جنگ میں جب مصر سے مداخلت کی اپیل کی گئی تو مصری صدر حسنی مبارک نے جواب دیا، "مصری فوج مصر کی حفاظت کے لئے بنائی گئی تھی لبنان کیلئے نہیں" اسرائیل کے ارد گرد 22 اسلامی ممالک ہیں، اسرائیل نے ان میں سے 9 ممالک کی زمین پر قبضہ کر رکھا ہے لیکن یہ ممالک آج تک اس قبضے کے خلاف اکٹھے نہیں ہو سکے، حالت یہ ہے جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تھا تو پورے عالم اسلام نے امریکہ کی حمایت کی تھی، پاکستان نے اس جنگ میں امریکہ کو ہوائی اڈے فراہم کئے تھے جبکہ عربوں نے امریکہ کی طیاروں کو پٹرول دیا تھا۔ اسی طرح جب عراق پر حملہ ہوا تو سعودی عرب سمیت سارے عرب ممالک نے امریکہ کی مدد فرمائی تھی، امریکہ کی فوج پہلے سعودی عرب، ترکی اور کویت میں اتری تھی اور پھر وہاں سے



مارچ کرتی ہوئی عراق میں داخل ہوئی تھی لہذا جب صورتحال یہ ہو تو اجتماعی جہاد کا تصور ممکن نہیں ہوتا اور اب رہ گیا تیسرا حل تو اس حل کو ہم جاپانی حل کہہ سکتے ہیں۔

جاپان دوسری جنگ عظیم سے پہلے دنیا کی دوسری بڑی عسکری قوت تھا 1937ء سے لے کر 1945ء تک جاپان میں چھ سو مصنوعات تیار ہوتی تھیں اور اس میں ایک ہزار چار سو بیس تھے جاپانی فوجیوں کے بارے میں کہا جاتا تھا ان کے صرف دو مقصد ہوتے ہیں ”مار دو یا مر جاؤ“ کہا جاتا تھا پسپائی اور واپسی جیسے لفظ جاپانی دشمنی میں شامل نہیں لیکن پھر جاپانیوں کی زندگی میں 6 اور 9 اگست آیا ”چھ اگست 1945ء کو صبح آٹھ بج کر 15 منٹ پر امریکی جہاز بی 29 نے ہیروشیما پر پہلا ایٹم بم گرایا اس بم کا نام ”نول بوائے“ تھا اس بم نے 30 سینٹر میں ایک لاکھ 40 ہزار لوگوں کو لقمہ اجل بنادیا جبکہ 80 ہزار لوگ زندگی بھر کیلئے معذور ہو گئے امریکہ نے 9 اگست کو صبح 11 بج کر 2 منٹ پر ناگاساکی پر دوسرا بم گرایا اس ایٹم بم کا نام ”نیٹ مین“ تھا اور یہ بم 74 ہزار جاپانیوں کو نکل گیا ”ہیروشیما اور ناگاساکی اس وقت جاپان کی ”بیک بون“ تھے چنانچہ دو دن میں دو بڑے شہروں کی جہاں اور دو لاکھ 14 ہزار لوگوں کی موت نے جاپان کو برباد کر دیا جاپان نے امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جس کے بعد امریکی جنرل میک آر تھرنے جاپان کی عثمان اقتدار سنبھال لی اس وقت جاپان کا شہنشاہ ہیروشیما تھا جاپانی اپنے شہنشاہ کی اوتار کی طرح عزت کرتے تھے جنرل میک آر تھرنے بادشاہ کو اپنے دفتر بلایا اور اسے کئی گھنٹے دفتر کے باہر بٹھائے رکھا جاپانی اس واقعے کو تاریخ کا انتہائی ذلت آمیز واقعہ قرار دیتے ہیں لیکن پھر کیا ہوا جاپانی قوم نے اپنی ذلت اپنی نفرت اور اپنی شکست کو علم فن سائنس اور معیشت میں تبدیل کر دیا اس نے توپ اور فوج کے بغیر جنگ لڑنے کا اعلان کیا اور اس جنگ میں امریکہ سے بدلے لینے کا فیصلہ کیا جاپانی شہنشاہ ہیروشیما نے جاپانی قوم کو اپنا اسلحہ امریکی فوج کے حوالے کرنے کا حکم دیا جاپانی قوم نے اسی وقت اپنے تمام ہتھیار امریکہ کے حوالے کر دیئے اور وہ دن ہے اور آج کا دن ہے جاپان کے کسی شہری نے بددوق اور پستول کو چھو کر نہیں دیکھا شہنشاہ نے جاپان میں فوج کے خاتمے کا اعلان کر دیا اور یہ قانون پاس کر دیا جاپان اپنے دفاع پر پی این پی کا صرف ایک فیصد خرچ کرے گا۔ 1945ء میں جاپان میں فوجی گاڑیاں بنانے والی 11 اور فوج کے لئے برقی آلات بنانے والی 2 کمپنیاں تھیں ہونڈا نیسان اور ایسوز فوجی ٹرک بناتی تھیں جبکہ ہینداچی اور تو شیا بموں کے لیوز اور توپوں کے ٹرانسپورٹ تیار کرتی تھیں اس وقت توکیو میں مشین گن اور رائفلیں بنانے کے 21 کارخانے تھے جاپانی قوم نے ان کو گاڑیاں سلوائی مشینیں کیمرے دوربینیں ریڈیو ٹیلی ویژن اور کھڑیاں بنانے کی فیکٹریوں میں تبدیل کر دیا حکومت نے توکیو شہر میں ایک سو بڑی یونیورسٹیوں اور تکنیکی کالجوں کی بنیاد رکھی آج ان کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تعداد ایک ہزار ہو چکی ہے جاپانی قوم نے بچت انکسپورٹ اور ویلفیئر کو اپنی بنیاد بنایا جاپان کا ہر شہری اپنی آمدنی کا دس فیصد بینک میں جمع کراتا تھا بینک یہ رقم حکومت کو دیتے تھے حکومت اس سے فیکٹریاں لگاتی تھی ان فیکٹریوں کی 70 فیصد پیداوار برآمد کی جاتی تھی اور اس سے جو زر مبادلہ ملتا تھا اس سے ہی مشینیں گاڑیاں ہتھیار اور دیگر سامان

تھا، جاپان نے قانون بنایا اگر اس کی کسی فرم میں سولازمین کی گنجائش ہے تو اس فرم میں ہر وقت سولازمین پورے رہیں گے، جس فرم میں ایک آدھ پوسٹ خالی رہ جاتی حکومت اسے بھاری جرمانہ کر دیتی، جاپان نے جاپانی معاشرے کو دلفیئر سوسائٹی کی شکل دی اس دلفیئر سوسائٹی میں عوام کی فلاح و بہبود حکومت کی بجائے لوگوں کا کام تھا، لوگوں نے یہ ذمہ داری خوب نبھائی لہذا 1980ء میں جاپان دنیا کی دوسری بڑی معیشت بن گیا، جاپان کی کمپنیوں، کیمروں، ریڈیو، ٹی وی، گاڑیوں اور کپڑوں نے پورے امریکہ کو شکست دے دی، لوگ ہارورڈ کی بجائے نوکیو یونیورسٹی میں داخلہ لینے لگے اور امریکی صدر کے ٹائم میں تک کے نیچے میڈان جاپان کی مہر لگ گئی۔ یہ وہی جاپان تھا جس میں دوسری جنگ عظیم کے بعد 30 لاکھ فٹیش پڑی تھیں اور جس کے پاس ان فٹیشوں کے لئے کفن تک نہیں تھا۔ جاپان کی یہ ترقی صرف ایک فیصلے کی مرہون منت تھی، جاپان نے 1945ء میں فیصلہ کیا تھا امریکہ کے پاس ایٹم بم ہے لہذا اگر اس نے زندہ رہتا ہے تو اسے اپنے جذبے اپنی نفرت اور اپنے انتقام کی شکل بدلنا ہوگی اور اسے مغرب کے اس نازک حصے پر ضرب لگانا ہوگی جہاں سے وہ بچ نہ سکے اور اس وقت مغرب کا وہ نازک حصہ معیشت، ٹیکنیٹی اور تعلیم تھی، جاپان نے اپنے انتقام کو نوکیو یونیورسٹی، ہونڈا، ٹیوٹا، نیسان، مہرڈا، سونی، توشیبا، ہیاچی اور نوکیو سناک کی سمجھ کی شکل دے دی لہذا آج جاپان فوج، گولی اور توپ کے بغیر دنیا کا سب سے بڑا قلعہ ہے اور آج پوری دنیا جاپان کے سامنے سرگوں ہے۔

مغرب اور عالم اسلام کی جنگ کا تیسرا حل جاپان کا یہ ماڈل ہے، اگر ہم پچاس برس کے لئے پسپائی اختیار کر لیں، اگر ہم پچاس سال کیلئے اپنے کشمیر، فلسطین اور چین کو بھول جائیں، اگر ہم پچاس سال کے لئے اہل مغرب کی طاقت کو تسلیم کر لیں اور اگر ہم اپنے دکھ اپنی شکست، اپنی تکلیف اور اپنی ذلت کو عظم، ٹیکنالوجی اور ٹیکنیٹی کی شکل دے دیں، اگر ہم پچاس سال کے لئے کولہ بارود، بم اور فوج پر پابندی لگا دیں اور اگر ہم پچاس سال کیلئے اپنے جہاد کو عظم اور دس گاہ کی شکل دے دیں، اگر آج ہمارے فدائی، ہمارے خود کش حملہ آور فیصلہ کر لیں انہوں نے کسی امریکی ٹینک سے ٹکرانے کی بجائے اپنی جان لیبارٹری اور لائبریری میں دیتی ہے اور اگر ہم آج یہ فیصلہ کر لیں، ہم جو رقم جنگوں اور کولہ بارود پر خرچ کرتے ہیں ہم نے آج سے دو رقم یونیورسٹیوں اور تجربہ گاہوں پر استعمال کرنی ہے اور ہم نے اس سے علم اور ٹیکنالوجی حاصل کرنی ہے تو یقین کیجئے ہماری پسپائی کے یہ پچاس سال ہمیں فتح کی اس انتہا تک لے جائیں گے جہاں ساری قومیں ہمارے تختوں تک رہ جائیں گی، جاپانی قوم کے بارے میں سبک آدھرنے کہا تھا، ان کے غصے نے انہیں 35 برس میں وہاں پہنچا دیا جہاں امریکہ دو سو سال میں پہنچا تھا، مجھے یقین ہے اگر ہم بھی اپنی نفرت کا رخ موڑ لیں تو ہم پچاس برسوں میں وہاں پہنچ جائیں گے جہاں مغرب پانچ سو سال میں پہنچا تھا۔

نوٹ: یہ پانچ کالوں کے سلسلے کا آخری کالم ہے، یہ سلسلہ 10 اگست کو "یہ جنگ کیسے شروع ہوئی" کے کالم سے شروع ہوا، اگر آپ ان پانچ کالوں کو اکٹھا پڑھیں تو آپ کو سلسلہ سمجھنے میں بہت ہوگی۔





## بادشاہوں کی غلطیاں

تیمور لنگ کا تعلق سرقد سے تھا، وہ سرقد کے قریب ایک گاؤں کیش میں پیدا ہوا، اس کے والدین معمولی درجے کے زمیندار تھے، وہ جوان ہوا تو وہ سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہو گیا، چند ماہ بعد اس نے سپہ سالار کو قتل کر دیا اور فوج کی عثمان سنبھال لی، یہ ایک چھوٹے درجے کے امیر کی فوج تھی، بادشاہ تیمور کی خدا داد صلاحیتوں سے ڈر گیا اور اس نے تیمور سے جان چھڑانے کی کوششیں شروع کر دیں، تیمور کو امیر کی سازشوں کی بھٹک پڑ گئی لہذا اس نے امیر سے جان چھڑائی اور وہ بادشاہ بن گیا، یہ اس کی پہلی بادشاہت تھی اس کے بعد وہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا اور اس نے آدمی دنیا سوس میں روند دی۔ 1403ء میں جب اس کا انتقال ہوا تو وہ فاتح عالم اور تیموری گریٹ بن چکا تھا۔

تیمور تاریخ کا ایک انتہائی دلچسپ کردار تھا، وہ حافظ قرآن تھا، وہ قرآن مجید کو ان اس سے الٹ کر الٹ پڑھ سکتا تھا، وہ دونوں ہاتھوں سے یکساں طاقت سے لڑتا تھا، وہ انتہائی خوشنور تھا، وہ جو ملک فتح کرتا تھا اس کے تمام مردوں کو زندہ کر دیتا تھا، عورتوں کو لوٹ لیا، اور بچوں کو غلام بنالیتا تھا اور سارے شہر جل کر رکھ کر دیتا تھا، وہ چنگیز خان کی طرح کھوپڑیوں کے بیٹا بھی بناتا تھا، اس ظلم و ستم کے ساتھ ساتھ وہ علم اور فن کا بھی بڑا شیدائی تھا، وہ فاتح کی حیثیت سے جس شہر میں داخل ہوتا تھا وہ اس کے تمام عالموں، فاضلوں اور ماہرین فن کو امان دے دیتا تھا، وہ جنگ کے بعد ان عالموں کے ساتھ مناظرہ کرتا تھا، ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہوتا تھا اور انہیں بھاری مراعات دے کر اپنے شہر ”سبز“ بھجوا دیتا تھا جہاں انہیں نامرگ شاندار وظیفہ دیا جاتا تھا، اس کی جنگ کا طریقہ بھی انتہائی دلچسپ تھا، وہ اپنے ہدف ملک کے بادشاہ کو اطاعت قبول کرنے کی پیش کش کرتا تھا، اگر بادشاہ یہ پیشکش مسترد کر دیتا تھا تو وہ اس ملک پر حملہ کر دیتا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا تھا، فتح کے بعد وہ اپنے سپاہیوں کو لوٹ مار اور قتل و غارت کی کھلی پھٹی دے دیتا تھا، سپاہی کئی دنوں تک قتل کرتے اور لوٹے رہتے تھے، جب ان کا دل بھر جاتا تھا تو تیمور شہر کو آگ لگانے کا حکم دے دیتا تھا، سارا شہر اکھڑا، امیر بن جاتا تھا، تیمور نے اپنی زندگی میں 54 ملک فتح کئے، امیر تیمور نے اپنی آپ بیتی بھی لکھی تھی، اس کتاب کا شمار دنیا کی بہترین کتابوں میں ہوتا ہے، یہ کتاب ترکی زبان میں لکھی گئی لیکن یہ سب سے پہلے فرانسیسی میں شائع ہوئی اور اس کے بعد دنیا کی 70 سے زائد زبانوں میں



اس کا ترجمہ ہوا "اردو میں یہ کتاب "میں ہوں تیمور" کے ناظم سے شائع ہوئی، یہ میری زندگی کی چند بڑی کتابوں میں شمار ہوتی ہے، میں نے جب پہلی بار یہ کتاب پڑھنا شروع کی تو میں تیمور کی شخصیت کا گرویدہ ہو گیا، وہ مجھے عزم و ہمت اور جذبے کا ایک ایسا اہالیہ محسوس ہوا جس کے قدموں میں کھینچ کر دنیا کی ہر چیز چھوٹی ہو جاتی تھی لیکن جب میں نے یہ کتاب ختم کی تو میں نے محسوس کیا امیر تیمور اور اس کے مفتوحہ بادشاہوں کے درمیان اتنا بہادری اور کشور کشائی کی جنگ تھی، دونوں بادشاہ ایک دوسرے کو مات دینا چاہتے تھے، تیمور تاریخ میں فاتح عالم کہلاتا تھا بتاتھا جبکہ دوسرے بادشاہ اس کے ارادوں کی راہ میں رکاوٹ بن رہے تھے یوں دو بادشاہوں کی آنا آپس میں ٹکرائی اور اس ٹکراؤ کے نتیجے میں ہزاروں لاکھوں لوگ مارے گئے، ہزاروں لاکھوں عورتیں عصمت سے محروم ہوئیں، لاکھوں بچے یتیم ہو کر غلام بنے اور سینکڑوں نابالغ روزگار شہر پرند خاک ہو گئے، میں نے جب یہ کتاب پڑھی تو میں نے سوچا بادشاہوں کی اس لڑائی میں ان لوگوں کا کیا تصور تھا؟ ان بے گناہ لوگوں نے کیا جرم کیا تھا؟ مجھے آج تک اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا، اس سوال کے بعد میں نے تاریخ عالم کا نئے زاویے سے مطالعہ شروع کیا تو میں نے دیکھا محمود غزنوی سچے پال سے آنکر آیا لیکن اس کا نقصان ہندوستان کے ان ہزاروں بے گناہ شہریوں نے اٹھایا جنہوں نے یہ جنگ چھیڑی تھی اور نہ ہی وہ یہ جنگ روک سکتے تھے، ظہیر الدین بابر اور ابراہیم لودھی دونوں مسلمان تھے، دونوں کی آنا ٹکرائی اور لاکھوں معصوم لوگ مارے گئے، ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی لڑائی میں بھی ہزاروں لاکھوں بے گناہ کام آئے اور آج کی تاریخ میں صدر بش اور سلامتی جنگ کا نقصان بھی لاکھوں بے گناہ افغان اٹھا رہے ہیں، اسی طرح بش اور صدام حسین کی لڑائی کا نقصان بھی عراقی شہری اٹھا رہے ہیں، میں نے سوچا امریکہ اور عراق کی جنگ کے دوران صدام حسین نے عوام سے رائے لی تھی اور نہ ہی اسامہ بن لادن اور امریکی تہذیب کے ٹکراؤ میں کسی نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے بے گناہوں اور معصوم لوگوں سے ریفرنڈم کرایا تھا، ہمارے صدر پرویز مشرف نے بھی رجسٹر آف شیخ کے "مشورے" پر عمل کرتے ہوئے پاکستان کے پندرہ کروڑ لوگوں سے پوچھا تھا اور نہ ہی ملا عمر نے امریکی جہازوں کو بمباری کی دعوت دینے سے پہلے عوام کو اعتماد میں لیا تھا، مجھے محسوس ہوا دنیا کی تمام جنگیں دو طاقتور لوگوں کا فیصلہ ہوتی ہیں لیکن اس کا نقصان ہمیشہ عوام اٹھاتے ہیں، دوسری جنگ عظیم بطور اوج چل کر لڑائی تھی لیکن اس کا نقصان دو کروڑ معصوم اور بے گناہ لوگوں نے اٹھایا، 1945ء میں ہیرو ڈیونز نے امریکی دھمکی کو سنجیدگی سے نہیں لیا لیکن ان کی غیر سنجیدگی کے نتیجے میں ہیروشیما اور ناگا ساگی کے وہ بے گناہ لوگ مارے گئے جنہوں نے یہ جنگ چھیڑی تھی اور نہ ہی وہ اسے روکنے کی قدرت رکھتے تھے، میں جوں جوں تاریخ کو اس زاویے سے پڑھتا گیا مجھے یہ قدرت کی قسم نظر ملی بلکہ ظلم عموماً ہونے لگا لہذا میں نے ایک دن اپنے ایک دوست سے اس کا ذکر کیا تو اس نے سنجیدگی سے جواب دیا "قدرت عوام کو اس کی غفلت اور بے حسی کی سزا دیتی ہے" میں نے پوچھا "وہ کیسے؟"

دو یوں "قدرت ایسے مظالم کے ذریعے لوگوں سے پوچھتی ہے تمہارے اوپر جیسے غم یا گل لوگ حکومت کر رہے

تھے۔ لیکن تجربہ کار لوگ خاموش رہتے۔ صرف اللہ اور رحمہ اللہ۔ حق تعالیٰ کے فضل سے۔

اختلاف تھا لیکن میں نے بحث کسی اچھے وقت پر چھوڑ دی۔

میں نے گزشتہ روز طالبان کے ترجمان عبدالجی مطہر کا ایک بیان پڑھا اس بیان میں انہوں نے فرمایا ”پاکستان طالبان کا دشمن ہے پاکستان امریکہ کا اتحادی ہے لہذا وہ ہمارے لئے اتحادی برا ہے حتیٰ افغانستان کی کٹ پتلی حکومت“ عبدالجی مطہر کا یہ بیان بھی تیمور سوچ کا تسلسل ہے پاکستان نے 1994ء میں جب طالبان کا ساتھ دیا تھا تو اس وقت کے حکمرانوں نے عوام سے مشورہ کرنا گوارہ نہیں کیا تھا اور جب 2001ء میں حکومت پاکستان نے یوٹرن لیا تھا تو اس وقت بھی حکومت کے کسی کارندے نے لوگوں سے رائے نہیں لی تھی، پہلی مرتبہ یہ فیصلہ جنرل نصیر اللہ بابر نے کیا تھا اور دوسرا فیصلہ جنرل پرویز مشرف نے کیا تھا لیکن دونوں مرتبہ پاکستان کے بے گناہ اور معصوم لوگوں نے ان فیصلوں کا تادان ادا کیا، دونوں مرتبہ عام لوگ اس فیصلے کی زد میں آئے، اگر ہم ڈراما سکرینی میں جا کر دیکھیں تو 1979ء میں افغانستان میں جہاد کا فیصلہ بھی پاکستان کے عوام نے نہیں کیا تھا، یہ فیصلہ جنرل ضیاء الحق نے اپنے ناجائز اقتدار کو جائز بنانے کیلئے کیا تھا لیکن اس کا تادان پاکستان کے عوام کلاشکوف اور ہیردین کی شکل میں آج تک دے رہے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کو اس فیصلے کے ذریعے ٹارگٹ شہنشاہت ملی لیکن ہزاروں پاکستانی عوام بم دھماکوں میں مارے گئے اور پاکستان شیعہ اور سنی میں تقسیم ہو گیا اور اس تقسیم کے نتیجے میں آج پاکستان میں مسجد محفوظ ہے اور نہ ہی امام بارگاہ جنرل ضیاء الحق کی سنت پر مملد آمد کرتے ہوئے جنرل پرویز مشرف نے 2001ء میں اس فیصلے کو آگ لگا دی جو ہماری انجینیئریوں نے 1994ء میں بوئی تھی اور 2001ء تک پہنچ کر جس نے پھل دینا شروع کر دیا تھا جنرل پرویز مشرف کے اس فیصلے سے انہیں امریکہ کے پہلو میں جیکل ملی لیکن پاکستانی عوام خطرات کا شکار ہو گئے اور ان پر خود کش دھماکے ہونے لگے وہ مسجدوں، امام بارگاہوں اور بازاروں میں مرنے لگے یہاں تک کہ آج طالبان نے بھی پاکستان کو دشمن ڈیکلئر کر دیا ہے۔ مجھے خدشہ ہے جس طرح افغانستان میں اتحادی فوجوں پر حملے ہو رہے ہیں چند ماہ بعد پاکستان میں بھی ایسی ہی صورتحال پیدا ہو جائے گی، اگر خدا نخواستہ پاکستان میں ایسی صورتحال پیدا ہوگی تو مجھے یقین ہے اس صورتحال کے سوا کو آرام سے زندگی گزارتے رہیں گے لیکن ہم بے گناہ لوگ ایک بار پھر مرنا شروع ہو جائیں گے۔ کسی ستم ظریف نے کیا خوب کہا تھا ”بادشاہوں کی غلطیوں کا کفارہ عوام ادا کرتے ہیں“۔ ہمارے بادشاہ جو کچھ کر رہے ہیں مجھے خطرہ ہے ہماری آنے والی کئی نسلیں اس کا کفارہ ادا کریں گی۔





## 67 لاکھ شتر مرغ

حسن کا تعلق غزوہ سے تھا، اس کے والد سرکہ مٹاتے تھے، اس کی والدہ اور بہنیں یہ سرکہ بوتلوں میں بھرتی تھیں، ان بوتلوں پر لیبل لگاتی تھیں اور یہ لوگ یہ بوتلیں شام بھجوا دیتے تھے، شام میں سرکہ کی بہت مانگ تھی، اس کام میں انہیں بچت ہو جاتی تھی، یہ لوگ امن پسند تھے، یہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے لیکن 1993ء میں ایک دن حسن کے والد غائب ہو گئے، وہ آخری بار غزوہ کی اسرائیلی چیک پوسٹ پر دیکھے گئے تھے، حسن نے اسرائیلی فوج کے کرنل سے رابطہ کیا، اس نے تصویر دیکھی اور یہ تصویر برقی کی فوٹری میں پھینک کر بولا ”میں اس شخص کو نہیں جانتا“ حسن نے کرنل کے رویے پر احتجاج کیا، کرنل نے گاڈ ز کو ایشاءہ کیا اور اسرائیلی فوجیوں نے حسن کو بار بار کرا دھ مورا کر دیا، حسن نوٹا بازہ اور پٹھان سر لے کر واپس آیا تو اس کے گھر میں صف ماتم بچھ گئی، اس کے بعد حسن کے اندر جنگ شروع ہو گئی وہ اس تذلیل کا بدلہ لینا چاہتا تھا، جس دن اس نے چار پانی سے نیچے قدم رکھا اس دن وہ ”دہشت گرد“ بن گیا وہ غزوہ سے ہیرو مت گیا اور وہاں اس نے حزب اللہ جوائن کر لی، پچھلے تیرہ برسوں میں حسن نے یہودیوں کے خلاف بے شمار آپریشن کئے، ان آپریشنوں میں اس نے اسرائیل کو شدید نقصان پہنچایا وہ اس وقت بھی ہیرو مت میں ہے اور ہیرو مت کے کسی خفیہ مقام سے اسرائیلی فوج پر چھوٹے سائز کے میزائل داغ رہا ہے۔

حزب اللہ حسن جیسے مجاہدین کی ایک چھوٹی سی جماعت ہے، اس کے 95 فیصد ارکان نے کسی فوجی اکیڈمی سے ٹریننگ حاصل نہیں کی، یہ لوگ حسن کی طرح نفرت اور ذلت کی آگ میں جلے، جل جل کر مٹا رہے ہیں اور انہوں نے اسرائیل اور اس کے حواریوں پر عرصہ حیات تک کر دیا، 1993ء میں امریکہ کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے بین الاقوامی دہشت گرد تنظیموں کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی تھی، اس رپورٹ میں انکشاف ہوا کہ حزب اللہ کے کل مجاہدین کی تعداد پانچ سے دس ہزار ہے اور ان میں صرف 300 سے 400 لڑاکا مجاہدین ہیں۔ 2003ء میں دہشت گردوں کے بارے میں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے دوسری رپورٹ جاری کی تھی اس رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ حزب اللہ کے کل مجاہدین کی تعداد تین ہزار سے زائد نہیں، جنوبی لبنان میں یہ لوگ صرف ایک ہزار ہیں اور ان میں بھی کل قحی مجاہدین صرف 300 ہیں، رپورٹ میں انکشاف ہوا یہ لوگ کبھی کسی ریکولر آرمی کا حصہ



نہیں رہے اور ان کی اہلیت صرف ہلکے پھلکے ہتھیاروں تک محدود ہے، اب ہم ان دونوں رپوں کو سامنے رکھ کر لبنان، فلسطین اور اسرائیل کی موجودہ جنگ کا تجزیہ کرتے ہیں، ہم فرض کرتے ہیں حزب اللہ کے مجاہدین کی تعداد دس ہزار ہے اور یہ دس ہزار نو جوان کسی ریگولر آرمی کا حصہ نہیں ہیں، ان کے پاس ٹینک ہیں، مشین گنیں ہیں اور مدعی اہم ہم ہیں لیکن اس قلیل تعداد اور بے سروسامان نو جوانوں نے پچھلے 20 برس سے اس اسرائیل کا ناظرہ بند کر رکھا ہے جس کے پاس ایک لاکھ 75 ہزار ریگولر آرمی اور 4 لاکھ 30 ہزار یزید فوج ہے اور جس کا دفاعی بجٹ 11 بلین ڈالر ہے اسرائیل کے پاس 3800 ٹینک دس ہزار تو ہیں اور 2105 لڑاکا طیارے بھی ہیں لیکن یہ غیر تربیت یافتہ نو جوان اسرائیل کی انتہائی تربیت یافتہ فوج کو لے کر بیٹھ گئے ہیں یہ غیر تربیت یافتہ نو جوان ایک حملے میں اسرائیل کے چھپچھپے فوجی ہلاک کر دیتے ہیں اور اسرائیل ان دس ہزار نو جوانوں سے چھٹکارے کیلئے امریکہ سمیت دنیا کی دس بڑی طاقتوں سے مدد لینے پر مجبور ہے۔ یہ اس جنگ کا ایک پہلو ہے۔

آپ جنگ کا دوسرا پہلو بھی ملاحظہ کیجیے، اس وقت دنیا میں 161 اسلامی ممالک ہیں، ان 61 ممالک میں ایک ارب 47 کروڑ 62 لاکھ 33 ہزار 4 سو 70 مسلمان آباد ہیں اور ان 161 اسلامی ممالک میں سے 56 ملکوں کے پاس ریگولر فوجیں ہیں اگر ان 56 ممالک کی فوجوں کو ملایا جائے تو ان کی تعداد 66 لاکھ 76 ہزار 5 سو 60 فوجی ہو جاتی ہے یہ 56 ممالک ہر سال اپنی فوجوں پر مجموعی طور پر 76 بلین 9 سو 50 ملین ڈالر خرچ کرتے ہیں، ان ممالک میں سعودی عرب کا دفاعی بجٹ 21 بلین 8 سو 76 ملین ڈالر ہے، ترکی کا عسکری بجٹ سواں بلین ڈالر، ایران کا پونے چھ بلین ڈالر، پاکستان کا ساڑھے تین بلین ڈالر، کویت کا سوا تین، انتھویا کا سوا تین، الجزائر کا تین، مصر کا پونے تین اور اسرائیل، عمان اور قطر کا دو، دو بلین ڈالر ہے لیکن آپ اتحاد دیکھئے حزب اللہ کے تین سو سے دس ہزار مجاہدین نے اسرائیل اور امریکہ سمیت دنیا کی دس بڑی فوجوں کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے جبکہ 66 لاکھ 76 ہزار 5 سو 60 فوجیوں اور دو سو اعلیٰ ہوں ہزاروں میزائلوں، رائٹوں، میٹکوں اور توپوں کے مالک 161 اسلامی ممالک اسرائیل کے سامنے دم سادھ کر بیٹھے ہیں، پورا یورپ اور امریکہ کھل کر اسرائیل کی حمایت کر رہا ہے، امریکہ سلاطینی کونسل میں جنگ بندی کی قرارداد کو ویٹو کر چکا ہے، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور روس اسرائیل کو حق بجانب قرار دے رہے ہیں، اسرائیل امریکی رائٹوں میں امریکی گولیاں بھر کر فلسطینی اور لبنانی مسلمانوں کو نشانہ بن رہا ہے، پورے لبنان میں اس وقت فحش بکھری پڑی ہیں، لبنان کے پانچ شہروں کی 70 فیصد عمارتیں زمین بوس ہو چکی ہیں، ہیروت میں پچھلے پانچ دنوں سے مسجدوں میں اذانیں نہیں ہوئیں اور لوگ بمباری کی وجہ سے مردوں کو کلن کے بغیر دفن کرنے پر مجبور ہیں لیکن پورا عالم اسلام اس ظلم پر خاموش ہے، کسی اسلامی ملک نے اب تک سرکاری سطح پر امریکہ اور اسرائیل کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا اور کسی اسلامی ملک نے اپنی فوج ہیروت بھجوانے کا فیصلہ نہیں کیا، حد ملاحظہ کیجیے اسرائیل کے جو طیارے لبنان اور فلسطین پر حملے کر رہے ہیں، اس کے جو ٹینک اور جو توپیں لبنان کے مسلمانوں پر بمباری کر رہی ہیں ان میں سعودی عرب اور امارات کا تیل استعمال ہو رہا ہے،

اسرائیل کو اس جنگ کیلئے جو بینک پیسے دے رہے ہیں ان بینکوں میں عربوں کے شیئرز ہیں، آپ حد ملاحظہ کیجئے اس وقت اسلامی دنیا میں 30 ہزار ملٹی بیٹنل کمپنیاں کام کر رہی ہیں، ان 30 ہزار ملٹی بیٹنل کمپنیوں میں سے 21 ہزار کمپنیوں کے مالک یہودی ہیں اور یہ تمام یہودی اس جنگ میں اسرائیل کو مالی امداد دے رہے ہیں لیکن کسی اسلامی ملک نے ان ملٹی بیٹنل کمپنیوں کو ملک سے نکلنے کا حکم نہیں دیا یہ اس جنگ کا دوسرا پہلو ہے۔

اس جنگ کا تیسرا پہلو اس سے بھی خوفناک ہے پوری دنیا جانتی ہے چود اسلامی ممالک امریکہ کے ہار گٹ ہیں، یہ اسلامی ملک افغانستان، عراق، ایران، شام، پاکستان اور سعودی عرب ہیں، امریکہ افغانستان اور عراق کو نشانہ بنا چکا ہے وہ اب اسرائیل کے ذریعے شام اور ایران کو نشانہ بنائے گا اس کے بعد وہ بھارت کے ذریعے پاکستان پر حملہ کرے گا اور آخر میں وہ تیل کی قیمتوں کا بھانہ بنا کر سعودی عرب کو ہار گٹ بنائے گا، پوری دنیا جانتی ہے امریکہ پہلے ڈاکٹر عبدالقدیر کو بنیاد بنا کر پاکستان کے اٹمی پلانٹ پر قبضہ کرے گا اور اس کے بعد بھارت اسرائیل کے شاہل میں پاکستان میں لشکر طیبہ کے ٹھکانوں پر بمباری شروع کر دے گا، پوری اسلامی دنیا جانتی ہے امریکہ دنیا میں تیل کی قلت اور تیل کی قیمتوں میں اضافے کو سعودی عرب کے خلاف جنگ کا جواز بنائے گا اور پوری اسلامی دنیا جانتی ہے لبنان کی یہ جنگ صرف ہیرت تک محدود نہیں رہے گی یہ جنگ ہر اس اسلامی ملک تک پھیل جائے گی جس میں ذرا سی بھی غیرت اور ایمان باقی ہوگا لیکن اس کے باوجود کوئی اسلامی ملک سراٹھا کر نہیں دیکھ رہا، کوئی اسلامی ملک اس آگ کو داپس اسرائیل میں نہیں دیکھ رہا 161 اسلامی ملک شتر مرغ کی طرح اپنی گردن ریت میں دبا کر بیٹھے ہیں۔ پوری دنیا جانتی ہے یہ جنگ کبھی نہ کبھی پاکستان ضرور پہنچے گی، عالم اسلام کو کبھی نہ کبھی اس مصلحت، اس خاموشی اور اس نا عاقبت اندیشی کی قیمت ادا کرنا پڑے گی پوری دنیا جانتی ہے آج جو لوگ چٹان پر بیٹھ کر جس سیلاب کا نظارہ کر رہے ہیں وہ سیلاب کبھی نہ کبھی ان کی دلیہز تک بھی پہنچے گا اور جو لوگ جس آگ کو پرائے گھر کی آگ سمجھ رہے ہیں وہ آگ کبھی نہ کبھی ان کے گریبان بھی راکھ کرے گی، عجیب بات ہے 300 نوجوان پوری دنیا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑے ہیں اور 167 لاکھ شتر مرغ ریت کے سورچے میں مچھے بیٹھے ہیں۔





## سکھ فوج

رنجیت سنگھ سکھوں کی تاریخ کا پہلا حکمران تھا، وہ 13 نومبر 1780ء میں گوجرانوالہ میں پیدا ہوا، اس کا والد مہان سنگھ پھوٹی سی "مثل" کا سردار تھا، ان دنوں پنجاب میں جاگیریں اور چھوٹی سرداریاں مثل کہلاتی تھیں، رنجیت سنگھ پر بچپن میں چچک کا حملہ ہوا اور وہ اس کی ایک آنکھ لے گئی، بارہ سال کی عمر میں وہ اپنی مثل کا سردار بن گیا، وہ ایک ہم جو انسان تھا، وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا، اس وقت لاہور پر تین سکھ سردار قابض تھے، رنجیت سنگھ نے لاہور کے مسلمانوں سے خفیہ رابطے قائم کئے، مسلمانوں نے اسے لاہور بلایا اور شہر اس کے حوالے کر دیا، اس نے سکھ سرداروں کو مار دیا اور لاہور پر قابض ہو گیا، اس وقت اس کی عمر صرف 19 برس تھی، 1802ء میں اس نے امرتسر پر بھی قبضہ کر لیا، 1806ء میں اس کا انگریزوں کے ساتھ پہلا معاہدہ ہوا جس کے بعد وہ وسطی، جنوبی اور شمالی پنجاب کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس نے چند ہی برسوں میں گجرات، ڈسکہ، سیالکوٹ، شیخوپورہ، جھنگ، چنیوٹ، خوشاب، ملتان، راولپنڈی، ڈیرہ اسماعیل خان، جڑا، پشاور اور کشمیر کو اپنی سلطنت کا حصہ بنالیا، 1809ء میں انگریزوں نے اسے دریائے ستلج کے پار پنجاب کا حکمران مان لیا اور وہ پنجاب کا پہلا سکھ حکمران بن گیا۔

1831ء کا سال راجہ رنجیت سنگھ اور سکھ سرکاری زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اس سال اکتوبر میں رنجیت سنگھ کی ہندوستان کے انگریز گورنر جنرل ولیم ہیک سے ملاقات ہوئی، رنجیت سنگھ انگریزوں کی شان و شوکت دیکھ کر حیران رہ گیا، وہ بنیادی طور پر دہقان زادہ تھا اور اس نے کبھی سکول کا منت نہیں دیکھا تھا، اس کی زندگی کا زیادہ تر حصہ گھوڑے کی پیٹھ پر گزرا تھا لہذا جب وہ گورنر جنرل ہاؤس میں داخل ہوا تو وہ انگریز کے کردار سے مرعوب ہو گیا، رنجیت سنگھ کو محسوس ہوا ایک منظم اور طاقتور فوج کے بغیر مضبوط اور دیر پا سرکاری عین نہیں چٹا، اس نے تاریخ کی پہلی سکھ فوج بنانے کا فیصلہ کیا، اس نے چند بیٹا، انگریز افسر ملازم رکھے اور انہیں ایک منظم فوج بنانے کی ذمہ داری سونپ دی، 1831ء تک ہندوستان میں پارٹ ٹائم فوجی ہوتے تھے، یہ لوگ پانچ ہزاری یا دس ہزاری کہلاتے تھے، یہ سرداروں اور جاگیرداروں کے قبضے میں ہوتے تھے، یہ لوگ زمانہ امن میں بھگتی بازی اور تجارت کرتے تھے، لیکن جب بادشاہ کو ضرورت پڑتی تھی تو یہ فوج کی شکل اختیار کر لیتے تھے، ہندوستان کی پہلی منظم فوج انگریز نے



تفکیلی دی تھی رنجیت سنگھ نے انگریز کی بیرونی میں سکھ فوج بنانے کا فیصلہ کیا لاہور میں آج جس جگہ انجینئرنگ یونیورسٹی ہے وہاں اس زمانے میں ایک چھوٹا سا گاؤں "بھو کا آوا" ہوتا تھا رنجیت سنگھ نے یہ گاؤں فوج کے حوالے کر دیا فوج نے اس جگہ پہلی چھاؤنی بنائی رنجیت سنگھ نے شروع میں چار ہزار سکھ سپاہی بھرتی کئے انگریز انسٹرکٹروں نے انہیں ٹریننگ دی اور اس کے بعد فوج میں اضافہ ہونے لگا 1839ء میں جب رنجیت سنگھ کا انتقال ہوا تو سکھ فوج کی تعداد چالیس ہزار تک پہنچ چکی تھی اور اس کا ماہانہ خرچ چار لاکھ روپے تھا جبکہ اس کے پاس ایک لاکھ گھوڑے اور ایک ہذا توپ خانہ بھی تھا۔ رنجیت سنگھ جب فوج تشکیل دے رہا تھا تو اس وقت تک اس کی سلطنت مضبوط ہو چکی تھی اور اسے کارسار کا چلانے کیلئے سول مردوں یا بیوروکریسی کی ضرورت پیش آرہی تھی وہ ایک ان پڑھ اور نیم متہدان انسان تھا لہذا اس نے سول بیوروکریسی کا کام بھی فوج سے لینے کا فیصلہ کیا اس نے مالے کی وصولی پولیس لاہور اینڈ آڈرڈ پھر سے داری سفارت کاری حتیٰ کہ گردواروں کی حفاظت تک فوج کے حوالے کر دی یہ رنجیت سنگھ کا وہ فیصلہ تھا جو آنے والے دنوں میں سکھ حکومت کے زوال کی وجہ بنا رنجیت سنگھ کے دور ہی میں فوج کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہونے لگا تھا لیکن وہ ایک مضبوط اعصاب کا سمجھا دار انسان تھا چنانچہ اس کی زندگی میں سکھ فوج اس کی تابعدار اور فرمانبردار رہی لیکن جوں ہی اس کا انتقال ہوا سکھ فوج شاہی تخت پر حاوی ہو گئی اور اس نے پنجاب کی سیاست اپنے ہاتھ میں لے لی۔

رنجیت سنگھ کے بعد اس کا بیٹا کھڑک سنگھ تخت نشین ہوا تو سکھ دور بے سیاسی گروہوں میں تقسیم ہو گئے ایک گروہ ڈوگر اسکھوں پر مشتمل تھا جبکہ دوسرا سندھانوالہ گروہ تھا آپ اپنی سہولت کے لئے انہیں ڈوگرہ اور سکھ گروہ کہہ سکتے ہیں۔ کھڑک سنگھ کا تعلق ڈوگرہ سے تھا جبکہ سکھ گروہ کا صدر دھیان سنگھ تھا دھیان سنگھ کھڑک سنگھ کا مخالف تھا وہ فوج کے ساتھ مل گیا اور اس نے فوج کو اپنا آئینی کردار ادا کرنے پر ابھارا شروع کر دیا دھیان سنگھ کا کہنا تھا کھڑک سنگھ پنجاب کو انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دے گا اور انگریز آکر سکھ فوج کو ختم کر دیں گے فوج نے اپنا آئینی کردار ادا کیا کھڑک سنگھ کو نندار ڈیکھ کر کیا اسے تخت سے اتارا اور اس کے بیٹے کیپٹن نوٹھال سنگھ کو بادشاہ بنا دیا نوٹھال سنگھ لڑکپن میں فوج میں رہا تھا اور فوج اسے اپنا نمائندہ سمجھتی تھی فوج نے نوٹھال سنگھ کی کاہنہ تشکیل دی تھی اور یوں فوج کو کاہنہ بنانے اور اپنے ناپسندیدہ لوگوں کو نندار ڈیکھ کر کے کا اختیار مل گیا بد قسمتی سے ایک سال بعد نوٹھال سنگھ حادثے میں مر گیا جس کے بعد اس کی بیوہ چاند کو رخت پر بیٹھ گئی چاند کو رخت سلطنت کی پہلی خاتون حکمران تھی وہ ایک با اعتماد و عورت تھی لہذا فوج جلد ہی اس سے "مایوس" ہو گئی اس گروہ کے سربراہ دھیان سنگھ نے ایک اور سازش تیار کی اس نے رنجیت سنگھ کے دوسرے بیٹے شیر سنگھ کو ساتھ ملایا ان دونوں نے چند جرنیلوں کو ہاتھ میں لیا جرنیلوں نے فوج کو اکٹیل کیا اور ستر ہزار فوجیوں نے لاہور کے قلعے پر حملہ کر دیا چاند کو رخت نے ہتھیار ڈال دیئے فوج نے شیر سنگھ کو تخت پر بٹھا دیا شیر سنگھ کو فوج نے حکمران بنایا تھا لہذا اس کے دور میں اقتدار عملہ فوج کے پاس تھا بادشاہ کے تمام فیصلے اس کا ملٹری سیکرٹری کرتا تھا لوگ انصاف نہیں کوں اور تک مکا کیلئے سیدھے "بھو کا آوا" جاتے تھے فوج کے پاس کسی بھی شخص کو

غدار قرار دے کر پھانسی دینے کا اختیار تھا اور فوج ایک مہرنگا کر کسی بھی ناجریا ٹھیکیدار کو لاکھ پتی بنا سکتی تھی، شیر سنگھ کے دور میں فوج نے قلعے کے باہر تمام زمینوں پر قبضہ کر لیا اور وہ یہ زمینیں بٹے پر دینے لگی، فوج حکومت کی آمدنی سے نصف رقم بھی لیتی تھی جبکہ تمام سول محکموں کے سربراہ حاضر سروس فوجی بنادے گئے، یہ اسلئے حکومت سے دوہری تنخواہ لیتے تھے۔ اس لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں عوام کی حالت پتلی ہو گئی، لاہور میں جلوس نکلنے لگے اور لوگ سرعام خودکشیاں کرنے لگے، دوسری طرف ڈگروپ اور سگروپ اقتدار کیلئے ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل لڑ رہے تھے، ڈگروپ نے اس سیاسی ابتری کا فائدہ اٹھایا اور اس نے مہاراجہ شیر سنگھ اور دھیان سنگھ دونوں کو قتل کر دیا جس کے بدلے میں ہیرا سنگھ نے ڈگروپ کا قتل عام شروع کر دیا، ڈگروپ نے مزاحمت کی اور یوں ہیرا سنگھ کو فوج کی مدد لینا پڑ گئی، ہیرا سنگھ نے فوج کو یقین دلایا اگر وہ کامیاب ہو گیا تو وہ سپاہی کی تنخواہ نو سے بارہ روپے اور گھڑ سوار کی 25 سے 30 روپے کر دے گا، فوج نے ہیرا سنگھ کی حمایت میں ایک بار پھر لاہور پر حملہ کر دیا، لاہور کے شہریوں پر دو راتوں تک گولہ باری ہوئی رہی، جس سے ہزاروں بے گناہ شہری مارے گئے، فوج نے لاہور پر قبضہ کیا، رنجیت سنگھ کے چھ سالہ بیٹے دیپ سنگھ کو تخت پر بٹھایا اور ہیرا سنگھ کو اس کا وزیر بنادیا، ہیرا سنگھ نے نہ صرف فوج کی مراعات اور تنخواہوں میں اضافہ کر دیا بلکہ اس نے فوج کو ہر قسم کے مالے اور ٹیکسوں سے بھی آزاد کر دیا لیکن فوج جلد ہی ہیرا سنگھ سے بھی مایوس ہو گئی اور اس نے اسے قتل کر دیا، ہیرا سنگھ کی جگہ جواہر سنگھ کو وزیر بنایا گیا، جواہر سنگھ نے سارا خزانہ فوج کے حوالے کر دیا لیکن فوج کے مطالبات بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ یہ مطالبات پھرے کہ مشکل ہو گیا، جواہر سنگھ نے ہاتھ کھڑے کر دیئے، فوج نے اسے ”بدھو کا آما“ طلب کیا اور اسے اس کی بہن چنداں کے سامنے قتل کر دیا، فوج نے چنداں کو نو سالہ بادشاہ دیپ سنگھ کا سر پرست نامزد کر دیا۔

اس وقت تک سکھ سلطنت بری طرح دیوالیہ ہو چکی تھی، پنجاب میں بے روزگاری، مہنگائی، کرپشن، اجرام اور بد امنی آسمان کو چھو رہی تھی، لوگ بھوکے مر رہے تھے جبکہ فوج بدھو کے آداس میں عیش کر رہی تھی، لاہور شہر سے باہر فوجی افسروں کے بڑے بڑے محل اور فارم ہاؤس تھے، حالت یہ تھی فوج کا ایک درمیانے درجے کا افسر اٹھتا تھا، شہر میں داخل ہوتا تھا اور جس دکان، جس گھر سے جو چیز چاہتا تھا گھوڑے پر لاد کر واپس چلا جاتا تھا اور کسی کو اسے روکنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، چنداں بی بی ایک سمجھ دار اور معاملہ فہم عورت تھی، اس نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا، اس نے سکھ فوج کو انگریز فوج سے لڑانے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے فوری طور پر دو کام کئے، ایک اس نے انگریز کو پنجاب پر حملے پر اکسایا اور دوسرا اس نے سکھ فوج کے جوانوں میں جذبہ حب الوطنی پیدا کرنا شروع کر دیا، اس نے انہیں بارہ کر دیا دنیا میں سکھ جو ان سے زیادہ جرأت مند اور بہادر کوئی نہیں، چنداں بی بی کی کوشش کامیاب ہوئی اور سکھ جو ان میں نہ ٹھوٹک نہ انگریز فوج کے سامنے کھڑے ہو گئے، سکھ جرنیل انگریز فوج کی طاقت اور اپنی کمزوریوں سے واقف تھے لہذا انہوں نے لڑائی سے بچنے کی بڑی کوشش کی لیکن چنداں بی بی نے فوج میں خبر پھیلا دی کہ ہمارے جرنیل لڑنا نہیں چاہتے، جوانوں نے جرنیلوں پر دباؤ ڈالا شروع کر دیا لہذا جرنیل بری طرح اندرونی اور خبیرونی دباؤ کا شکار ہو گئے یوں 1849ء میں سکھ جرنیلوں کو مجبوراً انگریز کے خلاف میدان میں اتار دیا گیا، جنگ



...  
 شروع ہوئی تو پہلے ہی حملے میں کچھ فوج کے 8 ہزار جوان مارے گئے، اس مشکل وقت میں فوج نے عوام سے مدد مانگی لیکن لوگوں نے فوج کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دیا، لگے دن کچھ جرنیلوں نے ہتھیار پھینکے اور میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے جنہاں بی بی نے لاہور انگریزوں کے لئے کھول دیا، انگریز آئے اور سکھوں کی پہلی اور شاید آخری سلطنت تاریخ کا حصہ بن گئی اس شکست کے بعد فوج کا لفظ سکھوں میں حقیر کا نشانہ بن گیا، یہ سلسلہ آج تک جاری ہے آج بھی جب دو تین سکھ اکٹھے ہو کر کسی جگہ جاتے ہیں تو دیکھنے والے ان سے پوچھتے ہیں ”اے فوجاں کتھوں آیاں نے“ (یہ فوجیں کہاں سے آئی ہیں) کیا ”اے فوجاں کتھے جارہیں نے“ (یہ فوجیں کہاں جا رہی ہیں) ”اور وہ جس کو جواب دیتے ہیں ”فوجاں لہوروں آیاں نے“ جبکہ ڈیڑھ سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی جب کوئی سکھ سیدتان کرکڑا ہوتا ہے تو دوسرا سکھ اسے کہتا ہے ”میں بلاواں جنہاں نوں“ (میں جنہاں کو بلاؤں) اور وہ کچھ شرما کر سیدنا اند کر لیتا ہے۔

نوٹ: ”یہ محض ایک تاریخی واقعہ ہے اس کا موجودہ سیاسی اور فوجی حالات سے کوئی تعلق نہیں۔“



Kashif Azad @ OneUrdu.com



## دفاع

موجودی حرب کے ایک اخبار نے چند روز پہلے دنیا کے 25 ایسے ممالک کی فہرست جاری کی جن میں فوج نہیں ہے ممالک امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور یورپ کے قرب و جوار میں واقع ہیں اور یہ چھوٹے چھوٹے جزائر پر مشتمل ہیں ان ممالک میں انڈورا، بارباڈوس، کوسٹاریکا، ڈومینیکا، گریناڈا، جینی، آئس لینڈ، کیریبائی، لکٹین، شین، جزائر مارشل، ماریشس، مائیکرونیشیا، موناکو، نیٹلاڈ، پانامہ، تووالو، سان مارینو، سموا، جزائر سینٹ وینسٹ اینڈ گریناڈا، سینٹ کٹس، سینٹ لوشیا، ٹاور وائیکن اور ٹوناڈو شامل ہیں۔ میں نے یہ خبر پڑھی تو میں نے ان 25 ممالک کا ڈیٹا جمع کیا اور پڑھنا شروع کر دیا، میں ان ممالک کی ان خوبیوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا جن کے باعث یہ نہ صرف فوج کے بغیر اپنا وجود برقرار رکھ سکے ہوئے ہیں بلکہ یہ ترقی بھی کر رہے ہیں مجھے معلوم ہوا یہ تمام ممالک رتے آہادی اور وسائل میں انتہائی چھوٹے ہیں لیکن ان ممالک نے چھوٹا ہونے کے باوجود دنیا میں بعض ایسے اعزاز حاصل کئے ہیں جن سے بڑی بڑی ملکیتیں اور قومیں بھی محروم ہیں مثلاً آپ اپنی کوئی چیز، اپنی دنیا کی قدیم ترین جمہوریہ ہے، اپنی میں 1804ء میں پارلیمنٹ بنی اور یہ پارلیمنٹ آج تک چل رہی ہے ڈومینیکا 1844ء کو آزاد ہوا وہاں اب تک سو صدر آچکے ہیں یہ تمام صدر جمہوری طریقے سے آئے اور جمہوری طریقے سے رخصت ہوئے کوسٹاریکا 1825ء میں آزاد ہوا وہ 1945ء تک خانہ جنگیوں، مارشل لاؤں اور سیاسی ابتری کا شکار رہا اس نے 1946ء میں فوج ختم کر دی اور تمام شہریوں کیلئے تعلیم مفت اور لازمی قرار دے دی اس اقدام کے نتیجے میں کوسٹاریکا گولاطینی امریکہ کے سب سے بڑے جمہوری ملک کا اعزاز حاصل ہو گیا بارباڈوس 1966ء میں آزاد ہوا اور اس کے تمام صدر جمہوری طریقے سے آٹھ آٹھ دس دس سال اقتدار میں رہے اور وہاں آج تک کسی نے کسی کے اقتدار پر شب خون نہیں مارا اینڈورا فرانس اور سپین کے درمیان واقع ہے اس ملک کی آبادی 67 ہزار ہے لیکن یہاں ہر سال ایک کروڑ سیاح آتے ہیں آئس لینڈ میں یورپ کی پہلی پارلیمنٹ بنی تھی آئس لینڈ کے لوگ اسے آلتھک کہتے ہیں اور یہ 930ء میں بنی تھی اس ملک میں 1980ء میں دنیا کی پہلی خاتون صدر منتخب ہوئی تھی اس کا نام مروگرس فن بوگا وڈ تھا اور یہ مسلسل چار مرتبہ آئس لینڈ کی صدر رہی کیریبائی 33 جزیروں کا

مجموعہ ہے یہ 1979ء میں آزاد ہوا اور اس کے عوام نے 29 سال کے ایک نوجوان جرمیہاگ تائی کو صدر منتخب کیا۔ یہ دنیا کا کم عمر ترین صدر تھا اور یہ مسلسل بارہ سال تک اقتدار میں رہا، لیکن شین آسٹریا اور سوئٹزر لینڈ کے درمیان واقع ہے یہ 1866ء میں آزاد ہوا اور اس نے 1868ء میں فوج ختم کر دی۔ یہ دنیا میں فوج ختم کرنے والا پہلا ملک تھا۔ اس نے 1978ء میں یورپ کا کم عمر ترین وزیراعظم منتخب کیا۔ اس وزیراعظم کا نام برن ہرٹ تھا اور انتخاب کے وقت اس کی عمر صرف 22 برس تھی۔ 1993ء میں اس سے بھی کم عمر شخص ڈاکٹر مار یو فرک کو وزیراعظم بنا دیا گیا۔ ڈاکٹر مار یو کی عمر 28 برس تھی۔ 2000ء میں لیکن شین کے عوام کا معیار زندگی یورپ کے تمام ممالک میں بلند ترین تھا۔ 2000ء میں پورے ملک میں کوئی غریب شخص نہیں تھا۔ جزائر مارشل 1991ء میں آزاد ہوا۔ اس میں 24 ہوائی اڈے ہیں۔ اس نے 1983ء میں امریکہ پر جوہری آلودگی پھیلانے کا الزام لگایا اور امریکہ سے 183 ملین ڈالر ہرجانہ وصول کیا۔ یہ امریکہ سے ہرجانہ وصول کرنے والا پہلا ملک تھا۔ مارٹینیکس 1968ء میں آزاد ہوا اور اس کے وزیراعظم سر سیو ساگرام غلام مسلسل 18 برس تک وزیراعظم منتخب ہوتے رہے وہ 1986ء میں دنیا میں لمبی مدت تک اقتدار میں رہنے والے وزیراعظم تھے۔ اسے تیسری دنیا میں سب سے زیادہ سیاح حاصل کرنے اور دنیا کی تیسری بڑی کھپنی بنانے کا اعزاز حاصل ہے۔ مائیکرو نیسیا 1991ء میں آزاد ہوا اور اس میں لوگوں نے آج تک کوئی درخت نہیں کٹنے دیا لہذا یہاں سب سے زیادہ بارشیں ہوتی ہیں۔ مونا کو دنیا کا دوسرا چھوٹا ملک ہے۔ اسے دولت مند عاشقوں کی جنت کہا جاتا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے مہنگا آباد ملک بھی ہے اس کے ایک مربع کلومیٹر میں 15 ہزار 3 س 21 لوگ رہتے ہیں اور یہ ملک صرف سیاحوں کے ذریعے اتنی دولت کمالیتا ہے جتنی ہر سال جاپان گاڑیوں کی فروخت سے حاصل کرتا ہے۔ پیلاؤ 1994ء میں آزاد ہوا اور یہ دنیا کا واحد ملک ہے جس میں بیچ تاحیات بھرتی ہوتے ہیں۔ یہ ملک پورے امریکہ اور لاطینی امریکہ کو ہنریاں فراہم کرتا ہے۔ پانامہ 1903ء میں آزاد ہوا۔ یہ ملک بھی شدید مارشل لاؤں اور خانہ جنگیوں کا شکار رہا لہذا 1994ء میں اس کی پارلیمنٹ نے فوج ختم کر دی۔ اس ملک میں 51 میل لمبی نہر ہے یہ نہر بحر اوقیانوس کو بحر الکاہل سے ملاتی ہے۔ پانامہ اس نہر سے ہر سال 9 بلین ڈالر کماتا ہے۔ تووالو 1978ء میں آزاد ہوا اور اس نے سیاحت کو انڈسٹری بنالیا لہذا اس کے عوام خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ ساموآ 1631ء میں آزاد ہوا۔ اس نے انگریزوں کو ایک ٹکٹ اور سرانگس کو ذریعہ روزگار بنایا اور کال کر دیا۔ اس ملک میں چھ ماہ کیلئے صدر کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ساموآ 1962ء میں آزاد ہوا۔ اس کے 4 ہزار کارکنوں نے مسلسل 90 دن تک ہڑتال کر کے دنیا میں ریکارڈ قائم کر دیا۔ سولوسن جزائر 1978ء میں آزاد ہوئے اور انہوں نے تاریخی سیاحت اور پھولی کی پیننگ سے کمال کر دیا۔ اس میں لاطینی امریکہ کی پہلی بین الاقوامی یونیورسٹی بھی قائم ہوئی۔ سینٹ کٹس نے نمک کو صنعت بنالیا۔ سینٹ لوشیائے بجلی کے پرزوں کی مارکیٹ ہاتھ میں لے لی۔ ان کے ایک شاعر ڈریک والکوٹ نے 1992ء میں نوبل پرائز بھی حاصل کیا۔ تاورو کے پاس دنیا کی سب سے چھوٹی جمہوریہ کاٹاٹل ہے اور اس نے فاسیٹ کی کھاؤ سے پورے ملک کے لوگوں کو خوشحال بنادیا۔



آج اس ملک میں کوئی غریب شخص موجود نہیں اس ملک نے 1993ء میں ماحولیاتی آلودگی پھیلانے پر آسٹریلیا سے 73 ملین ڈالر ہرجانہ بھی لیا تھا، وناڈو نے ناریل کو صنعت بنایا اور اس صنعت کی وجہ اس کے لوگ خوشحال زندگی گزار رہے ہیں وہ بھی کن 1929ء کو آزاد ہوا اور اس نے اس کو ریاست کی بنیاد قرار دیا اور سینٹ وینسٹ اینڈ گریناڈن نے سیاحوں کی توجہ کوڈریڈ روزگار بنالیا لہذا اس کے عوام بھی اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔

میں نے جب ان ممالک کے حالات کا جائزہ لیا تو مجھے محسوس ہوا ان ممالک نے رقبے، آبادی اور وسائل کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دیا، انہوں نے محدود وسائل میں رہ کر اپنے لئے ترقی، خوشحالی اور عزت کا راستہ نکال لیا، یہ حقیقت ہے ان تمام ممالک میں فوج نہیں لیکن ان سب ملکوں میں عدالتیں، سکول اور ہسپتال موجود ہیں اور ان ملکوں کا تعلیم، صحت اور انصاف کا نظام انتہائی مضبوط ہے، ان میں 13 ممالک ایسے ہیں جن میں مقدمے کی سماعت کی زیادہ سے زیادہ مدت ایک ماہ ہے، ایک ملک میں ججوں کی تقرری تاحیات ہوتی ہے اور دو ملکوں میں ججوں کے پاس پولیس اور پولیس کے پاس ججوں کے اختیارات ہیں ان تمام ممالک میں تعلیم مفت اور لازمی ہے اور ان تمام ملکوں میں عوام کو صحت کی انتہائی جدید اور یکساں سہولتیں حاصل ہیں، ان تمام ممالک میں میڈیا مکمل طور پر آزاد اور لوگوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہے، ان 25 ممالک میں سے 9 ملکوں میں پچھلے دس سال میں قتل اور دہشت گردی کی کوئی واردات نہیں ہوئی اور دو ملکوں میں پچھلے تین برسوں سے کوئی رپورٹ درج نہیں ہوئی، موناکو کی ٹریک پولیس کو دنیا کی بہترین ٹریک پولیس کا اعزاز حاصل ہے، آئس لینڈ کے ہسپتالوں کو دنیا کے صاف ترین ہسپتالوں کا ٹائٹل دیا گیا اور سینٹ لوشیا کے طالب علموں کو بہترین آئی کیو لیول کا ایوارڈ ملا لہذا جب میں نے ان ممالک کا پروفائل پڑھا تو مجھے محسوس ہوا انہوں نے جو کچھ ہمیں ملے ہوئے ہیں لیکن عدالتوں، سکولوں اور ہسپتالوں کے بغیر کوئی ملک قائم نہیں رہ سکتا مجھے محسوس ہوا ملک اسلئے اور جوانوں کے بغیر بھی خوشحال ہو سکتے ہیں لیکن دنیا کا کوئی ملک دواء، کتاب اور انصاف کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا، مجھے محسوس ہوا عدالتیں ملکوں کا سب سے بڑا دفاع، سکول سب سے بڑی فوج اور ہسپتال سب سے مضبوط قلعہ ہوتے ہیں اور جن ملکوں کے پاس یہ قلعے، یہ فوجیں اور دفاع کی یہ قوت ہوتی ہے ان ملکوں کو دنیا کی کوئی طاقت شکست نہیں دے سکتی وہ ملک کسی میدان میں ہار نہیں مانتے۔





## بھارت صرف 653 عہدوں کی قربانی دے دے

بریگیڈیئر لال شکر اور بریگیڈیئر ریشم کمار اور مادی بیڈ کوارٹر کو لکھنؤ میں تعینات تھے وہ بھارتی فوج کے خفیہ اسلحہ خانہ کے انچارج تھے یہ اسلحہ خانہ بھارتی حکومت نے ”بیک اپ“ کے لئے بنا رکھا ہے اور وہ اس میں دنیا جہاں سے جدید اسلحہ منگوا کر منسوخ کرتی رہتی ہے بھارتی حکومت نے ستمبر میں روس اور اسرائیل سے جدید اسلحہ منگوا لیا یہ اسلحہ منگوا کر منسوخ کر رہی ہے 2006ء کو کو لکھنؤ میں بریگیڈیئر نے اپنی عمرانی میں یہ اسلحہ بحری جہاز سے اتر دیا لیکن کالی کٹ کی بندرگاہ اور اسلحہ خانہ کے راستے میں راکٹوں کی چند پٹیاں غائب ہو گئیں حکومتی تحفظ کے مطابق ان پٹیاں کی مالیت ساڑھے تین کروڑ روپے تھی بھارت کے ”بی ایچ کیو“ نے اس سیرا پیمیری کا شدید نوٹس لیا، تفتیش شروع ہوئی تو دونوں بریگیڈیئر مجرم نکل آئے جس کے نتیجے میں بھارتی وزارت دفاع نے بریگیڈیئر کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ اس حکم کی تعمیل میں 14 اکتوبر 2006ء کو بریگیڈیئر لال شکر اور بریگیڈیئر ریشم کمار گرفتار کر لیا گیا۔

بھارتی فوج کے ان بریگیڈیئر کی گرفتاری کوئی نیا واقعہ نہیں بھارت میں آئے روز اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں ہر مہینے بھارتی فوج کے دس سے بیس اعلیٰ افسر کرپشن میں ملوث پائے جاتے ہیں گرفتار ہوتے ہیں اور پوری دنیا میں بھارتی فوج کی بے عزتی اور ہزیمت کا باعث بنتے ہیں میں نے پچھلے دنوں ایک بھارتی اخبار میں ایک میجر کی خبر پڑھی تھی یہ میجر صاحب فوجی ”کوٹے“ کی شراب منگل کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے اسی طرح بھارت کی پنجاب رجمنٹ کے ایک میجر صاحب ملٹری اسپتال کی دوائیں فروخت کرتے ہوئے دھر لئے گئے جبکہ بھارت کی چھاونیوں میں سائیکل اور موٹر سائیکلوں کی چوری عام سی بات ہو چکی ہے اس قسم کی وارداتوں میں بھی عموماً بڑے افسر ملوث ہوتے ہیں آپ کو یاد ہوگا اٹل بھاری واجپائی کے دور میں تھلک سیکنڈل سامنے آیا تھا اس سیکنڈل میں بھارتی فوج کے ایک میجر جنرل کو 25 ہزار روپے رشوت لیتے ہوئے دکھایا گیا تھا جبکہ راجیو گاندھی کے دور میں یو فوس سیکنڈل آیا تھا اس سیکنڈل میں کل تین کروڑ روپے کمیشن لی گئی تھی یہ رقم بعد ازاں ایک سو چار سیاستدانوں اور فوجی افسروں نے آپس میں تقسیم کی تھی لہذا اسلحہ کی چوری ہو شراب کی منگل یا

پھر توپوں کے سودے میں کمیشن یہ واقعات بھارتی فوج کی غربت، ناداری اور مسکینی ظاہر کرتے ہیں، یہ واقعات ثابت کرتے ہیں بھارتی فوج کے افسروں کی تحواہیں کم ہیں اور ان بے چاروں کیلئے اتنی تحواہیں میں "لیونگ شیلفڈ" برقرار رکھنا مشکل ہے چنانچہ وہ لوگ کبھی شراب منگ کر پینے، کبھی اسلحہ بیچنے، کبھی سائیکل چوری کرنے اور کبھی بچیس تیس ہزار روپے رشوت لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

میں جب بھی اس قسم کی خبریں پڑھتا ہوں تو مجھے بھارتی حکومت کی بے وقوفی پر افسوس ہوتا ہے اور میں سوچتا ہوں اگر بھارتی حکومت نے ذرا سی عقلندی کا مظاہرہ کیا ہوتا، اگر وہ ہماری طرح اپنی صرف 653 نقد آور پولیس ریٹائر اور حاضر سروس فوجی افسروں کے خزانے کو بڑھاتی تو آج بھارتی فوج میں ایسے سنگین اور افسوس ناک واقعات پیش نہ آتے اور آج یوں بھارتی فوج کا وقار اور عزت مٹی میں نہ ملتی، مجھے بھارتی حکومت کی بے وقوفی پر افسوس ہوتا ہے اور میں اکثر سوچتا ہوں اگر بھارتی حکومت بھارتی فوج کے افسروں کو امریکہ، تاجکستان، متحدہ عرب امارات، سعودی عرب، تھائی لینڈ، یوکرین، برازیل، انڈونیشیا اور بحرین میں سفیر لگا دیتی، اگر وہ ریٹائر فوجی افسروں کو وفاقی یونیورسٹی بھارتی پنجاب کی انجینئرنگ یونیورسٹی اور چند گزہ یونیورسٹی کو اس چانسلر لگا دیتی، اگر وہ فوجی افسروں کو فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا چیئرمین بنا دیتی، اگر وہ فوجی افسروں کو بھارتی پنجاب کے پبلک سروس کمیشن کا چیئرمین لگا دیتی، اگر بھارتی حکومت کسی میجر جنرل کو انڈین ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی کی چیئرمین شپ دے دیتی اور کسی کرنل کو ڈائریکٹر اینڈ ایڈمنسٹریٹو اور ڈائریکٹر انفراسٹرکچر سمیت بنا دیتی، اگر وہ تین بریگیڈ میجرز کو نیشنل کمیونیکیشن سکیورٹی بورڈ کا سیکرٹری، اینڈیشنل سیکرٹری، جو انٹل سیکرٹری اور کسی کرنل کو ڈیپٹی سیکرٹری بنا دیتی، اگر وہ کسی ریٹائر کرنل کو پرنسپل کارپوریشن کا ایم ڈی، کسی بریگیڈ میجر کو ڈیپارٹمنٹ آف کمیونیکیشن سکیورٹی کا ایڈیشنل ڈی جی، کسی بریگیڈ میجر کو نیشنل کمیشن فار ہیومن ڈویلپمنٹ اور کسی میجر جنرل کو نیشنل ری کنسٹرکشن بیورو کا ممبر بنا دیتی، اگر وہ بھارتی فوج کے حاضر اور ریٹائر افسروں کو ایکسپورٹ پروموشن بیورو بھارتی پورٹ اتھارٹی، ممبئی پورٹ ٹرسٹ، انڈین میرین ایکڈمی، نیشنل شپنگ کارپوریشن، نیشنل ہائی وے اتھارٹی، سوئس وے پولیس، کلکتہ پورٹ اتھارٹی، انڈین ریلوے، انڈین سپورٹس بورڈ، ڈیفنس ڈویژن، منسٹری آف ڈیفنس، انڈین پورٹ سکیورٹی فورس، انڈین آرملڈ سروسز بورڈ، ممبئی شپ یارڈ، سروے آف انڈیا، انڈین ایئر لائنز، سول ایوی ایشن اتھارٹی، انڈین آرڈیننس فیکٹری، ملٹری لینڈ ڈیولپمنٹ کنٹروولنگ ڈیپارٹمنٹ، ڈیفنس پروڈکشن ڈویژن، وزارت تعلیم، سٹیٹسمنٹ ڈویژن، فنانس ڈویژن، منسٹری آف فوڈ اینڈ ایگریکلچر، منسٹری آف ہاؤسنگ اینڈ ورکس، منسٹری آف انڈسٹریز اینڈ پروڈکشن، انڈین سٹیل ملز، پولیس سٹورز، کارپوریشن، منسٹری آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، کام ڈویژن، این آر آئی سی، انڈین ٹیلی کمیونیکیشن لمیٹڈ، نیشنل ٹریڈنگ بیورو، کمیونل ڈویلپمنٹ اتھارٹی اور انڈین ریجنل ڈیولپمنٹ شپ، سیکرٹری شپ، ڈائریکٹر جنرل شپ، انجینئر ڈائریکٹر شپ اور ممبر شپ دے دیتی، اگر بھارتی حکومت بھارتی فوج کے ریٹائر جرنیلوں، بریگیڈ میجرز، کرنلز، میجرز اور کپتانوں کو کلچر، سپورٹس اور ٹورازم، اوکیو پراپٹی ٹرسٹ بورڈ، نارتھ کونسل کنٹرول بورڈ، انڈین نارتھ کونسل کنٹرول فورس، افغان

رفوجیز آرگنائزیشن، منسٹری آف پٹرولیم اینڈ نیچرل ری سورسز، انٹرین منرل ڈویلپمنٹ اتھارٹی، نیشنل لاجسٹک سٹریٹجی ایجنسی، آئی ڈی آر، ڈی این، منسٹری آف واٹر اینڈ پاور، منسٹری آف وٹمن ڈویلپمنٹ، نیشنل ایجوکیشن اور انٹرین ہیٹ المال کی سربراہی دے دیتی اور اگر بھارتی حکومت کسی ریٹائر میجر کو بھارتی پنجاب کا آئی جی لگا دیتی تو آج بھارت سرکار اور بھارتی فوج کی یہ صورتحال نہ ہوتی۔ آج بریگیڈ میز لال شکر اور بریگیڈ میز رمیش کمار دیا جیسے شاہد ادا ضرورں کو اسلحہ چوری نہ کرنا پڑتا اور آج پوری دنیا بھارتی حکومت پر نہ فس رہی ہوتی۔

مجھے پچھلے دنوں فرانس، جی جی انٹرنیشنل کی رپورٹ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اس رپورٹ میں انکشاف ہوا بھارت رشوت دینے والے کرپٹ ترین ممالک میں دوسرے نمبر پر پہنچ گیا ہے، میرا خیال ہے بھارت کو یہ دن بھی فوج کو سول محکموں سے دور رکھنے کی وجہ سے دیکھنا پڑا، اگر بھارتی حکومت نے ہماری طرح اپنے سول محکمے فوج کیلئے کھول دیئے ہوتے تو آج نہ صرف اس کے 78 ریٹائر جنرل، سو بریگیڈ میز، 181 کرل، 209 میجر اور 87 کمیشن برسر روزگار ہوتے بلکہ بھارتی فوج کی کارکردگی اور مورال بھی بہت بلند ہوتا، میں جب بھی اس قسم کی خبریں پڑھتا ہوں تو میں سوچتا ہوں کاش میں بھارت میں ہوتا تو میں بھارتی حکومت کو تین مفید مشورے دے سکتا، میں اس سے درخواست کرتا وہ ملک کی 653 سول پولیسوں پر فوجی افسر تعینات کر دے وہ یہ قانون پاس کر دے آئندہ بھارتی فوج سے جو بھی افسر ریٹائر ہوگا اسے سول محکمے میں چار گنا زیادہ تنخواہ پر بھرتی کر لیا جائے گا اور وہ تاجر، ٹیکسٹائل، فیشن بھی وصول کرے گا اور تنخواہ بھی اور میں بھارتی حکومت کو مشورہ دیتا وہ ملک میں ارب پتیوں کی ایک نئی کلاس پیدا کرنے کیلئے اپنے 13 بڑے شہروں میں ڈیفنس ہاؤسنگ سکیمیں شروع کر دے، میں بھارتی حکومت کو سمجھاتا سول محکموں میں 653 ریٹائر فوجی افسر تعینات کرنے سے نہ صرف بھارتی فوج کرپشن سے پاک ہو جائے گی بلکہ ملکی معیشت بھی بہتر ہوگی اس سے جنگ کا خطرہ بھی ختم جائے گا اور ملک بھی ہمیشہ پیش کیلئے سیاست سے پاک ہو جائے گا۔





## جاپان اب ترقی کر کے دکھائے

ہیڈی کی ٹوجو (Hideki Tojo) چار ستارہ جنرل تھا، وہ 1940ء میں جاپان کا چیف آف آرمی سٹاف بنا، وہ جاپان کا سکندر اعظم بننا چاہتا تھا، جنرل ٹوجو نے فوج کی عنان سنبھالنے کے بعد ملک میں بڑی سطح پر اسلحہ سازی اور فوجی مہمیں شروع کر دیں، اس نے جاپانی فوج میں دنیا کا پہلا خود کش دستہ بھی تیار کیا، ہیرو ہیتو اس وقت جاپان کے شہنشاہ تھے، وہ جیسے مزاج کے بردبار شخص تھے، وہ جنرل ٹوجو کی پالیسیوں سے اتفاق نہیں کرتے تھے لیکن جنرل ٹوجو نے 1941ء میں شہنشاہ کو مارشل لا کی دھمکی دی اور اس دھمکی کی بنیاد پر خود کو جاپان کا وزیر اعظم منتخب کر لیا، وہ تاریخ کا پہلا ہاروری وزیر اعظم بن گیا۔ یہ جنگ عظیم دوم کا زمانہ تھا اس وقت تک امریکہ اس جنگ سے علیحدہ تھا، امریکی صدر روز ویلٹ نے نہ صرف غیر جانبداری کا اعلان کر دکھا تھا بلکہ وہ تازیوں اور اتحادیوں کے درمیان صلح کی کوشش بھی کر رہے تھے، جنرل ٹوجو نے ایک عجیب جنگی منصوبہ بنایا، اس نے 7 دسمبر 1941ء کو اچانک پرل ہاربر پر حملہ کر دیا، اس حملے میں امریکی نیوی کو شدید نقصان پہنچا، جنرل ٹوجو کے اس اقدام کے نتیجے میں امریکہ اور جاپان بھی دوسری جنگ عظیم کا حصہ بن گئے، دنیا اس وقت تک جاپان کی جنگی تیاری اور جاپانی جرنیلوں کی طالع آزمائی سے واقف نہیں تھی لہذا جب جنرل ٹوجو کی فوجوں نے حملے شروع کئے تو اس نے چند ہی ماہ میں کوریا، چین، ملائیا، سنگاپور، ہندوچین، تھائی لینڈ، برما، ولندیزی جزائر، فلپائن اور بحر الکاہل کے جزائر فتح کر لئے، جنرل ٹوجو اس کامیابی پر پھولے نہیں سارہا تھا لیکن شہنشاہ ہیرو ہیتو ان کامیابیوں پر بہت متشکر تھا، شہنشاہ نے جنرل ٹوجو کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن بندوق کی نالی سے سوچنے والے لوگ آسانی سے نہیں سمجھا کرتے لہذا جنرل ٹوجو آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ 1944ء میں جاپان کی معیشت پر جنگ کے اثرات ظاہر ہونے لگے جاپان شدید کساد بازاری، بے روزگاری اور قلت کا شکار ہو گیا اور لوگ دوا کی ایک گولی اور ایک ذیل روٹی کے لئے ترستے گئے، جاپانی شہنشاہ ہیرو ہیتو نے اس صورتحال کا فائدہ اٹھایا اور انہوں نے 18 جولائی 1944ء کو جنرل ٹوجو سے استعفیٰ لے لیا، جنرل ٹوجو نے استعفیٰ دے دیا لیکن وہ جاتے جاتے فوج کو یہ پیغام دے گیا، "ہم دنیا کی بہترین فوج ہیں لیکن ہمارا شہنشاہ ہمیں بزدلی کی موت مارنا چاہتا ہے" 22 جولائی 1944ء کو جنرل کویتا کی کوئی سو

(Kuniaki koiso) جنرل نو جو کی جگہ سپہ سالار بن گیا 'شہنشاہ' نے اسے جنگ بندی کا نامسک دیا لیکن اس نے بھی جنگ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا 'اس کا کہنا تھا ہم آخری گولی اور آخری سپاہی تک لڑیں گے لہذا جاپان جنگ میں آگے بڑھتا رہا۔

1945ء کے شروع میں جرمنی ہسپانی اختیار کرنے لگا جس کے بعد شہنشاہ ہیرو ہینو کو جنگ کا نتیجہ صاف دکھائی دینے لگا لیکن جاپانی فوج مسلسل فاتح عالم بننے کا خواب دیکھ رہی تھی 'مارچ کے آخر میں جب اتحادیوں نے جرمنی کا محاصرہ کیا اور ہٹلر کسی معلوم مقام پر منتقل ہو گیا تو شہنشاہ ہیرو ہینو نے جنگ بندی کا فیصلہ کیا 'فوج نے یہ فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا 'جنرل کوئی سواور شہنشاہ کے درمیان طویل ڈائیلاگ ہوا جس کے آخر میں شہنشاہ نے جنرل کوئی سو سے بھی استعفیٰ لے لیا '17 اپریل 1945ء کو جنرل کانارہ سوزو کی جاپانی فوج کا نیا سپہ سالار بنا 'جنرل نے فوج کی کان سنجانے سے پہلے شہنشاہ سے جنگ بندی کا وعدہ کیا لیکن جوں ہی اس کے کندھے پر سپہ سالار کے ستارے لگے جنرل وعدے سے منکر گیا 'اس کا کہنا تھا 'ہم نیویارک پر حملہ الہرائے بغیر جنگ بندی کا اعلان نہیں کریں گے دوسری طرف ہیرو ہینو کا کہنا تھا 'اتحادی جرمنی سے فارغ ہونے کے بعد مشترکہ طور پر جاپان پر حملہ کریں گے اور اس کے بعد فوج بچنے کی اور نہ ہی جاپان 'جنرل سوزو کی نے شہنشاہ کے خیالات کو تقبیوں میں اڑا دیا۔ 30 اپریل 1945ء کو ہٹلر نے خودکشی کر لی اور B مئی کو جرمنی نے اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے 'شہنشاہ ہیرو ہینو نے جنرل سوزو کی کو آخری بار بلا کر سمجھایا لیکن جنرل کا کہنا تھا "جاپان جرمنی ہے اور نہ ہی میں ہٹلر ہوں 'ہم اتحادیوں کی طاقت کو ہوا میں اڑا دیں گے" شہنشاہ بے بسی سے ہاتھ مل کر رہ گیا۔ شہنشاہ ہیرو ہینو کے خدشات درست ثابت ہوئے 'اتحادی جرمنی سے فارغ ہو کر جاپان کی طرف متوجہ ہو گئے 'امریکہ نے جاپانی فوج کو دارنگ دی 'جنرل سوزو کی نے اس دارنگ کے جواب میں آخری گولی اور آخری سپاہی کا نفری لگا دیا اور اس نفرے کے جواب میں امریکہ نے 16 اگست 1945ء کو ہیرو شیمابا 'ہیٹلم پھینک دیا 'دوسرا بم 9 اگست 1945ء کو ناگاساکی پر پھینکا گیا اور اس کے بعد جاپان رہا اور نہ ہی جاپانی فوج '14 اگست 1945ء کو جاپان نے امریکہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور امریکی کمانڈر جنرل میک آتھر جاپان کا مالک اور حاکم بن گیا 'جاپانی فوج کے تمام جوانوں اور جرنیلوں نے وردیاں اتاریں اور کسانوں اور مردوروں کے کپڑے پہن کر روپوش ہو گئے 'جنرل سوزو کی گرفتار ہوا اور امریکیوں کی قید میں انتہائی ذلت آمیز زندگی گزارنے لگا اور پوری دنیا کی فوجوں میں جنرل نو جو کی ایک نئی اصطلاح سامنے آگئی 'پچھلے 60 برسوں میں جب بھی کسی فوجی مستقر میں کوئی فوجی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس کے ساتھی اسے نو جو کے نام سے پکارنے لگتے ہیں۔

جاپان نے 1947ء میں نیا آئین بنایا اور اس آئین کی دفعہ نو کے تحت جاپان میں فوج پر پابندی لگا دی 'اسی آئین میں فیصلہ ہوا جاپان دفاع پر اپنے جی ڈی پی کا صرف ایک فیصد خرچ کرے گا 'اس فیصلے کے بعد جاپان دنیا کا واحد ملک بن گیا جس میں دفاع کی وزارت نہیں تھی 'جس میں انصاف 'بحریہ اور فطری نہیں تھی البتہ جاپان نے



## مرثیے کا مقام

”یہ تم لوگوں کا مسئلہ نہیں ہونا چاہیے“ اس نے راول جھیل پر نظر میں جھاویں وہاں ہر طرف دھوپ ہریالی اور سکون تھا پانی میں پہاڑوں کا عکس بلکھوے لے رہا تھا وہ وہاں میری طرف سزا ”تمام لوگوں کے پاس اللہ کے آخری نبی ہیں“ چار خلفائے راشدین ہیں اسی نوے ہزار صحابہ کرام ہیں ”ازواج مطہرات ہیں“ ان کے بعد اولیا اور صوفیاء کرام کا طویل سلسلہ ہے تمہارے ہر شہر ہر قصبے میں دس بیس ہزار ہیں اور لوگ ہر مزار پر فتنیں مانتے ہیں“ چڑھاوے چڑھاتے ہیں تم لوگ شخصیت پرست ہو لہذا شخصیت پرست معاشرہ اور لوگوں کا یہ مسئلہ نہیں ہونا چاہیے تم لوگوں کو بس ایک تحریک ایک تشفیہ اور ایک قدم کی ضرورت ہے اور تم لوگوں کے مسائل ہمیشہ ہمیش کے لئے ختم ہو جائیں گے“ مجھے اس کی بات عجیب محسوس ہو رہی تھی میرے ذہن میں بے شمار سوال اٹھ رہے تھے لیکن میں یہ سوال پوچھ کر اس کا تسلسل نہیں توڑنا چاہتا تھا ”جان کا یہ نفسیاتی مسئلہ تھا اگر گفتگو کے دوران اسے ٹوک دیا جائے تو وہ پھسل جاتا ہے اس کی گفتگو یعنی اور بے ربط ہو جاتی ہے اس کی باتوں سے لطف اندوز ہونے کا صرف ایک طریقہ ہے آپ خاموشی سے اس کی گفتگو سنتے رہیں اسے بولنے دیں اور میں اس وقت یہی کر رہا تھا۔

”تم لوگ حضرت امام حسینؑ کی ذات اقدس کو لڑا وہ دوبارہ گویا ہوا“ پورا عالم اسلام ان کے ساتھ گہری عقیدت رکھتا ہے دنیا کے ایک ارب 45 کروڑ مسلمان ہر محرم میں ان کا سوگ مناتے ہیں۔ سوگ منانے کا یہ عمل چودہ سو سال سے جاری ہے اور ہر سال اس میں اضافہ ہوتا ہے“ میں نے ہاں میں سر ہلا دیا ”وہ گویا ہوا“ میں تم لوگوں کو اس سوگ کو پراڈ کنوٹانے کا طریقہ بتاتا ہوں تم لوگ پاکستان میں حضرت امام حسینؑ کے نام سے دس کینسر ہسپتال بناؤ اور عوام سے درخواست کرو وہ محرم کے مہینے اپنی کمائی کا نصف اس ہسپتال کو دے دیں تم دیکھ لینا تمہارے ملک سے کینسر کا مرض ختم ہو جائے گا اسی طرح تم حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے نام پر ہسپتال اور یونیورسٹیاں بناؤ تم ازواج مطہرات کے نام پر چیرٹی سکولز کالجز اور یونیورسٹیاں قائم کرو اور اس کے بعد لوگوں سے درخواست کرو وہ ان اداروں کو ان کرلیں وہ اپنے صدقات خیرات اور زکوٰۃ ان اداروں کو دے دیں وہ اپنی اپنی عقیدت کو مالی شکل دے کر ان اداروں کی مدد کریں آپ لوگوں کو دعوت دیں



اگر وہ اپنی زمین جائیداد اور کاروبار کا ایک حصہ ان اداروں کے نام وقف کر دیں تو وہ ایک ایسا صدقہ جاریہ کریں گے جس کا ثواب انہیں قیامت تک ملتا رہے گا۔ میرا خیال ہے تمہارے ملک سے بنیادی اور تعلیم کا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ اس نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس طرح تم لاہور میں حضرت داتا گنج بخش یونیورسٹی، پیر کی شریف، پشپانائش، ہسپتال، شاہ حسین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی اور میاں میر لہار ٹری ٹاؤ، ملتان میں حضرت شاہ رکن الدین ہسپتال، بہاؤ الدین ڈگری سائنس فاؤنڈیشن، بہاولپور میں بابا فرید نی بی ہسپتال، کراچی میں شاہ غازی یونیورسٹی اسلام آباد میں بری امام سکول آف ٹیکنالوجی اور گولڑہ شریف یونیورسٹیاں بناؤ۔ تم دیکھنا تمہارا صحت اور تعلیم کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ جان بولا۔ میں نے تمہارے ملک میں دو چیزیں دیکھی ہیں تمہارے لوگ ان مقدس ہستیوں سے بے تحاشا محبت اور عقیدت رکھتے ہیں یہ لوگ جب تک سر نہ ڈھانپ لیں ان مقدس ہستیوں کا نام نہیں لیتے۔ لوگ جوتے اتار کر ان کے مزاروں میں داخل ہوتے ہیں اور جو بھی درگاہوں پر جاتا ہے وہ وہاں حسب توفیق صدقہ دیتا ہے۔ دوسری بات ان لوگوں کے مزاروں ان کی درگاہوں پر بہت برکت ہے۔ اگر کسی بزرگ نے اپنی زندگی میں ایک دیگ چولہے پر چڑھا دی تو اس کے بعد لوگوں نے یہ دیگ اترنے نہیں دی۔ لوگ چار چار سو سال تک چولہے میں لکڑیاں اور دیگ میں چاول ڈالتے رہے اور تین تین چار چار سو سال تک ہزاروں لاکھوں لوگ ان روحانی میسوں سے مفت کھانا کھاتے رہے۔ پورے یورپ میں اس قسم کی ایک بھی مثال نہیں۔ اگر کوئی شخص اس عقیدت اور اس برکت کو ٹھیکہ بیکل طریقے سے استعمال کرے تو پاکستان میں ایسے بے شمار ادارے بن سکتے ہیں جو اس ملک کے لوگوں کا مقدر بدل دیں۔ میں جب دیکھتا ہوں حضرت بری امام کے مزار پر تین سو سال سے آگ نہیں بجھی اور حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر پانچ سو سال سے دودھ کی سیلیں لگی ہیں تو میں سوچتا ہوں اگر ان کے نام سے ہسپتال اور یونیورسٹیاں بنی ہوتیں تو یہ ادارے اب تک کتنے لوگوں کو زندگی دے چکے ہوتے۔ وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔

میں نے پہلو بدلا۔ وہ میرا سوال بھانپ گیا لہذا مسکرا کر بولا۔ تم سوچ رہے ہو اس ملک میں ان مقدس ہستیوں کے ناموں سے بے شمار ادارے چل رہے ہیں تمہاری بات ٹھیک ہے، لیکن یہ ادارے حکومت نے بنائے تھے ان میں ان ہستیوں کے چاہنے والوں کا کوئی کنٹری بیوشن نہیں تھا۔ میں چاہتا ہوں تم لوگ ان بزرگوں کے نام سے باقاعدہ پرائیویٹ لیجنڈ کمپنیاں اور ٹرسٹ بناؤ۔ یہ کمپنیاں اور ٹرسٹ آگے چل کر جدید تعلیمی ادارے اور ہسپتال بنائیں۔ ان اداروں کے باقاعدہ شیئرز لالچ کئے جائیں۔ لوگ یہ شیئرز خریدیں اور ان شیئرز کی قیمت سے یہ ادارے چلیں۔ اس طرح ان کے مزاروں پر جمع ہونے والے صدقات کا ایک حصہ ان اداروں کے فنڈ میں چلا جائے۔ اس کے علاوہ لوگوں سے درخواست کی جائے وہ اپنی آمدنی اپنی جائیداد اور اپنے اثاثوں کے کچھ حصے ان اداروں کے نام وقف کر دیں۔ مجھے یقین ہے اس عمل سے یہ ادارے نہ صرف چلنا شروع ہو جائیں گے بلکہ ان کی برکت سے تمہارا ملک بھی ترقی کرے گا۔ میں کراچی کے ایک تاجر کو جانتا ہوں اس نے دس روپے سے کاروبار شروع کیا تھا اور

وہ ان ارب پتی ہے میں نے اس سے اس ترقی کی وجہ پوچھی تو اس نے عجیب بات بتائی اس نے بتایا جوانی میں وہ بہت غریب تھا وہ انتہائی غربت اور پریشانی کے عالم میں ملتان کی ایک درگاہ پر گیا وہاں اس نے درگاہ کے محن میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر مدد کی درخواست کی وہ جب باہر نکلے لگا تو درگاہ کا ایک مجاور اس کے پاس آیا اور اس کی جیب میں دس روپے کا نوٹ ڈال کر بولا ”باباجی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کرم کرے گا“ وہ واپس کراچی آ گیا اور ان دس روپوں سے کاروبار شروع کر دیا وہ دس روپے آج پانچ ارب روپے بن چکے ہیں اگر تم اس تاجر سے ملو اور اس سے کہو تم ملتان میں باباجی کے نام پر ایک ہسپتال بنانا چاہتے ہو تو مجھے یقین ہے وہ شخص اس پراجیکٹ پر ایک آدھ ارب روپے لگا دے گا اگر یہ نہ ہو تو بھی جس صاحب مزار کی برکت سے دس روپے کا نوٹ پانچ ارب روپے بن گیا تھا اس دلی کے نام پر بننے والا ہسپتال اور اس کے نام کی یونیورسٹی بھی چل نکلے گی بس ہمت کرنے کی دیر ہے۔ فیصلہ کرنے اور آگے بڑھنے کی دیر ہے“ وہ خاموش ہو گیا راول جھیل پر شام اتر رہی تھی آبی پرندوں کے عکس پانی میں ڈول رہے تھے اور ہوا میں خشکی بڑھ رہی تھی میں نے اس سے پہلی مرتبہ پوچھا ”تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو“ اس نے مسکرا کر جواب دیا ”معتقدیت سے بڑا سرمایہ کوئی نہیں ہوتا اور اسلامی دنیا اس سرمائے سے لبالب بھری ہے جو قوم بارہ کارٹونوں کے روٹل میں دنیا کی ساری سپر پاورز کو کان پکڑا سکتی ہے وہ قوم اس عقیدت کو ہسپتالوں اور تعلیمی اداروں میں لگا کر ترقی کیوں نہیں کر سکتی جنہیں پورے یورپ اور پورے امریکہ میں حضرت عیسیٰ کے نام پر جان دینے والا کوئی شخص نہیں ملے گا لیکن تمہارے ملک میں مقدس ہستیوں کی آن شان اور حرمت پر جان دینے والے لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگ موجود ہیں لہذا جس ملک کے پاس اتنے جاثرا ہوں جس ملک میں عقیدت اور برکت کے اتنے دریا بہتے ہوں اس ملک کے نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ اور امریکہ جائیں یہ عجیب لگتا ہے اور اس ملک کے بیماروں کو علاج کے لئے برطانیہ فرانس امریکہ اور بھارت جانا پڑے یہ بڑی قابل المسوس بات ہے“ وہ رکا تھوڑی دیر سوچا اور پھر مسکرا کر بولا ”معتقدیت اور برکت کے اتنے بڑے سٹیٹ بینک کے باوجود تم لوگ مسائل کا شکار ہوئیے مرٹنے کا مقام ہے“



## عشق کا مقام

عامر چیمہ کون تھا؟ وہ جرمنی میں کیا کر رہا تھا؟ وہ دن میں مذہب کا کتنا مطالعہ کرتا تھا؟ اس کی دماغی حالت کیا تھی؟ برلن کی پولیس نے اسے کیوں گرفتار کیا؟ اسے جرمنی کے بدنام ترین قید خانے موآبٹ جیل میں کیوں رکھا گیا؟ اس نے تین مئی 2006ء کو خودکشی کی یا وہ حقیقتاً جیل نظام کے ہاتھوں شہید ہوا؟ وہ غازی ہے؟ شہید ہے یا پھر مقتول؟ آئیے ہم یہ سارے سوال آنے والے وقت پر چھوڑ دیں، ہم ان کے جواب وقت کی تحقیق وقت کے وکیل اور وقت کی عدالت کے حوالے کر دیں، ہم اس کا فیصلہ مغرب کے ایماندار سکارلز اور محققین پر چھوڑ دیں اور انتظار کریں، آنے والا وقت عامر چیمہ کو کیا قرار دیتا ہے؟ وہ عامر چیمہ کے مقدمے کا کیا فیصلہ سنانا ہے؟ لیکن ہم اس ریفرنڈم کو وقت کے حوالے نہیں کر سکتے جو مئی کے مہینے میں ہوا اور اس نے پوری دنیا کے ذہنوں کا دھار ابدل دیا، ہم اس ریفرنڈم کا فیصلہ ابھی اور اسی وقت سنائیں گے یہ ریفرنڈم عامر چیمہ کے انتقال سے برپا ہوا تھا اور اس نے پوری دنیا کے سیکولر ذہنوں کو جڑوں سے ہلادیا تھا، اس نے دنیا پر عوام کے اصل جذبات آشکار کر دیئے تھے اور اس نے تہذیبوں کے تمام تضاد موصول کر رکھے ہیں۔

اس ریفرنڈم کا آغاز اولپنڈی کی ایک متوسط ہستی ڈھوک کشمیریاں کی گلی نمبر 18 سے ہوتا ہے یہ ریفرنڈم اس کے بعد دنیائے آباد کے قصبے ساروں کی میں جاتا ہے اور اس کے بعد اس ریفرنڈم کا سلسلہ پورے عالم اسلام میں پھیل جاتا ہے اور اس کے بعد کرہ ارض پر پھرتے 162 اسلامی ممالک کے ایک ارب 47 کروڑ 62 لاکھ 33 ہزار 4 سو 70 مسلمانوں تک نہ صرف عامر چیمہ کا نام پہنچتا ہے بلکہ وہ مسلمان اسے اپنے خیالات اور خواہشات کا ترجمان سمجھنے لگتے ہیں، اس نے اپنے خیالات اور رویوں میں ایک لیبرل شخص ہوں میری سوچ، صدورائش اور دنیا پر دین شریف سے ملتی جلتی ہے کسی یہ سمجھتا ہوں مسلمانوں کو ان خیالات پسند اور نرم ہونا چاہیے میں بھی یہ یقین رکھتا ہوں انسانوں کے دل کمور سے بھر نہیں کیے جاسکتے لوگوں کو بدلنے کیلئے فوج اور جرنیلوں کی نہیں بلکہ اولیاء اور صوفیاء کی ضرورت۔ ملتی ہے میں بھی یہ خیال کرتا ہوں آپ جسم سے ہم باندھ کر لوگوں کے جذبات و خیالات کے دھارے نہیں بدل سکتے، میرا بھی یہی خیال ہے آج کے دور میں ایک دوسو لوگوں کے لشکر سے



مغرب کی ٹیکنالوجی کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا' میں بھی یہ سمجھتا ہوں ڈپرین ایجاد کرنے والا شخص نعرے لگانے اور جلوس نکالنے والے دس لاکھ لوگوں سے بہتر ہے لیکن جب عام چیمبر کے ریفریڈم کی باری آتی ہے تو میرے تمام لیبرل خیالات جراب دے جاتے ہیں' میرے سارے فلسفوں کی بنیادیں مل جاتی ہیں اور میں بھی دنیا کو حیرت سے دیکھنے لگتا ہوں۔

یہ ریفریڈم کیا تھا اور اس کا آغاز کیسے ہوا؟ عام چیمبر نے جن مئی کو موآبٹ ہیل میں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے آکھیں بند کر لیں' چار مئی کے پاکستانی اخبارات میں عام چیمبر کے انتقال کی چھوٹی سی خبر شائع ہوئی' اس کے بعد جوں جوں دن گزرتے گئے عام چیمبر کا نام اور خبر بڑی ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ 13 مئی کو جب وزیر آباد کے قصبے سارو کی میں عام چیمبر کا جنازہ ہوا تو عام چیمبر نہ صرف پاکستان کے سارے میڈیا کی ہیڈ لائن تھا بلکہ دنیا بھر کے اخبارات ریلیوز اور ٹیلی ویژن اس کے جنازے کی جھلکیاں دکھا رہے تھے' عام چیمبر کا جنازہ مناجاب کے پانچ بڑے جنازوں میں سے ایک تھا' گو جرنالز ڈویژن کی تاریخ میں پہلی بار کسی جگہ دو لاکھ لوگ اکٹھے ہوئے تھے یہ ایک ایسے شخص کا جنازہ تھا جو تین مئی 2006ء تک ایک عام اور گناہم شخص تھا' اس گناہم اور عام شخص کو کس بات' کس ادارے خاص بنا دیا' یہ ادارے' یہ بات بنیادی طور پر اسلامی معاشرے اور مسلمانوں کی اساس ہے یہ وہ خون ہے جو ہر مسلمان کی رگوں میں دوڑتا ہے' یہ محبت کا وہ دریا ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا جب تک یہ لوگ آپ سے اپنی آل اولاد اور زمین چائیداد سے بڑھ کر محبت نہیں کرتے یہ مسلمان نہیں ہو سکتے یہ وہ خیال' یہ وہ احساس ہے جو ہر مسلمان کے اندر روح کی گہرائی تک پیوست ہے یہ وہ جذبہ ہے جو ایک مسلمان کو دوسرے شخص سے جدا کرتا ہے یہ احساس' یہ جذبہ رسول اللہ کی محبت ہے اور یہ محبت جس دل پر دستک دے دیتی ہے وہ شخص گناہی سے نکل کر عام چیمبر بن جاتا ہے وہ قازی علم دین شہید ہو جاتا ہے علامہ اقبال نے کہا تھا میں نے قازی علم دین شہید کے رشک میں جتنے آنسو بہائے ہیں وہ میری بخشش کیلئے کافی ہیں عام چیمبر کا جنازہ بھی اس محبت کا ایک چھوٹا سا ریفریڈم تھا۔

سارو کی کے اس ریفریڈم سے پہلے ایک ریفریڈم گلی نمبر 18 میں ہوا' اس ریفریڈم نے اس غیر معروف اور پس ماندہ گلی کا مقدر بدل دیا' رسول اللہ کی محبت میں ڈوبے ہزاروں عقیدت مندوں نے اس گلی کو اپنا سر کرنا چاہا' لوگ اس گلی میں قدم رکھنے سے پہلے وضو کرتے تھے' سفید کپڑے پہنتے تھے اور خوشبو لگاتے تھے' لوگ باادب ہو کر عام چیمبر کے والد کے ہاتھ چومتے تھے' 3 مئی سے 15 مئی تک 12 دنوں میں ایک لاکھ لوگوں نے اس بوڑھے پردیس کے ہاتھ چومے' یہ سعادت اس ملک کے شاید ہی کسی شخص کو حاصل ہوئی ہو' لوگوں نے گلی نمبر 18 میں پھولوں اور گلدستوں کا انبار لگا دیا' عام چیمبر کے گھر کے سامنے لوگوں نے اسے پھول رکھے کہ جو بھی شخص اس گلی میں داخل ہوتا تھا اس کا پورا جسم میچے لگتا تھا' لوگوں کی اس آمدورفت سے متاثر ہو کر پولیس کو گلی نمبر 18 میں باقاعدہ چوکی بنانا پڑی' لوگ آتے تھے عام چیمبر کے گیٹ کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور گیٹ کو سلام کر کے

واپس چلے جاتے تھے عقیدت کی اس کشش میں اتنی شدت تھی کہ لبرل اور اعتدال پسند حکومت کے ارکان بھی خود کو گلی نمبر 18 سے دور نہ رکھ سکے ان بارہ دنوں میں پنجاب اور وفاق کے 23 وزراء عامر چیمہ کے گھر گئے اور انہوں نے شہید کے والد کے ہاتھ چومے شعلہ راوی پٹنڈی کی ساری انتظامیہ بار بار اس کے گھر گئی اخبارات میں عامر چیمہ کی تصویریں اس کے لواحقین اور اس کے چاہنے والوں کے بیانات منوں کے حساب سے شائع ہوئے عامر چیمہ نے مٹی کے مہینے میں ریکارڈ کوریج حاصل کی آج پاکستان کا بچہ بچہ نہ صرف اس کے نام سے واقف ہے بلکہ وہ اس پر فخر کرتا ہے یہ کیا ہے؟ یہ مغرب اور مغربی سوچ کے خلاف ریفرٹم ہے یہ ریفرٹم ثابت کرتا ہے مسلمان اور مغربی انسان کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے جسے مغرب آزادی اظہار کہتا ہے اسے مسلمان نہ صرف توہین سمجھتے ہیں بلکہ وہ توہین کا یہ داروغہ دھونے کیلئے جان تک دے دیتے ہیں مجھے ایک بار ایک مغربی سکاڑھے نے کہا تھا ”ہمیں سمجھ نہیں آتی ایک مسلمان مغرب میں پیدا ہوتا ہے اس کا سارا لائف سٹائل مغربی ہوتا ہے اس میں تمام شرعی عیب بھی موجود ہوتے ہیں لیکن جب اسلام اور رسول اللہ کا ذکر آتا ہے تو اس مغربی مسلمان اور کٹھن مولوی کے رد عمل میں کوئی فرق نہیں ہوتا؟ کیوں“ میں نے عرض کیا ”یہ وہ بنیادی بات ہے جسے مغرب سمجھ نہیں سکتا یہ دلوں کے سودے ہوتے ہیں اور دلوں کے سودے کبھی بوجھ باری کی سمجھ میں نہیں آ سکتے نبی اکرم کی ذات ایمان کی وہ حساس رنگ ہوتی ہے جو برف سے بنے مسلمان کو بھی آگ کا گولہ بنا دیتی ہے مسلمان دنیا کے ہر مسئلے پر سمجھوتہ کر لیتا ہے لیکن وہ رسول اللہ کی ذات پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرتا عشق رسول وہ مقام ہے جہاں سے مومن کی زندگی کا آغاز ہوتا ہے جہاں موت سے بڑی سعادت اور فنا سے بڑی کوئی زندگی نہیں ہوتی جہاں پہنچ کر انسان مرنے کے بعد زندہ ہوتا ہے“ میں نے اس سے کہا ”دنیا میں لوگ مرنے کے بعد گناہ ہو جاتے ہیں لیکن عشق رسول میں آنے والی موت انسان کو ابد تک زندہ کر دیتی ہے یہ ایک ایسی آگ ہے جو انسان کو جلاتی نہیں اسے بناتی ہے اسے دوبارہ زندہ کرتی ہے اور تم اور تمہارے لوگ اس کیفیت اس سرور کو کبھی نہیں سمجھ سکتے تم لوگوں نے زندگی میں محبت رسول کا ذائقہ چکھا ہی نہیں تمہیں کیا پتہ رسول اللہ سے محبت کرنے والے شخص کے دل سے کون سی روشنی نکلتی ہے اور یہ روشنی کس طرح موت کے خوف کو مٹانے کے چھلکے کی طرح اتار کر رو پھینک دیتی ہے یہ اسے سارے دکھوں سے آزاد کر دیتی ہے“

ہم سب لوگ عامر چیمہ جیسے لوگوں کا مقام نہیں سمجھ سکتے۔





## ڈائلاگ کی گنجائش موجود ہے

چند روز پہلے سینیٹر مشاہد حسین نے برطانیہ کے ارکان اسمبلی کے اعزاز میں ڈنر دیا تھا اس ڈنر میں برطانیہ سے لارڈ امربھائیہ، برٹش ایم پی اے شاہد ملک اور ناروے کی پارلیمنٹ کے پاکستانی رکن خالد محمود شریک تھے ان لوگوں نے ڈنر دارک میں نبی اکرم کی ذات اقدس کے بارے میں گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کے بعد یورپ میں پیدا ہونے والی صورتحال کے بارے میں بریفنگ دی یہ ایک محدود و محفوظ تھی جس میں چند سینیٹر، ایم این اے اور چند صحافی شامل تھے ایم پی اے شاہد ملک اور ایم پی اے خالد محمود نے یورپ کی صورتحال پر روشنی ڈالی خالد محمود کے ساتھ یہ سیری دوسری ملاقات تھی ان کے ساتھ پہلی ملاقات اوسلو میں ہوئی تھی وہ اس وقت سٹی کونسل کے رکن تھے وہ اب ناروے کی پارلیمنٹ کے ممبر بن چکے ہیں انہوں نے اپنی گفتگو میں بتایا ”جنوری میں ناروے کے ایک میگزین نے یہ گستاخ خاکے ری پرنٹ کیے تھے یہ محدود کولیشن کا میگزین تھا جس کے قارئین کی تعداد کسی بھی طرح دو تین ہزار سے زیادہ نہیں یہ میگزین ناروے کا ایک صیہائی فرقہ چلا رہا ہے ہم نے جب یہ خاکے دیکھے تو ہمیں بہت افسوس ہوا ناروے میں مسلمانوں کی ایک بڑی تنظیم ہے جس کا نام اسلام کونسل ہے اس کونسل کے چیئرمین ایک فلسطینی عالم ہیں جبکہ سیکرٹری جنرل ایک پاکستانی ہیں ہم لوگوں نے کونسل کا اجلاس بلایا اجلاس میں فیصلہ ہوا ہم لوگ اس گستاخی پر احتجاج کریں گے ہم لوگوں نے دن اور وقت طے کیا اور تمام مسلمانوں کو جلوس میں شرکت کی دعوت دی ہم نے اس جلوس کے بارے میں مقامی اخبارات میں خبریں بھی شائع کرائیں ہم لوگ جب وقت مقررہ پر باہر نکلے تو ہم نے دیکھا ہمارے ساتھ بے شمار غیر مسلم نارویگیں بھی شامل ہیں ان لوگوں نے نہ صرف ہمارا ساتھ دیا بلکہ یہ ہمارے ساتھ نعرے بھی لگاتے رہے ہم نے ان سے پوچھا تم لوگ غیر مسلم ہو کر ہمارا ساتھ کیوں دے رہے ہو تو ان لوگوں نے جواب دیا ہم سمجھتے ہیں اس میگزین نے آپ کے ساتھ زیادتی کی میگزین کو کسی فرقے، مذہب اور طبقے کی دل آزادی کا حق حاصل نہیں لہذا ہم لوگ آپ کے حق کیلئے لڑ رہے ہیں خالد محمود کا کہنا تھا ”ناروے میں ایسے بے شمار لوگ ہیں جو مذہبی تعصب سے بالاتر ہو کر مسلمانوں کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں اور ہمارے مسائل میں ہماری مدد کرتے ہیں“ مجھے خالد محمود کی بات اچھی لگی اور مجھے محسوس ہوا یورپ میں جہاں ہولاند پوسٹن جیسے متعصب اخبارات اور ٹیلیوینک روز جیسے بد بودار ایڈیٹر موجود ہیں وہاں بے شمار ایسے لوگ بھی ہیں جو



مسلمانوں اور مسلمانوں کے عقائد کا احترام کرتے ہیں، جو ان پر ہونے والی زیادتیوں پر ان کے ساتھ مل کر احتجاج کرتے ہیں، مجھے محسوس ہوا، ہمیں جہاں ان متعصب اخبارات، ایڈیٹروں اور اسلام دشمن لوگوں کا مقابلہ کرنا چاہیے وہاں ہمیں ان اسلام دوست شہریوں کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے، ہمیں ان لوگوں سے بھی رابطہ رکھنا چاہیے۔

اگر ہم عالم اسلام، یورپ اور امریکہ کے تعلقات کا تجزیہ کریں تو ہمیں یورپ، عالم اسلام کے زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے، یورپی ممالک میں اس وقت کروڑوں کی تعداد میں مسلمان آباد ہیں، برطانیہ، فرانس، جرمنی اور اطالی میں اس وقت مسلمانوں کی چوتھی نسل پر ان چڑھ رہی ہے، یورپ میں مساجد، مسلمانوں کے قبرستان، اسلامک سنٹرز اور سکول موجود ہیں۔ یورپی ممالک مسلمانوں کے عقائد کا بھی خیال رکھتے ہیں، یورپ کے زیادہ تر دفاتر، اداروں، فیکٹریوں اور فرموں میں مسلمانوں کو عید، رمضان اور عاشورہ پر چھٹیاں دی جاتی ہیں، مسلمان نماز جمعہ کیلئے بھی اپنے اپنے دفاتر سے چھٹی لے لیتے ہیں، لہذا اگر دیکھا جائے تو عالم اسلام، یورپ کے زیادہ نزدیک ہے، جبکہ اس کے مقابلے میں امریکہ میں اسلام نسبتاً ایک نیا مذہب ہے، دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد اسی پندرہ ہزار تھی، مسلمانوں کا امریکہ کی طرف رجحان 80ء کی دہائی میں شروع ہوا، چنانچہ امریکی قوم اسلام اور اسلامی عقائد سے اتنی واقف نہیں تھی، چنتی یورپی اقوام آگاہ ہیں، تاہم ایون کے بعد امریکہ نے مسلمانوں کے خلاف جنگ شروع کی تو امریکہ کا خیال تھا یہ صلیبی جنگوں کا ایک نیا سلسلہ ہے جس میں یورپ امریکہ کا کھل کر ساتھ دے گا، لیکن جب یہ جنگ شروع ہوئی تو یورپ نے امریکی توقعات کے برعکس اس کا ساتھ نہ دیا، فرانس، جرمنی اور روس عراق پر امریکی حملے کے خلاف تھے، یوں دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں امریکہ اکیلا رہ گیا، چنانچہ ایک سطح پر امریکی انتظامیہ نے یہ سوچنا شروع کر دیا، اگر اس نے یہ جنگ جیتی ہے تو اسے یورپ کو بھی اس میں ملوث کرنا پڑے گا، اگر ہم اس پس منظر کو مد نظر رکھیں تو یہ خاکے ایک ایسی سازش محسوس ہوتے ہیں جس کے ذریعے بعض نادیدہ طاقتیں یورپ کو بھی ”دہشت گردی“ کے خلاف اس جنگ میں تھمھیٹ رہی ہیں، جن کے ذریعے یورپ بھی صلیبی جنگوں کا حصہ بننا شروع ہو گیا ہے۔

اگر ہم ان خاکوں کے کیسوں کو ذرا وسیع پس منظر میں دیکھیں تو ہمیں ان کے مزید دو تین پہلو بھی دکھائی دیں گے، یورپ میں اسلام تیزی سے پھیل رہا ہے، تاہم ایون کے بعد جرمنی، فرانس اور چین کے ہزاروں شہریوں نے اسلام قبول کیا تھا، اسلام قبول کرنے کا یہ عمل نہ صرف جاری ہے بلکہ اس میں تیزی بھی آ رہی ہے، اس کی وجہ اسلام کا مطالعہ ہے، تاہم ایون کے بعد جب مغربی میڈیا نے اسلام، اسلام اور مسلمان، مسلمان کا مارگ الاچنا شروع کیا تھا تو وہاں کے لوگوں نے تجسس سے مغلوب ہو کر اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا تھا، 2002ء میں یورپ میں قرآن مجید کے جتنے تراجم فروخت ہوئے اتنے پچھلے پچاس برسوں میں مجموعی طور پر نہیں ہوئے تھے، یورپی عوام نے جب یہ مطالعہ شروع کیا تو وہ اسلام کی حقانیت کے قائل ہو گئے اور انہوں نے دھڑا دھڑا اسلام قبول کرنا شروع کر دیا، یہ بات وہاں کے مذہبی طبقات کیلئے بڑی الارمنگ تھی، چنانچہ انہوں نے یہ سلسلہ روکنے کا فیصلہ کیا، میرا خیال

ہے یہ خاکے اس ٹیش بند کی کا ایک حصہ ہیں ان خاکوں کی تیسری وجہ خالصتاً کاروباری اور تجارتی ہے یورپ میں اس وقت مسلمانوں کی چوتھی نسل پر دان چڑھ رہی ہے یہ لوگ جب یورپ پہنچے تھے تو یہ تیسرے درجے کے شہری تھے اور انہیں وہاں صرف وہی نوکریاں دی جاتی تھیں جو عموماً تیسرے درجے کے شہریوں کو ملتی ہیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ لوگ پہلے درجے کے شہری بن گئے انہوں نے تعلیم حاصل کی کاروبار کیے انکسٹ لڑے یہاں تک کہ وہ آج کارخانوں، فارم ہاؤسز اور بڑے بڑے اداروں کے مالکان ہیں یورپ کے مین بڑے اداروں کی تحقیق کے مطابق مسلمان یورپ میں ایک بڑی کاروباری طاقت بن کر ابھر رہے ہیں چنانچہ یورپ کے حصب طبقوں کا خیال ہے اگر مسلمان اسی طرح ترقی کرتے رہے تو یہ لوگ ان کے مذہب کو شدید نقصان پہنچائیں گے چنانچہ یہ لوگ بڑے عرصے سے مسلمانوں کا کاروباری زور توڑنے میں مصروف ہیں میرا خیال ہے اگر ہم اس پس منظر کو سامنے رکھ کر ان خاکوں کو دیکھیں تو ہمیں محسوس ہوگا خاکے شائع کرانے والوں کو مسلمانوں کا اندازہ قیادہ جانتے تھے مسلمان ان خاکوں کے خلاف احتجاج کریں گے اور وہ بعد ازاں اس احتجاج کو بنیاد بنا کر مسلمانوں کے خلاف ایسے قوانین منظور کرالیں گے جن کے ذریعے ان کا کاروباری اثر و نفوذ محدود کیا جاسکے۔

یہ وہ سارے خدشات ہیں جن کی روشنی میں اگر ہم خاکوں کو دیکھیں تو مستقبل میں یورپ کے ساتھ اپنے تعلقات کی نوعیت طے کر سکتے ہیں حقیقت یہ ہے عالم اسلام کے موجودہ رد عمل کی وجہ سے یورپ میں مسلمانوں کے ساتھ ڈائلاگ کی سوچ ابھر رہی ہے یورپ میں ایک بہت بڑا طبقہ ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ایسے ڈائلاگ کا خواہاں ہے جس کے نتیجے میں یورپی اقوام اور مسلمان مستقبل میں اس نوعیت کے مذہبی اور نظریاتی تصادم سے بچ سکیں جس کے ذریعے دونوں ایک دوسرے کا نقطہ نظر سمجھ سکیں اور دونوں مل کر ایک ایسا لائحہ عمل طے کر لیں جس کی مدد سے دونوں اچھے مساویوں کی طرح رہ سکیں۔ ہمیں اس موقع کا فائدہ اٹھانا چاہیے ہمیں چاہیے ہم یورپ کے ساتھ ایک سنجیدہ ڈائلاگ کریں اور اس ڈائلاگ کے ذریعے وہاں تو بین رسالت کے باقاعدہ قوانین بنوائیں۔ ہم انہیں اپنی روایات، نظریات اور ثقافت کا احترام کرنے پر مجبور کریں ہم دونوں مذاہب اور تہذیبوں کے درمیان ایک ایسا لکیر وضع کر دیں جس کے دونوں طرف رہنے والے ایک دوسرے کا احترام کریں ایک دوسرے سے محبت کریں۔

مجھے محسوس ہوتا ہے اگر عالم اسلام نے یہ موقع کھو دیا تو ہم تہذیبوں کی اس جنگ میں اپنے دشمنوں میں اضافہ کر لیں گے ہم اپنے دوستوں کی تعداد میں کمی لے آئیں گے۔





## زوال کی تین وجوہات

اسلامی دنیا البتہ ان اور فلسطین کی صورت حال پر کیوں خاموش ہے؟ یہ سوال آج دنیا کے ہر شخص کی زبان پر ہے اس سوال کے پیچھے زوال کی طویل تاریخ ہے۔ انسان کی دس ہزار سالہ تاریخ میں جس قوم نے بھی ترقی کی اس میں تین خوبیاں تھیں، وہ علم میں دوسری قوموں سے برتر تھی، اس کی معیشت مضبوط تھی اور وہ باقی قوموں سے طاقت ور تھی، ترقی کا یہ فارمولا آج تک دنیا میں کارفرما ہے لیکن انیسویں اسلامی ممالک ان تینوں شعبوں میں دنیا سے بہت پیچھے ہیں، اس وقت دنیا میں ایک ارب 47 کروڑ 62 لاکھ 33 ہزار 4 سو 70 مسلمان ہیں، دنیا کا ہر پانچواں شخص مسلمان ہے، دنیا میں ایک ہندو اور ایک بودھ کے مقابلے میں دو مسلمان اور ایک یہودی کے مقابلے میں 100 مسلمان ہیں، دنیا میں 161 اسلامی ممالک ہیں، ان میں سے 57 آوازی سی کے رکن ہیں لیکن یہ دنیا کی تیسری بڑی قوت ہونے کے باوجود انتہائی کمزور، حقیر اور بے بس ہیں، کیوں؟ اس کا جواب ہمیں ترقی کے تین بڑے اصولوں میں ملتا ہے۔

دنیا میں ترقی کا پہلا اصول علم ہے، اس وقت پوری اسلامی دنیا میں صرف 500 یونیورسٹیاں ہیں۔ ان یونیورسٹیوں کو اگر ہم مسلمانوں کی مجموعی تعداد پر تقسیم کریں تو ایک یونیورسٹی 30 لاکھ مسلمانوں کو جانوں کے حصے آتی ہے جبکہ اس کے مقابلے میں صرف امریکہ میں 5 ہزار 7 سو 58 یونیورسٹیاں ہیں اور ٹوکیو شہر میں 1000 یونیورسٹیاں ہیں، عیسائی دنیا کے 40 فیصد نوجوان یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہیں جبکہ اسلامی دنیا کے صرف دو فیصد نوجوان یونیورسٹی تک پہنچ پاتے ہیں، اسلامی دنیا میں ایکس لاکھ لوگوں میں سے صرف 230 لوگوں کو سائنس کا علم ہوتا ہے جبکہ امریکہ کے دس لاکھ شہریوں میں سے 4 ہزار اور جاپان کے 5 ہزار شہری سائنس دان ہوتے ہیں، پوری عرب دنیا میں صرف 35 ہزار کل ٹائم سرچ سکلرز ہیں جبکہ صرف امریکہ میں ان کی تعداد 22 لاکھ ہے۔ پوری اسلامی دنیا اپنے جی ڈی پی کا صرف اٹھارہ فیصد دیرسرج پر خرچ کرتی ہے جبکہ عیسائی دنیا اپنی آمدنی کا پانچ فیصد حصہ تحقیق اور علم پر لگاتی ہے۔ اس وقت دنیا میں 200 بڑی یونیورسٹیاں ہیں ان دو سو یونیورسٹیوں میں سے 54 امریکہ، 24 برطانیہ، 17 آسٹریلیا، 10 چین، 10 جاپان، 10 ہالینڈ، 9 فرانس، 9 جی جی، 9 کینیڈا اور 7 سوئزر لینڈ میں ہیں، ان دو سو یونیورسٹیوں میں اسلامی دنیا کی صرف ایک یونیورسٹی ہے جبکہ اس فہرست میں بھارت کی تین یونیورسٹیاں آتی ہیں، اگر ہم اس فہرست کا ذرا سا کڑا جائزہ لیں تو دنیا کی پہلی

میں یونورسٹیوں میں 18 یونورسٹیاں امریکہ میں ہیں، کپیئر کے پہلے دس بڑے ادارے امریکہ میں ہیں اور دنیا کے 30 فیصد غیر ملکی طالب علم امریکہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، پوری دنیا میں امریکہ اعلیٰ تعلیم پر سب سے زیادہ رقم خرچ کرتا ہے، امریکہ اپنے جی ڈی پی کا دو اشاریہ چھ فیصد ہائر ایجوکیشن پر صرف کرتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں یورپ ایک اشاریہ دو اور جاپان ایک اشاریہ ایک فیصد خرچ کرتے ہیں۔ امریکہ ٹیکنالوجی اور ایجادات میں دنیا میں پہلے نمبر پر آتا ہے، اس کی کمپنیاں تحقیق پر دنیا میں سب سے زیادہ رقم خرچ کرتی ہیں، امریکہ تحقیقی اداروں کے معیار میں سب سے آگے ہے اور اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ نو مل انعام یافتہ سائنس دان امریکہ میں ہیں۔ چین اور بھارت علم اور ٹیکنالوجی میں نئی طاقت بن کر ابھر رہے ہیں، امریکی ماہرین کا خیال ہے چین 2045ء میں امریکہ کی جگہ لے لے گا، اس کی وجہ یونورسٹیاں اور ٹیکنالوجی ہے، چین میں اس وقت 9000 اور بھارت میں 8407 یونورسٹیاں ہیں۔ یہ دونوں ملک ہر سال 9 لاکھ 50 ہزار انجینئر پیدا کرتے ہیں اس کے مقابلے میں امریکہ میں ہر سال صرف 70 ہزار نئے انجینئر مارکیٹ میں آتے ہیں، اس وقت دنیا میں 120 کیمیکل پلانٹس بن رہے ہیں ان میں سے 50 چین میں ہیں لہذا آپ دیکھ لیجیے اس وقت ہر وہ ملک ترقی یافتہ ہے جو علم، یونورسٹیوں اور شرح خواندگی میں دنیا سے آگے ہے اور ہر وہ ملک پسماندہ ہے جو علم میں پیچھے ہے اور بد قسمتی سے اسلامی دنیا اس شعبے میں دنیا میں سب سے پیچھے ہے۔

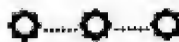
ترقی کا دوسرا اصول معیشت ہوتی ہے، 161 اسلامی ممالک کا مجموعی جی ڈی پی صرف 2 ٹریلین ڈالر ہے جبکہ امریکہ صرف مصنوعات اور خدمات کے شعبے سے 12 ٹریلین کماتا ہے، امریکہ کے صرف ایک شہر لاس ویگاس کی معیشت سو 13 ٹریلین ڈالر ہے، امریکہ کی شاخ آنکھیں والی سڑیٹ 20 ٹریلین ڈالر کی مالک ہے، صرف کوکا کولا کمپنی کے نام کی قیمت 97 ارب ڈالر ہے، دنیا میں اس وقت 36 ہزار ملٹی نیشنل کمپنیاں ہیں ان میں سے 25 ہزار کا تعلق امریکہ سے ہے، دنیا کے 25 اہم ترین لوگوں میں سے 12 کا تعلق امریکہ سے ہے۔ دنیا کی 52 فیصد ٹیکسٹریاں عیسائی دنیا میں ہیں جبکہ دنیا کی 70 فیصد صنعتوں کے مالک عیسائی اور یہودی ہیں، دنیا کی دس ہزار بڑی ایجادات میں سے 16103 ایجادات امریکی جبکہ 18315 ایجادات عیسائیوں اور یہودیوں نے کی تھیں، اسلامی دنیا جتنی رقم کا تیل فروخت کرتی ہے امریکہ اور یورپ اس سے دوگنی رقم کی ہر سال شراب پیچتے ہیں، ہمارے سارے تیل کی مالیت امریکہ کی برگر کھانے والی تین کمپنیوں کے سالانہ ٹرن اور کے برابر ہے۔ امریکہ کے سرسبز کے شعبے کی آمدنی پوری اسلامی دنیا کے مجموعی جی ڈی پی سے زیادہ ہے اور ہم 161 اسلامی ممالک ہر سال ایکسپورٹس سے جتنی رقم حاصل کرتے ہیں اتنی رقم ہالینڈ صرف پھول بیچ کر کماتا ہے۔

اب آجائیں طاقت کے اصول کی طرف، ذرا اپنے دل سے پوچھیے اس وقت دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت کون ہے؟ کس ملک کے پاس بڑی فوج ہے، کس کا دفاعی بجٹ زیادہ ہے، کس کے پاس دنیا میں سب سے زیادہ جوہری ہتھیار ہیں، میزائل کس کے پاس زیادہ ہیں، کس کے طیارے پوری دنیا کا چکر لگا سکتے ہیں، وہ



کون سا ملک ہے جو اڑتے ہوئے طیاروں میں بیٹروں بھر سکتا ہے جس کے پاس توپیں اور ٹینک ہیں جو لیزر گائیڈڈ بموں سے ہزاروں میل دور ہتھی چا سکتا ہے، کس کے مصنوعی سیارے دنیا کی ایک ایک اونچ پر نظر میں گاڑھے بیٹھے ہیں، کون ہے جو ہزاروں میل دور بیٹھ کر آپ کے چشمے کا نمبر معلوم کر سکتا ہے اور کون ہے جو دنیا کا ہر کپیڑا اور ہر ٹیلی فون مانیٹر کر رہا ہے مہینا آپ کا جواب ہوگا امریکہ، آپ کی بات درست ہے امریکہ کے بعد برطانیہ، جرمنی، فرانس، اٹلی اور روس آتے ہیں اور اس کے بعد چین اور بھارت کا نمبر آتا ہے جبکہ بد قسمتی سے ایک بھی اسلامی ملک دفاعی ساز و سامان بنانے والے نمائندگی کی فہرست میں شامل نہیں، پورے عالم اسلام میں پاکستان واحد ملک ہے جس کے پاس ایٹم بم ہیں اسلامی ہلاک کے کسی ملک میں اتنا دم ختم نہیں کہ وہ کسی یورپی ملک کے بغیر اپنا دفاع کر سکے، آپ پوری اسلامی دنیا کی فوجی تھکیمات اور فوجی اٹالوں کا تجزیہ کر لیں، ان کے پاس رائل سے لے کر جہاز تک امریکہ اور یورپ کے ہوں گے، وہ رائلوں کی گولیاں تک کسی عیسائی ملک سے لے رہے ہوں گے۔

یہ ہے اسلامی دنیا کی صورت حال، یہ ہیں ہمارے زوال کی اصل وجوہات قدرت کا قانون ہے جب بھی کوئی چیز بلندی سے گرتی ہے تو وہ ہمیشہ نیچے آتی ہے، قدرت نے آج تک دنیا کے کسی شخص، کسی قوم کے لئے اپنا یہ قانون تبدیل نہیں کیا، دنیا میں کامیابی اور فتح کیلئے خود کو طاقتور ثابت کرنا پڑتا ہے یہ بھی قدرت کا قانون ہے قدرت نے اپنا یہ قانون اپنے انبیاء کرام تک کیلئے تبدیل نہیں کیا تھا، حضرت آدم سے لے کر رسول اکرم تک دنیا کے ہر نبی کو میدان جنگ میں اپنی طاقت ثابت کرنی پڑی تھی اور وقت کے ہر دور میں صرف وہی تہذیب قائم رہی جس کے پاس فوج، علم اور ٹیکنالوجی تھی لیکن بد قسمتی سے اس وقت عالم اسلام ان تینوں شعبوں میں بہت پیچھے ہے، بد قسمتی سے ہم سب رنگ آلود گنوار میں لے کر میزائلوں کے سامنے صف آراء ہیں، ہم سب کی گردنوں میں جہالت کے طوق پڑے ہیں اور ہم سب مشکوٰۃ کے لے کر غیروں کے دروازوں پر کھڑے ہیں اور اس کے بعد اللہ کی نصرت کا انتظار کر رہے ہیں اور ہمارا خیال ہے اللہ ہمارے لئے اپنے سارے اصول بدل دے گا، ہمارا خیال ہے اللہ تعالیٰ نے جو نظام اپنے نبیوں کیلئے تبدیل نہیں کیا تھا وہ ہمارے لئے بدل دے گا، ہم کس قدر سادہ لوگ ہیں، ہم ڈیڑھ ارب لوگ جو 21 ویں صدی میں ایک نئی بدوق ایماں نہیں کر سکتے، جو عالمی سطح کی یونیورسٹی نہیں بنا سکتے اور جو انٹرنیشنل سطح کا رگرو کوکا نہیں بنا سکتے، جو اپنا تیل بیچنے کیلئے عیسائی کمپنیوں کے محتاج ہیں، جو قرآن مجید تک یہودیوں کے پریسوں پر میسائیوں کی روشنائی سے چھاپتے ہیں اور جن کے خانہ کعبہ میں یہودی کشن کا انٹرکنٹینٹل سسٹم لگا ہے ان لوگوں کا خیال ہے اللہ تعالیٰ ان کیلئے اپنا نظام بدل دے گا، کیا یہ ممکن ہے؟ ہم لوگ کتنے بے وقوف ہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں، ہم غور باللہ! اپنے اللہ کو بھی دھوکہ دے لیں گے۔



## زوال کی چوتھی وجہ

احسن اقبال کا خیال مختلف تھا، ان کا فرمانا تھا، قوموں کی ترقی کیلئے صرف علم، معیشت اور طاقت کافی نہیں ہوتی اس کیلئے کریکٹر بھی ضروری ہوتا ہے۔ میں نے اتفاق کیا، میں نے ان سے عرض کیا واقعی اسلامی دنیا کے زوال کی چوتھی وجہ کریکٹر کی کمی ہے، ہم کردار میں بھی دنیا سے پیچھے ہیں، ہم اس شعبے میں بھی مار کھا رہے ہیں۔

کریکٹر پانچ خوبیوں کا مجموعہ ہوتا ہے، یہ خوبیاں ایمانداری، وسعت قلبی، وعدے کی پابندی، سچائی اور انصاف ہیں، جب یہ پانچ خوبیاں جمع ہوتی ہیں تو ان سے کریکٹر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن بد قسمتی سے پوری اسلامی دنیا میں یہ خوبیاں ناپید ہیں، آپ ایمانداری کو لے لیجئے، پاکستان سمیت کون سا اسلامی ملک ہے جس کی اسی یا نوے فیصد آبادی ایماندار ہے۔ آپ کسی اسلامی ملک میں خوراک اور ادویات کے خالص ہونے کی قسم نہیں کھا سکتے۔ آپ احتجاج دیکھتے پوری عرب دنیا میں یورپ اور امریکہ سے خوراک آتی ہے۔ ڈنمارک کی کپنی ”آر لے“ سعودی عرب کو ذیری مصنوعات بیچتی ہے، یواسے اسی کی ریاستیں ڈنمارک سے گوشت منگواتی ہیں اور پوری اسلامی دنیا جرمی سوئٹزر لینڈ اور امریکہ سے ادویات خریدتی ہے، گویا ہماری ایمانداری کا یہ عالم ہے ایک اسلامی ملک دوسرے برابر اسلامی ملک سے کھانے پینے کی اشیاء تک نہیں خریدتا، کیوں؟ کیونکہ اسے ان اشیاء کی کوالمی کا یقین نہیں ہوتا، آپ اسلامی دنیا کا دفتری نظام دیکھ لیجئے، پاکستان سمیت کسی اسلامی ملک کے سرکاری ملازم وقت پر دفتر نہیں آتے۔ پورے عالم اسلام کے دفاتر میں ایمانداری سے کام نہیں ہوتا، پورے عالم اسلام میں کرپشن اور رشوت ستانی عام ہے، ہم لوگ حج اور عمرے کے دوران حیرت اور چرس منگل کرتے ہیں، اطواف کے دوران حاجیوں کی جبین کاٹتے ہیں اور ہم خرین میں کھڑے ہو کر بھیک مانگتے ہیں، کریکٹر کی دوسری خوبی وسعت قلبی ہوتی ہے، ہم لوگ بد قسمتی سے تنگ دل اور متعصب لوگ ہیں، چھوٹے بڑے، گورے کالے اور عربی، ممکی، جتنی تفریق اسلامی ممالک میں پائی ہے اتنی دنیا کے کسی ملک میں نظر نہیں آتی، امریکہ نے 1850ء میں ”کاسٹ“ کا لفظ ختم کر دیا تھا لیکن اسلامی دنیا میں آج تک سرکاری فارموں میں فرقہ، کاسٹ اور سب کاسٹ کے خائے موجود ہیں، دنیا میں بے شمار ایسے اسلامی ممالک ہیں جو ساٹھ ساٹھ سال تک غیر ملکی مسلمانوں کو شہریت نہیں دیتے، اسلامی دنیا 72 فرقوں میں تقسیم



ہے۔ ایک فرقے کا مسلمان دوسرے فرقے کی مسجد میں نماز نہیں پڑھ سکتا، ہر فرقے کے قبرستان الگ ہیں، ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لوٹے کے ساتھ وضو نہیں کرتا اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ایمان کو مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے، کرکٹ کی تیسری خوبی وعدے کی پابندی ہے، آپ اپنے گرد و پیش میں نظر دوڑائیے کیا آپ سمیت اسلامی دنیا کا کوئی شہری اپنے وعدوں کا پاس کرتا ہے، ہم لوگ تو اللہ کے ساتھ کئے وعدے نہیں بھاتے، اللہ اور اس کا رسول کہتا ہے مسلمان ایک وجود کی طرح ہیں لیکن لبنان، فلسطین، افغانستان اور عراق میں مسلمان مر رہے ہیں اور ہم مسلمان سب سے پہلے پاکستان کے فخرے لگا رہے ہیں مسلمانوں میں خانہ کعبہ میں کھڑے ہو کر نوے دنوں کا وعدہ کرنے والے حضرات گیارہ سال تک کرسی سے نہیں ہٹتے اور 2004ء میں یونین فارم اتارنے کا وعدہ کرنے والے 2006ء تک چلے جاتے ہیں، آپ پوری دنیا کا دورہ کریں آپ کو یہودی، عیسائی، سکھ، ہندو اور بودھ وعدے کا پابند ملے گا لیکن مسلمان وعدے سے پھرتے ہوئے ایک منٹ نہیں لگائے گا، آپ کا رو بار سے سیاست تک کوئی شعبہ دیکھ لیں آپ کو ہر شعبے میں وعدہ خلافی اور عہد شکنی ملے گی، ملازم ملازمت کا باؤ بھر کر کام نہیں کرتا اور مالک وعدہ کرنے کے بعد ملازم کو پوری تنخواہ نہیں دیتا، چوتھی خوبی سچائی ہوتی ہے، آپ پوری اسلامی دنیا کا مشاہدہ کر لیں آپ کو 161 اسلامی ممالک میں سچ زوال پذیر دکھائی دے گا، ہم لوگ اپنی ذات سے لے کر آئین اور قانون تک ہر چیز سے جھوٹ بولتے ہیں اور ہم لوگ ہاتھ میں قرآن اٹھا کر غلط بیانی کرتے ہیں، میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں جو دکاندار اللہ اور رسول کی قسمیں کھائے میں اس سے سودا نہیں خریدتا اور کرکٹ کی پانچویں خوبی انصاف ہوتا ہے، اس وقت اسلامی معاشروں میں لوگوں کے ساتھ جتنی بے انصافی ہوتی ہے اس کی مثال کسی غیر اسلامی ملک میں نہیں ملتی، آج 161 اسلامی ممالک میں سے 23 ملکوں میں آمریت ہے ہم اپنی ذات سے لے کر جانوروں تک پر ظلم کرتے ہیں۔ 17 میر اسلامی ممالک 9 غریب اسلامی ملکوں سے بچے چوری کرتے ہیں اور انہیں اونٹ دوڑ میں مرداویہ ہیں، اسلامی ممالک کی عدالتیں تاخیر اور نا انصافی کا گڑھ ہیں اور ان سے صرف طاقتور کو انصاف ملتا ہے۔

میں نے احسن اقبال کے ساتھ اتفاق کیا، میں نے ان سے عرض کیا صفائی مسلمانوں کا نصف ایمان تھی لیکن آپ کو کسی اسلامی ملک میں صفائی نہیں ملے گی، علم مومن کی میراث تھا لیکن آج کے مومن کی جہالت سے دل گھبراتا ہے، جابر سلطان کے سامنے کلہ حق مسلمان کی پہچان ہوتا تھا لیکن آج کا مسلمان جابر سلطان کی اجازت کے باوجود کلہ حق نہیں کہتا، شراب، زنا، جوا اور سود اسلام میں حرام ہیں لیکن یہ چاروں برائیاں تمام اسلامی ممالک میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، پردہ اسلام کی شناخت تھا لیکن فاشی اسلامی ممالک میں انٹرنیٹ کی شکل اختیار کر چکی ہے، برداشت اور اعتدال مسلمان کا طرہ امتیاز تھا لیکن پوری دنیا میں سب سے زیادہ شیشے توڑے اور سب سے زیادہ ٹائمر اسلامی ملکوں میں جلائے جاتے ہیں شہریوں کے تحفظ کی بنیاد اسلام نے رکھی تھی لیکن آج حالت یہ ہے پورے یورپ میں کوئی جوان بچی سکرت اور شرٹ پہن کر ملک کے دوسرے کو نے تک چلی جاتی ہے اور کوئی اس کی

طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا لیکن اسلامی ملک میں ایک مسلمان بچی برقعہ اوڑھ کر دوسرے محلے تک نہیں جاسکتی، اسلامی ملکوں میں مسجدوں سے جوتے، ٹکے اور لاؤڈ سپیکر چوری ہو جاتے ہیں، ہسپتالوں سے نو مولود بچے اغوا کر لئے جاتے ہیں، ڈاکٹر مریضوں کے گروے نکال لیتے ہیں اور سیاستدان پارلیمنٹ ہاؤس میں یونیفارم کی حمایت میں قراردادیں پاس کرتے ہیں۔ یہ ہے ہمارا کریکٹر چنانچہ ہم اللہ تعالیٰ کی محبوب قوم ہونے کے باوجود پوری دنیا میں جوتے کھارہے ہیں، ہم رو رو کر اپنی جائے نمازیں گیلی کر دیتے ہیں لیکن ہماری دعائیں، ہماری آیاتیں مسجد کی چھت تک نہیں جاتیں، میں نے احسن اقبال صاحب سے عرض کیا اللہ کے نزدیک ایک ہا کروار کا فر ایک بے ایمان اور بد کردار مسلمان سے ہزار درجے بہتر ہوتا ہے چنانچہ آج اللہ تعالیٰ ہمارے دشمنوں کو دل کھول کر نواز رہا ہے آج ہمارے دشمنوں کا پانی تیل بن چکا ہے جبکہ ہمارا تیل بھی پانی ہو گیا ہے، آج ان کی مٹی سونا ہے جبکہ ہمارا سونا بھی مٹی کے بھاؤ تک رہا ہے، آج ہم 67 لاکھ کی فوج اور ایک ارب 48 لاکھ کی آبادی کے باوجود 4 کروڑ یہودیوں سے اپنے لبنان کو نہیں بچا سکتے کیوں؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ جعلی دوائیں بنانے اور لونٹ ریس کرانے والوں کیلئے اپنا پیس نہیں بھجوا کر تا اس لئے کہ ہم پوری دنیا کو بے وقوف بنا سکتے ہیں لیکن ہم (نعوذ باللہ) اپنے خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے اس لئے کہ ہم اس کے قوانین کی خلاف ورزی کر کے اس سے مدد حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ ہمارے زوال کی چوتھی وجہ ہے۔

Kashif Azad @ Oneindia.com





## نورے کی ماں

نورا مصلیٰ میری زندگی کا پہلا کی تھا میں اس سے پہلے کیوں سے واقف تھا اور نہ ہی مصلیوں کے بارے میں کچھ جانتا تھا میں بس اتنا دیکھتا تھا بعض لوگ ہمارے گھر اور ڈیرے پر آتے ہیں وہ سارا دن ہماری خدمت کرتے ہیں ہمارے جھونے برتن دھوتے ہیں ہمارے ڈھور ڈھگروں کو چارہ کھلاتے اور پانی پلاتے ہیں ہمارے کھیتوں میں کام کرتے ہیں ہمارے محلوں میں بھاڑ دیتے ہیں ہمارے بزرگوں کے حقے تازہ کرتے ہیں ہماری بھینسوں کا دودھ دھوتے ہیں ہمارے کپڑے منجرتے ہیں اور ہمارے مہمانوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں میں یہ بھی دیکھتا تھا ان لوگوں کو چار پائوں پر بیٹھنے ہمارے بزرگوں کے حقے کو منہ لگانے اور ہمارے برتنوں میں کھانا کھانے کی اجازت نہیں ہم سب انہیں بھائی چاچا اور بھو بھی کہتے تھے لیکن جب وہ ہم سے ملنے آتے تھے تو وہ ہمارے سامنے چپ چاپ زمین پر بیٹھ جاتے تھے میں ان لوگوں کو دیکھتا تھا اور سوچتا تھا ہمارے کچھ چاہئے بھو بھیاں اور بھائی تو ہمارے ساتھ چار پائوں پر بیٹھتے ہیں وہ ہمارے ساتھ کھاتے اور پیتے ہیں لیکن اس قسم کے بھائی بھو بھیاں اور چاہے فاصلے پر رہتے ہیں اور زمین پر بیٹھتے ہیں کیوں؟ مجھے اس کیوں کا جواب نہیں ملتا تھا میں یہ بھی دیکھتا تھا ہماری ان بھیموں چاچوں اور بھائیوں کے بچے بھی ہیں یہ بچے ہمارے ہم عمر ہیں لیکن ان بچوں کو ہمارے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں ہم لوگ ان کے سامنے کھیلتے ہیں اور یہ بچے زمین پر بیٹھ کر ہمیں حسرت سے دیکھتے رہتے ہیں اور اپنے کالے ننگے بازوؤں کے ساتھ ناک صاف کرتے رہتے ہیں میں سوچتا تھا ایسے کیوں ہے؟ مجھے اس کیوں کا جواب نہیں ملتا تھا لیکن جب میں پانچ سال کا ہوا اور میری والدہ نے مجھے سکول داخل کر لیا تو مجھے ان دونوں کیوں کا جواب مل گیا اس جواب کا نام نور تھا یہ نور اکون تھا؟ نور امیرا کی تھا؟ مجھے سکول میں داخلے پر سنے جوتوں نئے کپڑوں نئے جوتے نئی محنتی اور نئی کتابوں کے ساتھ نور اٹھتے میں ملتا تھا میرے لیے یہ ایک انوکھا تھا تھا مجھے آج بھی یاد ہے جب میں پہلی بار سکول جانے لگا تھا تو میری والدہ نے میرے سامنے ایک بچہ کھڑا کر دیا تھا اور میرے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی تھی "یہ تمہارا کی ہے یہ تمہارے ساتھ سکول چایا کرے گا" میں اس بچے کو دیکھ کر حیران رہ گیا وہ کالے سیاہ رنگ کا ایک مضبوط بچہ تھا اس کی آنکھیں سرخ ناک کے تھننے نیلے اور اس کے

دانت پہلے تھے اس کے منہ سے بوا رہی تھی اور اس کے پورے جسم پر ایک چھوٹے سائز کی شلوار تھی یہ شلوار بے شمار پیر غنوں اور داغوں سے الٹی پڑی تھی اور کثرت استعمال سے اس کا اصل رنگ تک ڈھچکا تھا لیکن اس کے باوجود مجھے نور اچھا لگا۔

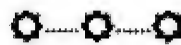
نور سے کی ڈیونیاں بہت دلچسپ تھیں وہ میرا بہت اور میری بوری سکول پہنچاتا تھا میں اکثر اس کے آگے آگے چلتا تھا اور نور میری بوری اٹھا کر میرے پیچھے آتا تھا اگر کبھی مجھے اپنی ”کھوتی“ سکول لے جانے کی اجازت مل جاتی تو میں کھوتی پر بیٹھتا تھا اور نور کھوتی کی دم کھینچ کر اس کی سپینے کنٹرول کرتا تھا سکول میں اس کے تین کام ہوتے تھے وہ میری تختی دھوتا تھا میری سلٹیٹ صاف کرتا تھا میری روات میں پانی ڈال کر لاتا تھا اور اگر کبھی ماسٹر صاحب مجھ سے خفا ہو جاتے تو میری جگہ کان پکڑتا تھا اور ماسٹر صاحب سے میرے حصے کی مار بھی کھاتا تھا واپسی پر وہ میرے لئے دوسروں کے کھیت سے سولیاں گاڑیں اور تر بوڑھی چوری کرتا تھا مجھے ہیر بھی توڑ کر دیتا تھا اور ان ساری خدمات کے عوض میری ماں اسے ایک پراٹھا دوڑھ کا ایک گلاس اور میرے پرانے کپڑے دیتی تھی یہ کپڑے نور سے کے قد کاٹھ اور جسامت کے لحاظ سے بہت تنگ اور چھوٹے ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود نور ایہ کپڑے پہن کر بہت خوش ہوتا تھا وہ میرے کپڑوں کی وجہ سے کیوں کے مکھلے کار نہیں کہلاتا تھا۔

نور ایک بھر پور کردار تھا اور یہ کردار بھر پور فرصت اور زیادہ تفصیل کا مستحق ہے میں ان شاء اللہ کسی اور وقت نور سے پر پوری تفصیل سے روشنی ڈالوں گا سر دست میں نور سے کی والدہ کی ایک عجیب عادت کا ذکر کرتا چاہتا ہوں نور سے کی ماں اسے روزیج ہمارے گھر چھوڑنے آتی تھی وہ جب گھر سے نکلتی تھی تو ایک تازہ گنا توڑ کر ہاتھ میں پکڑ لیتی تھی اور اپنے گھر سے ہمارے گھر تک اس گنے سے نور کی پٹائی کرتی آتی تھی نور اچھی مارتا ہوا آگے آگے بھاگتا تھا اور اس کی ماں گنا لہراتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے یہ روز کا معمول تھا نور اچھا صرف میری ”خدمت“ میں رہا میں نے ہمیشہ اس کے تنگے جسم پر چوٹوں کے نشان دیکھے ان چوٹوں سے بعض اوقات خون بھی رستا تھا لیکن نور ایک ہا کمال بچہ تھا وہ ٹھیک دس پندرہ منٹ بعد ان چوٹوں کو بھول جاتا تھا اور قہقہے لگاتا تھا کھوتی کی دم سے لٹک جاتا تھا میں نے ایک بار اپنی ماں سے پوچھا ”اماں نور سے کی ماں اسے روز کیوں مارتی ہے“ میری ماں نے عجیب جواب دیا اس کا کہنا تھا ”تمام کیوں کی ماں اپنے بچوں کے ساتھ بھی سلوک کرتی ہیں“ میں نے وجہ پوچھی تو ماں نے بتایا ”ان لوگوں کا خیال ہے اس سے بچوں میں برداشت پیدا ہوتی ہے“ میں نے حیرت سے ماں کو دیکھا انہوں نے بتایا ”ان کے بچے کی ہوتے ہیں انہوں نے جلد یا بدیر کسی ڈیرے پر کام کرنا ہوتا ہے ڈیرے کے لوگ ذرا سخت طبیعت کے لوگ ہوتے ہیں لہذا یہ لوگ اپنے بچوں کو شروع سے مار کھانے ذلت برداشت کرنے اور ظلم سہنے کی عادت ڈال دیتے ہیں ان کا خیال ہوتا ہے اس سے ان کے بچوں کی آنے والی زندگی آسان ہو جاتی ہے“

مجھے نور اور اپنی ماں کا یہ عجیب و غریب فلسفہ دلوں بھول گئے لیکن میں نے کل کے اخبار میں ایک عجیب



خبر پڑھی اس خبر نے مجھے نور اور ماں کا فلسفہ دونوں یاد کرادیئے، خبر یہ تھی حکومت نے کراچی انٹیرپورٹ پر بیرون ملک جانے والے مسافروں کے جوتے اتروا کر تلاشی کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کے بعد سکیورٹی اہلکار پورڈنگ پاس لینے والے تمام پاکستانی مسافروں کے جوتے اور بیٹلس اترواتے ہیں ان کے پرس چابیاں اور موبائل لٹکواتے ہیں اور ان کی بھرپور تلاشی کے بعد انہیں کیئر کرتے ہیں اب آپ پوچھیں گے اس خبر میں کون سی ایسی بات تھی جس نے مجھے تیس برس پرانا نور یاد کرادیا اس خبر میں ایک ٹھیک ٹھاک نور اچھا تھا میں آپ کو ابھی اس نور سے تک لے جاتا ہوں، ٹائمن الیون کے بعد امریکہ اور سیون سیون کے بعد یورپ نے اپنے انٹیرپورٹس پر پاکستانیوں کے جوتے اتروانے شروع کر دیئے تھے انہوں نے جوتا اتروائی کی اس رسم میں بڑا کڑا امرٹ رکھا تھا، دوسر کاری دورے پر جانے والے ہمارے وزرا، سیکرٹریوں اور جرنیلوں تک کو نہیں بخشے تھے پاکستانی اس سلوک پر شدید احتجاج کرتے تھے اور حکومت کو اس احتجاج پر عموماً پانی اختیار کرنا پڑتی تھی لہذا حکومت نے طویل غور و فکر کے بعد نورے کی ماں بننے کا فیصلہ کیا اس نے اپنے ہی شہریوں کے ساتھ اپنے انٹیرپورٹوں پر امریکہ اور یورپ جیسا سلوک شروع کر دیا اس نے پاک سرزمین سے لوگوں کے جوتے اتروانے اور بیٹلس کھلوانا شروع کر دیں تاکہ ہمارے لوگوں میں برداشت پیدا ہو جائے اور جب یہ لوگ نیو یارک یا لندن کے انٹیرپورٹ پر اتریں اور وہاں ان کی بے عزتی ہو تو انہیں تکلیف نہ ہو اور وہ بڑی آسانی سے یہ ذلت برداشت کر جائیں مجھے حکومت کا یہ اقدام بہت اچھا لگا اور میں دل سے ان لوگوں کی ذہانت اور فطانت کا قائل ہو گیا اور میں نے سوچا میں براہِ رمانا طاہر کے ذریعے اپنے ”ڈزنی“ وزیراعظم صاحب سے رابطہ کروں اور ان سے درخواست کروں وہ اب مہربانی فرما کر پاکستان کے دس بارہ شہروں میں گوانٹانا موبے جیسے انکسپریس کمپ بھی بنوائیں اور پاکستان کے تمام زندہ اور مردہ شہریوں کیلئے ان کمپوں میں ایک ایک ماوی ٹرینگ لازمی قرار دے دیں تاکہ جب ہمارا کوئی شہری اچانک غائب ہو جائے تو اس کے لواحقین کو اور اسے زیادہ تکلیف نہ ہو اور وہ اس ذلت اور اس دکھ کو کی کہیں لوگوں کیلئے حکومت کا نارش پنچ سمجھے اور نورے کی طرح دس منٹ بعد اپنی ساری تکلیف بھلا کر کھوتی کی دم سے لٹک جائے۔



## بھائی لوگوں کی خدمت

ممبئی بھارت کا سب سے بڑا شہر ہے، اس کی آبادی ڈیڑھ کروڑ ہے۔ اس شہر میں دو قسم کی حکومتیں ہیں، ایک حکومت سرکار کہلاتی ہے اور اسے مہاراشٹر کا وزیر اعلیٰ چلاتا ہے جبکہ دوسری حکومت غیر سرکاری ہے اور یہ ”اظہر ورلڈ“ کے احکامات سے چلتی ہے۔ ممبئی کی اظہر ورلڈ دنیا میں پانچویں نمبر پر آتی ہے۔ ممبئی شہر کی تمام گلیاں، کوچے، بازار اور آبادیاں مختلف بزمیوں، کنٹینٹوں اور غنڈوں کے قبضے میں ہیں۔ یہ لوگ فٹ پاتھ پر بھیک مانگنے والوں سے لے کر ملٹی سنور پربلڈنگ کے مالکان تک سے بہتہ لیتے ہیں۔ یہ لوگ اس بھتے کو اپنی زبان میں ”بھنڈ“ کہتے ہیں۔ ممبئی میں اگر کوئی شریف انسان بھنڈ دینے سے انکار کرے یا وہ کسی مجبوری کے باعث بھنڈ دینے کے قائل نہ ہو تو یہ لوگ اسے سرعام جینٹا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ اس عمل کو ”دھلائی“ کہتے ہیں۔ اظہر ورلڈ کے ایجنٹ شہر کے مختلف علاقوں سے ”بھنڈ“ جمع کر کے بڑے غنڈے تک پہنچاتے ہیں۔ یہ بڑے غنڈے سیکر انچارج کہلاتے ہیں اور سیکر انچارج یہ مال اپنے سے بڑے غنڈے تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ بڑا غنڈہ ممبئی کی زبان میں ”بھائی“ کہلاتا ہے۔ یہ شخص بنیادی طور پر ممبئی کا اصل مالک ہوتا ہے اور ممبئی کی تجارت سے لیکر سیاست تک ہر شعبہ اس کی انگلیوں پر ناچتا ہے، ممبئی میں اس کی اجازت کے بغیر ہتھ تک نہیں مل سکتا۔ یہ ”بھائی“ فوج کی طرح کام کرتا ہے۔ اس کے ہزاروں کارکن شہر میں بکھرے ہوتے ہیں یہ لوگ اسے ہل ہل کی خبر دیتے رہتے ہیں۔ بھائی انکیشن میں اپنی مرضی کے لوگوں کو منتخب کرتا ہے، یہ پولیس چیف تک تبدیل کر دیتا ہے۔ ”بھائی“ کے خاص کارندے ”چھوٹے“ کہلاتے ہیں۔ یہ چھوٹے ”بھائی“ کے جانور ہوتے ہیں اور ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد ہوتا ہے بھائی کی عزت اور خدمت کا خیال رکھنا۔ یہ بھائی کی آن، شان اور جان پر اپنی اور اپنے خاندان کی جان قربان کر دیتے ہیں۔ چھوٹوں کے گھر میں آٹا ہو یا نہ ہو، ان کی بیوی کو دوا ملے یا نہ ملے، ان کے باپ کو کفن نصیب ہو یا نہ ہو اور ان کے سر پر چھت ہو یا نہ ہو انہیں اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی یہ لوگ بس بھائی کے لیے جیتے اور بھائی کے لیے مرتے ہیں۔ ان بھائی لوگوں کی روایات بھی بڑی دلچسپ ہیں مثلاً یہ لوگ جب اپنے ساتھیوں کو جمع کرتے ہیں تو ایک کوڑو روڈ بولتے ہیں ”فلاس نے بھائی کو گالی دی“ یہ کوڑو روڈ سن کر تمام غنڈے جمع ہو جاتے ہیں اور ”تو نے بھائی کو گالی دی“ کا خروار کا کرہدف پر ہل پڑتے ہیں۔

میں بچپن پانچ برسوں سے جب بھی اخبارات پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے امریکہ پاکستان کا



”بھائی“ بن چکا ہے اور پاکستان نے بین الاقوامی سطح پر اپنے لیے چھوٹے کا کردار منتخب کر لیا ہے لہذا دنیا کے کسی بھی کونے میں کوئی شخص امریکہ کی عزت اور حرمت کی طرف انگلی اٹھاتا ہے تو ہم فوری طور پر ”تو نے بھائی کو گالی دی“ کا نعرہ لگاتے ہیں اور ہدف پر پل پڑتے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو آپ شمالی اور جنوبی وزیرستان کو دیکھ لیجئے، ہم وہاں کیا کر رہے ہیں، امریکہ کا خیال ہے ان بھڑے آب و گیاہ اور دور دراز علاقوں میں دہشت گرد پروان چڑھ رہے ہیں امریکی ماہرین کو خدشہ ہے یہ دہشت گرد فخریوں اور گھوڑوں پر بیٹھ کر امریکہ پہنچ جائیں گے اور مسواکوں اور تھیموں سے امریکہ کو پتہ کر دیں گے۔ امریکہ کو انا کے غریبوں، ناداروں اور بے بس لوگوں سے خطرہ ہے لہذا ہم لوگ امریکہ کی محبت میں ان لوگوں پر گولیاں اور گولے برس رہے ہیں۔ ہماری چھوٹی گیری کا یہ عالم ہے امریکہ کے کسی دانشور کو خواب میں اسامہ بن لادن نظر آ جاتا ہے تو ہم فوراً اسامہ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی امریکی کلرک کو سندھ میں حکمت یار یا ملا عمر کی نشان دہی کر دیتا ہے تو ہم پورا علاقہ جھان مارتے ہیں اور ہم ”بھائی“ کی خدمت کرتے ہوئے یہ تک بھول جاتے ہیں اس وقت ہمارا سارا ملک لاہ اینڈ آرڈر کے شدید مسائل کا شکار ہے۔ صوبہ سرحد میں ڈی آئی جی قتل ہو رہے ہیں، لاہور جیسے شہر میں ڈی آئی جی کو لٹیرے لوٹ رہے ہیں اور ہمارے آئی جی یہ اعتراف کر رہے ہیں پنجاب میں بچکس تیس مافیا ز ہیں اور ان مافیاز نے پورے صوبے کو بریغال بنا رکھا ہے۔ ہم ”بھائی“ کی خدمت کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں پاکستان کے پانچ بڑے شہروں میں روزانہ دو سے چار ہزار وارداتیں ہوتی ہیں اور ہمارے ”مورے تک اب ڈاکوؤں سے محفوظ نہیں رہی، ہم رات کو بچے کے بعد کسی براج روڈ پر سڑ نہیں کر سکتے اور مغرب کے بعد ملک میں حکومت عملاً ختم ہو جاتی ہے ہم یہ بھول جاتے ہیں پاکستان کے تمام بڑے شہروں کے دفاتروں اور گمروں کے باہر سکیورٹی گارڈز کھڑے ہیں، ہمیں ہر دوسری گاڑی میں ایک سکیورٹی گارڈ اور کلا شکوف دکھائی دیتی ہے، تمام صاحب ثروت لوگوں کی گاڑیوں کے آگے پیچھے اب سکیورٹی کی گاڑیاں ہوتی ہیں، لوگ اپنے بچوں کو ”سکیورٹی کور“ میں سکول بھجواتے ہیں، ہمارے پولیس افسروں تک نے ذاتی گاڑیوں کو کھٹے ہوئے ہیں اور ہمارے ملک میں سکیورٹی کا یہ عالم ہے میرے ایک دوست نے اپنے والد کے لیے گاڑی رکھ لئے ہیں۔ یہ گاڑی والد صاحب کو مسجد میں نماز پڑھاتے ہیں اور میرے دوست کے بزرگ جب نماز کیلئے نکلتے ہیں تو گاڑی زانچیں سکیورٹی کور دیتے ہیں اور جتنی دیر بزرگ مسجد میں رہتے ہیں گاڑی زانچ کے پیچھے کھڑے رہتے ہیں۔ موبائل اور پس کا چھینا جانا ہمارے معمول کا حصہ بن چکا ہے۔ صرف کراچی شہر میں روزانہ تین ہزار موبائل چھینے جاتے ہیں، ملک میں ڈاکوؤں کی یہ حالت ہے آپ کسی دن کا اخبار کھول کر دیکھ لیں آپ کو اس میں دس بیس ڈاکوؤں کی خبر ضرور ملے گی۔ عوام اس صورتحال کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ وہ روز لٹتے ہیں لیکن وہ تھانے نہیں جاتے۔ لاہ اینڈ آرڈر کی یہ حالت ہے اب لوگ قتل کے خلاف رپورٹ درج کرانے کی بجائے خود انصاف کرتے ہیں اور چپ چاپ پھانسی چڑھ جاتے ہیں، اس وقت ملک میں ریکارڈ اشتہاری موجود ہیں اور پولیس کو کسی بھی دور میں اسٹے لوگ مطلوب نہیں تھے، پچھلے سال پاکستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ لوگوں کو پھانسی کی سزا ہوئی اور ملک میں امن وامان کی یہ حالت ہے وزیر اعلیٰ پنجاب تک پولیس کو یہ دھمکی دینے پر مجبور

ہو چکے ہیں کہ اگر کوئی ایس ایچ او کام نہیں کرے گا تو اسے نوکری سے فارغ کر دیا جائے گا لیکن حکومت ان حالات پر توجہ کی بجائے "بڑے بھائی" کی خدمت میں مصروف ہے۔

آپ ملک میں لاء اینڈ آرڈر کی صورتحال دیکھتے دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی سپریم کورٹ نے پولیس کی تحویلوں کو روکنے کی دھمکی دی ہے۔ لوگ ملک میں بجلی کا بل جمع کرانے کے لیے ڈاکے مارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، بچوں کی لڑائیاں قتل و غارت گری تک پہنچ جاتی ہیں، پاکستان میں خالص دوا ملتی ہے اور نہ پانی اور آٹا، ہمارے ایک دفاعی وزیر پچھلے دنوں افریقہ سے بہرے سگنل کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ ہاؤسنگ سکیمیں لوگوں کے اربوں روپے لوٹ کر کھا گئیں، لوگوں نے نیپ کو "انکیشن کمیشن" کا نام دے دیا ہے اور ملک میں شراب کے کنٹینرز کے کنٹینرز آ رہے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں، ملک میں مسجدیں فرقہ واریت کا میدان جنگ بن چکی ہیں۔ اسلام کے نام پر بننے والے ملک میں ہر محرم پر سکيورٹی ارٹ ہو جاتی ہے۔ ملک میں عاشورہ پر موٹر سائیکل کی دوسری سواری پر پابندی لگ جاتی ہے اور اس ملک میں لوگ رائفلوں کے سائے میں جنازے پڑھتے ہیں لیکن ہماری حکومت کے پاس ان مسائل کے لیے کوئی وقت نہیں، ہم نے آج تک اس ملک میں جعلی دواؤں، جعلی خوراک اور جعلی ہاؤسنگ سکیموں کے خلاف کوئی آپریشن نہیں کیا۔ ہمارے پاس ناجائز تجاوزات تک دور کرنے کیلئے وقت نہیں۔ انسانی سنگٹروں دس لاکھ روپے لے کر ہمارے فوجیوں کو مرنے کے لیے ایران کے بارڈر پر چھوڑ آتے ہیں لیکن ہمارے پاس ان انسانی سنگٹروں سے نمٹنے کیلئے بھی وقت نہیں اور ہمارے پاس ڈاکوؤں اور سرگرمیوں اور چوروں سے مقابلے کے لیے وقت نہیں۔ آپ ذرا غور کیجئے ہم لوگ 18 سو کھیلو میٹر لمبی افغان سرحد کی ذمہ داری تو اٹھا لیتے ہیں لیکن ہم کراچی، لاہور، پشاور اور فیصل آباد کے شہریوں کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ ہم امریکیوں پر ہونے والے حملوں کی روک تھام تو کر سکتے ہیں اور ہم لوگ برطانیہ کے طیاروں کو لاحق خطرات کا جتنی اندازہ تو لگا سکتے ہیں لیکن ہم لاہور میں ڈی آئی جی کو قتل کرنے سے نہیں بچا سکتے، ہم لاہور اور کراچی کے شہریوں کی طرف بڑھتے خطرات کا اندازہ نہیں لگا سکتے، ہمارے پاس سات سمندر پار لینے صدر بش کے لیے تو وقت ہے لیکن ہمارے پاس اپنے ہمسائے میں پیشے اس بشیر کیلئے کوئی وقت نہیں جس کے ٹکس، جس کے خون اور جس کے پسینے سے یہ ملک چل رہا ہے۔ ہم امریکہ اور امریکی مفادات کی حفاظت تو کر سکتے ہیں لیکن ہم اپنے شہریوں کی جان اور مال کا احساس نہیں کر سکتے میرا خیال ہے ہم پوری طرح چھوٹے بن چکے ہیں اور اب دنیا میں ہماری صرف ایک ہی ذمہ داری رہ گئی ہے ہم صرف بھائی لوگوں کی خدمت کریں اور ہم بھائی کو گالی دینے والوں سے انتقام لیتے رہیں میرا بھی کبھی دل چاہتا ہے میں "بڑے بھائی" جناب صدر بش سے درخواست کروں وہ ہمارے حکمرانوں کو فون کریں اور انہیں یہ دھمکی دیں "تم لاء اینڈ آرڈر ٹھیک کر دو ورنہ تم تمہارا تو راہورہ بنا دیں گے" میرا خیال ہے ہمارے ملک میں اب لاء اینڈ آرڈر صرف اسی وقت ٹھیک ہو سکتا ہے جب امریکہ کو پاکستان میں ایک اچھی پولیس درکار ہوگی جب انکل سام جی چاہیں گے اور جب تک وہ وقت نہیں آتا ہم اسی طرح بھائی لوگوں کی خدمت کرتے رہیں گے۔





## جادوگر

جان غیر ملکی صحافی ہے، وہ تھائی لینڈ میں ایک امریکی اخبار کا بیورو چیف ہے، ایشیا کے چار ممالک پاکستان، افغانستان، ایران اور بھارت بھی اس کے دائرہ کار میں آتے ہیں، وہ خبروں کی تلاش میں اکثر پاکستان آتا رہتا ہے، وہ جب بھی پاکستان آتا ہے تو اس کے ساتھ میری ملاقاتیں رہتی ہیں۔ وہ چند روز پہلے ایم کیو ایم ایٹو کی کوریج کیلئے اسلام آباد آیا، ہم دونوں ڈنر کے لئے دامن کوہ چلے گئے وہاں ہماری حالات حاضرہ پر گپ شپ شروع ہو گئی، اس گپ شپ کے دوران جان نے بڑے پتے کی بات کہی، اس نے کہا ”دنیا میں عورت ‘انکیشن‘ اور کرکٹ کے بارے میں ڈیشن کوئی نہیں کی جاسکتی“ میں نے پوچھا ”وہ کیسے“ وہ مسکرا کر بولا ”عورت کے سواڈز میں بڑی تیزی سے تبدیلی آتی ہے وہ پانچ منٹ میں قہقہہ بھی لگا سکتی ہے، دھاڑیں مار کر رو بھی سکتی ہے اور انجی پانچ منٹوں میں کسی کے سر پر گلا بھی مار سکتی ہے“ میں نے اثبات میں سر ہلادیا ”جان بولا ”انکیشن بھی عورت کی طرح ہوتے ہیں ان کے سواڈز کے بارے میں بھی ڈیشن کوئی نہیں کی جاسکتی“ جان کا کہنا تھا ”ڈنر اور بیلٹ بکس کے درمیان پانچ فٹ کا فاصلہ ہوتا ہے لیکن یہ دنیا کا حساس اور قیمتی ترین فاصلہ ہوتا ہے اس پانچ فٹ کے فاصلے کے دوران 30 فیصد ووزر اپنا فیصلہ تبدیل کر لیتے ہیں اور 30 فیصد ووزر کی یہ تبدیلی ہزاروں لاکھوں لوگوں کا مقدمہ بدل دیتی ہے“ میں نے اثبات میں سر ہلادیا ”وہ مسکرایا۔“ کرکٹ بھی عورت اور انکیشن کی طرح ہوتی ہے، اس کھیل میں آخری کینڈ پر ایک چھکا ہاری ہوئی ٹیم کو فتح یاب کر دیتا ہے اور ایک وکٹ کرنے پر جیتی ہوئی ٹیم ہار جاتی ہے، اس کھیل میں کسی وقت ایک باؤلر اچھا بیٹسمین ثابت ہو سکتا ہے اور کسی بھی وقت ایک بیٹسمین باؤلر بن سکتا ہے، وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے قہقہہ لگایا اور بڑے پیار سے عرض کیا ”جان تم پوری دنیا کے بارے میں یہ رائے دے سکتے ہو لیکن جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے وہ دنیا کی پہلی سائنسی قوم ہیں جس نے کم از کم کرکٹ اور انکیشن کو ڈیشن کوئی کے قابل بنادیا“ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا ”میں نے عرض کیا ”جب ہماری ٹیم میدان میں اترتی ہے تو گولمنڈی کے بٹ صاحب تک کو کھیل کے نتیجے کا پتہ ہوتا ہے، وہ سچ دس بجے اعلان کر دیتے ہیں شام کو کون سی ٹیم جیتے گی اور ان کی ڈیشن کوئی سو فیصد سچ ثابت ہوتی ہے“ جان نے جذباتی ہو کر کہا ”تم لوگوں کے بٹ تو بڑے جینکس ہیں“ میں نے عرض کیا ”ہمارے بٹ نہیں ہمارے بٹی بڑے جینکس ہیں“ اس نے قہقہہ لگایا اور اس کے بعد بولا ”اور انکیشن“ میں نے قہقہہ لگایا اور اس سے الٹا سوال تو تھا ”اگر آج امریکہ میں مارٹن لوتھر کینگا تو کتنا

سکتے ہو؟ سو کر ایک پارٹی اور ری پبلکن پارٹی کا صدر کون ہوگا؟“ اس نے فوراً انکار میں سر ہلا دیا، میں نے مسکرا کر جواب دیا، ”لیکن ہم پاکستان میں پارٹی انکیشن سے پہلے یہ پیش گوئی کر سکتے ہیں کون صاحب کس پارٹی کے صدر منتخب ہونگے؟“ اس نے تھوڑی دیر سوچا اور پھر مسکرا کر بولا، ”مثلاً“ میں نے جواب دیا، ”مثلاً تم نے کچھلی ملاقات میں مجھ سے پوچھا تھا، مسلم لیگ ق کے صوبائی الیکشنوں میں کون کون صدر منتخب ہوگا؟“ میں نے تمہیں بتایا تھا پنجاب سے چوہدری پرویز الہی، بلوچستان سے جام یوسف اور سندھ سے ارباب غلام رحیم منتخب ہوں گے“ آج دیکھ لو یہ حضرات صدر منتخب ہو چکے ہیں،“ اس نے فوراً ہاں میں سر ہلا دیا، ”میں نے عرض کیا، ”تمہیں معلوم ہے مجھے یہ کس نے بتایا تھا؟“ اس نے انکار میں سر ہلا دیا، ”میں نے مسکرا کر جواب دیا، ”میرے ذرا تصور نے“ وہ چونک کر سیدھا بیٹھ گیا اور حیرت سے بولا، ”تمہارا ذرا تصور بھی جھٹکس ہے“ میں نے انکار میں سر ہلا دیا، ”صرف میرا ذرا تصور نہیں بلکہ اس ملک کے سارے پندرہ کروڑ لوگوں کو اس کا علم تھا، ہم میں سے ہر شخص انکیشن کشنر ہے اور ہر شخص پولیٹیکل جھٹکس ہے، ہم سب پارٹی انکیشن سے ایک دو سال پہلے اس کے نتائج سے واقف ہو جاتے ہیں، جان سر ہلا کر بولا، ”بڑی حیران کن بات ہے“ میں نے عرض کیا، ”میں تمہیں مزید حیران کن بات بتاتا ہوں، چند دن بعد مسلم لیگ ق کے مرکزی صدر کے انکیشن ہوں گے، میں آج پیش گوئی کرتا ہوں اس انکیشن میں چوہدری شجاعت حسین صدر منتخب ہوں گے“ اس نے حیران ہو کر کہا، ”ڈونٹ ٹیل می“ تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟“ میں نے عرض کیا، ”جس طرح میں نے صوبائی صدر کے بارے میں وثوق سے دعویٰ کیا تھا، اسی طرح تم آج لکھ لو دنیا ادھر سے ادھر ہو سکتی ہے لیکن مسلم لیگ قائد اعظم کے صدر چوہدری شجاعت ہی ہونگے اور جب تک صدر پرویز مشرف برسر اقتدار ہیں چوہدری صاحب منتخب ہوتے رہیں گے“

اس نے تھوڑی دیر سوچا اور سنجیدگی سے بولا، ”میں نے پچھلے دنوں وزیر اعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الہی کا ایک بیان پڑھا تھا، اس بیان میں چیف منسٹر نے دعویٰ کیا تھا وہ جنرل پرویز مشرف کو موجودہ اسمبلیوں سے دوبار صدر منتخب کر سکتے ہیں، مجھے سمجھ نہیں آتی، جس چیز کی آئین اور قانون میں ایک بار تجانش موجود نہیں تمہارے چیف منسٹر وہ کام دوبار کیسے کر نہیں گے؟“ میں نے قہقہہ لگایا اور تھوڑا سا سوچ کر جواب دیا، ”وہ ایک جھٹکس سیاستدان ہیں اگر انہیں یہ ناسک دے دیا جائے تو میرا دعویٰ ہے وہ یہ کام اٹھارہ مرتبہ کر سکتے ہیں“ جان پریشان ہو گیا، ”اس نے دونوں باتوں سے سر ہٹا کر ہنسی اور تھکی آواز میں بولا، ”لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟“ میں ذرا سا آگے جھکا اور آہستہ آہستہ عرض کیا، ”ہمارے مسلم لیگی قائدین جاوہر جی، یہ لوگ اگر کرنے پر آ جائیں تو پوری دنیا کو حیران کر سکتے ہیں“ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور پریشان لہجے میں پوچھا، ”مثلاً“ میں نے ہنس کر جواب دیا، ”مثلاً یہ ملک محمد علی جناح نے بنایا تھا اور محمد علی جناح کو قائد اعظم ان کی بہن محترمہ فاطمہ جناح نے بنایا تھا لیکن ہماری مسلم لیگ نے صدر ایوب خان کی محبت میں اسی فاطمہ جناح کو انکیشن میں شکست دے دی تھی، یہ مسلم لیگ کی تاریخ ہے یہ جب نشان لیتی ہے تو یہ فاطمہ جناح تک کو خاطر میں نہیں لاتی، مجھے یقین ہے اگر آج قائد اعظم زندہ ہوتے تو وہ بھی مسلم لیگ ق کے ہاتھوں شکست کھا جاتے“





## نمک کی چٹان پر گنا

ہمارے محبوب وزیر اعظم جناب شریک عزیز 1982ء سے 1984ء تک ملائیشیا میں رہے ہیں۔ وہ ملائیشیا میں شی بینک کے کٹری چیف آفیسر تھے، پچھلے دنوں انہوں نے ایک محفل میں ملائیشیا میں اپنے قیام کی چند یادیں دہرائیں، انہوں نے بتایا ملائیشیا میں ایک دن وہ گملوں کو پانی دے رہے تھے، ان کی ذرا سی بے احتیاطی سے پانی گیلے سے باہر گر گیا اور فرش گیلیا ہو گیا، ملائیشیا میں گندہ النازم ہے چنانچہ انہیں سو ڈالر جرمانہ ہو گیا، انہوں نے معافی طلبی کی بڑی کوشش کی لیکن انہیں یہ جرمانہ بھرنا ادا کرنا پڑا وزیر اعظم نے یہ واقعہ کیوں سنایا؟ میں پچھلے پانچ چھ دن سے حیران ہوں شاید وزیر اعظم اس واقعے سے ملائیشیا میں ”رول آف لاء“ کی صورت حال بتانا چاہتے ہوں شاید وہ ملائیشیا میں صفائی کی اہمیت ثابت کرنا چاہتے ہوں یا وہ پاکستان میں قانون کی صورت حال اور ہمارے گھروں سے سڑکوں تک پھیلی گندگی کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہوں، یہ بتانا چاہتے ہوں ایک اسلامی ملک صفائی کو کس قدر ترجیح دیتا ہے، میں ابھی تک حیران ہوں اگر ہم صفائی کا پس منظر دیکھیں تو اسلام دنیا کا پہلا مذہب تھا جس کا آغاز صفائی سے ہوا، اسلام کے ابتدائی دنوں میں جب کوئی شخص اسلام قبول کرتا تھا تو نبی اکرمؐ اسے سب سے پہلے طہارت اور وضو کا طریقہ سکھاتے تھے، نہینہ منورہ میں ایسے صحابہ کرامؓ موجود تھے جو ایک وضو سے پانچ نمازیں ادا کرتے تھے، پاکیزگی اس دور میں تنوئی کا حصہ ہوتی تھی، نہینہ منورہ تمام لوگوں کے لباس صاف اور خوشبودار ہوتے تھے، اسلام کے ابتدائی دنوں میں نبی رسالتؐ اور صحابہ کرامؓ کے پاس سترہ حلقے کے لئے صرف دو چادریں ہوتی تھیں اور ان پر بھی دس دس بیس بیس ہونڈے لگے ہوتے تھے لیکن دونوں چادریں پاک اور صاف ہوتی تھیں، اسلام پہلا مذہب تھا جس نے ماحول کی صفائی کو عبادت کا درجہ دیا، اسلام نے فحش کاری کو باقاعدہ معاشرے کا حصہ بنایا، آپؐ نے فرمایا اگر میرے ہاتھ میں ایک سوکھی ٹہنی ہو اور دوسری طرف صومرا لٹل چھوٹا جارہا ہو تو میں یہ ٹہنی فوراً زمین میں بوردوں گا، اسلام چانوروں کو لگیوں، بازاروں میں کھلا چھوڑنے کے خلاف تھا، راستے میں کھوٹا گاڑنے اور گھروں کا گندہ دروازے کے باہر پھینکنے کو انتہائی ناپسندیدہ فعل سمجھا جاتا تھا، اس کے برعکس اگر آپؐ اس زمانے کے دوسرے مذاہب اور معاشروں کا جائزہ لیں تو آپؐ کو ان میں صفائی کا یہ تصور نہیں ملے گا، میں حیرت میں دارسانی گیا، دارسانی فرانسسی بادشاہوں کا گرمائی دارالحکومت تھا، وہاں بادشاہوں کے محلات تھے یہ محلات 1789ء کے

فرج انقلاب کے بعد خالی کرائے گئے اور وہ اب عجائب گھر بن چکے ہیں یہ انتہائی خوبصورت اور پرچشم مملات ہیں ان کی چھتوں پر سونے سے تصویریں بنی ہیں اور دلیز سے لے کر باغوں تک سنگ مرمر نصب ہے لیکن اس پورے محل میں کوئی غسل خانہ اور کوئی ٹوائلٹ نہیں! میں نے مملات کی سر کے بعد سوچا "بادشاہ لوگ بوقت ضرورت کہاں جاتے تھے" پتہ چلا بادشاہ سلامت تخت پر بیٹھے بیٹھے اشارہ کرتے تھے اور خادم سونے کا پیالہ لے کر حاضر ہو جاتے تھے اور بادشاہ سلامت وہیں بیٹھے بیٹھے فارغ ہو جاتے تھے جبکہ درباریوں کے لئے دربار سے ذرا سامٹ کر پردے لگے تھے اور ان پردوں کے پیچھے خادم پتیل کی باللیاں لے کر کھڑے ہوتے تھے درباری ان بالٹیوں میں پیشاب کرتے تھے درباریوں کی فراغت کے بعد پردے کے آگے پیچھے خوشبو چھڑک دی جاتی تھی 'فرانس کی پرلوم اعظمی نے انہیں پردوں سے ختم لیا تھا" پتہ چلا فرانس کا پہلا ٹوائلٹ 1852ء میں بنایا تھا اور 1902ء میں عیسائی کے لوگوں کو نہانے پر مجبور کرنے کیلئے باقاعدہ قانون سازی کرنا پڑی تھی جبکہ اس کے مقابلے میں قرطبہ کی اسلامی حکومت نے 785ء میں شہر کا پہلا سیوریج سسٹم بنایا تھا! اموی دور میں قرطبہ شہر کے ہر گھر میں ٹوائلٹ اور غسل خانہ ہوتا تھا پورے شہر میں پبلک ٹوائلٹس اور غسل خانے بھی تھے ان غسل خانوں اور ٹوائلٹس کے آثار آج بھی موجود ہیں چند رحوں صدی میں اندلس کی اسلامی ریاست کے زوال کے بعد فرقہ بندیوں نے قرطبہ کے محل سے ایک غسل خانہ اکھاڑا اور یہ غسل خانہ ملک از ایلہ کو تحفے میں دے دیا عباسی خلفاء کے دور میں بغداد سے لے کر سرقد تک درخت کاٹنے اور سڑکوں پر گند پھیلانے کی سزاؤں کوڑے ہوتی تھی اور مجرم کو اس سزا کے بعد شہر میں سوارخت بھی لگنا پڑتے تھے اور دس دن تک سڑک پر جھانڈو بھی دینا پڑتا تھا اور اسیر تیمور کے دور میں سرقد دنیا کا صاف ترین شہر تھا یہ وہ ادوار تھے جب یورپ اپنے بدترین دور سے گزر رہا تھا 'لندن میں فحشوں تک کیچڑ اور لید ہوتی تھی اور دنیا کا کوئی فاتح اس گندے جزیرے پر پاؤں تک رکھنا پسند نہیں کرتا تھا لیکن پھر یورپ جاگا اور اس نے عیسویں کی ترقی اور صفائی کا ایک دوسرے سے انگوٹھی اور تکیے کا تعلق ہے اور جب تک کوئی قوم صفائی کو اپنا پورا ایمان نہیں بناتی اس وقت تک وہ ترقی یافتہ اقوام کی فہرست میں شامل نہیں ہو سکتی لہذا یورپ نے اسلام کے فلسفہ صفائی کو قانون بنا دیا جس کے نتیجے میں یورپ ترقی کے اس مقام پر چلا گیا جو اس وقت پورے عالم اسلام کی خواہش ہے آپ آج دنیا کی تمام ترقی یافتہ اقوام کا دورہ کر لیں آپ کو ان سب میں ایک چیز مشترک ملے گی اور وہ چیز ہوگی صفائی اسی طرح آپ دنیا کے تمام پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ممالک میں بھی جا کر دیکھ لیں آپ کو وہاں بھی ایک چیز مشترک نظر آئے گی اور وہ چیز ہوگی گندگی آپ کو تمام پسماندہ ممالک کی گلیاں بازار سڑکیں اور گھر گندے ملیں گے آپ کو وہاں بد بو گڑ غبار اور کچرے طے گا اور بد قسمتی سے آج پورا عالم اسلام بد بو اور پسماندگی کا دار الحکومت ہے 'گندگی کے اس دار الحکومت میں عیس صرف ملائیشیا مختلف نظراً تا ہے ملائیشیا کی ترقی کا آغاز بھی صفائی سے ہوا تھا 'مہاتیر محمد نے 1980ء میں صفائی کو قانون کی شکل دی تھی 1980ء میں ملائیشیا میں گند ڈالنے اور پھیلانے والوں کیلئے بھاری جرمانے طے کئے گئے تھے اور ان سزاؤں پر پورا پورا عملدرآمد ہوا تھا لہذا آج ملائیشیا اسلامی دنیا کا واحد ملک ہے جس میں آپ کو یورپی معیار کی صفائی اور ستھرائی ملتی ہے آپ کو کوالالمپور شہر میں فائینو سٹار ہوٹلوں کے معیار کے پبلک ٹوائلٹس ملتے ہیں اور آپ کو کسی شہر کی کسی



سڑک پر تنکا اور نشو وچر دکھائی نہیں دیتا۔

ملانیشیا کے مقابلے میں ہم اگر جناب شوکت عزیز کے پاکستان کا جائزہ لیں تو ہمیں اس ملک کی کوئی سڑک صاف ملتی ہے اور نہ ہی کوئی گلی کوئی محلہ آپ کراچی سے اسلام آباد تک دیکھ لیں آپ کو یقین نہیں آئے گا یہ اسی شوکت عزیز صاحب کا ملک ہے جن کی زندگی کا بڑا حصہ دنیا کے ترقی یافتہ اور صاف ستھرے ملکوں میں گزرا تھا آپ کو یقین نہیں آئے گا یہ شوکت عزیز صاحب جیسے وزیراعظم کا ملک ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ میرا خیال ہے اس کی وجہ ہمارے وزیراعظم کی ترجیحات ہیں ان کی ترجیحات میں تمام چیزیں موجود ہیں لیکن ان میں صفائی کی کوئی گنجائش نہیں۔ وزیراعظم اس ملک کو ترقی یافتہ ملک دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ بھول جاتے ہیں ترقی صفائی کی "بائی پرائوٹ" ہوتی ہے اور جس ملک کے عوام گھر کا کچرا گلی میں پھینک رہے ہوں یا سگریٹ نشو اور بوتلیں سڑک پر پھینک رہے ہوں وہ ملک ترقی نہیں کر سکتا ملکوں کی ترقی نوٹلس باجہ روضہ اور کچرے کی نوکریوں سے شروع ہوتی ہے اور جو قومیں اپنی "ایش ٹرے" تک صاف نہیں کرتیں وہ ہمدرد دور میں داخل نہیں ہو سکتیں ہمارے وزیراعظم بھول جاتے ہیں امریکہ ہوسٹنگا پور ہو یا مہاتیر محمد کا ملائیشیا ترقی صفائی کے پیٹ سے جنم لیتی ہے اور جو قومیں صفائی کو اپنا ایمان نہیں بناتیں ترقی کبھی ان کا مقدر نہیں بنتی اور صفائی کے بغیر ترقی کا خواب دیکھنا نمک کی چٹان پر گنا آگاہنے کی خواہش سے مختلف نہیں۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com



## خواہشوں کا دن

24 ستمبر کو ہم ایسٹرن ٹائم سے پیرس روانہ ہوئے، مخدوم عباس گاڑی چلا رہے تھے، مخدوم صاحب بچے لاہور دیے ہیں، وہ تین برس قبل یورپ آئے اور انہوں نے سویڈن میں چادلوں کی پراسیڈنگ کا ریویوٹ لگایا، اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور ان کا کاروبار دنوں میں پورے یورپ میں پھیل گیا، وہ اس وقت یورپ میں تیزی سے ترقی کرنے والے پاکستانیوں میں شمار ہوتے ہیں، وہ مجھ سے ملنے کے لئے سویڈن سے ایسٹرن ٹائم شریف لائے تھے، ہم دونوں 24 ستمبر کی شام پیرس کے لئے روانہ ہوئے تھے، جب ہم پہنچے تو اچانک برادر طارقی بھیٹی کا فون آگیا، طارقی شریف بھیٹی گوجر خان کے رہنے والے ہیں، اٹلی میں ان کی ٹیلی کمیونیکیشن کی کمپنی ہے، ان کی کمپنی یورپ کے گیارہ ملکوں میں کام کرتی ہے اور اٹلی کی ٹیلی کمیونیکیشن انٹرنیٹ میں ان کا شیئر 35 فیصد ہے، انہوں نے پیرس میں جرائیں بیچنے سے عملی زندگی کا آغاز کیا تھا لیکن صرف 30 برس بعد وہ نہ صرف یورپ کے خوشحال ترین پاکستانی ہیں بلکہ اٹلی کے صدر ملک ان کے نام اور کام سے واقف ہیں، پاکستان میں صدر پرویز مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز کے ساتھ ان کے دیرینہ مراسم ہیں، طارقی بھیٹی کی آواز میں پریشانی تھی، ان کا کہنا تھا پاکستان میں دوپہر سے مختلف افواہیں گردش کر رہی ہیں۔ بعض لوگ کہہ رہے ہیں امریکہ میں صدر پرویز مشرف کو ہارٹ ایٹک ہو گیا ہے، چند لوگوں کا کہنا ہے پاکستان میں فوج کے جوئیئر افسروں نے حکومت کا تختہ الٹ دیا ہے، بعض لوگ دعویٰ کر رہے ہیں صدر مشرف نے وزیراعظم شوکت عزیز کی حکومت معطل کر دی ہے اور ان کی جگہ سید مشاہد حسین کو وزیراعظم بنا دیا ہے اور بعض لوگ کہہ رہے ہیں چوہدری شجاعت حسین کی طبیعت خراب ہو گئی ہے اور شوکت عزیز نے مسلم لیگ ق کے صدر کا عہدہ بھی سنبھال لیا ہے، دہلیہ آپ مہربانی فرما کر پاکستان فون کریں اور حالات کا جائزہ لیں، میں نے فوری طور پر پاکستان میں مختلف دوستوں سے رابطے کے واسطے معلوم ہوا ساری اطلاعات محض افواہیں، خدشات اور خواہشیں ہیں، اصل واقعہ بجلی کا طویل بریک ڈاؤن ہے، پاکستان کی تاریخ میں بجلی بارگراچی سے لنڈی کوتل تک بجلی بند ہوئی ہے اور واپٹا بریک ڈاؤن کی اصل وجوہات تلاش نہیں کر سکا، یہ بریک ڈاؤن آہستہ آہستہ افواہوں کی شکل میں دھل گیا اور یہ افواہیں جوں جوں آگے بڑھیں لوگ ان میں اپنی اپنی خواہشیں اور اپنے اپنے خدشات شامل کرتے چلے گئے یہاں تک کہ حکومت



کے مخالفین نے مضامین خریدنا شروع کر دیں لیکن جوں ہی بجلی بحال ہوئی لوگوں کے ٹیلی ویژن آن ہوئے اور انہیں اپنے محبوب وزیراعظم کی زیارت نصیب ہوئی تو یہ افواہیں دم توڑنے لگیں یہاں تک کہ رات تک حالات پوری طرح حکومت کے ”قابو“ میں آ گئے۔ میں نے طارق علی کے تمام خدشات دور کر دیئے وہ مطمئن ہو گئے لیکن میں اور خمدوم عباس افواہوں کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔

ہمارے ملک میں افواہیں کیوں پیدا ہوتی ہیں اور لوگ ان افواہوں پر کیوں یقین کر لیتے ہیں لوگ صدر پرویز مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز کے مستقبل کے بارے میں خدشات کا کیوں شکار ہوتے ہیں اور لوگ معمولی معمولی افواہوں پر طواغی کی دکان کی طرف کیوں دوڑ پڑتے ہیں یہ سوال انتہائی اہم ہیں میرا خیال ہے اگر حکومت ان سوالوں پر غور کر لے اور اگر ہمارے حکمران ان وجوہات کا جائزہ لے لیں تو شاید مستقبل میں کبھی وہ وقت نہ آئے جب عوام صرف بڑے بڑے بڑے حجاج اخذ کرنا شروع کر دیں جب لوگ ٹیلی فون، ٹیلی ویژن اور موبائل سروس بند ہونے پر مضامین خریدنا اور تقسیم کرنا شروع کر دیں 24 ستمبر 2006ء کا دن ثابت کرتا ہے لوگ حکومت کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں اور چدرہ سولہ کروڑ لوگوں کے دلوں میں کہیں نہ کہیں حکومت کی تبدیلی کی خواہش موجود ہے اور حکومت بھی عوام کی اس خواہش سے آگاہ ہے لہذا وزیراعظم شوکت عزیز تک کو اپنی حکومت کی یقین دہانی کے لئے پورے میڈیا کے ساتھ یوٹیٹی سنور جانا پڑا اور بجلی کی بحالی کے بعد وزارت اطلاعات کو وزیراعظم شوکت عزیز کو ٹیلی ویژن سکرین پر پہنچانے کے لئے پوری طاقت صرف کرنا پڑی اور پنجاب حکومت کو اپنے ناظموں کو حکم دینا پڑا وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بتائیں حکومت اپنی جگہ قائم ہے اور جس کسی نے اس اطلاع پر شبیدہ ہونے کی کوشش کی اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے حکومت کی ہدایت پر ناظم اپنے گھروں اور دفتروں سے نکلے اور انہوں نے ”گھر بس روٹ لیول“ تک جا کر لوگوں کو حکومت کی یقین دہانی کرانی شروع کر دی میرے ایک دوست نے بتایا بعض ناظم وقاداری میں آئے آگے نکل گئے کہ انہوں نے رکشوں پر لاؤڈ سپیکر رکھ کر اعلان شروع کر دیئے ”حکومت اپنی جگہ قائم ہے لہذا عوام کو زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں“ میرے دوست کا کہنا تھا پنجاب کے ایک شہر میں ناظم صاحب نے مضامین کی تمام دکانوں پر پتالے لگوا دیئے تاکہ لوگ خوشی منانے کے لئے مضامین نہ خرید سکیں اس دن اپوزیشن کے تمام چھوٹے بڑے لیڈروں پر بھی غبر رکھی گئی لیکن سوال یہ ہے ایسا کیوں ہے؟ لوگ حکومت کی تبدیلی کیوں چاہتے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں حکومت اپنی تمام تر خوشحالی، مقدس اصلاحات اور کامیاب سفارتکاری کے باوجود عوام کی توقعات پر پورا نہیں اتر رہی کہیں ایسا تو نہیں جناب شوکت عزیز کی معاشی فتوحات عوام تک نہیں پہنچ پارہیں اور جناب صدر پرویز مشرف کی اعتدال پسندی اور عوام کے درمیان بھی کوئی ان دیکھی خلیج موجود ہو کہیں ایسا تو نہیں حکومت کی کاشت کردہ خوشحالی صرف ان کے اپنے گودام تک محدود ہو اور عوام کے لئے 1993ء، 1999ء اور 2006ء میں کوئی فرق نہ ہو کہیں ایسا تو نہیں عوام بے نظیر بھٹو، نواز شریف اور شوکت عزیز کی حکومت میں کوئی فرق محسوس نہ کرتے ہوں اور ان کے لئے تمام حکومتیں محض ناموں کی تبدیلی ہو اور کہیں ایسا تو نہیں لوگوں کی نظر میں جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف

میں کوئی فرق نہ ہوا سوچنے کی بات ہے 12 اکتوبر 1999ء کو جس صدر پرویز مشرف کے آنے پر لوگوں نے مظاہریناں تقسیم کی تھیں انہیں لوگوں نے 24 ستمبر 2006ء کو ان کے جانے کی افواہوں پر مظاہریناں خریدنا شروع کر دی تھیں اور وہ لوگ جو دو برس پہلے تک وزیراعظم شوکت عزیز کو مبارکبادیں دے رہے تھے وہ 24 ستمبر کو ان کے جانے کی افواہوں پر ایک دوسرے سے گھلے مل رہے تھے، کیوں؟ اس کیوں میں حکومت کی ساری کمزوریاں، ساری کوتاہیاں اور ساری غفلتیں پوشیدہ ہیں، یہ کیوں ثابت کرتا ہے لوگ حکومت کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں، یہ کیوں دھوئی کر رہا ہے حکومت کی کامیابیاں اور فتوحات لوگوں تک نہیں پہنچ پارہیں اور لوگ جس سے جان چھڑانے کے لئے گرم لوکی دعائیں کر رہے ہیں، لوگ ایک جیلر کی قید سے نکل کر دوسرے جیلر کی قید میں جانا چاہ رہے ہیں، یہ کیوں ثابت کرتا ہے کسی حکمران کی نیک نامی کیلئے صرف کتابیں، انٹرویوز، ٹیلی ویژن کے پروگرام، پریس بریفنگز، سیمینار، تالیاں اور عالمی اخبارات اور جرائد میں تصاویر کی اشاعت کافی نہیں ہوتی، حکمرانوں کی اصل کامیابی ان کے عوام ہوتے ہیں اور جب کسی ملک کے عوام اپنے حکمران سے خوش اور مطمئن ہوتے ہیں تو وہ معمولی واقعات کے بعد حلوایم کی طرف نہیں دوڑ پڑتے، یہ کیوں ثابت کرتا ہے اگر ملکوں پر اصلی لیڈروں کی اصلی حکومت ہو تو ملکوں میں ایسی افواہیں جنم نہیں لیتیں، یہ کیوں ثابت کرتا ہے 24 ستمبر کا دن صرف افواہوں کا دن نہیں تھا، یہ لوگوں کی خواہشوں کا دن بھی تھا، یہ لوگوں کی دعاؤں اور تمناؤں کا دن بھی تھا اور یہ کیوں ثابت کرتا ہے حکومت عوام کے دلوں میں اپنا احترام کھو چکی ہے اور عوام حکومت سے دور ہو چکے ہیں۔





## تم کافر لوگ

”سناپ سناپ“ یورپ پر ائم مسٹر از ڈونگ سم تھنک ”فلپ کی آواز میں حیرت بھی تھی اور اضطراب بھی میری انگلی ریٹوٹ کنٹرول پر رک گئی سانسے ٹپلی دپٹن سکرین پر وزیراعظم شوکت عزیز عوام میں مکمل رہے تھے لوگ عقیدت سے ان کے ہاتھ چوم رہے تھے ان کیلئے زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اور ان کے پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے جبکہ وزیراعظم مختلف سالوں کا دورہ کر رہے تھے وہ ریٹ لٹین چیک کر رہے تھے یوریوں اور تھیلوں سے والیں چاول چینی اور آٹا نکال نکال کر دیکھ رہے تھے اور دکا عماروں کو بھی چیزیں بیچنے پر ڈانٹ پلا رہے تھے میں نے ٹپلی دپٹن کا وایم ایو چا کر دیا تھوڑا سا سڑجھٹلی آواز میں انکشاف کر رہی تھی ”وزیراعظم اچانک اسلام آباد کے جی ٹاؤن فور کے اتوار بازار پہنچ گئے اور انہوں نے وہاں عوام کے مسائل کا جائزہ لینا شروع کر دیا وزیراعظم پروٹوکول کے بغیر اتوار بازار پہنچے ان کی گاڑی ٹریفک سکنلز پر کتی رہی وہ اتوار بازار میں پیدل چلتے رہے اور انہوں نے سخت گرمی بھس اور بھیڑ میں لوگوں سے ہاتھ ملایا اور بڑے تحمل سے ان کی گفتگو سنی“ میں نے دیکھا وزیراعظم کے ساتھ صحافیوں اور کیمرا مینوں کا پورا سکواڈ ہے اور وہ کیمروں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے ہیں فلپ بڑے غور سے یہ منظر دیکھ رہا تھا جبکہ میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کر رہا تھا مجھے وزیراعظم کے عوام میں ٹھٹھنے ملنے سے پہلے یہ منظر دیکھنے کی سعادت نصیب ہو گئی۔

وزیراعظم جناب شوکت عزیز سالوں کے درمیان ٹپل رہے تھے لوگ ان کے گرد دائرہ بنا کر چل رہے تھے جبکہ دکا عماران کے جلال سے کانپ رہے تھے فلپ نے میرے ہاتھ سے ریٹوٹ کنٹرول لے کر آواز بند کر دی اور مسکرا کر پوچھا ”وزیراعظم صاحب کیا کر رہے ہیں“ میں نے فخر سے جواب دیا ”وہ قیثوں کا جائزہ لے رہے ہیں وہ دیکھ رہے ہیں ان کے عوام کو معیاری اور سستی چیزیں مل رہی ہیں یا نہیں؟“ فلپ مسکرایا اور اس نے گردن اٹھا کر آگے پیچھے دیکھنا شروع کر دیا یہ فلپ کا مخصوص شائل ہے وہ جب بھی لمبی چوڑی بات کرنا چاہتا ہے تو وہ سڑ سڑ کی طرح گردن اٹھاتا ہے آگے پیچھے دیکھتا ہے اور اس کے بعد اس کی زبان کے سارے بند مکمل جاتے ہیں اس نے کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا اور چٹکتی ہوئی آواز میں بولا ”کیا اتوار بازار میں قیثوں کا جائزہ لینا

وزیراعظم کا کام ہوتا ہے۔ میں اس کی بات سمجھ گیا لہذا میں نے تقاضا سے جواب دیا۔ ”یہ ہماری اسلامی روایات ہیں ہمارے وزیراعظم خلفاء راشدین کی روایات پر عمل پیرا ہیں، وہ حضرت عمر فاروق کی طرح ہمیں بدل کر اپنی رعایا کے حالات جاننا چاہتے ہیں۔“ قلم نے تہتہ لگایا۔ ”ڈونٹ ٹیل می یہ وزراء اعظم کا کام نہیں ہوتا مہنگائی پر قابو پانا پر انس کنٹرول انسپکٹروں، میونسپل کارپوریشن کے عملے اور فوڈ اینڈ پیارمنٹ کی ذمہ داری ہوتی ہے وزیراعظم کا کام پالیسیاں بنانا اور ان پالیسیوں پر عملدرآمد کرنا ہوتا ہے ایک فوڈ کنٹرول انسپکٹر اور وزیراعظم میں فرق ہونا چاہیے اگر ہمارے ملک میں ٹوٹی پلیٹر ایسا کرنا تو شام سے پہلے اس کی حکومت ختم ہو جاتی۔“ مجھے قلم کی بات عجیب لگی، میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“ وہ بولا۔ ”ہم سمجھتے ہیں جب وزیراعظم سستے بازاروں کا جائزہ لے گا تو اس کا مطلب ہوگا برطانیہ کا فوڈ کنٹرول فوڈ پیارمنٹ صحیح کام نہیں کر رہا، اپوزیشن یہ ایسا اٹھائے گی اور ٹوٹی پلیٹر کی حکومت مل جائے گی۔“ مجھے ابھی تک اس کی بات سمجھ نہ آئی وہ میری ناگہی بھانپ گیا چنانچہ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”چند برس پہلے ٹوٹی پلیٹر نے اپنے چھوٹے بیٹے کیلئے نیوز کا بندوبست کیا تھا یہ بات کسی طرح پریس تک پہنچ گئی اس کے بعد اپوزیشن نے طوفان کھڑا کر دیا اپوزیشن کا کہنا تھا وزیراعظم کے گھر نیوز آ لے گا مطلب ہے سرکاری سکولوں کا نظام ٹھیک کام نہیں کر رہا چنانچہ لیبر پارٹی کو حکومت چھوڑ دینی چاہیے، ٹوٹی پلیٹر نے فوراً نیوز کو گھر سے نکالا اور عوام سے معافی مانگ کر جان چھڑائی۔“ میں اس کا نقطہ سمجھ گیا لہذا میں نے عرض کیا۔ ”ہماری اور برطانیہ کی حکومت میں بڑا فرق ہے ہماری حکومت ایک آئوٹریک سسٹم کے تحت چل رہی ہے سرکاری جماعت چودھری شجاعت حسین کے پاس ہے وہ پارٹی کے تمام امور احسن طریقے سے چلا رہے ہیں چنانچہ وزیراعظم کو پارٹی کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں، خارجیہ امور افغانستان کے ساتھ چھوٹی بڑی جہز ہیں، دہشت گردی، دانا آپریشن، پاک بھارت دوستی اور نواز شریف بے نظیر کے معاملات صدر کے پاس ہیں چنانچہ وزیراعظم کو ان معاملات کی طرف سے بھی مکمل اطمینان ہے ایم کیو ایم، پٹریاٹ، ملت پارٹی (سابق) منگور احمد، ڈو، حامد ناصر، چٹھہ اور مولانا فضل الرحمان کا چار ج نیب کے پاس ہے لہذا وزیراعظم کو ان کی طرف سے بھی پوری پوری تسلی ہے اور میڈیا کو اینجنسیاں ڈیل کر رہی ہیں چنانچہ وزیراعظم کو اس کی طرف سے کوئی خوف نہیں رہی معیشت، صنعت، تجارت، بجٹ اور تعلیم تو ہم یہ سارے نکھیرے پہلے ہی امریکہ کے حوالے کر چکے ہیں چنانچہ اب ہمارے وزیراعظم کے پاس وقت ہی وقت ہے یہ ان کی مہربانی اور خلوص ہے وہ یہ وقت عوام میں عمل بل کر گزار رہے ہیں اور وہ یہ وقت اپنی رعایا، اپنے لوگوں کو دے رہے ہیں۔“

قلم نے تہتہ لگایا۔ ”یا رتم لوگ، بہت عجیب ہو ہمارے لوگوں میں اگر وزیراعظم ٹیلی فون اٹکھینچے سے رابطہ کر لے وہ ڈاک خانے کا ریکارڈ چیک کر لے، وہ بازار سے چیز خرید کر داپس کر دے، وہ سرکاری ڈپنٹری کی بجائے مارکیٹ سے رو خرید لے اور وہ خرین سے اتر کر ٹیکسی لے لے تو اس کی حکومت خطرے میں پڑ جاتی ہے، اس کے لئے لوگوں کو مت دکھانا مشکل ہو جاتا ہے لیکن تم لوگ۔۔۔“ وہ خاموش ہو گیا، کمرے میں تھوڑی دیر خاموشی رہی، قلم نے سگریٹ سلگایا اور ایک لمبا سس لے کر بولا۔ ”اور یہ جو نیوز کا سٹریٹار بار اعلان کر رہی تھی وزیراعظم پروڈو کو



اور سکيورٹی کے بغیر اتوار بازار تشریف لے گئے ہیں اور ان کی گاڑی ہر سنگل پر رکتی رہی تھی“ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا، اس نے دوسرا کس لیا“ اس کا مطلب ہے پاکستان میں سربراہان مملکت ٹریفک روڈ کی پابندی نہیں کرتے اور وزیراعظم نے سنگلز پر رک کر نئی تاریخ رقم کر دی“ میں خاموش رہا، وہ بولا“پورے پورے امریکہ پورے مشرق بعید اور پورے مشرق وسطیٰ میں صدر سے لے کر عام شہری تک ہر شخص ٹریفک سنگل پر رکتا ہے وہاں اگر وزیراعظم اشارہ توڑ دے تو یہ میڈیا کی سب سے بڑی خبر ہوتی ہے لیکن تمہارے ملک میں وزیراعظم اشارے پر رک جائے تو یہ اطلاع ہاٹ نیوز بن جاتی ہے اور تم لوگ واقعی حیرت انگیز ہو“ وہ رکا“ اس نے ایک لمبا کس لیا اور اس کے بعد بس کر بولا“میں تم سے آخری سوال پوچھتا ہوں“ میں نے اثبات میں گردن ہلا دی، وہ بولا“تمہارے ملک میں بجلی چوری ہوتی ہے پانی چور نہروں کے نالے توڑ دیتے ہیں تمہاری دیکھو میں بارہ کی جگہ اٹھارہ سواریاں بٹھائی جاتی ہیں تمہارے میں جھڑول ہوتی ہے زکوٰۃ کی رقم خورد برد ہو جاتی ہے اور تمہارے استاد جشروں پر حاضری لگا کر سکولوں سے غائب ہو جاتے ہیں“ وہ رکا اور مسکرا کر بولا“میں ٹھیک کہہ رہا ہوں“ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا، اس نے پوچھا“تم بتاؤ تمہارے وزیراعظم سکولوں، زکوٰۃ کمیشنوں، تمہاروں، دیکھو اور بجلی کے دفتر میں کب چھاپے ماریں گے“ میری برداشت جواب دے گئی، میں نے اس کی طرف غصے سے دیکھا اور سختی سے جواب دیا“تم کافر لوگ بڑے متعصب ہو تم ہمیں ترقی کرتے نہیں دیکھ سکتے“ غلب نے قہقہہ لگایا اور اٹھ کر باہر چلا گیا۔



## نمک کی کان

بادشاہ کی عجیب عادت تھی، وہ صبح سویرے شیر خاص اور شاہی جام کو طلب کر لیتا تھا۔ جام بادشاہ کی گردن پر چادر لپیٹ کر اس کی حجامت بناتا اور شیر اسے عوام کی خوشحالی اور اس کے بلند ہوتے اقبال کی خوشخبری سناتا تھا۔ وہ بادشاہ کو بتاتا تھا حضور آپ کی فلاں پالیسی کی برکت سے ہمارے قارئین کیسے بڑے روز میں سوا طین ڈالر کا اضافہ ہو گیا، آپ نے سلیمان شاہ جیسا شاندار اور باصلاحیت شیر منتخب کیا اور اس شیر کی ان تھک محنت سے ہمیں تین بلین ڈالر کا مزید قرضہ مل گیا، آپ نے عمرایوب کا انتخاب فرمایا تھا اور اس نے جو ان کی مہربانی سے ہمارے چھٹی ہٹانے والے شیروں نے اربوں روپے کھائے اور انہوں نے نہایت ایمان داری سے اپنے منافع کا تیس لاکھ پارٹی کے فنڈ میں جمع کر دیا اور اب پارٹی بڑی آسانی سے اگلے الیکشنوں کا بوجھ اٹھا سکتی ہے اور حضور آپ کے پوئلکٹی شعوروں پر چھاپوں نے تو کمال کر دیا، اس وقت پوری دنیا میں ان کی دھوم مچی ہے۔ مجھے کل امریکہ، جاپان اور برطانیہ کے بادشاہوں نے فون کیا، وہ ہم سے چھاپوں کا ماڈل خریدنا چاہتے ہیں لیکن ہم نے فوراً معذرت کر لی، ہم نے احتیاطاً ملک کے چار صوبوں کے 18 پوئلکٹی شعور زشارٹ لسٹ کر لئے ہیں، ہم بہت جلد آپ کو ان شعور ز پر بھی چھاپے مارنے کی تکلیف دیں گے جس کے نتیجے میں پوری قوم آپ کی صلاحیتوں کی معترف ہو جائے گی اور حضور والا عوام دینی اور رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔ پورے ملک میں خوشحالی کے دریا بہہ رہے ہیں، لوگ جھولیاں اٹھا اٹھا کر آپ کو دعاؤں دے رہے ہیں، لوگوں کی فنی کس آمدنی میں اضافہ ہو چکا ہے اور جب سے محمد علی دہانی آپ کے شیر خاص بنے ہیں اس وقت سے لوگوں کو پیاس لگتی ہے، نہ بھوک اور نہ ہی مری اور 18 کروڑ لوگ صبح شام ایک دوسرے سے بھل گئے ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں اور دعا لیں ڈالتے ہیں۔

شیر خاص بادشاہ کو یہ اچھی خبریں سناتا رہتا، بادشاہ آرام اور سکون سے سنتا رہتا اور حجام پوری یک سوئی سے بادشاہ کی حجامت بناتا رہتا، یہ سلسلہ کئی ماہ تک چلا رہا تھا اب تک کہ حجام اس محنگو سے بھگ آ گیا اور اس نے کلمہ حق کہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز جب شیر خاص بادشاہ کو رپورٹ دے چکا تو حجام نے تپنی اور کنگھی ایک طرف رکھی اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا "حضور اگر جان کی امان پاؤں تو میں کلمہ حق کی جسارت کروں" بادشاہ نے رحم دلی کا ثبوت



دیتے ہوئے اسے اجازت دے دی، حجام نے عرض کیا ”شیر خاص بکواس کر رہا ہے، حکومت کی یہ ساری کامیابیاں اور کامرانیوں محل کی دیواروں تک محدود ہیں، عوام اس وقت ہنگامی، بے روزگاری، بے انصافی، لاقانونیت، بے بسی اور ستم ظریفی کی انتہا سے گزر رہے ہیں، ہماری پادروٹی لائین موٹی ہوتی جا رہی ہے، لوگوں کے پاس کھانے کیلئے روٹی، پینے کیلئے پانی اور پینے کیلئے کپڑا نہیں، ملک میں اہل ایمان کو سزائیں اور بے ایمانوں کو سرکاری عہدے مل رہے ہیں، ڈاکے، قتل اور فراڈ روز کا معمول بن چکے ہیں، سڑکیں کھنڈر ہو رہی ہیں اور قبرستانوں میں مارکیٹیں بن رہی ہیں، لوگ روٹی اور سالن کی ایک پلیٹ کے بدلے مہینہ مہینہ کام کرنے کیلئے تیار ہیں اور لوگ جمولیاں پھیلا پھیلا کر آپ اور آپ کی ٹیم کو بدعائنیں دے رہے ہیں اور آپ کے سارے شیر آپ کو غلط پورنٹس دیتے ہیں۔“

بادشاہ کا موڈ اچھا تھا لہذا وہ حجام کی بات چپ چاپ سنتا رہا، حجام خاموش ہوا تو بادشاہ نے بڑی شفقت سے اس کی پیچھے ٹھوگی، سرکاری فٹنی کو طلب کیا اور اسی وقت شیر خاص کو حجام اور حجام کو شیر بنا دیا اور اس کے بعد اسے حکم دیا آئندہ تم مجھے عوام کی صورت حال سے مطلع کیا کرو گے۔ حجام خوش ہو گیا۔

اس کے بعد نیا شیر خاص روزانہ بادشاہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتا اور لوگ حکومت کے بارے میں جو کچھ سوچتے ہیں وہ سب بادشاہ کے گوش گزار کر دیتا۔ شروع شروع میں حجام کی رپورٹیں بہت کڑی ہوتی تھیں لیکن پھر ان رپورٹوں میں خوشگوار تبدیلی آنے لگی، اب حجام کی رپورٹوں میں بھی عوام خوشحال ہونے لگے، قماروں کی پھینچ ریزرو میں اضافہ ہونے لگا، بے روزگاری، مہنگائی اور لاقانونیت میں کمی آنے لگی، عوام بادشاہ سے مطمئن ہونے لگے اور لوگ جمولیاں پھیلا پھیلا کر بادشاہ کیلئے دعائیں کرنے لگے۔ بادشاہ یہ تبدیلی نوٹ کرتا رہا، ایک دن جب حجام سب اچھا کی رپورٹ دے چکا تو بادشاہ نے سرکاری جلا دیا اور حجام کو دھوپ میں لٹا کر کوڑے مارنے کا حکم جاری کر دیا، حجام نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا ”حضور میری کیا خطا ہے؟“ بادشاہ جلال سے بولا ”او بد بخت انسان تمہیں شیر بنے ہوئے صرف ایک مہینہ گزرا ہے پہلے شیروں کو تو حالات ٹھیک کرنے میں سال چھ مہینے لگ جاتے تھے لیکن تم نے ایک ہی مہینے میں ملک کا مقدر بدل دیا“ حجام نے جان کی امان طلب کی اور اس کے بعد عرض کیا ”حضور میں ایک مہینہ پہلے بھی صحیح کہہ رہا تھا اور آج بھی صحیح بول رہا ہوں۔“ بادشاہ نے اسے فیسے سے دیکھا، حجام بولا ”حضور جب میں فقط ایک حجام تھا تو میں تیلی محلے میں رہتا تھا، وہاں بے روزگاری، لاقانونیت، غربت اور مہنگائی تھی اور میں روزانہ ان مسائل کا مشاہدہ کرتا تھا چنانچہ میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا لیکن جب آپ نے مجھے شیر خاص بنایا تو آپ نے مجھے مشرانگلوں میں گھر دے دیا اور میں تیلی محلے سے اٹھ کر محلات میں آ گیا۔ یہاں کے حالات بیکسر مختلف تھے۔ یہاں قانون بھی تھا، تحفظ بھی، روزگار بھی، ہسپتال اور ڈاکٹر بھی، شاہی سواری بھی اور سیکرٹ فنڈ بھی، میں دن رات اس ماحول میں رہنے لگا تو میں نے آپ کو بھی وہی کچھ بتانا شروع کر دیا جو میں دیکھ رہا تھا“ بادشاہ خاموشی سے سنتا رہا، حجام نے عرض کیا ”حضور اگر آپ عوام کی اصل صورت حال جاننا چاہتے ہیں تو آپ

”اوپر آپ انہیں رکشوں اور دیکھوں میں گھر بھجوائیں یہ لوگ آپ کو اس وقت محام کی اصل رپورٹیں دیں گے“ حجام خاموش ہو گیا۔

بادشاہ نے گستاخ حجام کے ساتھ کیا سلوک کیا، راوی اس مسئلے پر خاموش ہے لیکن حجام کی بات میں بہت وزن تھا۔ مجھے یہ واقعہ جناب عباس اطہر کا کالم پڑھ کر یاد آیا جناب عباس اطہر مجھ سمیت پاکستان کے بے شمار صحافیوں کے استاد ہیں انہوں نے اپنے گزشتہ کالم میں بڑا خوبصورت نکتہ اٹھایا، انہوں نے گورنر پنجاب جناب خالد مقبول کو محام کی اصل صورت حال بتانے کی ”جسارت“ کی۔ انہوں نے فرمایا، ہمارے حکمران، گورنر ہاؤسز کے سربراہانوں میں بیٹھ کر عام آدمی کی زندگی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہ لوگ زندگی کو کالے شیشوں کے پیچھے دیکھتے ہیں لہذا یہ لوگ اس ملک کے اصل انشوکو نہیں سمجھ سکتے، میں شاہ جی سے ذرا سا اختلاف کرتا ہوں، میرا خیال ہے اس میں ان سب چاروں کا کوئی قصور نہیں، یہ دراصل وہ لوگ ہیں جو تیس چالیس برس پہلے تیلی محلوں سے نکلے تھے اور اس کے بعد انہوں نے ان محلوں کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا چنانچہ یہ لوگ تیلی محلوں میں رہنے والے 95 فیصد لوگوں کے مسائل نہیں سمجھ سکتے خود سوچنے جس شخص نے چالیس برس اپنی جیب سے پیٹرول نہ ڈلوایا ہو، جس کے جوتے تک بیٹ مین پالش کرتے ہیں اور جس کی گاڑی کا اسے سی ان کی تعریف آدمی سے ایک گھنٹہ پہلے آن کر دیا جاتا ہو وہ زندگی کی حقیقتوں کا کیسے اوداک کرے گا، اسے کیسے معلوم ہوگا درد کیا ہوتا ہے، وہ اس باپ کا دکھ کیسے جانے گا جس کا بیٹا روزانہ ڈگریاں اٹھا کر گھر سے نکلتا ہے اور شام کو نا کام واپس لوٹ آتا ہے اسے کیا معلوم چیز کیا ہوتا ہے اور دس پرین کی ایک گولی اور اینٹی بائیوٹک کی ایک ڈبی کیلئے انسان کو زندگی کے کس کس طور سے گزرنا پڑتا ہے۔ اسے کیا معلوم فقیر کی تباہی ہوتی ہے اور انسان کو خودکشی تک لے جانے والے حالات کیسے ہوتے ہیں۔ شاہ جی کا کہنا ہے ان لوگوں نے غلط بینکس چن کر ہار لی ہیں جبکہ میرا خیال ہے ان لوگوں کی تو آنکھیں ہی نہیں ہیں۔ اللہ نے انہیں بینائی کی نعمت ہی سے نہیں نوازا یہ بے چشم اور بے رحم لوگ دیوار کے اس پار پیدا ہوتے ہیں جہاں ہر چیز بری اور روشن ہوتی ہے۔ جہاں ڈبل روٹی نہ ملے تو لوگ کیک کھا کر گزارا کر لیتے ہیں اور جن کے غریب ترین ہیرے بھی اپنی گاڑی پر آتے جاتے ہیں یہ ناواقف لوگ ہیں انہوں نے زندگی میں کبھی آنا نہیں خریدا چنانچہ یہ لوگ بھوک جیسے احساس ہی سے بے بہرہ ہیں اور یہ لوگ تک کی ایک ایسی کان میں رہتے ہیں جس میں داخل ہونے والے حجام بھی شام سے پہلے تک ہو جاتے ہیں۔





## بیٹھے منہ

انور مقصود پاکستان کے لچھے اداکار ہیں ان کا شمار پاکستان کے ان چند تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جو بیک وقت اچھے لکھاری اچھے مقرر اچھے کہیں اچھے اداکار اور اچھے انسان ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں ذوقِ فقرے بنانے کی صلاحیت بھی دے رکھی ہے لوگ جو بات جس کتاب میں لکھ کر نہیں کہہ پاتے انور مقصود وہ بات ایک فقرے میں بیان کر دیتے ہیں میں نے سنا تھا لفظوں کی دھار نکوار سے تیز ہوتی ہے لیکن مجھے انور مقصود کے علاوہ اردو میں کوئی ایسا لکھنے والا نہیں ملا جس کے لفظوں کی دھار بھی ہو اور یہ دھار واقعی نکوار سے تیز ہو دو ماہ پہلے مجھے انور مقصود صاحب کا ایک ٹیلی شوڈیکے کا اتفاق ہوا یہ شوچینی کے بارے میں تھا شو میں چینی منگی ہونے کی وجوہات پر گفتگو ہو رہی تھی انور مقصود نے بشری انصاری کو چینی بنا رکھا تھا انور صاحب چینی سے سوال کرتے تھے اور بشری انصاری جواب دیتی تھیں شو کے آخر میں انور مقصود نے چینی (بشری انصاری) سے پوچھا "آج کل آپ کہاں ہوتی ہیں" چینی ذرا سمسکرائی اور شرما کر بولی "کابینہ میں" یہ دو لفظ "کابینہ میں" ایک ایسی حقیقت ہیں جنہیں لکھتے ہوئے پچھلے تین ماہ سے بڑے بڑے صحافیوں کے ہاتھ کانپ رہے تھے لیکن یہ انور مقصود کا کمال تھا انہوں نے بشری انصاری کے منہ سے یہ دو لفظ کہلوائے اور ہم پھینک کر گھر چلے گئے اس دن سے ان دو لفظوں کا مزہ لے رہا ہوں۔

چینی کی حقیقت بہت دلچسپ ہے اس وقت پاکستان میں 75 شوگر ملیں آپریشنل ہیں ان میں سے 41 پنجاب 28 سندھ اور 6 صوبہ سرحد میں ہیں پنجاب کی 41 شوگر ملوں میں سے 20 سیاستدانوں کی ملکیت ہیں جبکہ 21 ملیں سیاستدانوں اور عیار جرنیلوں کے برٹس مین رشتے دار چلا رہے ہیں صوبہ سندھ کی 28 ملوں میں سے 6 سیاستدانوں 10 برٹس مینوں اور 12 سیاستدانوں کے رشتے داروں کے پاس ہیں جبکہ سرحد کی چھ شوگر ملوں میں سے 5 سیاستدانوں کی ملکیت ہیں ان ملوں کی تفصیل بہت دلچسپ ہے پنجاب کی شوگر ملوں میں سے 9 نواز شریف اور ان کے رشتے داروں کی ملکیت ہیں جبکہ دو ملیں مسلم لیگ ن کے اعلیٰ عہدیداروں کے پاس ہیں ان 11 ملوں میں سے 8 ملوں کے پچھلے دروازے حکومتی جماعت کے محکمے میں کھلتے ہیں پنجاب کی چار شوگر ملیں چودھری برادران کی ملکیت ہیں دو ملیں صنعت و پیداوار کے موجودہ وفاقی وزیر جہانگیر ترین کی ہیں ایک شوگر مل کے مالک وفاقی

وزیر تجارت ہمایوں اختر خاں ہیں اور ایک ایک شوگر مل ق لیگ کے ارکان قومی اسمبلی نصر اللہ دریشک اور انور علی چیسر کی ملکیت ہیں باقی 21 ملوں کے مالکان ہمارے جرنل ہیں اور ان کے نام تحریر کرنا اس وقت تقریباً ناممکن ہے بزنس لوں کے نام لکھنے کیلئے ہمیں ذرا سی آزادی اور تھوڑی سی فکری بلورت کا انتظار کرنا پڑے گا صوبہ سندھ کی پانچ ملیں آصف علی زرداری کی ملکیت ہیں یا وہ ان کے بڑے شیئر ہولڈر ہیں ایک مل ہینٹلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل راجہ پرویز اشرف کی ہے جبکہ باقی 22 ملوں کا ذکر بھی درست ممکن نہیں صوبہ سرحد کی کل 6 ملوں میں سے 5 ملیں سابق وفاقی وزیر عباس سر فراز کی ہیں عباس سر فراز آزاد سیاحان تھے لیکن وہ ان ملوں کی وجہ سے اب مسلم لیگ ق میں شامل ہو چکے ہیں ان 75 شوگر ملوں میں سے پنجاب کی 17 ملوں نے دسمبر 2005ء کے آخر میں "اتحاد قائم کیا" ان اتحادیوں کو قومی اسمبلی میں بیٹھنے ان پانچ بڑے جاگیرداروں نے سپورٹ کیا جو پاکستان کا 70 فیصد گنا اگاتے ہیں ان 17 ملوں نے 31 جنوری 2006ء تک 5 لاکھ 95 ہزار 177 ٹن چینی پیدا کی لیکن انہوں نے اس میں سے 3 لاکھ 63 ہزار 734 ٹن چینی گوداموں میں ذخیرہ کر دی اس ذخیرہ اندوزی کے رد عمل میں مارکیٹ میں چینی کی قیمت گئی ہوئی اور ملک میں چینی کا شدید بحران پیدا ہو گیا یہ بحران آنے والے دنوں میں اتنی شدت اختیار کر گیا کہ حکومت نیب کی مدد لینے پر مجبور ہو گئی نیب نے چینی کے بارے میں تحقیقات شروع کر دیں یہ تحقیقات چند دن چلی تو پتہ چلا اگر یہ تحقیقات جاری رہیں تو حکومت بھی نوٹ جائے گی اور ہینٹلز پارٹی کے ساتھ جاری ذیل میں بھی رخت پڑ جائے گا لہذا نیب نے انکو اٹری سے معذرت کر لی یوں چینی کا مقدمہ ایک بار پھر وزیراعظم کی عدالت میں آ گیا وزیراعظم اپنے اختیارات کے دائرے میں رہ کر مختلف اوقات میں مختلف پالیسیاں بناتے اور بیانات جاری کرتے رہے لیکن چینی 40 روپے سے نیچے نہ آئی اس دوران حکومت نے باہر سے چینی درآمد کرنے کا اعلان بھی کیا لیکن یہ اعلان بھی کاغذوں میں دفن ہو کر رہ گیا حکومت نے اس دوران یونٹائی سنوروں پر سستی چینی فراہم کرنا شروع کر دی لیکن عوام کی ایسی لمبی قطاروں سے حکومت کا سافٹ ایج متاثر ہونے لگا وزیراعظم نے یونٹائی سنوروں پر "چھاپہ سکیم" بھی شروع کی لیکن ان کے چھاپوں سے بھی چینی نے سستا ہونے سے انکار کر دیا لہذا مجبوراً وزیراعظم نے 15 جون 2006ء کو اپنے جیسر میں پریس کانفرنس بلائی اور انہوں نے وہاں اعلان فرمایا "ہم نے پیکیوں کو ہدایت کر دی ہے وہ چینی کے ذخیرہ اندوزوں کو قرضے جاری نہ کریں اور ہم نے سی بی آر کو بھی شوگر ملوں کی ٹیکس ریٹرز کے سو فیصد معائنے کا حکم دے دیا ہے" وزیراعظم نے یہ اعلان فرمایا اور وزیراعظم ہاؤس واپس چلے گئے میں نے جب وزیراعظم کا یہ بیان پڑھا تو میرے اوپر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی میں نے پہلے نشو سے آنکھیں پونچھیں اور اس کے بعد تہتہ لگایا میرے ایک دوست میرے پاس بیٹھے تھے انہوں نے مجھ سے پوچھا "تم پہلے روئے اور اس کے بعد بیٹھے آخر ماجرا کیا ہے؟" میں نے عرض کیا "اے اللہ کے نیک بندے میری دلی خواہش تھی یہ حکومت کامیابی سے چلتی رہے لیکن جب میں نے وزیراعظم کا بیان پڑھا تو مجھے اپنی یہ خواہش خطرے میں محسوس ہوئی لہذا میری آنکھوں میں آنسو آ گئے" میرے دوست نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے بعد بولے "لیکن تم



بٹے کیوں تھے" میں نے ایک اور تہہ بولگایا اور نرم لہجے میں جواب دیا "مجھے محسوس ہوا وہ کام جس سے زیب نے بھی معذرت کر لی تھی اس کا بیڑا ہمارے وزیراعظم نے اٹھا لیا ہے وزیراعظم نے نہ صرف کابینہ میں ہنسی چینی کو پہنچا کر دیا ہے بلکہ انہوں نے اپنی حکومت کے چینی سے بنے ستون بھی ڈھانے کا فیصلہ کر لیا ہے" میں وزیراعظم سے اسی جرأت اور اسی غرور میں کی توقع رکھتا تھا" مجھے ایک ایسا ہی قائد چاہیے تھا جو حالات کے سامنے دبے اور نہ ہی ہچکے میں نے جب ان کا یہ بیان پڑھا تو مجھے محسوس ہوا مجھے وہ قائد مل گیا ہے لہذا خوشی سے میری ہاتھیں کھل اٹھیں میرا دل چاہتا ہے" میں اب کئی میں کھڑا ہو جاؤں اور چلا چلا کر نعرے لگاؤں شوکت عزیز قدم بڑھاؤ ہم تمہارے ساتھ ہیں" میرے دوست نے تھوڑی دیر سوچا اور اس کے بعد مسکرا کر بولا "تمہاری بات درست ہے لیکن حکومت کی یہ چینی محض چینی نہیں یہ وہ مٹھی دلدل ہے جو ہر کلمہ حق کہنے والے کو نگل جائے گی" پچھلے ساٹھ برسوں میں ہمارا رونگ کلاس پرچم سے ایک نہیں ہوئی لیکن چینی وہ ایٹو ہے جس پر سول اور ملٹری بیورو کسی سے لے کر تمام سیاسی جماعتیں ایک ہیں اس معاملے میں سب کے منہ منھے ہیں اور ہر جو شخص ان کے منہ کڑوے کرنے کی کوشش کرے گا یہ لوگ مل کر اس کا اقتدار پھیکا کر دیں گے"



Kashif Azad @ OneUrdu.com

## پاکستان فیل سٹیٹ نہیں

میں نے کہا ”یہ سب بکو اس ہے“ پاکستان ناکام ریاست نہیں یہ ساری فہرست ہی دوغیر ہے“ اس نے سگریٹ کا نوٹا تیسری انگلی میں دبا یا مٹھی بند کی مٹھی منہ کے ساتھ لگائی اور ایک لمبا کش لیا“ میں نے کہا ”یہ میگزین فارن پالیسی اور یہ ادارہ فنڈ فار چیئرس دونوں بااعتماد ہیں“ ان کی رپورٹ بھی غلط ہے“ خدا کی پناہ پاکستان کا شمار دنیا کے تیزی سے ترقی کرنے والے ممالک میں ہوتا ہے“ یہ ایشیا کے ان پانچ ممالک میں شامل ہے جن کی معیشت جیٹ پی پیڈ سے آگے بڑھ رہی ہے لیکن فارن پالیسی میگزین ناکام ریاستوں کی فہرست میں پاکستان کو 34 سے نویں درجے پر لے آیا ہے اور فنڈ فار چیئرس کا کہنا ہے سوڈان دنیا کی ناکام ترین ریاست ہے جبکہ کانگو آئندہ ری کوئٹ ”مراق“ ”زمبابوے“ ”چاڈ“ ”صومالیہ“ ”بنی“ پاکستان اور افغانستان اس کے بعد آتے ہیں“ آج کے دور میں اس سے بڑا جھوٹ کیا ہوگا“

وہ کش لگا تا رہا اور میری بات بڑے غور سے سنتا رہا“ وہ فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا“ میں اسے ہمیشہ کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دیتا ہوں لیکن اس کا کہنا ہے وہ کبھی دس لمحوں سے زمین پر بیٹھتا آ رہا ہے چنانچہ وہ کرسی پر ”ایڑی فل“ نہیں کرتا“ اسے زمین پر بیٹھ کر سکون اور آرام ملتا ہے اس نے اس سلسلے میں اتنی دلیلیں دیں کہ میں نے اسے کرسی کی دعوت دینا بند کر دی“ وہ اب آتا ہے، سامنے فرش پر اکڑوں بیٹھ جاتا ہے“ تیسری انگلی میں سگریٹ لگاتا ہے اور غور سے میری باتیں سننے لگتا ہے۔

میں نے اس سے کہا ”تم گاڑیاں دیکھو پچھلے سات سال میں پاکستان میں گاڑیوں کی تعداد میں چار گنا اضافہ ہوا“ پاکستان کی سڑکوں پر چلنے والی نوے فیصد گاڑیاں نئی ہیں“ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس میں گاڑیاں ”بلنک“ میں ملتی ہیں“ گاڑی کی قیمت بارہ لاکھ ہے لیکن جب آپ گاڑی خریدنے جاتے ہیں تو آپ کو یہ گاڑی ساڑھے تیرہ لاکھ روپے میں ملتی ہے“ پاکستان میں گاڑیاں بنانے والی 4 کمپنیوں کے پاس لوگوں کے 22 ارب روپے الیہ وائس جمع ہیں۔ پاکستان میں ایک ماہ میں 93 کروڑ الٹری گاڑیاں اپورٹ ہوئی ہیں اور پاکستان کا شمار ان ملکوں میں ہوتا ہے جو ہنگی گاڑیوں کی بڑی مارکیٹ ہیں لیکن فارن پالیسی اور فنڈ فار چیئرس کا خیال ہے پاکستان



ایک ناکام ریاست ہے، ہونی اٹا، وہ چپ چاپ کش لگا تا رہا، میں نے کہا "پاکستان میں پچھلے سات برسوں میں بے تحاشا خوشحالی آئی پاکستان کے 8 شہروں میں غیر ملکی ریستوران کھلے پاکستان میں ہر گھر اور فرینڈ چکن کی کپنیاں آ رہی ہیں دنیا کے بڑے بڑے برانڈز پاکستان آنے لگے ہیں لاہور اور اسلام آباد میں دو دو تین تین لاکھ روپے کے سوٹ بک رہے ہیں، میکا، لڑکی بڑا نہیں کھل رہی ہیں، ہائی راتر بلڈنگز بن رہی ہیں، اربوں ڈالری ہاؤسنگ سکیمیں شروع ہو رہی ہیں، گوادر کے نام سے پاکستان میں دھنی بن رہا ہے، شہروں میں سڑکیں بن رہی ہیں، انیس لکھ رہی ہیں، انڈر پاس اور فلائی اور بن رہے ہیں، پورا پاکستان تیزی سے موٹرویز سے منسلک ہو رہا ہے، سینٹ پاکستان کی سب سے بڑی انٹرنیٹ بین چکا ہے، پاکستان اور بھارت مشترکہ فلم ساز کی پر تیار ہیں، پاکستانی سینماؤں میں بھارتی فلمیں چل رہی ہیں، سات سال میں 27 نئے ٹیلی ویژن چینل کھلے ہیں، ہر شہر میں ایک ایم ویو ہیں، خواتین نے جینز پہننا اور اپنی مرضی سے شادیاں کرنا شروع کر دی ہیں، ختاراں مائی پوری دنیا میں ٹیسٹ گیسٹ کا پروفو کوئلے رہی ہیں، ریستورانوں میں شراب سروس ہو رہی ہے اور ناچ گانا ہمارے معاشرے کا حصہ بن چکا ہے، ہر گھر میں کیبل کے ذریعے موسیو پیسل، کیچے جاتے ہیں، ڈاکٹر عطاء الرحمن پورے ملک میں پی ایچ ڈی کا سیلاب لے آئے ہیں، ملک میں سی یو ایو سٹڈیاں، کالج اور سکول کھل رہے ہیں، ملک بھر میں پھولوں کے میلے اور تصویروں کی نمائش ہوتی ہیں، خواتین آگے آ رہی ہیں اور مرد پیچھے جا رہے ہیں، فری اینڈ فیئر ایکشن ہو رہے ہیں اور ملک بھر میں سیاسی سرگرمیوں پر کسی قسم کی کوئی قدغن نہیں لیکن ہم مغرب کا تعصب دیکھو اتنی ترقی کے باوجود فاران پالیسی اور فنڈ فار ٹریس جیسے ادارے پاکستان کو ناکام ریاست قرار دے رہے ہیں، "کش لگا تا رہا، میں نے کہا" صدر بنیں اور کنڈولیز اور انس تک صدر شرف کی جمہوریت نوازی کی تعریف فرما چکی ہیں، نوٹی پلیئر اور من مومن سنگھ تک پاکستان کے جمہوری مستقبل سے مطمئن ہیں، پاکستان کے جمہوری ادارے مضبوط سے مضبوط تر ہو رہے ہیں، ایکشن کمیشن فیئر اینڈ فری الیکشن کی تیاری کر رہا ہے، حکومت عوام دوست بجٹ تیار کر رہی ہے، انسانی سنگٹ رک چکی ہے اور پچھلے چھ سات برسوں میں حکومت نے آنکھ لاکھو جو انوں کو نوکریاں دی ہیں، چینی اور سینٹ کی قیمتیں گر رہی ہیں اور حکومت کی برڈ فلو سکیم سے پاکستان میں مہر فی کا گوشت سستا ہو چکا ہے، یہ حقیقت ہے والہیں اسی نوے روپے کلو بک رہی ہیں لیکن یہ یورپ اور امریکہ سے سستی ہیں، پٹرول، گیس اور بجلی مہنگی ہو رہی ہے لیکن یہ بھی ترقی اور خوشحالی کی علامت ہیں چنانچہ جس ملک میں لوگ مہنگا پٹرول انورڈ کر لیتے ہیں اس کا مطلب ہوتا ہے اس ملک کے لوگوں کی قوت خرید بہتر ہے۔"

اس نے سگریٹ کا ٹوٹا بجھا، پافرش پر پھینکا اور اسے جو سے رگڑ کر بولا، "جناب میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں، اس میں کوئی شک نہیں، جہاں ملک ترقی کر رہا ہے، ہم ایک کامیاب ریاست ہیں لیکن یہ بتاؤ کیا ملک کے 80 فیصد عوام کی انصاف تک رسائی ہے؟ کیا لوگ عدالت جانے سے نہیں گھبراتے؟ کیا یہ دنیا کا واحد ملک نہیں جس میں جب تک مقتول کی جائیداد نہیں بک جاتی اس وقت تک اس کا مقدمہ جج کی میرٹ تک نہیں پہنچتا؟"

کیا اس ملک میں تحفظ، امان اور انصاف کے لئے آپ کے پاس پیسے نہیں ہونے چاہئیں؟ کیا اس ملک میں اب زندہ رہنے کے لئے آپ کو منزل و اثر نہیں پناہ پڑتا اور کیا یہ پانی اس ملک کے صرف تین فیصد لوگوں کو دستیاب نہیں؟ کیا اس ملک میں جب تک آپ کے گیٹ پر گارڈ نہ کھڑا ہو آپ سکون کی نیند نہیں لے سکتے؟ کیا اس ملک میں پولیس بڑے لوگوں کی پولیس نہیں بن چکی؟ کیا اس ملک میں روزانہ 800 لوگ قتل نہیں ہوتے؟ کیا اس ملک میں ڈاکے فیشن نہیں بن چکے اور کیا یہاں اغواء برائے تاوان معمول نہیں کیا کراچی کے صنعت کار اور تاجر اغواء کے خوف سے روٹنی شفت نہیں ہو رہے کیا۔ اس ملک میں ملل کداس کے ہاتھ سے تعلیم نہیں نکل چکی؟ کیا حکومت نے بنیادی تعلیم تک پرائیویٹ نر نہیں کر دی اور تم بتاؤ میری بیٹی نے بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی لیکن میں اسے کالج میں داخل نہیں کرا سکتا کیوں؟ کیونکہ میرے پاس فیس کے پیسے نہیں ہیں؟ پوری دنیا میں تعلیم، صحت، انصاف اور تحفظ بنیادی ضرورتیں ہیں لیکن کیا اس ملک میں یہ چاروں بنیادی ضرورتیں عوام کے پاس ہیں؟ کیا یہ سچ نہیں اس ملک میں جسے تحفظ چاہیے وہ اپنا گارڈ رکھتا ہے جسے انصاف چاہئے وہ اپنا مکان اور اپنی دکان بچتا ہے اور یہ پیسے وکیل کے حوالے کرتا ہے وہ مقدمہ دائر کرتا ہے اور اس کے بعد روزمرہ روز بچتا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں اس ملک میں جسے دوا چاہیے وہ ڈاکٹر کو فیس دے اور بازار سے دس ہزار روپے کی دوائیں خرید لے اور جس کے بچوں کو تعلیم چاہیے وہ گردے سچ کر بچوں کو سکول میں داخل کرائے؟ کیا یہ سچ نہیں اس ملک میں بے روزگاری کا یہ عالم ہے پولیس جس ڈاکو جس قاتل کو پکارتی ہے اس کی عمر جس سے تین برس کے درمیان آتی ہے؟ کیا یہ سچ نہیں پاکستان میں دنیا میں سب سے زیادہ ایکسپنڈ ہوتے ہیں اور اس ملک میں ضروریات زندگی اوسط آمدنی سے ساڑھے تین گنا مہنگی ہیں لہذا اگر ان تمام حقائق کو دیکھا جائے تو ہم اپنے ملک کو اتنا زیادہ کامیاب بھی قرار نہیں دے سکتے؟ یہ درست ہے ہم ترقی کر رہے ہیں لیکن کون لوگ ترقی کر رہے ہیں؟ دو لوگ جو کروڑ پتی ہیں، کیا یہ سچ نہیں کروڑ والا کروڑ سے کروڑ کمارہا ہے لیکن ہزاروں اور لاکھوں والے روز بروز غریب ہو رہے ہیں یہ ہے حقائق کا دوسرا رخ۔

وہ خاموش ہو گیا مجھے خصلہ آ گیا اور میں نے چلا کر کہا "اس کا مطلب ہے تم بھی پاکستان کو ملل سٹیٹ سمجھتے ہو؟" اس نے فوراً انکار میں سر ہلا دیا "نہیں پاکستان ملل سٹیٹ نہیں لیکن اس کا نظام ملل ہو چکا ہے کیونکہ یہ سسٹم اپنے شہریوں کو روزگار دے رہا ہے اور نہ ہی احترام مجھے خطرہ ہے اگر ہم نے یہ سسٹم نہ بدلاتو کہیں خدا خواست فنڈ فارمیں اور فارمن پالیسی جیسے اداروں کے خدشات درست ثابت نہ ہو جائیں؟ کہیں ہم حقیقت مار نہ کھا جائیں۔" مجھے اس کی بات سے اتفاق نہیں تھا لہذا میں غصے سے باہر نکل گیا۔





## قبر تک

یہ وزیراعظم شوکت عزیز کی کابینہ کے ایک اجلاس کا سنہرے اجلاس کے دوران وزیر مملکت اسحاق خان خاگوانی نے اپنی فائل سے ایک ٹینڈر نوٹس نکالا اور وزیراعظم کی خدمت میں پیش کر دیا، وزیراعظم نوٹس دیکھ کر حیران رہ گئے، یہ پاسکو کی انتظامیہ کی طرف سے جاری کردہ نوٹس تھا جس میں پاسکو نے 50 گزٹری گاڑیاں خریدنے کیلئے ٹینڈر طلب کئے گئے تھے، ان گاڑیوں میں بی ایم ڈبلیو، لینڈ کروزر، ٹویٹا ہائی کس، پراڈو اور ٹویٹا کرولا شامل تھیں، پاسکو یہ گاڑیاں اسلام آباد میں اپنے افسروں کیلئے خریدنا چاہتا تھا، اسحاق خان خاگوانی نے وزیراعظم سے عرض کیا "پاکستان کا کوئی سرکاری افسر وزیراعظم کی اجازت کے بغیر قیمتی گاڑیاں نہیں خرید سکتا لیکن پاسکو کی انتظامیہ نے نہ صرف گاڑیاں خریدنے کا فیصلہ کر لیا بلکہ وزیراعظم کی اجازت کے بغیر اخبارات میں ٹینڈر بھی چھپا دیے" اسحاق خان خاگوانی نے اس کے بعد با آواز بلند ٹینڈر نوٹس پڑھا، نوٹس سننے کے بعد تمام وزراء ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، وزیراعظم نے ذرا عت کے وفاقی وزیر سکندر یونس کی طرف دیکھا اور ان سے پوچھا "کیا پاسکو نے آپ سے ان گاڑیوں کیلئے اجازت لی تھی" سکندر یونس نے بے چارگی سے جواب دیا "پاسکو کے سربراہ ایک فوجی جرنل ہیں اور میں انہیں گاڑیاں خریدنے سے نہیں روک سکتا" سکندر یونس کے اس جواب کے بعد وزیراعظم نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے یہ ٹینڈر نوٹس منسوخ کر دیا۔

آج اس واقعے کو سات دن گزر چکے ہیں لیکن ابھی تک کسی طرف سے اس واقعے کی کوئی وضاحت آئی اور نہ ہی کسی نے اس کی تردید کی، ابھی تک کسی اتھارٹی نے اس خلاف ورزی کی انکوائری کی اور نہ ہی کسی نے کسی سے وضاحت طلب کی لہذا یہ شعوری بھی بے شمار دوسری کہانیوں کی طرح ہے جس کے قبرستان میں دفن ہو گئی، میری گزشتہ روز روف کلاسز سے بات ہو رہی تھی روف کلاسز پاسکو کی فوجی قیادت کو اس کا قصور وار ٹھہرا رہا تھا جبکہ میرا خیال اس سے یکسر مختلف تھا، میں نے اس سے کہا "قیمتی اور آرام دہ گاڑیاں ایک ایسا حمام ہے جس میں حکومت کے زیادہ تر عہدیدار اور وزراء ننگے ہیں، بیکر ٹریوں سے لے کر وزیراعظم تک اس ملک کی تمام مقتدر ہستیاں اس دلدل میں اس قدر ڈھنس چکی ہیں کہ ان میں اب کسی دوسرے ٹکے کے اعتبار کی جرأت اور ہمت نہیں رہی، روف



کلاسز نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا لیکن میں ڈنکار ہائیں نے اسے بتایا پچھلے سال اخبارات میں ان گاڑیوں کے بارے میں خبریں شائع ہوئیں جو حکومت نے دی دی آئی چیز کے لئے باہر سے 60 بلٹ پروف گاڑیاں منگوائی تھیں، ان میں سے ہر گاڑی کی قیمت 7 کروڑ روپے تھی اور ان میں دو تین ایسی کیوزین بھی شامل تھیں جن کی فی کس قیمت سولہ کروڑ تھی، حکومت نے 20 گاڑیاں کنسل کر دیں لیکن چالیس گاڑیاں آئیں اور یہ گاڑیاں اب دی دی آئی چیز کے زیر استعمال ہیں، حکومت نے ان گاڑیوں کے ٹکس کی مد میں خزانے کو 70 کروڑ روپے کا نقصان پہنچایا۔ وزیراعظم صاحب نے اپنے لئے دو نئے جہازوں کا بھی آرڈر دیا تھا، ان میں سے ایک جہاز پاکستان آچکا ہے اور وزیراعظم اس میں باقاعدہ سفر کر رہے ہیں جبکہ دوسری ایئر بس ابھی پاکستان نہیں پہنچی، پچھلے سال دی دی آئی بی جہاز کی مرمت پر 58 کروڑ روپے خرچ ہوئے تھے لہذا وزیراعظم کی دیکھا دیکھی دوسرے اعلیٰ عہدیداروں نے بھی اب دھڑا دھڑ بڑی گاڑیاں منگوانا شروع کر دی ہیں، پچھلے سال پتیکر قومی اسمبلی چوہدری امیر حسین نے ایک کروڑ تیس لاکھ کی نئی سرسبز خریدی تھی، جب میڈیا نے اس پر شور کیا تو انہوں نے اس سرسبز کے ساتھ ساتھ 90 لاکھ کی دو لینڈ کروزر بھی خرید لیں۔ اس وقت ہماری کابینہ کے 17 وزراء کے پاس بڑی گاڑیاں ہیں۔ تمام وزراء گاڑیوں کے پورے پورے فلیٹ کے ساتھ سفر کرتے ہیں، ان کے ساتھ پولیس کی سیکورٹی جیپ کے علاوہ ذاتی ٹائف کی گاڑیاں بھی ہوتی ہیں، صوبائی حکومتوں کی بھی یہی صورتحال ہے آپ چیف جسٹس کے پروٹوکول نکال کر دیکھ لیجئے، آپ صوبائی حکومتوں سے پوچھئے چار برسوں میں کس کس چیف جسٹس نے کون کون سی گاڑیاں خریدی ہیں اور ان کی قیمت کیا تھی، آپ حقائق جان کر حیران رہ جائیں گے، آپ افواج پاکستان کے چیف کو بھی دیکھ لیجئے آپ کو حیرت ہوگی ان سب کے پاس بھی نئی بلٹ پروف گاڑیاں ہیں اور وہ بھی پورے نو آبادیاتی پروٹوکول کے ساتھ سفر کر رہے ہیں، ان کے آگے بھی پچاس پچاس موٹر سائیکل اور ہونڈوالی گاڑیاں چلتی ہیں اور ان کے سیکورٹی گارڈز بھی سارے راستے اور سارے علاقے کو اپنے نرنے میں لے لیتے ہیں لیکن آپ دلچسپ صورتحال ملاحظہ کیجئے ان حضرات نے یہ گاڑیاں باقاعدہ تحریری اجازت سے منگوائی تھیں اور انہیں یہ اجازت وزیراعظم کے آفس سے دی گئی تھی لہذا کہنے کا مطلب ہے بڑی اور بلٹ پروف گاڑیاں اب باقاعدہ سیاسی کلچر بن چکی ہیں، ہمارے ملک کے ذمہ داروں میں اب سرکاری خزانے سے تنگی سے منگی گاڑیاں خریدنے کا باقاعدہ مقابلہ ہوتا ہے اور اس مقابلے میں شامل قریباً تمام لوگ جیت جاتے ہیں۔

میں نے رؤف کلاسز سے عرض کیا یہ مقابلہ صرف اعلیٰ مقتدرہ سٹیوں کے ایوانوں تک محدود نہیں بلکہ اب یہ ایوانوں سے نکل کر کارپوریشنوں، وزارتوں اور ڈویژن میں آچکا ہے اور جب مختلف محکموں کے چیئرمین، ڈی جی اور ایم ڈی اپنے وزراء کو پانچ پانچ کروڑ کی گاڑیوں میں گھومتے دیکھتے ہیں تو ان کے ارمان بھی اٹھ جائیں گے لگتے ہیں لہذا وہ بھی دی دی آئی بی جتنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں، پچھلے دنوں بحریہ ناؤن کے چیف ایگزیکٹو ملک ریاض حسین نے گیارہ کروڑ روپے کی دو دفرائس فیٹم منگوائی، میرے ایک مہربان رٹائرڈ جنرل صاحب کو پچہ چلا تو

انہوں نے مجھ سے فرمائش کی تم مجھے ملک ریاض سے دو گھنٹے کیلئے روٹروائرس لے کر دے سکتے ہو، میں نے عرض کیا "سر ان کے ساتھ میری بے تکلفی ابھی روٹروائرس کے دائرے میں داخل نہیں ہوئی، وہ خاموش ہو گئے، اس کے بعد میں نے ان سے احتیاطاً پوچھ لیا "سر آپ نے یہ گاڑی کیا کرنی ہے" انہوں نے قہقہہ لگا کر فرمایا "میرا ایک جونیئر افسر پرموٹ ہو گیا ہے، اس کے پاس سرکاری بی ایم ڈبلیو ہے، میں اسے مبارک باد دینے کیلئے روٹروائرس پر جانا چاہتا ہوں" جنرل صاحب کی یہ خواہش بظاہر منطقی محسوس ہوتی ہے لیکن فی زمانہ یہ بہت بڑی حقیقت ہے جب ملک کا سرکاری کالج بڑی گاڑیوں میں ڈھل چکا ہو تو پھر آپ کس کس کا ہاتھ روکیں گے، آپ کس کس کی خواہشوں کے راستے میں بند ہاندھیں گے۔ چینی کہاوت ہے مچھلی ہمیشہ اپنے سر سے گھٹنا شروع ہوتی ہے، اگر ہم ذرا سامغور کریں تو ہمیں معلوم ہوگا ہمارے ملک، ہمارے معاشرے کا سرگھل چکا ہے، ہمارے سیاسی ایوان بری طرح لرز رہے ہیں لیکن ہم ماننے کیلئے تیار نہیں ہیں، ارسطو سے سکندر اعظم نے پوچھا تھا "بابا پاکستان کب جاہ ہوتی ہیں" اس نے ہنس کر جواب دیا تھا "جب بادشاہ عوام کی انتہیوں کو اپنے دسترخوان پر سجانے لگیں" اگر ہم سوچیں تو بڑی گاڑیوں پر خرچ ہونے والی یہ رقم بھی بالآخر عوام کے پیٹ سے نکلتی ہے اور یہ اس ملک کے لوگوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے جس میں 34 فیصد لوگ خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہوں جس میں لوگ دو اور روٹی کے لئے گردے بچ رہے ہوں اور جس میں لوگ اپنی بیٹیاں نکال کر رہے ہوں آخر ہم نے بھی کبھی نہ کبھی مرنا ہے آخر ہم نے بھی کبھی نہ کبھی اپنے خدا کے سامنے پیش ہونا ہے لہذا مجھے سمجھ نہیں آتی ہم اپنے اللہ کے سامنے کون سا منہ لے کر جائیں گے اس میں کوئی شک نہیں گاڑی آج کی ضرورت ہے لیکن سرکاری خزانے سے خریدی گئی بڑی اور مہنگی گاڑیاں ضرورت نہیں ہوتی ہیں اور یہ حقیقت ہے ضرورت کبھی نہ کبھی پوری ہو جاتی ہے لیکن ہوس کا منہ قبر تک کھلا رہتا ہے۔



## بد قسمتی کا اونٹ

یہ تو معلوم نہیں وہ کون تھا، وہ کہاں رہتا تھا، وہ کیا کرتا تھا اور وہ کس جگہ دفن ہے لیکن اس شخص کا تخلیق کیا ہوا فقرہ شاید راقی دنیا تک قائم رہے، لوگ دنیا میں جب بھی بد نصیبی کا ذکر کریں گے تو وہ بے اختیار اس شخص کا فقرہ دہرائیں گے اس نے کہا تھا "بد نصیب انسان اونٹ پر بھی بیٹھا ہوتا ہے کتا کاٹ لیتا ہے"۔ شیخ عبدالحفیظ صاحب میرے بزرگ دوست ہیں، وہ علم نجوم اور رمل کے ماہر ہیں۔ وہ لوگوں کی قسمت کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں لہذا وہ اکثر کہتے ہیں "جب کسی انسان کی خوش نصیبی کا دور شروع ہوتا ہے تو اللہ اس کی خامیوں کو خوبیوں میں بدل دیتا ہے اور اس کی غلطیوں پر بھی پھل لگنے لگتا ہے لیکن جب کوئی شخص بد قسمتی کے بغیر میں داخل ہوتا ہے تو اس کی خوبیاں بھی خامیاں بن جاتی ہیں اور اس کی اچھائیوں پر بھی کانٹے آگ آتے ہیں" میں ہمیشہ ان کی اس آرزو پریشان سے اختلاف کرتا ہوں لیکن گزشتہ چند ماہ سے مجھے ان کی بات میں تھوڑی تھوڑی صداقت محسوس ہونے لگی ہے، میں دیکھتا تھا ہماری حکومت بڑے ہموار طریقے سے چل رہی تھی، اس کے سامنے کوئی چیلنج نہیں تھا، جناب شوکت عزیز دونوں ہاتھوں سے خزانہ بھر رہے تھے، جناب پرویز مشرف کی مقبولیت کا گراف انتہائی سرے کو چھو رہا تھا اور حکومت میں جو تھوڑی بہت خرابی تھی اس پر ہمارے نئے وزیر اطلاعات محمد علی درانی اپنی دروغ گوئی کا رنگ کر دیتے تھے وزیر اعلیٰ جناب پرویز الہی اور ان کے صاحبزادے پنجاب کی زمینوں اور پلاٹوں کو "پرائیٹائز" کر رہے تھے، لاہور ٹینک پولیس کے ایک ایس پی اور ان کے امریکہ پلٹ بھائی ڈیفنس ہاؤسنگ سکیم کی قیادت کو دونوں ہاتھ سے نواز رہے تھے اور اپوزیشن کے منصوبوں میں دراڑیں پڑ رہی تھیں لہذا حالات ہر لحاظ سے حکومت کے ہاتھ میں تھے لیکن پھر اچھائیوں پر کانٹے اگنا شروع ہو گئے اور چیزیں ایک ایک کر کے حکومت کے ہاتھ سے نکلنے لگیں، کراچی سٹیل ملز کا مسئلہ اٹھا اور لوگوں نے پہلی بار وزیراعظم شوکت عزیز کی معاشی دیانت کو چیلنج کر دیا، سٹیل ملز کا مقدمہ پیریم کورٹ تک پہنچا اور عدالت نے منج کاری کے عمل کو جائیداد نہ قرار دے دیا، اس کے بعد شاک ایکیس چیلنج کا معاملہ بیدار ہوا اور اس معاملے نے وزیراعظم کی ساری معاشی ٹیم کو اپنی پیٹ میں لے لیا اور وزیراعظم کے ساتھ ساتھ سلیمان شاہ جیسے بین الاقوامی ماہر بھی بدنام ہو گئے، ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ اچانک ایم کیو ایم روٹھ گئی



اور سندھ حکومت جاتی ہوئی دکھائی دینے لگی، حکومت وہاں سے نکلی تو مولانا فضل الرحمن آگے بڑھے اور وہ نواز شریف اور بے نظیر بھٹو کے ساتھ شامل ہو گئے، حکومت ابھی اس جھگڑے سے نہیں سنبھال پائی تھی کہ اپوزیشن نے تحریک عدم اعتماد پیش کر دی، اس سے پہلے بھارت میں فرینوں کے دھماکے ہوئے اور پاک بھارت مذاکرات قحط کا شکار ہو گئے، اسی دوران حکومت نے تحفظ حقوق نسواں بل پیش کر دیا اور مسلم لیگ (ق) تک کے ارکان نے اس کی مخالفت کر دی، حکومت ابھی بمشکل ان کا "سنت ترل" کر رہی تھی کہ اچانک ڈاکٹر عبدالقدیر کو کنفرس ہو گیا اور لوگوں نے حکومت کو مورہ الزام ٹھہرانا شروع کر دیا اور ابھی یہ خبریں جاری تھی کہ کوہلو کا واقعہ پیش آیا اور نواب اکبر خان کی قتل ہو گئے۔

یہ اوپر تلے پیش آنے والے واقعات بتاتے ہیں شاید حکومت کا وہ دور شروع ہو چکا ہے جس میں حکومتیں اونٹ پر چڑھ کر بھی بد قسمتی کے پنجوں اور جڑوں سے محفوظ نہیں رہتیں، آپ حکومت کی بد قسمتی کا انداز لگائیے نواب اکبر خان کی قتل کی ہلاکت کا واقعہ 27 اگست کے اخبارات میں شائع ہوا اور 28 اگست کو صدر صاحب مری میں سوئی گیس کا افتتاح کر رہے تھے، اس افتتاح پر ایک بلوچ سردار نے مجھے فون کیا اور دھکی آواز میں پوچھا "حکومت سوئی کے سردار کو قتل کر کے مری میں سوئی گیس کا افتتاح کر رہی ہے یہ لوگ ہمیں کیا پیغام دینا چاہتے ہیں" میں خاموش رہا لیکن اس کے بعد دیر تک سوچتا رہا حکومت نے مری میں سوئی گیس کے افتتاح کا پروگرام چار ماہ پہلے بنایا تھا اور یہ حقیقت ایک مثبت اور اچھا منصوبہ ہے لیکن آپ بد قسمتی ملاحظہ کیجئے حکومت کے اس ٹیک اور اچھے کام کے ساتھ بھی کائناتے لگ گئے، اس افتتاح سے لیکر دو دن پہلے نواب اکبر خان کی قتل کا ساتھ پیش آیا اور حکومت کیلئے بدنامی سنبھالنا مشکل ہو گئی اگر ہم بد قسمتی کی اس تھجوری کو ج مان لیں تو صاف محسوس ہوتا ہے حکومت اس خطرناک فیز میں داخل ہو چکی ہے جس میں کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے، کسی بھی وقت ایم کیو ایم حکومت سے الگ ہو سکتی ہے، ایم ایم اے بلوچستان حکومت سے علیحدگی کا اعلان کر سکتی ہے اور اپوزیشن پارٹیاں مل کر اسمبلیوں سے استغفہ دے سکتی ہیں جس کے بعد حکومت کا اونٹ بیٹھ جائے گا اور بد قسمتی کے جڑے اونٹ تک کو نگھ جائیں گے، میں ایم کیو ایم اور ایم ایم اے کے بارے میں شدید ضدشات کا شکار ہوں، یہ دونوں اپوزیشن کی جھاتیں ہیں لیکن یہ پچھلے چار برس سے اقتدار میں ہیں، ان چار برسوں میں ان کی کارکردگی زیادہ آئیڈیل نہیں رہی لہذا ان لوگوں کی کوشش ہوگی یہ الیکشن سے پہلے حکومت سے الگ ہو جائیں تاکہ یہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کو ایٹو بنا کر عوام سے ایک بار پھر روٹ لے سکیں۔

لوگوں کا ہم کا لم نویسوں کے بارے میں عمومی خیال ہوتا ہے ہم لوگ ایسے طیب ہیں جو تحقیق میں تو بہت ماہر ہوتے ہیں لیکن ان کے پاس مسئلے کا کوئی حل نہیں ہوتا، بعض لوگ کہتے ہیں ہم لوگ ماہر سرجن کی طرح مریض کا آپریشن تو کر لیتے ہیں لیکن ہمیں ٹانگے لگانے نہیں آتے، میں آج یہ الزام بھی دھودنا چاہتا ہوں، میں آج مریض کو ٹانگے لگا دیتا ہوں میں حکومت کے سامنے ایک ایسا حل رکھتا ہوں جس کے ذریعے وہ بد قسمتی کے

”کتوں“ سے بھی بچ جائے گی اور وہ اس ملک پر مزید دس چودہ برس تک برسرِ اقتدار بھی رہے گی اس مسئلے کے دو حل ہیں اول پرانے زمانے میں لوگ مشکل وقت لانے کیلئے کالے بکروں کی قربانی دیا کرتے تھے حکومت بھی یہ وقت لانے کیلئے ایک آدھ بکرے کی قربانی دے دے حکومت کی ساری بلائیں ٹل جائیں گی اگر حکومت کو چوٹس کا مسئلہ پیش آئے تو میں انہیں دس بارہ بکروں کی لہرست پیش کر سکتا ہوں حکومت ان میں سے اپنی مرضی کا بکرا پکڑے اور قربان کر کے جان چھڑائے دوسرا حل ڈاکٹر امجد پیر صاحب زکوڑی شریف اور ظفر بخٹاوری ہیں، یہ تینوں حضرات وزارتِ عظمیٰ کے بڑے شاندار امیدوار ہیں، اگر وزارتِ عظمیٰ کا بوجھ باری باری ان تینوں کے کندھوں پر لا دیا جائے تو میرا خیال ہے یہ لوگ نہ صرف مسائل کے سارے کتے بھاگادیں گے بلکہ حکومت کے اونٹ کو دوڑاتے دوڑاتے دانشمندان تک لے جائیں گے۔ مگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر حکومت کا دل علی آغا پر پوری طرح اعتماد کر سکتی ہے، آغا صاحب کو بھی اللہ تعالیٰ نے خود کو حالات کے مطابق ڈھالنے کا ٹھیک ٹھاک ملکہ دے رکھا ہے وہ گیا پنجاب تو اس کیلئے میں میاں عامر محمود کا نام پیش کروں گا، میاں صاحب جنرل صاحب کیلئے وہ کچھ کر سکتے ہیں جو ساری فوج مل کر نہیں کر سکتی۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com



## فلک

فرعون رامتیس دوم 1279 قبل مسیح میں مصر کا حکمران بنا اس وقت اس کی عمر صرف 20 سال تھی اس نے 66 برس دو ماہ تک مصر پر حکومت کی وہ ایک شاندار شخصیت کا وژنری انسان تھا اس نے مصری تہذیب کو اپنے نقطہ کمال تک پہنچا دیا اس نے پوری دنیا سے ماہرین فن جمع کئے اور ان ماہرین نے آنے والوں دنوں میں مصر کو تاریخ کی پہلی سپر پاور بنا دیا رامتیس نے نہ شینے والی روشنائی بنوائی اس نے نعثوں کو ہزاروں سال تک سلامت رکھنے والے کیمیکل ایجاد کرائے اس نے ہادل لانے اور برسانے والی ٹیکنالوجی حاصل کر لی اس نے ہواؤں کا رخ موڑنے اور موجوں کو پسپا کرنے کا فن سیکھ لیا اس نے ایک ایسی ٹیکنالوجی بنائی جس کی مدد سے مصری انجینئر بینکڑوں میں بھاری پتھر ہوا میں اٹھاتے تھے اور اس کے بعد ان پتھروں کو جوڑ کر اہرام بنا دیتے تھے اس کے پاس ستارہ شناسوں کا پورا سکواڈ تھا اس کے ستارہ شناس آسمان کی تبدیلیاں دیکھ کر آنے والے حالات بتا دیتے تھے اس نے دریائے نیل کے دونوں کناروں پر اناج اور بارش کا دیئے تھے جس کی وجہ سے مصر کے لوگ خوشحالی اور استحکام کی آخری حدیں چھونے لگے اس نے مصر میں درس گاہوں کا جال بچھا دیا تھا اس کے دور میں فلسفی اور دانشور عام تھے آج دنیا یونان کے جن فلسفیوں سائنس دانوں اور دانشوروں کو علم و فن کی بنیاد قرار دیتے ہیں ان تمام لوگوں نے مصریوں سے علم سیکھا تھا اور ان تمام علوم کا منبع رامتیس تھا اس نے دنیا کے بہترین چادوگر جمع کئے اور انہیں دربار میں اعلیٰ عہدے دے دیئے اس کے پاس دنیا کی بہترین فوج تھی اس کے پاس سونے اور چاندی کے پہاڑ تھے اور وہ ہوا ہرات جزیرے پر بتوں میں کھاتا تھا ان تمام کامیابیوں اور فتوحات نے رامتیس کا دماغ خراب کر دیا اور اس نے خود کو کائنات کا خدا (نعوذ باللہ) سمجھنا شروع کر دیا اس کا کہنا تھا دنیا کی تمام طاقتیں اس کے کنٹرول میں ہیں اور وہ چاہے تو ہواؤں کا رخ بھیر دے تو چاہے تو کنگوں کو بادشاہ بنا دے اور اگر وہ چاہے تو وہ بادشاہوں کو کنگا کر دے خدائی کے اسی زعم میں ایک "اس" نے اپنے نجومیوں سے پوچھا "ہمارے میری خدائی کب تک قائم رہے گی؟" نجومیوں نے سادوں کی چال پر بھی اور اس کے بعد عرض کیا "مضور بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا یہ بچہ آپ اور آپ کی خدائی کیلئے خضر ناک ثابت ہوگا" رامتیس نے اسی وقت حکم دیا "آج کے بعد بنی اسرائیل میں جو بھی بچہ پیدا ہوا اسے فوراً قتل کر دیا جائے" اس حکم کے بعد بنی اسرائیل کے بچوں کا قتل شروع ہو گیا یہاں سے حضرت موسیٰ اور فرعون کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

فرعون رات گیسس ۱۲۱۳ قبل مسیح میں حضرت موسیٰ کا پیچھا کرتا ہوا دریائے نیل میں ڈوب کر مر گیا۔ لیکن قدرت نے اس کی نعش کیلئے محفوظ کر دی رات گیسس کی نعش آج بھی قاہرہ کے میوزیم میں رکھی ہے اس کے منہ میں ایک چھوٹی سی نگلی ہے اور اس نگلی کے ذریعے اس کے منہ میں قطرہ قطرہ پانی ٹپکا جاتا ہے اور اس کے ناخن مسلسل بڑھتے رہتے ہیں جنہیں دو تین ماہ بعد باقاعدہ تراشا جاتا ہے اس سارے عمل میں اللہ تعالیٰ کی کیا حکمت ہے اس پر کوئی عالم دین اسی روشنی ڈال سکتا ہے۔ سرحد دست ام 3285 برس بعد آج کے زمانے میں بیٹے کر فرعون کے اس نفسیاتی خوف کا تجربہ کرتے ہیں جس نے اسے بنی اسرائیل کے بچے قتل کرانے پر مجبور کر دیا تھا آج ہم فرعون کے احکامات کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے فرعون کو بظاہر اس بے وقوفی کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس کی کرسی مضبوط تھی اپوزیشن کا کوئی وجود نہ تھا عوام خوشحال تھے اور علم و ادب میں پوری دنیا میں مصر کا کوئی ثانی نہیں تھا لہذا اگر فرعون قدرت کے نظام سے چھپر بھارت کرنا تو اس کی حکومت اسی طرح چلتی رہتی سوال یہ ہے پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟ تھوڑا سا مزید گہرائی میں جائیں تو ہمیں محسوس ہوگا یہ بنیادی طور پر فرعون کا خوف نہیں تھا یہ اس کے حواریوں بلکہ اس کی "اسلم لیگ" کا خوف تھا اس کی اسلم لیگ کا خیال تھا اگر نجومیوں کی بات درست ثابت ہوگئی تو ہم سب فارغ ہو جائیں گے چنانچہ انہوں نے فوراً فرعون سے ایل ایف اوجاری کر دیا جس کے بعد فرعون کی قدرت کے ساتھ لڑائی شروع ہوگئی اور اس لڑائی کے نتیجے میں فرعون رہا اور نہ ہی مصر آپ کو محسوس ہوگا فرعون کا سارا بحران اس کی قیادت میں پیدا کیا تھا یہ قیادت بنیادی طور پر بحران کی وہ لکیریں ہوتی ہیں جو پتھر اور لوہے کے بنے قلعوں کو کنڈر بنا دیتی ہیں یہ فرعون جیسے شاہدار بادشاہوں کو براہ کروی ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے یہ قیادتیں جنم کیسے لیتی ہیں؟ ان کے جنم کو سمجھنے کیلئے آپ کو جنگل کی روایات میں جھانکنا پڑے گا۔

کہا جاتا ہے جنگل میں جب کوئی شیر پہلی بار شکار کیلئے نکلتا ہے تو اس کے حواریوں کا ایک گروہ بن جاتا ہے یہ حواری ایسے چھوٹے اور مسکین جانور ہوتے ہیں جو شیر کے شکار پر زندہ رہتے ہیں ان میں سے کوئی شکار کا سر کھاتا ہے کوئی شکار کی کھال اٹھارتا ہے کوئی اس کی آنتیں چباتا ہے کوئی اس کی دم چوستا ہے کوئی اس کی آنکھیں نوچتا ہے اور کوئی اس کے پائے پکا کر کھاتا ہے حواریوں کا یہ گروہ دیکھے جانوروں کا دست ہوتا ہے اور ان کی تاثیر اور شیر کے شکار سے وابستہ ہوتی ہے یہ جانور و شیر کی کھار کے سامنے قطار باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں جو نجی شیر نکلتا ہے یہ چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑتے ہیں شیر شکار کے بعد ایک آدھ دن لیٹتا ہے اور صوب میں بیٹھ کر ظال کرتے لگتا ہے جس کے بعد ان حواریوں کی باری آتی ہے یہ حواری جانور اس شکار سے بڑے آرام سے ایک آدھ ہفتہ نکال لیتے ہیں جب یہ شیر بوڑھا ہو جاتا ہے یہ درویشی اختیار کرنے لگتا ہے یا یہ اس جنگل سے اکتا ہوتا ہے تو یہ حواری اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسے یہ بتانا شروع کر دیتے ہیں حضور آپ کا وجود اس جنگل کی خوشحالی اور استحکام کیلئے انتہائی ضروری ہے اگر آپ نے وردی اتار دی تو یہ سارا جنگل برباد ہو جائے گا لہذا خدا کے واسطے اس جنگل کی بھائی کیلئے اپنے فیصلے پر نظر ثانی فرمائیں اکثر شیر ان حواریوں کی باتوں میں آ جاتے ہیں اور وہ مزید دس دس برس تک شکار کیلئے کا اعلان کر دیتے ہیں ان دس بیس برسوں کے دوران



کسی دن شیر کے پنجے کمزور پڑ جاتے ہیں اور اس کے دانت گر جاتے ہیں تو یہ سارے عوارض کسی دوسرے شیر کی کھجور کے سامنے قطار باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں یہ سلسلہ جب جنگلوں سے نکل کر شہروں اور ملکوں میں آتا ہے تو اس سے لگیں بنتی ہیں اور ان یگیوں سے انسانی شیروں کے زوال کا دور شروع ہوتا ہے۔

یہ بنیادی طور پر اقتدار کا فلسفہ ہے 'فرعون سے لے کر آج تک ہر صاحب اقتدار کی ایک ایک ہوتی ہے اور یہ ایک اسے ہر وقت یہ یاد رکھانی رہتی ہے "آپ کا وجود اس ملک کیلئے انتہائی ناگزیر ہے اور اگر آپ نے میدان چھوڑ دیا تو خوشحالی اور استحکام کا یہ عمل دم توڑ دے گا جس کے بعد یہ ملک ختم ہو جائے گا" اور دنیا کے 99 اعشاریہ 99 فیصد حکمران ان لوگوں کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں جس کے بعد جب تک وہ حکمران قائم رہتے ہیں یہ لوگ اس کے حکار پر چلتے رہتے ہیں ان یگیوں کا ریکارڈ ہے انہوں نے آج تک کسی سربراہ کو اقتدار سے باعزت طریقے سے رخصت نہیں ہونے دیا لہذا آج راجہ مہیسس دوم کے 3285 برس بعد محسوس ہوتا ہے بنی اسرائیل کے بچے نقل کرنے کا منصوبہ فرعون نے نہیں بنایا ہوگا یہ یقیناً فرعون کی ف لیگ کا جمہوری فیصلہ ہوگا 'فرعون کی ف لیگ کو جب نجومیوں کی پیش گوئی کا علم ہوا ہوگا تو اس نے فوراً ایک بڑا اجلاس بلایا ہوگا اور اس اجلاس میں "پارٹی" نے فیصلہ کیا ہوگا ہمیں ملک کی خوشحالی اور جمہوریت کی بقاء کیلئے ہر قیمت پر فرعون کی جان بچانا ہوگی اس فیصلے کے بعد انہوں نے فرعون کو قاتل کر لیا ہوگا وہ بنی اسرائیل کے تمام قوموں کو بچے نقل کرنے کا حکم دے دے اور فرعون نے بھی وسیع تر قومی مفاد اور نظریہ ضرورت کے تحت اس قرارداد پر دستخط کر دیے ہوں گے جس کے بعد جب تک فرعون زندہ رہا ف لیگ بنی اسرائیل کے بچے نقل کرتی رہی لیکن آخر میں پتہ چلا وہ خطرہ جسے ف لیگ عمل سے باہر دھونڈتی رہی تھی وہ فرعون کی گود میں پروان چڑھتا رہا تھا مجھے یقین ہے ف لیگ نے آخری وقت بھی اس خطرے سے بچنے کی کوشش کی ہوگی لیکن اس لمحے وقت کی پلٹ سے بہت پانی جمع ہو چکا ہوگا۔

میں نے فرعون اور موسیٰ کا واقعہ زندگی میں بے شمار مرتبہ پڑھا لیکن اس واقعے کا یہ نفسیاتی پہلو ہمیشہ میری نظروں سے اوجھل رہا میں نے 25 جولائی 2006ء کے اخبارات میں ایک تین کالم خبر پڑھی تو اس خبر نے مجھے فرعون کی ساری مجبوریات سمجھا دیں اور مجھے وہ پہلی بار بچاؤ بچاؤ سے محسوس ہوا یہ خبر پنجاب کی مسلم لیگ ق کے بارے میں تھی اس خبر میں انکشاف تھا مسلم لیگ ق پنجاب نے 24 جولائی کو لاہور میں قرارداد پاس کی "پاکستان مسلم لیگ ق وطن عزیز میں جاری ترقیاتی پروگراموں اور جمہوری عمل کے استحکام کیلئے جنرل پرویز مشرف کی صدارت کو ناگزیر سمجھتی ہے لہذا ہم جنرل مشرف کو موجودہ اسکیڈن سے اگلے پانچ سال کیلئے دردی سمیت صدر منتخب کرائیں گے" میں نے جوں ہی یہ خبر پڑھی مجھے 3285 برس پرانے حکمرانوں کی مجبوریات یاد آ گئیں اور میں بے اختیار "مسلم لیگ ق کے دفتر کی طرف دوڑ پڑا میں مارگلہ روڈ پر مسلم لیگ ق کے دفتر کے سامنے رکا اس عمارت کو سیلوٹ کیا اور اس کے بعد عرض کیا "میں اس عمارت اور اس عمارت میں رہنے والے لوگوں کا دل سے ممنون ہوں ان لوگوں نے میرے تمام فکری مفاد لیے دور کروئے انہوں نے دنیا کا 3285 برس پرانا مسئلہ حل کر دیا۔"



کاشفِ ازا

## چودھری شجاعت سمجھدار ہیں

ہمارے محبوب صدر جنرل پرویز مشرف کی کتاب "ان وی لائن آف فائز" کا انتہائی دلچسپ حصہ 12 اکتوبر 1999ء کے انقلاب سے متعلق ہے، صدر نے نواز شریف کی جسارت کو "کو" لکھا ہے جبکہ فوجی کارروائی کو "کاؤنٹر کو" کا نام دیا ہے یہ حصہ صفحہ 101 سے شروع ہو کر صفحہ 140 تک جاتا ہے۔ جناب عباس اطہر سمیت ہمارے تجربہ نگاروں اور ٹیلی ویژن چینلوں نے اس حصے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جبکہ فوج کی طاقت، سوچ اور دست کو سمجھنے کے لئے یہ حصہ انتہائی اہم ہے اس حصے میں ہمیں ہماری سیاست کا مستقبل اور قوم کے آنے والے دن بھی دکھائی دیتے ہیں۔

صدر محترم نے کتاب کے اس حصے میں 12 اکتوبر کو ایک خود کار واقعہ قرار دیا ہے ان کا فرمانا ہے فوج نے اقتدار میں آنے کیلئے کسی قسم کی منصوبہ بندی نہیں کی تھی "نو اڈ شریف" نے ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے جن کے نتیجے میں فوج ایوان اقتدار میں داخل ہو گئی صدر نے فرمایا "12 اکتوبر کا انقلاب شام پانچ بجے شروع ہوا" پاکستان ٹیلی ویژن سے ان کی بے دلی کی خبر نشر ہوئی جس کے بعد فوج حرکت میں آ گئی اور صرف ساڑھے تین گھنٹے میں حالات فوج کے قابو میں تھے، صدر نے فرمایا "پانچ بجے شام چیف آف جنرل شاف لیفٹیننٹ جنرل محمد عزیز خان اور کورکمانڈر راولپنڈی لیفٹیننٹ جنرل محمود احمد آری کلب چک لالہ میں ٹینس کھیل رہے تھے جبکہ ٹرپل ون بریگیڈ کے دو کمانڈنگ افسر لیفٹیننٹ کرنل شاہد علی اور لیفٹیننٹ کرنل جاوید سلطان اسی کلب میں سکونش کھیلنے میں مصروف تھے جوں ہی ان لوگوں نے بھری بے دلی کی خبر سنی انہوں نے کھیل بند کیا اور پی ایچ کیو کی طرف دوڑ پڑے۔ ڈی جی ملٹری آپریشنز میجر جنرل شاہد عزیز گھر پر آرام کر رہے تھے وہ بھی خبر سن کر پی ایچ کیو کی طرف دوڑ پڑے۔ ڈی جی ملٹری آپریشنز میجر جنرل شاہد عزیز نے ٹرپل ون بریگیڈ کے بریگیڈیئر صلاح الدین سی کو آ پریشن کا حکم دے دیا کرنل شاہد علی اور کرنل جاوید سلطان کو وزیراعظم ہاؤس، ایوان صدر، ٹیلی ویژن اور ریڈیو سٹیشنوں کے "تحفظ" کی ذمہ داری سونپ دی گئی، کرنل شاہد علی نے چند جوان لئے اور وہ اسلام آباد روانہ ہو گئے، جس کے بعد جنرل شاہد عزیز نے لاہور، کراچی اور پشاور کے کورکمانڈروں کو احکامات جاری کرنا شروع کر دیئے، لاہور کے کورکمانڈر لیفٹیننٹ جنرل خالد مقبول اس وقت کوہر انوالد میں تھے، ان کی غیر موجودگی میں میجر جنرل طارق مجید سینٹر افسر تھے، جنرل شاہد عزیز نے جنرل طارق مجید کو گورنر ہاؤس پنجاب، نواز شریف فیملی کی رہائش گاہیں، رائے ونڈ کا فارم ہاؤس، انٹیرپورٹ، ٹیلی ویژن



ریٹ پر شیش اور شہر میں داخل ہونے اور باہر جانے کے تمام راستوں پر قبضے کا حکم دے دیا اسی قسم کے احکامات کراچی کے کورکمانڈر لیفٹیننٹ جنرل مظفر عثمانی اور کورکمانڈر پشاور کو بھی جاری کر دیے گئے۔

صدر محترم نے صفحہ 123 پر تحریر کیا "جب کرنل شاہد راولپنڈی سے نکلنے لگے تو انہوں نے وزیراعظم ہاؤس کی گاؤڈ کے انچارج کوفون کیا "یہ ایک سرورنگ میجر تھا" میجر اس وقت وزیراعظم ہاؤس کے میدان میں جاٹنگ کر رہا تھا" میجر کو اس کی بیوی کے ذریعے ٹیلی فون پر بلایا گیا "کرنل شاہد علی نے اسے وزیراعظم ہاؤس کو فوراً سیل کرنے کا حکم دے دیا" اسی طرح کرنل جاوید سلطان نے بھی ایوان صدر کے سیکورٹی انچارج میجر کوفون کیا اور اسے حکم دیا "ایوان صدر کو فوراً سیل کر دو اور اس کے بعد ٹیلی ویژن شیش کو قبضے میں لے لاؤ" دونوں میجر آگے بڑھے اور انہوں نے وزیراعظم ہاؤس "ایوان صدر اور پاکستان ٹیلی ویژن شیش سیل کر دیے" محترم صدر نے لاہور کے بارے میں لکھا "پانچ بج کر 45 منٹ پر پاک فوج کے چار دستے نکلے اور لاہور شہر میں پھیل گئے" ان میں سے ایک گورنر ہاؤس چلا گیا "دوسرا ٹیلی ویژن شیش تیسرا وزیراعظم کی رہائش گاہوں اور چوتھا وزیراعظم کے رائے دہ فارم ہاؤس کی طرف روانہ ہو گیا" گورنر پنجاب ذوالفقار علی بھٹو 200 لوگوں کے مجمع سے خطاب کرنے کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک وہ فوجی جوان ان کے دفتر میں داخل ہو گئے "گورنر کے پرائیویٹ گاؤڈ نے انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن وہ انہیں ایک طرف دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے" ان دو جوانوں کے بعد ان کا کمانڈر داخل ہوا اور اس نے گورنر کو اپنے ساتھ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر چلنے کا حکم دے دیا "تیسرا واقعہ ان دونوں سے کہیں دلچسپ تھا" محترم صدر نے تحریر کیا "کرنل شاہد علی اپنے دو تین جوانوں کے ساتھ وزیراعظم ہاؤس کے بڑے پورچ میں داخل ہوئے" پورچ میں جنرل ضیاء الدین کی سیاہ گاڑی کھڑی تھی گاڑی پر فل جرنل کے سنار لگے تھے جنرل ضیاء الدین چیف آف آرمی سٹاف کی یونیفارم میں گاڑی کے پاس کھڑے تھے" ان کے ساتھ تھے مقرر شدہ چیف آف جنرل سٹاف لیفٹیننٹ جنرل اکرم اور وزیراعظم کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر جاوید کھڑے تھے "یہ دونوں افسر بھی یونیفارم میں تھے" ان کے ساتھ وزیراعظم کی سیکورٹی کے ڈی جی (یہ ایک ریٹائرڈ میجر جنرل تھے) اور وزیراعظم کے پرنسپل سیکرٹری سعید مہدی کھڑے تھے اور ان کے ساتھ وزیراعظم ہاؤس کے سیکورٹی گاؤڈ اور ایلٹ فورس کے جوان تھے، کرنل شاہد علی نے اپنے دو تین جوان پورچ میں تعینات کئے اور ان تمام افسروں کو ہتھیار بھینکنے کا حکم دے دیا "صدر کی کتاب میں اس کے بعد افسروں کے طویل مکالمات شروع ہو جاتے ہیں، جنرل ضیاء الدین جی ایچ کیو جانا چاہتے تھے جبکہ کرنل شاہد علی ان کا راستہ روکے کھڑے تھے، کرنل شاہد کو جنرل ضیاء الدین، جنرل اکرم اور بریگیڈیئر جاوید نے کبھی دھمکانے اور کبھی ترقیب دینے کی کوشش کی لیکن وہ ثابت قدم رہے یہاں تک کہ جنرل ضیاء الدین اور ان کے ساتھی ہتھیار پھینک کر اندر چلے گئے یوں کرنل شاہد علی اپنے چند جوانوں کی مدد سے وزیراعظم ہاؤس پر قابو پا لیتے ہیں۔

میں نے جب یہ خبریں واقعات پڑھے تو مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی اللہ کے کرم سے ہماری فوج اتنی طاقتور

ہے کہ ایک جاگنگ کرتا ہوا میجر دس منٹ میں ہیوی میٹھیٹ وزیرا عظیم ہاؤس کو سیل کر سکتا ہے اور ایک میجر چند جواہروں کی مدد سے ایوان صدر کو تالے لگا سکتا ہے جبکہ پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کے سیاسی گورنر کو گرفتار کرنے کیلئے صرف دو فوجی جوان کافی ہیں۔ اسی طرح ایک کرنل دو تین جواہروں کی مدد سے نہ صرف وزیراعظم، وزیراعلیٰ، وزیراعز، سینئروں اور ایم این اے کو قمارغ کر سکتا ہے بلکہ وہ جنرل اور ریگنڈیز لیول کے باغی افسروں کو بھی بے دست و پا کر سکتا ہے جبکہ ایک جونیئر افسر پندرہ منٹ میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی نشریات روک سکتا ہے۔ مجھے صدر صاحب کی کتاب پڑھنے کے بعد محسوس ہوا ملک میں ”کاؤنٹر کو“ کرنے کیلئے کسی لمبی چوڑی فورس یا پلاننگ کی ضرورت نہیں ہوتی اگر چند سینئر افسر تینس اور سکواش کھیلتے ہوئے فیصلہ کر لیں تو وہ صرف پندرہ منٹ میں ملک کو تمام سیاسی خطرات سے آزاد کر سکتے ہیں، مجھے صدر صاحب کی کتاب پڑھ کر معلوم ہوا ہماری فوج میں جونیئر افسر جنریلوں سے کہیں زیادہ طاقتور اور با اختیار ہیں۔

یہ کتاب پڑھنے کے بعد میرے دل میں چوہدری شجاعت حسین، شیخ رشید احمد اور مشاہد حسین کی قدر میں اضافہ ہوا اور میں ان کی دانشمندی اور معاملہ فہمی کا قائل ہو گیا، یہ تینوں حضرات میاں نواز شریف کے انتہائی قریب تھے، میں نے اپنی آنکھوں سے کئی بار ان حضرات کو نواز شریف پر جان چھڑکتے دیکھا تھا لیکن جب ”کاؤنٹر کو“ ہوا تو یہ لوگ فوراً فوجی حکومت کا حصہ بن گئے ان حضرات کی اس معاملہ فہمی پر اس دور میں بعض لوگوں نے انہیں نامناسب خطاب سے نوازنا شروع کر دیا تھا بد قسمتی سے میں بھی ان بے وقوف لوگوں میں شامل تھا ان دنوں شیخ رشید نے بڑا خوبصورت بیان دیا تھا انہوں نے فرمایا تھا ”میں طویل تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں، پاکستان میں فوج کے بغیر سیاست ممکن نہیں“ مجھے اس وقت شیخ صاحب کے خیالات سے اتفاق نہیں تھا لیکن آج صدر محترم کی کتاب پڑھنے کے بعد مجھے شیخ رشید کی معاملہ فہمی اور الہامی خیالات پر یقین ہو گیا اور مجھے محسوس ہوا شیخ رشید کی طرح چوہدری شجاعت حسین اور مشاہد حسین سمیت مسلم لیگ (ق) کے تمام ارکان، ایم کیو ایم، پیپریاٹ اور مولانا فضل الرحمن بھی ٹھیک ٹھاک معاملہ فہم اور سمجھ دار لوگ ہیں یہ لوگ بھی بروقت اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے لہذا آج یہ تمام لوگ تاریخی اختیارات اور اقتدار سے لطف اندوز ہو رہے ہیں جبکہ وہ لوگ جنہوں نے ابھی تک اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا وہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر دھکے کھا رہے ہیں، وہ آج تک ملک میں جمہوریت کے خواب دیکھ رہے ہیں مجھے معلوم ہوا قدرت نے ہماری فوج کو اپنا ملک فتح کرنے کی ٹھیک ٹھاک صلاحیت سے نوازا رکھا ہے چنانچہ اب اس ملک میں سیاست کرنے کا صرف ایک ہی فارمولا ہے تمام سیاستدان چوہدری شجاعت بن جائیں، جنرل مشرف زندہ باد کے نعرے لگائیں اور انتقال تک حکومت کریں۔





## یہ کتاب ثابت کرتی ہے

کسی سردار نے اپنی بیوی سے پوچھا ”اگر کوئی شخص تمہاری عصمت کے بدلے تمہیں دس ہزار روپے کی پیشکش کرے تو تمہارا کیا رد عمل ہوگا“ بیوی نے غصے سے جواب دیا ”میں اس کا منہ توڑ دوں گی“ سردار نے پوچھا ”اگر وہ ایک لاکھ روپے کی آفر دے تو؟“ بیوی نے جواب دیا ”میں معذرت کر لوں گی“ سردار مسکرایا ”اور اگر وہ تمہارے سامنے ایک کروڑ روپے رکھ دے تو؟“ بیوی نے تھوڑی دیر سوچا اور بخند ہو کر یوں ”میں خاموش رہوں گی“ سردار نے قہقہہ لگایا ”اور اگر وہ دو کروڑ روپے دے دے تو؟“ بیوی نے فوراً جواب دیا ”میں اس کی آفر قبول کر لوں گی“ سردار نے میز پر ہاتھ مار کر نعرہ لگایا ”لو ایک بات تو ثابت ہو گئی“ بیوی نے سر اٹھا کر پوچھا ”کیا؟“ سردار پورے دھڑکنے سے بولا ”میں ایک ایسی عورت کے ساتھ رہ رہا ہوں جسے خریدنا جاسکتا ہے۔“

میں آج تک اس واقعہ کو محض ایک لطیفہ سمجھتا رہا ہوں لیکن جب سے ہمارے محبوب صدر جناب پرویز مشرف کی ”خودنوشت“ ان دی لائن آف فائر مارکیٹ میں آئی ہے مجھے محسوس ہو رہا ہے یہ محض ایک لطیفہ یا ایک واقعہ نہیں، یہ ایک باقاعدہ فلسفہ حیات ہے اور ہم 16 کروڑ لوگ اس فلسفہ حیات کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں! گو صدر پرویز مشرف، جانیں گوہر اور ان کی صاحبزادی ثانیہ گوہر نے اس کتاب سے عالمگیر شہرت حاصل کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کتاب نے ہماری سیاست، ہماری سفارت اور ہماری عسکری شہنشاہت کو بھی پوری دنیا کے سامنے نکال کر دیا، ہم پہلی مرتبہ مکمل کر دنیا کے سامنے آ گئے دنیا اس سے پہلے ہمیں سردار کی بیوی کی طرح قائل خرید اور بد اخلاق سمجھتی تھی لیکن ہم نے پہلی مرتبہ دنیا کو اس کا تحریری ثبوت پیش کر دیا، ہم نے پہلی مرتبہ اپنے جرائم تسلیم کر لئے! صدر صاحب کی کتاب کے اصل تجزیے تو دس چہرہ برس بعد اس وقت ہوں گے جب صدر صاحب ہمیں دارغ مفارقت دے چکے ہوں گے تاہم سردست ہم اس کتاب کی چند موٹی موٹی باتوں کا ایک ”مختصر“ سا جائزہ لے سکتے ہیں! صدر صاحب نے اپنی ذات اور اپنی خودنوشت دونوں کو اعتدال پسند ثابت کرنے کے لئے کتاب کا آغاز اپنی جوانی کے دو عاشقوں سے کیا۔ صدر نے اعتراف کیا وہ میٹرک میں اپنی ایک ہمسائی کے عشق میں جھانسنے اور وہ اپنی نانی کے ہر قے کی جیب میں رکھے ڈال کر اسے بھجوا کر تے تھے۔ صدر نے انکشاف کیا وہ اس دور میں ایک

بنگالی لڑکی کے سحر میں بھی مبتلا ہو گئے تھے اور انہوں نے فرمایا وہ اکثر کالج سے غائب ہو جاتے تھے رات کو کولم دیکھتے تھے وہ اپنی پرمسج میں لیٹ جاتے تھے اور صبح ہاسٹل آ جاتے تھے صدر صاحب کے ان انکشافات سے جہاں ان تمام نوجوانوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جو راتوں کو ہاسٹلوں سے غائب ہو جاتے ہیں جن کے گھروں کی کمزیریاں ہمسایوں کے گھن میں کھلتی ہیں اور جو اپنی اپنی نائندوں کے برقعوں کے اس سائنسی استعمال سے ناواقف ہیں وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے ہمارے ملک میں صدر بننے کے لئے اعلیٰ اخلاقی اقدار یا بہت زیادہ ذہانت اور محنت کی ضرورت نہیں گو صدر صاحب کی جوانی کے یہ تجربات صحیح ہیں اور ان تجربات کا اعتراف انہیں ایک جرأت مند اور بے باک شخص ظاہر کرتا ہے لیکن اگر صدر یہ اعتراف نہ کرتے تو بھی ان کی جرأت مندی اور بے باکی پر کوئی حرف نہ آتا دنیا انہیں پہلے ہی سچا کھرا اور جرأت مند شخص تسلیم کر چکی ہے صدر صاحب نے انکشاف کیا جنرل جہانگیر کرامت کے دور میں کور کمانڈر کے اجلاس میں جنرل علی گلی خان فوج کو اقتدار پر قبضے کی ترغیب دیتے رہتے تھے اس انکشاف سے ثابت ہوتا ہے فوج میں اقتدار تک پہنچنے کی سوچ ہر وقت موجود رہتی ہے صدر صاحب نے انکشاف کیا نائن الیون کے بعد امریکہ کے نائب وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹج نے پاکستان کو دھمکی دی "اگر پاکستان نے امریکہ کا ساتھ نہ دیا تو وہ بمباری کے ذریعے پاکستان کو پتھر کے زمانے میں پہنچا دیں گے" اس دھمکی کے بعد حکومت نے امریکہ کی حمایت کا فیصلہ کر لیا صدر کا یہ انکشاف ثابت کرتا ہے ہم لوگ ہماری پالیسی، ہمارا قانون، ہمارا آئین اور ہماری حکومتیں ایک دھمکی کے فاصلے پر ہیں اور امریکہ کا ایک درمیانے درجے کا افرجیب چاہے ٹیلی فون اٹھا کر ہمیں یوٹرن لینے پر مجبور کر سکتا ہے، صدر صاحب نے انکشاف کیا امریکی سفیر وینڈی جیمبرلین 13 ستمبر 2001 کو سات مطالبات کی فہرست لے کر ان کے پاس آئیں۔ یہ انکشاف ثابت کرتا ہے پاکستان میں امریکی سفیر کو وائسرائے کی حیثیت حاصل ہے اور امریکہ جب چاہے اپنا سفیر بھجوا کر ہم سے بڑے سے بڑے فیصلہ کر سکتا ہے، صدر نے انکشاف کیا ہم نے القاعدہ کے 689 ارکان پکڑے، ان میں سے 369 لوگ امریکہ کے حوالے کئے اور لاکھوں ڈالر کمائے، یہ انکشاف ثابت کرتا ہے ہم ڈالر کمانے کیلئے ہر قسم کی "قربانی" دے سکتے ہیں، یہ انکشاف ثابت کرتا ہے ہمارے ملک میں قومی سطح کی ایسی خدمات کا صلہ سرکاری خزانے میں جمع نہیں ہوتا، یہ براہ راست افراد کی جیبوں میں چلا جاتا ہے، صدر نے انکشاف کیا انہوں نے اسپرے پرنٹل میکر ٹری طارق عزیز کی مدد سے (ق) لیگ بنائی اور انہوں نے جناب شوکت عزیز کو وزیراعظم بنانے کا فیصلہ ذاتی طور پر کیا، یہ دونوں انکشاف ثابت کرتے ہیں پاکستان میں کوئی بھی طاقتور حکمران کسی بھی وقت ایک بڑے ساز کی مسلم لیگ بنا سکتا ہے اور ملک میں وزیراعظم کے عہدے کیلئے کوئی کوالیفیکیشن موجود نہیں اور صدر صاحب نے اس کتاب کی لاپچنگ کے دوران وردی کے بارے میں فرمایا "وردی اتارنے کا وعدہ منہ کے الفاظ تھے"۔ یہ انکشاف ثابت کرتا ہے صدر صاحب کے وعدے کسی بھی وقت منہ کے الفاظ ثابت ہو سکتے ہیں وہ تین لفظ بول کر اپنے بڑے سے بڑے فیصلے سے انحراف کر سکتے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان کے اس انحراف کا احتساب نہیں کر سکتی۔



اگر ہم اس کتاب کا سرسری سا جائزہ لیں تو ثابت ہوتا ہے ہمارے ملک میں اخلاقیات، قانون، آئین اور سیاسی روایات نام کی کوئی چیز موجود نہیں، ہمارے ملک کی کوئی خارجہ پالیسی، کوئی داخلی قانون اور کوئی آئین نہیں اور یہ کتاب ثابت کرتی ہے اس ملک میں 1958ء سے کسی پیرل خان یا کسی آغا توپ خان کی حکومت چلی آ رہی ہے اور اس توپ خان کا ہر خواب، ہر خواہش اور ہر خیال قانون، آئین اور (نحوہ باللہ) حکم الہی کا درجہ رکھتا ہے اور پوری قوم اس حکم کے سامنے بے بس ہے۔ یہ کتاب ثابت کرتی ہے ہمارا ملک صوم کی ناک ہے اور جو شخص جب چاہے اس ناک کو ہتھی میں لے کر اس کا زاویہ بدل سکتا ہے اور یہ کتاب ثابت کرتی ہے ہم لوگ کوئی قوم، کوئی ملک نہیں ہیں ہم سردار کی بیوی ہیں اور دنیا کا ہر سوداگر ہماری قیمت لگا سکتا ہے یہ کتاب ثابت کرتی ہے ہم بک بھی سکتے ہیں دُوب بھی سکتے ہیں، ہمارا گ بھی سکتے ہیں اور ہم معافی بھی مانگ سکتے ہیں۔

میرے ایک سرکاری دوست کا فرمانا ہے "یہ کتاب پاکستان کی تاریخ ہے" میں ان کے فرمان میں تھوڑا سا اضافہ کرنا چاہتا ہوں "میرا یہ خیال ہے یہ کتاب ہماری تاریخ نہیں بلکہ یہ ہمارا مستقبل بھی ہے اور یہ کتاب ثابت کرتی ہے ہم کیا تھے، ہم کیا ہیں اور ہم آ لے والے دلوں میں کیا ہوں گے یہ کتاب ایک آئینہ ہے جس میں ہم اپنی تمام بد صورتیاں دیکھ سکتے ہیں۔"

Kashif Azzam @ OneUrdu.com



## پانچ چھ سالوں کی گیم

میں میاں نواز شریف کے دفتر سے واپس آیا تو میرے دوست نے بے تابی سے پوچھا ”ملاقات کیسی رہی“ میں نے کوٹ کے مٹن کھولے اور لمبا سانس لے کر جواب دیا ”بہت اچھی، میاں نواز شریف پہلے سے زیادہ بکھر چکے ہیں اس جلا وطنی نے انہیں حقیقی سیاستدان بنا دیا“ میرے دوست نے قہقہہ لگایا اور طنزیہ انداز سے بولا ”بکھرنی ا“ میں اس کی بات سمجھ گیا، میرا یہ دوست پیٹے کے لحاظ سے صحافی ہے اور یہ میاں نواز شریف کو غیر سنجیدہ سیاستدان سمجھتا ہے، اس کا خیال ہے میاں صاحب نے جلا وطنی سے کچھ نہیں سیکھا، وہ ابھی تک خواب و خیال کی دنیا میں رہ رہے ہیں، حکومت انتخابات میں ان کی پارٹی کو جڑ سے اکھاڑ دے گی اور وہ اسمبلیوں میں بمشکل پانچ سات نشستیں لے سکیں گے لیکن میاں صاحب صورتحال کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہے“ مجھے اپنے دوست سے ہمیشہ اختلاف رہا، میرا خیال ہے ہم لوگ میاں نواز شریف کو سمجھنے میں غلطی کرتے آ رہے ہیں، ہم کیا غلطی کرتے ہیں یہ میں آپ کو چند لمحے بعد بتاؤں گا، سرورست میں میاں صاحب سے ملاقات کی طرف آتا ہوں۔

میاں صاحب سے میری ملاقات 5 مارچ 2007ء کو ساڑھے بارہ بجے ان کے آفس میں ہوئی تھی۔ میاں صاحب کا آفس نادر چودھری اور پرویز رشید چلا رہے ہیں۔ میاں نواز شریف کی پچھلی سیاست کیسی تھی، وہ آنے والے دنوں میں سیاست کے میدان میں کیا رول ادا کریں گے اور میاں صاحب کو قدرت نے کون سے مواقع فراہم کیے تھے اور وہ ان مواقع سے کتنا فائدہ اٹھا سکے، یہ ایک طویل بحث ہے لیکن جہاں تک میاں نواز شریف کی ذات کا تعلق ہے، ان میں ایک دلچسپ خوبی ہے۔ میاں صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایک برکت اور ایک رونق بخش رکھی ہے، وہ جہاں پہنچتے ہیں لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، میں جب ان کے دفتر پہنچا تو کئی تک لوگ کھڑے تھے۔ دفتر میں بھی لوگوں کا ہتھکھٹا کا تھا، میں نے پرویز رشید سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے بتایا جس دن میاں صاحب لندن نہیں ہوتے اس دن دفتر سنسان ہو جاتا ہے اور ہم لوگ سارا دن ایک دوسرے کی شکل دیکھتے رہتے ہیں۔ پرویز رشید کا کہنا تھا ”ہم نے یہ دفتر شروع کیا تو یہاں لوگوں کی بلیکار ہو گئی، جس کے رونق میں ملنگ کے دوسرے کرایہ داروں نے ہماری شکایت کر دی، یہ لوگ ہمارے کلچر سے واقف نہیں تھے لہذا اب ہم نے بڑی حد تک



لوگوں کو کنٹرول کر لیا ہے، ہماری کوشش ہوتی ہے لوگ میاں صاحب سے ملاقات کیلئے وقت لے کر آئیں لیکن اس کے باوجود روزانہ سوڈ پڑھ سولوگ آ جاتے ہیں" میں نے میاں صاحب سے بھی اپنی آبروروشن کا ذکر کیا۔ انہوں نے تہنید لگایا اور اوپر دیکھ کر بولے "یہ سب اللہ کا کرم ہے" میاں صاحب نے مجھے اپنا سوبائل دکھایا ان کے سوبائل میں دو ہزار نو سو 34 پیغام تھے یہ سب ایک دن کے پیغام تھے۔

میری میاں صاحب سے گفتگو شروع ہوئی تو مجھے ان کے خیالات میں بڑی یکسوئی محسوس ہوئی، ان کا کہنا تھا وہ جنرل پرویز مشرف سے کسی قیمت پر کپور و ماتر نہیں کریں گے ان کا کہنا تھا "میری زندگی کا اب صرف ایک ہی مقصد ہے فوج کو سیاست سے الگ کرنا اور پاکستان میں اصل جمہوریت کا نفاذ" میاں صاحب کا خیال تھا "وقت اور حالات بڑی تیزی سے سیاسی جماعتوں کو اتحاد کی طرف لے جا رہے ہیں لہذا وہ وقت دور نہیں جب ساری سیاسی جماعتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں گی اور حکومت کے لیے اپنے آپ کو بچانا مشکل ہو جائے گا" میں نے ان سے پوچھا "اگر کبھی ان کے پرانے ساتھی چودھری شجاعت حسین، مشاہد حسین اور شیخ رشید ان کے پاس واپس آ گئے تو" انہوں نے فوراً نفی میں سر ہلایا اور یقین سے کہا "میرے دروازے ان لوگوں کے لیے بند ہو چکے ہیں" میں نے عرض کیا "جب آپ بینظیر بھٹو، مولانا فضل الرحمن اور عمران خان سے اتحاد کر سکتے ہیں تو چودھری شجاعت حسین میں کیا خرابی ہے" میاں صاحب فوراً بولے "مخالفت اور بے وفائی میں فرق ہوتا ہے، بینظیر بھٹو اور عمران خان ہمارے سیاسی مخالف تھے جبکہ چودھری شجاعت، مشاہد حسین اور شیخ رشید نے پارٹی اور میرے ساتھ بے وفائی کی۔ میں اگر ان لوگوں کو دوبارہ سینے سے لگالیتا ہوں تو یہ میرے وفادار ساتھیوں کے ساتھ زیادتی ہوگی" میں نے ان سے عرض کیا "آپ کو برطانیہ جیسے کھلے معاشرے میں رہ کر محسوس نہیں ہوتا قدرت نے آپ کو دوبار پاکستان کی قسمت بدلنے کا موقع دیا لیکن آپ پاکستان کو برطانیہ نہیں بنا سکتے" انہوں نے فوراً جواب دیا "برطانیہ کی سیاست میں فوج نہیں، ہم لوگ بھی پاکستان کو ترقی کے اس معیار تک پہنچا سکتے تھے لیکن فوج نے ہمارے ہاتھ باندھ رکھے تھے، میں یہ نہیں کہتا ہم لوگ مکمل طور پر بے قصور ہیں ہم لوگوں سے بھی غلطیاں ہوئی تھیں، میں آج ان غلطیوں کو "ریٹائر" کر رہا ہوں اور ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے دوبارہ موقع دیا تو میں یہ غلطیاں نہیں دہراؤں گا، میں اقتدار کو صرف اور صرف لوگوں کی بھلائی کیلئے استعمال کروں گا" میاں صاحب کا کہنا تھا "پاکستان کے سیاسی حالات میں بہت بڑی تبدیلی آنے والی ہے، انہیں محسوس ہوتا ہے وہ اور محترم بے نظیر بھٹو انکیشن سے پہلے پاکستان ہوں گے"

میں اب واپس اپنے دوست کی طرف آتا ہوں، میرا دوست نواز شریف کو "مان سیریس" سیاستدان سمجھتا تھا، میں نے نواز شریف کی تعریف کی تو اس نے تہنید لگایا اور مجھے تسخیرانہ نظروں سے دیکھنے لگا، میں نے اس سے کہا، میں تم سے سات سوال پوچھتا ہوں اگر تم ان میں سے کسی ایک سوال کا جواب نفی میں دے دو تو میں تمہاری بات مان لوں گا۔ اس نے کہا "او کے سوال پوچھو" میں نے کہا "پاکستان میں اڑھائی سو کے قریب بڑے کاروباری

خاندان ہیں، ان میں سے صرف ایک خاندان کے ایک فرد نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا اور وہ شخص کامیاب ہو گیا، یہ شخص نواز شریف تھا، کیا کوئی نان سیریس برٹس مین سیاست میں آ سکتا ہے اور کیا آ کر کامیاب ہو سکتا ہے؟“ میرا دوست خاموش رہا، میں نے پوچھا ”نواز شریف جب سیاست میں آیا تو اس وقت ملک میں بڑی بگاڑا، غلام مصطفیٰ جتوئی، محمد خان جونجو اور حامد ناصر چٹھہ کا طوطی بولتا تھا لیکن نواز شریف نے آتے ہی ان سب کو سیاست سے باہر تھو دیا۔ تم بتاؤ کیا یہ کام کوئی نان سیریس شخص کر سکتا ہے؟“ میرا دوست خاموش رہا، میں نے پوچھا ”نواز شریف پاکستان میں دو بار وزیراعظم بنا، دوسری بار ایک بھائی وزیراعظم تھا اور دوسرا بھائی سب سے بڑے صوبے کا وزیراعظم، کیا کوئی نان سیریس شخص اقتدار کے اس لیول تک پہنچ سکتا ہے؟“ میرا دوست خاموش رہا، میں نے کہا ”میں نواز شریف نے دو صدیوں کا غلام اسحاق خان، سردار فاروق احمد لغاری، ایک چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ اور تین سردار جسٹس گھر بھجوا دیے۔ اس نے نول چیف منصور الحق اور آری چیف جنرل جہانگیر کرامت سے استغنے لیے، کیا یہ کام کوئی نان سیریس شخص کر سکتا تھا“ میرا دوست خاموش رہا، میں نے پوچھا ”نواز شریف پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار بھارتی وزیراعظم اٹل بھاردی واپس لے آیا تھا۔ اس نے کشمیر کے مسئلے کو حل تک پہنچا دیا تھا۔ کیا کوئی نان سیریس شخص یہ کام کر سکتا تھا؟“ میرا دوست خاموش رہا، میں نے پوچھا ”نواز شریف نے پوری دنیا کے دباؤ کے باوجود اٹل بھاردی واپس لے آیا، یہ وہ کام تھا جو ذوالفقار علی بھٹو جیسا ایڈراور جنرل ضیاء الحق جیسا با اختیار شخص نہیں کر سکا، کیا یہ کام بھی کوئی نان سیریس شخص کر سکتا تھا۔“ میرا دوست خاموش رہا اور میں نے اس سے آخری سوال پوچھا ”نواز شریف نے اس دور میں موڑوے، پہلی بیسیوں اور ستے گھروں کے منصوبے شروع کیے تھے جب یہ منصوبے خواب گئے تھے، آج سترہ اٹھارہ برس بعد حکومت روڈ ٹیٹ ورک، کارخانہ ٹنگ اور ہاؤس ٹنگ کے فیز میں داخل ہوئی ہے۔ کیا یہ بھی کسی نان سیریس شخص کا کام ہے؟“ میرا دوست خاموش رہا، میں نے عرض کیا ”میں نواز شریف کے سارے کام تجھے ہوئے اور دورانہ پیش سیاستدانوں جیسے تھے لیکن اس کے باوجود تم جیسے لوگ غلط فہمی کا شکار ہیں“ میرے دوست نے بے چینی سے کروش بدلی، میں نے عرض کیا ”بس نواز شریف میں دو خامیاں ہیں، ایک وہ مشرقی روایات کے باجاء انسان ہیں، وہ اردو اور پنجابی بولتے ہیں، لوگوں سے گلے ملتے ہیں اور ایک خاندانی انسان کی طرح لوگوں کی توجہ کرتے ہیں اور ان کی دوسری خامی پنجابی ٹکڑ ہے وہ منہ میڑھا کر کے انگریز کی نہیں بولتے جبکہ ہم لوگ دو سو سال غلام رہے ہیں لہذا غلامی ہمارے ضمیر میں شامل ہو چکی ہے۔ ہم لوگ صرف قاصلے پر رہنے والے سیاستدانوں کو لیڈر مانتے ہیں، ہم صرف انہیں سیاستدان سمجھتے ہیں جو انگریزی بولتے اور پائپ پیتے ہیں، مجھے یقین ہے اگر یہی نواز شریف وائٹن سے آیا ہوتا یا روس انگریزی میں لکھی تقریریں کرتا تو ہم اسے ہالیوے سے بلند لیڈر سمجھتے“ میرا دوست خاموش رہا۔ میں نے عرض کیا ”میں اب تمہیں مستقبل کے نواز شریف کے بارے میں بتاتا ہوں، تم لکھو نواز شریف اپنے سے پہلے بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم بنائے گا“ میرے دوست نے حیرت سے میری طرف دیکھا ”میں نے عرض کیا“ اس کی دو وجوہات ہیں، پاکستان کے اگلے



وزیراعظم کو جنرل پرویز مشرف کی روشن خیالی اور اعتدال پسندی سے سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ اسے پاکستان میں شراب نوشی اور کھجور کی اجازت دینا پڑے گی اور یہ اس وزیراعظم کی پہلی ناکامی ہوگی دوسرا اگلے وزیراعظم کو فوج کے ساتھ بھی سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔ فوج موجودہ حکمرانوں کا احتساب نہیں کرنے دے گی چنانچہ نواز شریف کی کوشش ہوگی کھانے کا یہ سودا بے نظیر بھٹو کرے، یوں بے نظیر اقتدار میں آکر ایک دو برسوں میں ناکام ہو جائے گی اور اس کے بعد نواز شریف پوری طاقت کے ساتھ پاکستانی سیاست میں آئے گا اور وہ کام کر دکھائے گا جو حسین شہید سہروردی سے ذوالفقار علی بھٹو تک کوئی نہ کر سکا۔ میرے دوست نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولا ”کیا مطلب“ میں نے عرض کیا ”نواز شریف اپنے لیے صدر کا عہدہ چنے گا اور شہباز شریف کو وزیراعظم بنائے گا“ میرے دوست نے تہتہ لگا یا ”لیکن کب“ میں نے کہا ”یہ صرف پانچ چھ سالوں کی گیم ہے“ میرے دوست نے تہتہ لگا یا اور میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا ”تم صحافی رہو نہ توئی بننے کی کوشش نہ کرو جب تک صدر پرویز مشرف ہیں نواز شریف اور بے نظیر بھٹو پاکستان نہیں جاسکتے یہ گیم شروع نہیں ہوگی“



Kashif Azad @ OneUrdu.com

## کوئٹہ

”کوئٹہ“ انور مسعود صاحب کی تخلیق ہے۔

دنیا میں اس وقت پانچ ہزار بڑی زبانیں اور 25 ہزار بڑے لہجے ہیں ان 25 ہزار لہجوں اور پانچ ہزار زبانوں میں ہزاروں لاکھوں لوگ شاعری کرتے ہیں لیکن ان لاکھوں ہزاروں شاعروں میں صرف دس بیس حضرات ایسے ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ نے نئی زبان اور نیا لہجہ تخلیق کرنے کا اعزاز بخشا ہوگا ان دس بیس لوگوں میں ایک نام انور مسعود ہیں انور مسعود اردو زبان کے ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے پنجابی، اردو اور انگریزی کو ملا کر نہ صرف ایک نئی زبان ایک نیا لہجہ تخلیق کیا بلکہ یہ لہجہ اور یہ زبان ان کی زندگی میں رائج بھی ہو گئی یہ زبان انور مسعود صاحب کی زبان کہلاتی ہے یہ انور مسعود صاحب ہیں جن کی وجہ سے لوگ اب بھیٹس کو صرف بھیٹس نہیں کہتے وہ اسے ”بھولی راج“ کہتے ہیں اور بنیان کو صرف بنیان نہیں بلکہ بنین کہتے ہیں انور مسعود صاحب نے پچھلے دنوں ”کوئٹہ“ کے عنوان سے ایک خوبصورت نظم تخلیق کی ”کوئٹہ“ محض ایک نظم نہیں یہ ایک فلسفہ ایک تاریخ اور ہماری قوم کی پوری نفسیات ہے اس نظم میں انور مسعود صاحب کوئٹہ کی ہسٹری بیان کرتے ہیں وہ بتاتے ہیں انسان پہلے بوٹی کا قیصر بناتا ہے پھر اس قیصر کو گوندھ کر دوبارہ بوٹی بناتا ہے اور اس بوٹی کو ایک بار پھر دانستوں میں کچل کر اس کا قیصر بناتا ہے بوٹی اور قیصر کا یہ کھیل کئی دنوں تک چلتا رہتا ہے میں نے جب پہلی بار انور مسعود صاحب سے یہ نظم سنی تو میں نے ان سے عرض کیا ”یہ ایک خالص سیاسی اور باغی نظم ہے“ انور صاحب نے قہقہہ لگا کر اس آبروروشن کی تصدیق کر دی۔

ہم اور ہماری پالیسیاں بنیادی طور پر کوئٹہ ہیں ہم لوگ پچھلے ساٹھ برسوں سے یونیاں کاٹتے ان یونیوں کا قیصر بناتے اس قیصر کو گوندھ کر دوبارہ تخت کرتے اور پھر اس کوئٹہ کو دانستوں میں بیس کر دوبارہ قیصر بناتے چلے آ رہے ہیں ہماری ساری تاریخ ”کوئٹہ تاریخ“ ہے آپ دن ڈش کو لیجئے حکومت نے 22 اگست 2006 کو پارلیمنٹ میں شادی کی تقریب میں دن ڈش کی اجازت دینے کا بل پاس کر لیا یہ دن ڈش کا چوتھا کوئٹہ تھا نواز شریف نے 1997ء میں شادی کی تقریبات میں کھانا کھلانے پر پابندی لگائی تھی پارلیمنٹ نے اس پابندی کی تصدیق کی تھی پرویز مشرف کے دور میں اس پابندی پر عملدرآمد ختم ہو گیا حکومت نے خلاف ورزی کا نوٹس لیتے ہوئے اسے دن ڈش کر دیا کسی صاحب نے اس دن ڈش کو عدالت میں چیلنج کر دیا اور سربراہ کر دیا۔



دن ڈش پر دوبارہ پابندی لگا دی یہ پابندی قومی اسمبلی میں پیش ہو گئی اس پر سال بھر بحث چلتی رہی یہاں تک کہ 22 اگست کو حکومت نے دن ڈش کو قانون کی شکل دے دی یوں یوٹی چوٹی ہار کونٹ بن گئی ہم اب بھی دھوئی سے نہیں کہہ سکتے دن ڈش کے بارے میں اگلی حکومت اور اگلی پارلیمنٹ کی کیا پالیسی ہوگی وہ ویسے اور نکاح کے کھانے پر مکمل پابندی لگانے کی یا پھر وہ اسے پوری طرح کھلا چھوڑ دے کی چٹانچوڑ اس کو فٹے کا سفر ابھی جاری ہے۔

دن ڈش ہمارے مزاج کی صرف ایک مثال ہے آپ اگر ذرا سا غور کریں تو آپ کو ایسی سینکڑوں ہزاروں مثالیں ملیں گی جن میں ہم نے ایک ہی کام چار چار بار کیا آپ ان تمام سیاسی اور سماجی کاموں کا جائزہ لیں تو آپ کو محسوس ہوگا ہم پالیسیوں کے حوالے سے ”کوٹنے“ ہیں آپ حدود کو لیجئے ”ذوالفقار علی بھٹو تک پاکستان میں“ حدود نام کا کوئی قانون نہیں تھا جنرل ضیاء الحق آئے تو اچانک محسوس ہوا ملک میں فاشی اور عریانی کا دور دورہ ہے اور اگر اس فاشی کے سامنے بند نہ باندھا گیا تو یہ فاشی ملک کو بھالے جائے گی جنرل صاحب نے فاشی کا راستہ روکنے کیلئے 1979ء میں حدود آدرز جنس نافذ کر دیا اس وقت پاکستان کے تمام حلقوں نے اس آدرز جنس کو خوش آمدید کہا اخبارات میں اس کے حق میں ادارے لکھے گئے لیکن 2006ء میں اچانک یہ آدرز جنس ظلم اور زیادتی محسوس ہونے لگا حکومت نے اس آدرز جنس کی کوکھ سے تحفظ حقوق نسواں میں نکالا اور پوری سرکاری مشینری اس کے نفاذ پر لگادی اب اخبارات میں اس نئے بل کے حق میں ادارے لکھے جا رہے ہیں اور قوم اسے خوش آمدید کہہ رہی ہے مجھے سمجھ نہیں آتی 1979ء کا آدرز جنس صحیح تھا یا 2006ء کا بل جنرل محمد ضیاء الحق کی سوچ درست تھی یا جنرل پرویز مشرف کے انکاؤ جنرل ضیاء الحق کا کوٹہ ٹھیک تھا یا جنرل مشرف کی یوٹی ایک جرنیل صحیح تھا یا دوسرا جرنیل آپ 58 نوٹی کو لیجئے 1985ء کی اسمبلی نے صدر کو 58 دوب کے اختیارات دیئے ان اختیارات کے ذریعے صدر کسی بھی وقت کسی بھی منتخب حکومت کو گھر بھجوا سکتا تھا اس زمانے میں سیاستدانوں اور دانشوروں نے اس ترمیم کو جمہوریت کی ہمارا دریا 1997ء میں نواز شریف نے دھتائی اکثریت سے یہ ترمیم ختم کر دی 1997ء میں سیاستدانوں اور دانشوروں نے اس اقدام کو جمہوریت کی فتح قرار دیا صدر پرویز مشرف کی تخلیق کردہ اسمبلی نے 2003ء میں ایک بار پھر 58 دوب کو آئین کا حصہ بنا دیا اور سیاستدانوں نے اسے بھی جمہوریت کی ہمارا دریا مجھے سمجھ نہیں آ رہی 1985ء کی اسمبلی درست تھی 1997ء کی اسمبلی نے صحیح فیصلہ کیا تھا یا پھر 2003ء کی اسمبلی کا موقف درست تھا اور اب آنے والی اسمبلی اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرے گی سرورست اس کے بارے میں کوئی چمن کوئی نہیں کی جاسکتی کیونکہ کوٹہ سازی کا عمل ابھی تک جاری ہے آپ اگر تحقیق کریں تو آپ کو ہماری تاریخ سے ایسی بے شمار مثالیں ملیں گی ہم نے آج تک اس ملک میں کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جس میں بعد ازاں ترمیم نہ ہوئی ہو اور ہم نے آج تک کوئی ایسی پالیسی نہیں بنائی جس سے ہم نے 180 درجے کے زاویے پر اپنا رخ نہ بدلا ہو بھارت سے لے کر افغانستان تک اور امریکہ سے لے کر ایران تک ہر دور میں ہماری خارجہ پالیسی مختلف تھی ہر دور کی خارجہ پالیسی پچھلے دور سے الٹ تھی ہماری کوٹہ سازی کی یہ حالت ہے ہم آج

تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے ہماری دفتری اور سرکاری زبان کیا ہوگی اور ہمارا قومی لباس کیا ہے ہم لوگ سوٹ کو بھی قومی لباس کہتے ہیں اور شیر وانی کو بھی جناح کیپ ہمارے قومی لباس کا حصہ ہے لیکن صدر اسحاق سے صدر پرویز مشرف اور نواز شریف سے شوکت عزیز تک میں نے آج تک کسی کو جناح کیپ پہنے نہیں دیکھا جناب ظفر اللہ بڑی صاحب نے تو اپنے پورے دور میں شیر وانی تک نہیں پہنی لہذا ہم لوگ ہر لحاظ سے کو فتنے ہیں۔

آپ بلوچ سرداروں کے الٹو کو لے لیجئے ہم نے نواب اکبر خان کیٹی کوتارنگ میں پانچ بار محبت وطن اور پانچ بار شری پسند اور علیحدگی پسند قرار دیا 1947ء میں نواب اکبر خان کیٹی نے پاکستان میں شمولیت کا اعلان کیا تو وہ محبت وطن تھے 1957-1958ء میں وہ وزیر داخلہ اور دفاع کے وزیر ملکیت بنے تو بھی وہ محبت وطن تھے لیکن صدر ایوب کے دور میں جب ان کے فیملی مارشل سے اختلافات پیدا ہو گئے تو وہ مجرم بھی ہو گئے خدا ربھی اور ظالم بھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں وہ گورنر بنے تو وہ دوبارہ محبت وطن ہو گئے بھٹو کے ساتھ ان کے اختلافات پیدا ہوئے تو وہ ایک بار پھر ظالم بھی ہو گئے علیحدگی پسند بھی اور خدا ربھی اجڑل ضیاء الحق کے دور میں انہوں نے جنرل ضیاء الحق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تو وہ ایک بار پھر خدا ربھی اور ظالم ہو گئے بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کے ادوار میں وہ دوبارہ محبت وطن بن گئے 2003ء میں ان کے موجودہ حکومت سے اختلافات شروع ہوئے تو وہ ایک بار پھر ظالم شری پسند اور علیحدگی پسند ہو گئے آج جب کئی صاحب قتل ہو چکے ہیں تو معلوم ہو رہا ہے وہ بلوچستان کے بلاکو خان تھے انہوں نے اپنی ذاتی جیلیں بنا رکھی تھیں اور وہ اب تک سینکڑوں لوگوں کو قتل کر چکے ہیں سوال یہ ہے ایک ہی شخص 60 برسوں میں پانچ بار خدا ربھی اور پانچ بار محبت وطن کیسے ہو سکتا ہے؟ سوال یہ ہے اگر نواب اکبر خان کیٹی مسلم لیگ ق میں شامل ہو جاتے وہ صدر پرویز مشرف کی حمایت کا اعلان کر دیتے تو وہ کیا ہوتے؟ اور آج کاسرکاری مورخ انہیں کیا لکھتا؟ میرا خیال ہے وہ اس وقت پاکستان کے سب سے بڑے محبت وطن لیڈر ہوتے وہ اس وقت بلوچستان کے گورنر ہوتے اور انہیں سرکاری پروٹوکول مل رہا ہوتا خدا ربھی کے اس کو فتنے کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا پاکستان کا کوئی ذی شعور شخص آج یہ دعویٰ نہیں کر سکتا صدر پرویز مشرف کے دور کا یہ "شر پسند" مستقبل قریب میں کیا ہوگا؟ ہو سکتا ہے مستقبل کی کوئی حکومت اس "شر پسند" کو شہید جمہوریت قرار دے دے اور ان کی قبر پر باقاعدہ فوجی گارڈ لگادی جائے۔

یہ کیا ہے؟ کیا قومیں کو فتنے بن کر ترقی کر سکتی ہیں؟ کیا پارہ صفت معاشرے آگے بڑھ سکتے ہیں؟ اور کیا مرگشت اور معاشروں میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے؟ کیا سورج یکسی اور ملکوں میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے؟ اور کیا ہم ایک رکعت میں پانچ پانچ بار قبلہ بدل کر زیادہ دیر تک زعمہ رہ سکیں گے؟ یہ وہ سوال ہیں جو آج ہر سوچنے والے ذہن کو پریشان کر رہے ہیں خدا کے بندو! ہمیں کہیں تو رکنا چاہیے ہمیں کچھ تو طے کرنا چاہیے یہ تو کوئی بات نہ ہوئی جو شخص میرا دشمن ہے وہ شیطان ہے اور جو میری صفوں میں کھڑا ہے وہ شیطان ہو کر بھی نیک ہے ا معاف کیجئے گا ایسی پالیسیوں سے صرف کو فتنے بن سکتے ہیں ملک نہیں۔

~ ~ ~



## اصل مشاہد حسین کون ہے

جناب مشاہد حسین کے ساتھ میری شناسائی آٹھویں سال میں داخل ہو چکی ہے، میری ان کے ساتھ پہلی ملاقات 1997ء میں ہوئی تھی یہ ملاقات نسیم انور بیک صاحب کے گھر ہوئی تھی وہ ان دنوں میاں نواز شریف کی کابینہ میں "کڑا کے" نکال رہے تھے اس کے بعد ان سے گاہے بگاہے ملاقاتیں ہوتی رہیں 1999ء میں ان سے ملاقات ہوئی تو وہ میرے کسی کالم پر ذرا سے ناراض تھے انہوں نے کالم کی ایک سطر دہرائی یہ سطر کچھ یوں تھی "آج کی حکومت کل کی اپوزیشن اور آج کی اپوزیشن کل کی حکومت ہوتی ہے لہذا سیاستدانوں کو اپنے معاملات میں توازن رکھنا چاہیے" اس کے بعد وہ اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگا کر بولے "دیکھ لیں ہمارے دور میں پریس کتنا آزاد ہے" میں نے ان کی مہربانی اور آزادی کا شکریہ ادا کیا، انہوں نے اس ملاقات کے دوران مجھ سے وعدہ کیا وہ کسی دن زیادہ وقت کیلئے میرے ساتھ بیٹھیں گے اور حکومت اور اپوزیشن کے معاملات پر مکمل کربات کریں گے لیکن یہ وعدہ ایسا نہ ہو سکا چند دن بعد میاں نواز شریف کی حکومت ختم ہو گئی اور مشاہد حسین کابینہ کے دوسرے ارکان کے ساتھ قید ہو گئے وہ ڈیڑھ سال بعد رہا ہوئے تو ان سے چند ایک مختصر ملاقاتیں ہوئیں میں ان ملاقاتوں میں شاہ جی کا گرویدہ ہوتا چلا گیا، اس میں کوئی شک نہیں مشاہد حسین ایک انٹلیجنٹ پڑھے لکھے مہذب اور ذہنی انسان ہیں ان کے دامن پر سردست کرپشن کا بھی کوئی دھبہ نہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں میں زمانہ طالب علمی سے ان کا فین چلا آ رہا ہوں ہمارے درمیان تعلقات بھی ایسے ہیں لیکن بد قسمتی سے یہ تعلقات کبھی شناسائی سے آگے نہیں بڑھ سکے وہ 12 اکتوبر 1999ء کو گرفتار ہوئے اور 25 دسمبر 2000ء کو انہیں رہائی نصیب ہوئی رہا ہونے کے بعد انہوں نے امریکہ کے مشہور اخبار نیو یارک ٹائمز میں اپنے قید کے دنوں کے بارے میں ایک مضمون تحریر کیا، میں نے جب یہ مضمون پڑھا تو میں نے یہ کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا، یہ مضمون میرے پاس 4 سال تک پڑا رہا، چند روز پہلے میں نے کسی کانغذ کی تلاش میں اپنی فائلیں دیکھنا شروع کیں تو یہ مضمون میرے ہاتھ لگ گیا، میں نے یہ مضمون پڑھنا شروع کر دیا، میں اسے جوں جوں پڑھتا گیا، میں مشاہد حسین کی کیفیات میں ڈوبتا چلا گیا، مشاہد حسین کا یہ مضمون ایک "ماسٹر پیس" تھا، اس میں آپ کو ایک ایسے زندہ انسان کے سارے احساسات ملتے ہیں جسے

اور رات سے انھا کو کھڑی میں پھینک دیا گیا تھا جو اپنی بے گناہی کی سزا بھگت رہا تھا اس مضمون کے مشاہد حسین اور آج کے مشاہد حسین میں بڑا فرق ہے اس مضمون کا مشاہد حسین ایک دانشور ایک صحافی اور ایک نگہباری تھا جبکہ آج کا مشاہد حسین ایک کامیاب سیاستدان اور روشن خیال اور اعتدال پسند حکومت کا ایک اعتدال پسند اور روشن خیال "مشیر" ہے اس مضمون کا مشاہد حسین اندھیری کوٹھری میں روشنی کی کرن کا انتظار کرتا ہے اور اس کیلئے انسانی آواز دنیا کی عظیم ترین نعمت ہے جبکہ آج کا مشاہد حسین کیمروں کی روشنیوں اور آوازوں کے جھوم میں رہنے والا ایک کامیاب سیاستدان ہے ان دونوں میں اصل مشاہد حسین کون ہے؟ اس کا فیصلہ مشکل ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے میں اس مضمون کے مشاہد حسین کا فین ہوں آپ مضمون ملاحظہ کیجئے میں یہ مضمون ترجمے کے ساتھ آپ کی نذر کرتا ہوں۔

"میں 12 اکتوبر 1999ء کی شام اپنے سرکاری گھر میں تھا شام کے سات بج رہے تھے اچانک ٹیلیفون کی گھنٹی بجی وہ میرا ٹیلیفون آپریٹر تھا اس نے بتایا "فوج نے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے فوجی اندر کودنے کی تیاری کر رہے ہیں" میری بیوی اور گیارہ سالہ چٹا مصطفیٰ دوسری منزل پر تھے۔ میں بھاگ کراہ کر چلا گیا اور ان سے کہا "باہر فوجی ہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں" میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا مسلح فوجی ٹرکوں سے کود رہے تھے اسی لمحے میں نے شیشے ٹوٹنے کی آواز سنی وہ کھڑکیاں توڑ رہے تھے اس کے بعد فوجیوں کے بیڑھوں پر چڑھنے کی آواز آئی میں باہر نکلا اور میں ان سے قاطب ہوا "ریٹریس رہیں ہم سب فیر سلج ہیں" فوجی اس وقت نہیں تھے شاید ان کے چہروں پر فوجی بغاوت کے آثار تھے وہ میرے کمرے میں گھس آئے انہوں نے میرے کمرے کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ ٹیلیفون لائنوں کی تاریں کھینچ دی گئیں اس لمحے ایک میجر آگے بڑھا اس نے ٹیلیفون اٹھا لیا اور پیغام دیا "پندرہ منبرے میں ہے" اور میں ایک لمحے میں حکومتی وزیر سے حکومتی قیدی میں تبدیل گیا۔ اس دن رات گئے جیل پر ویز مشرف اور دوسرے فوجی لیڈروں نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور منتخب حکومت کو اقتدار کے اہوان سے باہر نکال دیا میں نواز شریف حکومت میں شامل تھا۔ میرے سمیت بہت سے سرکاری عہدیداروں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ آج فوجی حکمران پاکستان پر حکومت کر رہے ہیں جبکہ جیل پر ویز مشرف نے 2002ء میں جمہوریت بحال کرنے کا عندیہ دے دیا ہے۔ اکتوبر کی اس رات کے بعد مجھے ایک مکان میں دو ماہ تک قید رکھا گیا اس دوران میری بیوی اور بچہ میرے ساتھ رہے 14 دسمبر کو اظہار کے بعد ایک افر میرے پاس آیا اور مجھ سے کہنے لگا "آپ کو کسی دوسری جگہ منتقل کیا جا رہا ہے" میں نے چند جوڑے کپڑے اور کتابیں پیک کیں اور ملٹری ٹرک میں چڑھ گیا۔ میں نے تہیہ کیا تھا میں ان کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر نہیں ہونے دوں گا مجھے اس وقت امریکی ناول نگار مصیٰک دے کا قول یاد آیا "ہمت والا وہی ہے جو بحران میں بھی اپنی عزت نفس قائم رکھے" مجھے ایک گیٹ ہاؤس میں لے جایا گیا اور وہاں مجھے کمرے میں بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی گئی۔ مجھے کسی نے یہ نیک بتانا مناسب نہ سمجھا کہ میں وہاں کتنا عرصہ رہوں گا اس وقت مجھے ٹیلن منڈ پلا یاد آگئے ایک سال قبل جب



نیلسن سنڈیلا پاکستان کے دورے پر آئے تھے تو میں ان کا وزیر مہمان داری تھا، میں نے ان سے پہلی ملاقات کے دوران پوچھا تھا "27 سالہ قید کے دوران آپ کے لئے سب سے تکلیف دہ لمحات کون سے تھے؟" انہوں نے ایک لمحہ کی تاخیر کے بغیر جواب دیا تھا "قید تہائی"۔ اس وقت میں بھی قید تہائی کا شکار تھا، گو یہ ایک مختصر قید تھی لیکن اس کے باوجود آپ اس کی شدت کا اندازہ نہیں کر سکتے، مجھے اچانک دنیا سے الگ تھلک کر دیا گیا تھا۔ مجھے قرآن پاک کے علاوہ کسی قسم کا ریڈنگ میٹر مل دستیاب نہیں تھا۔ میرے بیرونی دنیا سے تمام رابطے منقطع تھے۔ میں ٹیلیفون ٹیلیوڈن یا ریڈیو کے بغیر زندگی گزار رہا تھا۔ میرے ملاقاتی بھی نہیں تھے۔ آزادی کے دنوں میں جو چیز کم اہم ہوتی ہے قید کے دنوں میں وہی چیز انتہائی اہمیت اختیار کر جاتی ہے قید کے دنوں میں کسی انسان سے گفتگو دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہوتی ہے۔ میں نے محسوس کیا تہائی کی قید جسم سے زیادہ دماغ کی آزمائش ہوتی ہے۔ میرے خیال میں جب آپ تہا ہوتے ہیں تو اس وقت خوف سے لڑنے کا سب سے بہترین طریقہ خدا پر یقین ہوتا ہے۔ مجھے زندگی کی بے شمار حقیقتوں کا علم قید میں جا کر ہوا، میں نے وہاں غم اور خوشی کو دو بہنوں کی طرح دیکھا، میں قید کے دنوں میں قرآن پاک پڑھتا اور رکھتا تھا مجھے اپنی زندگی کے ان تاریک ترین دنوں میں قرآن پاک میں حضرت عیسیٰؑ کے واقعہ نے بہت متاثر کیا۔ اس واقعہ نے مجھے آنے والے اندیشوں سے بچائے رکھا۔ میں نے مستقبل کے بارے سوچنا بند کر دیا۔ میں آج کے دن پر نظر رکھتا اور اسے شید دل کرتا رہتا تھا۔ قید تہائی کے دنوں میں میں پوری توجہ کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تھا۔ بات کرتا تھا اپنے کمرے میں 22 قدم واک اور ورزش کرتا تھا اور پھر قرآنی تعلیمات پر توجہ دیتا تھا۔ میں نے اپنے محافضوں سے گفتگو سے احتراز کیا۔ وہ لوگ تہائی میں قید شخص سے درخواستوں کی توقع رکھتے تھے یہ درخواستیں انہیں نفسیاتی تسکین دیتی تھیں۔ ان کا خیال تھا میں ان سے موجودہ حالات قید کی مدت اور رہائی کے متعلق سوال کروں گا مگر میں نے کبھی ان سے کوئی سوال نہیں پوچھا، میری اس پالیسی کی وجہ سے وہ میرے خوف کو نہیں جان سکے تھے یہی ایک وجہ تھی میں ہر رات گہری نیند سوتا تھا۔

پاکستان میں جمہوریت کی کمزوری اور جمہوری سسٹم میں خامیوں کی ایک بڑی وجہ لیڈرشپ کی ناکامی ہے سیاسی لیڈروں کے غیر جمہوری رویوں اور عدم برداشت نے جمہوریت کی بنیاد کمزور کر دی ہے۔ ہمارے سیاستدان اقتدار حاصل کر کے اپنی شان و شوکت میں اضافہ کرتے ہیں یہ لوگ سیاست میں داخل کلاس اور لوئر کلاس کے لئے ترقی کے دروازے بند کر دیتے ہیں اور میرٹ کی وجوہات اڑاتے ہیں۔ ہماری ایلٹ کلاس اپنی ترقی اور دوسروں کو مرنے دو کی اپروچ پر کاربند ہے۔ یہاں پر بدلے لینے کی سیاست بھی رواج پا چکی ہے۔ طاقتور خاندان اور افراد ایک دوسرے کو بچا دکھانے کے لئے خطرناک حد تک چلے جاتے ہیں یہ لوگ ملک میں ایسی اقتدار کو ترجیح دے رہے ہیں جن میں نظر اندازی معافی اور باہمی سہل جول کی گنجائش نہیں ملتی۔ پاکستان کا سب سے بڑا چیلنج یہ ہے کہ یہاں ایسا سیاسی کلچر بنایا جائے جس میں فرد واحد قبیلہ یا گروپ کے مفادات ملک پر ترجیح نہ رکھتے ہوں۔ میں یکم مارچ 2000 تک قید تہائی میں رہا یہ تین ماہ بنتے ہیں اس دوران میری فیملی نے ایک عدالتی حکم



ہم حاصل کر لیا جس کے بعد مجھے مہری بہن کے مگر شفٹ کر دیا گیا۔ 9 مہینوں کے بعد 25 دسمبر 2000 کو مجھے رہا کر دیا گیا۔ سیاسی قیدی کے طور پر میرا تجربہ دوسروں سے زیادہ تلخ نہیں تھا۔ میری فیملی نے میرے لئے سخت جدوجہد کی تھی۔ پاکستانی عدالتوں میں اپیلیں کی گئیں دوسرے لوگوں نے بھی میرا دفاع کیا۔ پینلٹی انٹرنیشنل نے مجھے ”ضمیر کا قیدی“ قرار دیا۔ میں 440 دن قید میں رہا لیکن مجھ پر کوئی الزام ثابت نہیں ہو سکا۔ میں اب آزاد ہو چکا ہوں لیکن میں جمہوری پاکستان کے لئے جدوجہد کی ذمہ داری سے آزاد نہیں ہوا۔ میرے ملک (عوام) کو یہ سب ضرور سیکھنا چاہیے اور اسے یاد رکھنا چاہیے کہ ایک شخص سیاسی طور پر دوسرے شخص کی مخالفت کر سکتا ہے لیکن اسے انسانی اقدار کی نگریم کرنا چاہیے۔ یہی صاف ستمرا قانونی راستہ ہے 1400 سال قبل حضرت علیؓ نے فرمایا تھا ’معاف کر دینا انصاف سے بہتر ہے‘ ہمیں درگزر اور معافی کو اپنی سیاست کا حصہ بنانا چاہیے اس ملک میں ان حالات میں انصاف اور سیاسی انتقام میں فرق ممکن نہیں لہذا ہمیں معافی اور سخاوت سے کام لینا چاہیے اس کو فارمولا بنانا چاہیے۔“

آپ عجیب اتفاق دیکھئے مجھے یہ تحریر 25 دسمبر 2005 کو ملی اور یہ مشاہد حسین کی رہائی کی سالگرہ تھی اور جب میں نے یہ تحریر پڑھی تو میں نے سوچا اصل مشاہد حسین کون ہے وہ جس نے یہ تحریر لکھی تھی یا وہ جو آج مسلم لیگ ق کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے باوردی صدر جنرل پرویز مشرف کا ساتھی ہے وہ مشاہد حسین اصل ہے جو قید میں جمہوریت کے خواب دیکھ رہا تھا یا وہ مشاہد حسین جو قید سے باہر آتے ہی جمہوریت اور ضمیر فروشی کے کاروبار میں شریک ہو گیا مجھے کوئی سمجھ نہ آئی لہذا میں نے مشاہد حسین کا یہ آرٹیکل فائل میں رکھا اور یہ فائل ایک بار پھر الماری میں بند کر دی۔



## برزنس مینوں کیلئے بھی وقت نکالے

آج سے 26 برس پہلے رولڈ ریگن نے اپنی انتخابی ہم کا آغاز کیا تو ٹیلی ویژن کے ایک پروگرام میں کپیٹر نے ان سے ایک عجیب سوال پوچھا۔ اس نے پوچھا ”مسٹر ریگن فرض کرتے ہیں آپ امریکہ کے صدر منتخب ہو جاتے ہیں اور آپ کے سامنے ملاقات کے متنی لوگوں کی فہرست رکھی جاتی ہے اس فہرست میں امریکہ کے نائب صدر کا نام ہے آپ کی کابینہ کے پانچ اہم وزیر ہیں نیکول چیف، چیف آف انٹر سٹاف اور آرٹی چیف ہے یورچین یونین کا سربراہ ہے، گلف کا ایک شاہ اور سات سفیر ہیں روس کا ایلچی ہے اور امریکہ کا ایک درمیانے درجے کا برزنس مین ہے، آپ ان تمام شخصیات میں سب سے پہلے کس سے ملیں گے۔“ صدر ریگن نے شہادت کی اگلی سے ٹھوڑی رگڑی اور فس کر بولے ”امریکی برزنس مین سے ا“ کپیٹر نے حیران ہو کر پوچھا ”کیوں؟“ صدر ریگن نے کندھے اچکا کر جواب دیا ”روس کا ایلچی، جاپان اور چین کے سفیر، حمزہ ورلڈ کے ہیڈ آف شیٹس، گلف کے شہزادے اور یورچین یونین کا سربراہ ریگن سے نہیں بلکہ امریکہ کے صدر سے ملنا چاہتا ہے اور امریکہ کا صدر اس درمیانے درجے کے برزنس مین کی وجہ سے صدر ہے باقی رہے چیٹس، کابینہ کے وزیر اور نائب صدر تو یہ لوگ بھی اس معمولی برزنس مین کی مہربانی سے نائب صدر وزیر اور چیف ہیں۔“ صدر ریگن رس کے اور مسکرا کر بولے ”اب میں آپ سے ایک اور سوال پوچھنا چاہتا ہوں“ وہ رس کے اور پروگرام کے میزبان پر نظر س جھا کر بولے ”آپ مجھے بتائیے اگر امریکہ کے تیسرے دوسرے اور پہلے درجے کے برزنس مین کام چھوڑ دیں اگر امریکی فیکٹریاں نہ چلیں اگر شاہک انجینئر کی سرگرمیاں دم توڑ جائیں اور اگر ہمارے بازار غیر آباد ہو جائیں تو کیا امریکہ امریکہ رہے گا؟ کیا امریکی صدر انتخابی باعزت اور اہم سمجھا جائے گا؟ کیا روس کا ایلچی، چین اور جاپان کے سفیر، گلف کے شہزادے، یورچین یونین کا سربراہ اور تیسری دنیا کے ہیڈ آف شیٹس امریکی صدر سے اسی طرح ملنا چاہیں گے؟“ کپیٹر نے گردن لٹی میں ہلا دی ریگن نے قہقہہ لگایا اور مائیگ پر جھک کر بولے ”ملکوں کو سیاست نہیں بلکہ فیکٹریاں چلایا کرتی ہیں اور جن سربراہان کے پاس برزنس مینوں سے ملنے کا وقت نہیں ہوتا ان سربراہان کی زندگی میں جلد وہ وقت آ جاتا ہے جب ان سے کوئی نہیں ملتا۔“

اگر ہم کامیاب امریکی صدر کی فہرست تیار کریں تو ریگن کا شمار ان دو یا تین صدر میں ہوتا ہے جنہیں ہم امریکہ کے مقبول اور محبوب ترین صدر کہہ سکتے ہیں اور اگر ہم ان وجوہات کی فہرست بنائیں جن کے باعث ریگن کامیاب صدر قرار پائے تھے تو اس میں پہلے نمبر پر کاروباری طبقے سے خوشگوار تعلقات آتے ہیں۔ ریگن کی ترجیحات میں بزنس اور بزنس مین کی کیا حیثیت تھی اس کا اندازہ لگانے کے لئے آپ کریسلر اور ڈیوڈ رین گروپ کی مثالیں لیجئے۔ 80ء کی دہائی میں کریسلر گروپ دیوالیہ ہوا تو ریگن جاپان کا دورہ منسوخ کر کے کریسلر کے ہیڈ آفس میں آ بیٹھے۔ خود حالات اور وجوہات کا جائزہ لیا اور پھر اپنا سارا اثر و رسوخ استعمال کر کے کریسلر گروپ کو دفاعی آلات کے بھاری ٹھیکے دلوائے جن کے نتیجے میں یہ گروپ دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ کچھ ایسی ہی صورت حال ڈیوڈ رین گروپ کو بھی درپیش تھی۔ یہ گروپ آئرلینڈ میں ڈیپالٹ کر گیا، ریگن نے آئرلینڈ پر دباؤ ڈال کر گروپ کو ازحائی سولین ڈالر کا اقتصادی چیلنج دلایا بعد ازاں گروپ کا سربراہ جان ڈیوڈ رین غنیمت کی سنگٹانگ میں پکڑا گیا تو صدر ریگن نے گروپ کو بچانے کے لئے اسے باعزت بری کر دیا۔ یہ تھی ریگن کی اقتصادی سوچ، وہ کہا کرتے تھے پورا امریکہ دو صنعتی اور کاروباری گروپوں پر استوار ہے، ان گروپوں میں معمولی سی گڑ بڑ پورے امریکہ کو برباد کر سکتی ہے لہذا جو بھی امریکی صدر وقت کی کتاب میں اپنا نقش چھوڑنا چاہتا ہے اسے چاہیے وہ ان گروپوں کو اپنی ترجیحات کی فہرست میں رکھے۔ دنیا ریگن کے اس فارمولے کو ریگن کالفسد معیشت کہتی ہے اور 80ء اور 90ء کی دہائی میں جن اقوام نے اس فلسفے پر عمل کیا وہ دیکھتے ہی دیکھتے بکری سے ٹائیگر بن گئیں جبکہ جو لیڈر بزنس مینوں کے مقابلے میں سروسز چیف، وزراء اور ایلیٹوں کو اہمیت دیتے رہے وہ لیڈر اور ان کی قومیں شیر سے بکری بن گئیں۔

میں جب بھی پاکستان کے کسی تاجر، کسی بزنس مین اور کسی کارخانے دار سے ملتا ہوں تو وہ مجھے حکومت سے تالاں اور ملک کے مستقبل سے مایوس دکھائی دیتا ہے، میں اس سے وجہ پوچھتا ہوں تو وہ اسلام آباد کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے ان لوگوں کے پاس ہمارے لئے وقت ہی نہیں، میں ان کی پریشانی دیکھ کر سوچتا ہوں یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششوں اور محنتوں سے اس ملک کی معاشی رکوں میں تھوڑی بہت زندگی ہے، اگر ان لوگوں کی پریشانی مایوسی میں بدل گئی، اگر یہ لوگ بھی ہجرت پر مجبور ہو گئے تو پھر ہمارا اور ہمارے ملک کا کیا بنے گا؟ درست ہے کاروبار بہت دراز ہیں اور بھرانوں کی مصروفیات کا کوئی انت نہیں ہوتا لیکن یہ بھی حقیقت ہے یہ ساری مصروفیات اور یہ ساری سرکاری لٹ پیٹ صرف اس ملک کی وجہ سے ہے، نواز شریف اس لئے وزیر اعظم تھے کہ پاکستان سلامت تھا اور اب پرویز مشرف بھی اس لئے صدر اور جناب شوکت عزیز اس لئے وزیر اعظم ہیں کہ یہ ملک قائم ہے، اگر خدا نخواستہ اس ملک کی سلامتی اندیشوں میں گھر گئی تو پھر پرویز مشرف کہاں ہوں گے اور دنیا شوکت عزیز کسے کہے گی لہذا حکومت کو ہر اس متون پر توجہ دینی چاہئے جس پر اس ملک کی چھت استوار ہے اور بزنس مین کیونٹی اس ملک کا مرکزی ستون ہے، یقین کیجئے مارکیٹ اکالوی کے اس دور میں اگر ایک ہیڈ آف شیٹ پریشان ہو تو اس کی پریشانی حکومت یا کابینہ کو متاثر کرتی ہے، ایک جزل کی پریشانی کے اثرات صرف ایک کورنگ



محدود رہتے ہیں لیکن اگر کسی ملک کی ایک انڈسٹری 'ایک بڑا انڈسٹریل گروپ یا بزنس مینوں کا ایک بڑا حلقہ' شکر' پریشان یا مایوس ہو جائے تو پھر پورا ملک بخار کا شکار ہو جاتا ہے 'پوری قوم اس شکایت' اس پریشانی اور اس فکر میں جھلا ہو جاتی ہے۔ مجھے چند روز پہلے کوئی صاحب بتا رہے تھے پاکستان کی 13 بڑی صنعتیں بند ہو چکی ہیں، اس وقت پاکستان میں چینی کے برتن بنانے والی تمام فیکٹریاں بند ہو چکی ہیں، پتھیا سازی کبھی پاکستان کی بہت بڑی صنعت ہوتی تھی لیکن یہ صنعت اب آخری سانس لے رہی ہے، سیالکوٹ کے 400 صنعت کار چین منتقل ہو چکے ہیں جبکہ کراچی کے تمام بڑے صنعت کار اور تاجر دو جی میں اپنے دفتر کھول چکے ہیں لیکن حکومت کے اعلانوں تک کوئی سرگوشی نہیں پہنچتی، حکومت کے کسی کارندے کو کوئی پریشانی نہیں ہوتی، یقین کیجئے صنعت کاروں اور بزنس مینوں کی پریشانیاں پانی کے کیڑوں کی طرح ہوتی ہیں اگر ان کا بروقت تدارک نہ کیا جائے تو یہ پورے شہر 'پورے ملک کو بیمار کر دیتی ہیں اور ہم لوگ دن بدن بیمار یوں کا شکار ہوتے جا رہے ہیں لہذا میری حکومت سے درخواست ہے وہ کبھی کبھی بزنس مینوں کو بھی تھوڑا سا وقت دے دیا کرے۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

## خارجہ پالیسی

جلاوطن شہزادہ رک گیا، برہمن نے درخت کی جڑیں کھودیں، جڑیں پوری طرح نکلی ہو گئیں تو اس نے جڑوں میں کھولنا ہوا گرم پانی پھینکا، مٹی ڈالی اور ہاتھ جھاڑ کر کھڑا ہو گیا، حیران پریشان شہزادے نے برہمن کو پرنام کیا اور پھر بڑے ادب سے عرض کیا "گرو آپ کیا کر رہے تھے؟" برہمن نے ہنس کر اپنا ہاتھ منجے سر پر پھیرا اور شرارتی لہجے میں بولا "کچھ نہیں مہاراج زرا درخت سے انتقام لے رہا تھا، مجھے بچپن میں اس درخت سے ٹھوکر لگی تھی، میں نے آج اس کی جڑوں میں گرم پانی ڈال دیا اب یہ درخت سوکھ جائے گا اور میرا انتقام پورا ہو جائے گا۔" پریشان شہزادے نے حیرت سے پوچھا "گرو آپ اتنی مشقت کی بجائے سیدھا سادا درخت کاٹ دیں؟"۔ برہمن نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور خوفزدہ لہجے میں بولا "رام رام، میں برہمن ہو کر درخت کاٹوں گا؟" شہزادے نے قہقہہ لگایا، نیچے جھکا اور برہمن کے قدم چھو کر بولا "میں چندرگپت ہوں، پانچویں پتر سے آیا ہوں، آج سے آپ میرے گرو بھی ہیں اور مشیر بھی۔" یہ برہمن وشنو گپت تھا، اس کے ماں باپ نے اس کا یہی نام رکھا تھا لیکن تاریخ نے اسے چانکیہ کوئلہ کے نام سے یاد رکھا، نیپٹلا کے اس برہمن زادے کو قدرت نے بے شمار صلاحیتوں سے نوازا رکھا تھا وہ آج تک اپنے فارمولوں اور اپنی شاطرات چالوں کے باعث دنیا میں زندہ ہے، آج بھی جب "مانیت از داسیت" کی بات آتی ہے یا اقتدار اور طاقت کا سوال اٹھتا ہے تو فوراً "جس کی لاشی اس کی بھیئس" کی شکل میں چانکیہ سامنے آ جاتا ہے چندرگپت مور یہ نے چانکیہ کی مدد سے ہندوستان میں پہلی وسیع اور مستحکم سلطنت کی بنیاد رکھی، اس سلطنت کی سرحدیں شمالی ہندوستان کے شہر پانچ پتر (پٹنہ) سے کابل، کابل سے ہرات اور ہرات سے یوگال تک پھیلی تھیں، چندرگپت ہندوستان کا پہلا راجہ تھا جس کا سکہ بھرہ عرب سے طلحہ یوگال تک چلتا تھا، چانکیہ اس کا مشیر خاص تھا، وہ چندرگپت کی زندگی میں پوری طرح راج پس چکا تھا، چانکیہ نے اس کیلئے ایک کتاب لکھی، تاریخ اس کتاب کو "ارتھ شاستر" کہتی ہے۔ یہ کتاب حکومت کاری کی قدیم ترین دستاویز ہے جس میں چانکیہ نے راجہ کے حرم سے لے کر سماجی جرم تک زندگی کے ہر زاویے پر حکمرانوں کی رہنمائی فرمائی۔ چندرگپت مور یہ 296 قبل مسیح میں "سورگ ہاش" ہو گیا اور چانکیہ بھی مر گیا لیکن یہ دونوں اپنے پیچھے حکومت کاری کا ایک ایسا ماڈل چھوڑ گئے جسے



ہندوستان کے ہر ہندو راجے نے اپنا پاپا اور کامیابی حاصل کی۔ ارتھ شاستر، چاکلیہ اور چندر گپت مور یہ ہندو نفسیات کی اصلی اور سچی تصویر ہیں اور کوئی بھی شخص ان تینوں کے مطالعے کے بغیر ہندوستان کے ہندوؤں کو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی ہندو سلطنت کو تقسیم ہند کے بعد جواہر لال نہرو بھارت کے پہلے وزیر اعظم بنے تھے یہ چاکلیہ کو اپنا روحانی گرو کہتے تھے، وہ شروع میں چاکلیہ کے لکھی نام سے اخبارات میں کالم بھی لکھتے رہے تھے۔ 48-1947ء میں جب بھارت کی فارن پالیسی کے تعین کا مرحلہ آیا تو نہرو نے ارتھ شاستر کا ایک فقرہ لکھ کر اپنے دفتر خارجہ کے حوالے کر دیا۔ وہ فقرہ تھا ”ہمسایہ دشمن ہوتا ہے لیکن ہمسائے کا ہمسایہ دوست“ اس دن سے چاکلیہ کا یہ فلسفہ بھارت کی فارن پالیسی بن گیا۔ اسی لئے شاید دہلی کے ”ڈپلویک انکلیو“ کا نام چاکلیہ پوری ہے اور مین بیوارڈ ”کوئٹہ مارک“ کہلاتا ہے۔ بہر حال یہ بھارت کی فارن پالیسی ہے، بھارت نے ہر دور میں ہمسائے کو اپنا دشمن اور ہمسائے کے ہمسائے کو اپنا دوست سمجھا۔ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ بھارت نے چین کو ہمیشہ اپنا دشمن جانا اور روس کو دوست، پاکستان اس کا دشمن ہے اور افغانستان دوست اور خیال، برما، سری لنکا، بھوٹان، مالدیپ اور بنگلہ دیش کے ساتھ پولیس مین جیسا سلوک کرتا ہے اور کوریا، تھائی لینڈ، فلپائن، سنگاپور اور جاپان سے دوستی کی ٹانگیں بڑھاتا ہے۔ آپ ذرا غور کیجئے آپ کو بھارت کی ساری فارن پالیسی اسی فلسفے پر استوار دکھائی دے گی۔ بھارت صرف فارن پالیسی میں چاکلیہ کا معتقد نہیں بلکہ وہ ”آریہ کبھی غلام نہیں رہ سکتا“ کے فلسفے کے تحت ہر پاور کے خواب بھی دیکھتا ہے وہ ”ہندوستان ماں ہے اور ماں تقسیم نہیں ہو سکتی“ کے نظریے کے تحت اکھنڈ بھارت کی خواہش بھی رکھتا ہے اور وہ ”دشمن کو قتل نہ کرو، اس کی جڑوں میں گرم پانی ڈال دو“ کے فارمولے کے تحت ہر منفر سے مسلمانوں کی بیخ کنی کا بھی تمنا کرتا ہے۔ بہر حال یہ ایک تفصیل طلب مسئلہ ہے جبکہ ہمارا فوری مسئلہ بھارت کی افغان پالیسی ہے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد بھارت نے ہمارے ہمسائے افغانستان کو گلے لگا لیا یہ افغان بھارت دوستی 1980ء تک قائم رہی۔ افغان وار شروع ہوئی تو پاکستان کو افغانستان میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ 1990ء میں روس گیا تو پاکستان نے رہائی، مہر دی اور حکمت یار کی شکل میں افغانستان پر قبضہ کر لیا، افغانستان کے یہ رہنما فارغ ہوئے تو پاکستان طالبان کی صورت میں افغانستان میں موجود رہا۔ اس دوران بھارت نے شمالی اتحاد پر سرمایہ کاری شروع کر دی، اکتوبر نومبر 2001ء میں شمالی اتحاد نے طالبان کو شکست دے دی، جس کے بعد امریکہ نے حامد کرزی کو افغانستان کا حکمران بنادیا، اس کے ساتھ ہی پاکستان افغانستان سے خارج ہونا شروع ہو گیا اور بھارت کو ایک بار پھر ہمسائے کے ہمسائے کو دوست بنانے کا موقع مل گیا 2001ء میں 21 برس بعد بھارت نے افغانستان کے وزیر داخلہ پولس قانونی کو دہلی بلایا، جموں سنگھ، قربانز اس اور انڈوانی نے اس کے ساتھ ملاقات کی اور اسے افغانستان میں پولیس کا نظام ترتیب دینے کی پیشکش کی، بھارت نے افغانستان کیلئے 10 کروڑ ڈالر امداد کا اعلان بھی کیا، دہلی کا بل پروا لیں شروع کرنے کا عندیہ بھی دیا اور افغانستان کی تعمیر نو کیلئے اپنی خدمات بھی پیش کر دیں جس

کے ساتھ ہی افغانستان میں ایک نیا سفارتی کھیل شروع ہو گیا۔

پاکستان بھارت کی یہ سیاسی دست و درازیاں دیکھتا رہا لیکن دہشت گردی کی جنگ میں ملوث ہونے کے خطرے اور امریکی دباؤ کے باعث کھل کر بھارت سے احتجاج نہ کر سکا، صدر کرزئی کو پاکستان کی نسبت بھارت زیادہ سوٹ کرتا تھا وہ بھی بازو پھیلا کر بھارت کی طرف بڑھے، یوں ہمسائے کا ہمسایہ بھارت کا دوست بن گیا، بھارت نے افغانستان میں 14 سفارتی اڈے بنائے اور صوبہ سرحد اور بلوچستان میں گزیر شروع کر دی، بھارت نے وزیرستان میں لڑنے والے ”مجاہدین“ اور سردار اکبر خان بگٹی کو ہتھیار تک فراہم کئے، بھارت کی اس سفارتی مہربانی سے پاکستان کے اندرونی حالات خراب ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ نواب اکبر خان بگٹی انتقال فرما گئے اور بلوچستان میں آگ لگ گئی، بھارت اب اس آگ پر تیل پھینک رہا ہے، تیل پھینکنے کی وجہ سے حکومت کو پہلی بار تپش محسوس ہو رہی ہے، مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے 6 ستمبر 2006ء کو افغانستان کے دورے کے دوران صدر پرویز مشرف نے افغانستان کے صدر حامد کرزئی سے بھارتی نوآوری کا شکوہ کیا تھا جس کے جواب میں صدر کرزئی نے ”میں سر، نو سر“ کے سوا کوئی جواب نہیں دیا تھا، مجھے اندیشہ ہے آنے والے دنوں میں افغانستان کی طرف سے بھارتی گزیر میں اضافہ ہو جائے گا اور یہ اضافہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ہم بھی بھارت کے کسی ہمسائے کو اپنا دوست نہیں بناتے، ہم بھی کسی خالستان کو ”تیل“ فراہم نہیں کرتے کیونکہ چانکیہ نے کہا تھا ”جب تک دشمن وارد نہ کرے اس وقت تک اس کے پاؤں میں کانٹے چھوڑتے رہو“ اور یہ بھی بھارت کی خارجہ پالیسی ہے۔





## پاکستان کا سوئزر لینڈ

میرا قیام مرغزار کے واسطے بیس میں تھا۔

واسطے بیس سوات کے پہلے دائی میاں گل عبدالودود نے بنوایا تھا، میاں گل عبدالودود کو لوگ بادشاہ صاحب کہتے تھے، بادشاہ صاحب کا محل یگورہ میں تھا لیکن گرمیوں میں یگورہ کا درجہ حرارت بڑھ جاتا تھا لہذا شاہی خاندان نے ایک گرمائی محل بنانے کا فیصلہ کیا، اس سلسلے میں یگورہ سے چند میل کے فاصلے پر ایک خوبصورت جگہ کا انتخاب کیا گیا، اس جگہ کو بادشاہ صاحب نے مرغزار کا نام دیا، بادشاہ صاحب نے مرغزار میں سفید سنگ مرمر سے ایک چھوٹا سا خوبصورت محل بنایا، یہ محل 1941ء میں مکمل ہوا، اس محل کیلئے انیس کانوں سے سنگ مرمر نکلوا گیا جن سے تاج محل کیلئے ماہل حاصل کیا گیا تھا، بادشاہ صاحب نے سنا تھا انگریزوں کے محل خانوں میں تختے اور گرم پانیوں کی الگ الگ نوٹیاں ہوتی ہیں چنانچہ انہوں نے سفید محل کیلئے لندن سے فلش سسٹم اور نوٹیاں منگوائیں، یہ اس علاقے کا پہلا فلش سسٹم تھا، انہوں نے ہاتھ درم میں دس بیسن لگوا دیے اور اس دس بیسن پر تختے اور گرم پانیوں کی نوٹیاں بھی لگوائیں، سفید محل کے لئے قدرتی چشموں کا پانی تین مختلف نیکیوں میں جمع کیا گیا، یہ پانی بعد ازاں محل کے مختلف لانوں اور مختلف فواروں تک لایا گیا، جب ہندوستان میں نکلی کچی تو سفید محل کیلئے ”پاور پلانٹ“ لگایا گیا، ٹیلی فون آیا تو ایکس چینج کی مدد سے سفید محل کو پورے ہندوستان کے ساتھ جوڑ دیا گیا، بادشاہ صاحب کی خراب گاہر کزی گل میں تھی جبکہ شہزادے شہزادیوں اور ملکہ (پاکاؤس) کیلئے بائیں جانب تین سطحوں پر کمرے بنائے گئے، محل کے ایک پہلو میں ایک خوبصورت دریائی ندی گزرتی تھی اور دوسرے پہلو میں پھولوں اور پھلوں کے سنکڑوں ہزاروں پودے تھے، یہ محل چاروں طرف سے سرسبز پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا اور ملکہ اترجہ سمیت برطانیہ ہندوستان اور پاکستان کی بے شمار شخصیات کو اس محل میں ٹھہرنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔

بادشاہ صاحب نے 1949ء میں سوات کا تخت اپنے صاحبزادے میاں گل جہاں زیب کے حوالے کر دیا تھا، میاں گل جہاں زیب کے تین بیٹے تھے، میاں گل امیر زیب، میاں گل اورنگ زیب اور احمد زیب، صدر پاکستان ایوب خان نے اپنی ایک صاحبزادی جلیلہ میاں گل امیر زیب اور دوسری صاحبزادی نسیم میاں گل

اور گل نریب کے عقد میں دے دیں، میاں گل اور گل نریب ایم این اے اور میاں نواز شریف کے دور میں بلوچستان کے گورنر رہے ہیں، میاں گل امیر نریب کے دو بیٹے ہیں، اسفندیار اور شہریار، ریاست سوات 1969ء میں پاکستان میں ضم ہو گئی جس کے بعد بادشاہ صاحب کی جائیداد ان کی اولاد میں تقسیم ہونا شروع ہو گئی، اس تقسیم میں سفید گل میاں گل امیر نریب کے بیٹے اسفندیار کے حصے میں آ گیا، اسفندیار نے اس محل کو ہوٹل میں تبدیل کیا اور یہ ہوٹل لاہور کے کسی صاحب کو بیچے پر دے دیا، یہ صاحب کوئی بازو حق انسان ہیں لہذا انہوں نے ہوٹل میں تبدیلی ہونے کے باوجود اس عمارت کی تاریخی حیثیت کو بحال نہیں ہونے دیا۔ بادشاہ صاحب کا بیڑا روم اصل حالت میں موجود ہے جبکہ باقی کمرے بھی اسی فیصد تک اپنی اصل ہیئت میں برقرار ہیں۔

مجھے اس محل میں دو دن ٹھہرنے کا موقع ملا، یہ واقعی ایک "لائف ٹائم" تجربہ تھا، اس جگہ میں ایک پراسراریت اور ایک تخلیقی اداسی ہے، آپ جب رات ایک اور دو بجے کے دوران وسیط مجلس کے لان میں بیٹھتے ہیں تو آپ ہندوستان کی تاریخ کو اپنے ارد گرد چلتے پھرتے دیکھتے ہیں، آپ محسوس کرتے ہیں ہندوستان کے بے شمار وائسرائے اور ملکہ اثر بھ پورے کرد فر کے ساتھ آپ کے سامنے بیٹھی ہیں اور آپ ان کی گفتگو سن رہے ہیں، میں نے زندگی میں بے شمار چاند دیکھے ہیں لیکن جو چاند میں نے سرخسار کے اس سفید گل میں دیکھا مجھے وہ چاند دنیا کے کسی ملک، کسی کوٹے میں دکھائی نہیں دیا، ایک چاند مجھے 2003ء کی گرمیوں میں بہاولپور کے ایک گاؤں میں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اس گاؤں میں بجلی نہیں تھی، میں صبح کی ٹوٹی ہوئی چار پائی پر چٹ لیٹا تھا، میں نے اوپر دیکھا، اوپر ایک شفاف آسمان تھا جس پر ایک چاند اور اریوں ستارے ٹھہرا رہے تھے، میں نے اس سے پہلے کبھی اتنا شفاف آسمان، اتنا ٹھنڈا چاند اور اتنے خشک ستارے نہیں دیکھے تھے، اس منظر نے مجھے اتنا مبہوت کر دیا کہ میں اٹھا، میں نے مٹی کے خنڈے کوڑے سے وضو کیا اور شکر اے کیلئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جھک گیا، میرا خیال تھا اتنا قیمتی اور اچھوتا منظر میری زندگی میں دوبارہ نہیں آئے گا لیکن سفید گل کا چاند بہاولپور کے اس چاند سے سنگزروں جڑاؤں گنا خوبصورت اور نظر میں اترنے والا تھا، وہاں اس رات سفید گل تھا، لان میں نرم ہوائی اور ندی کی ہلکی ہلکی سرگوشیاں تھیں، مجھے محسوس ہوا میرے پورے بدن کا خون حلق میں جمع ہو گیا ہے اور بس ایک سانس لینے کی دیر ہے اور یہ سارا خون اور یہ سارا بدن فضا میں تحلیل ہو جائے گا اور میں سرخسار کی نرم ہواؤں کی نرم رگوں میں جذب ہو جاؤں گا، میں ختم ہو جاؤں گا۔

سوات میرا اور مردان تھا، بہاولپور مردان اس ملک کے لاکھوں کروڑوں شریلوں اور شریف بچوں کی طرح کٹڑ کیوں کے پنوں اور دواؤں کے دروں اور چٹوں کی درزوں کے پیچھے پروان چڑھاؤ پروان چڑھتے ہی اس پر شرم و حیا اور شیش کی مہر لگ گئی، میں نے اپنے اندر ایک قبر کھودی اور اسے اس قبر میں دفن کر دیا، میں ایک مزدور تھا لہذا میں شاہجہاں اور جہانگیر کی طرح اس قبر کو سفید سنگ مرمر سے ڈھکوا رہا تھا اس پر تاج محل بنا سکا لیکن میں نے اسے اپنے دل کی سرخ دیواریں اور اپنی ٹوٹی اور مرنی لور مر جھاتی خواہشوں کی سفیدی ضرور دے دی، میں نے اسے اپنی بیانی کے موتیوں کا تھوڑا سا دیواہولت میرا



دوسرا رومان تھا، میں نے سمجھن میں کسی جگہ پڑھا تھا سوات پاکستان کا سوئزر لینڈ ہے جس کے بعد سوات اور سوئزر لینڈ دونوں میری خواہشوں کی گہرستوں میں شامل ہو گئے لیکن قدرت کے ہیر پھیر سے اس گہرست کی ترتیب بدل گئی، میں پہلے سوئزر لینڈ گیا اور اس کے بعد سوات، سوئزر لینڈ حقیقتاً ایک خوبصورت اور نظروں میں اتر جانے والا ملک تھا، اس ملک میں سمندر نہیں لیکن اس کے ملک کے لوگوں نے اپنی جھیلوں کو سمندروں کی شکل و سعی، ان کی جھیلیں فقط جھیلیں نہیں تھیں آئینہ تھے، میں ان کی تھیں جھیل پر گیا، میں نے انٹر لاکن کی جھیلیں دیکھیں، میں نے یوشلیس کی جھیل پر لوگوں کو ہتھ باز کر کے دیکھا اور میں جینوا کی جھیل پر گھنٹوں بیٹھا رہا، میں نے ایسی جھیلیں، ایسا سبزہ اور ایسا پاک صاف ماحول کسی دوسری جگہ نہیں دیکھا، پوری دنیا میں گھاس کافی جاتی ہے لیکن سوئس دنیا کی واحد قوم ہے جو قہقہوں سے گھاس کا تکی ہے جس کا صفائی میں کوئی جواب نہیں، آپ کو کسی ڈنٹ پاتھ، کسی سڑک پر گھاس کا کوئی فالٹو نہ لائیں ملے گا، میں نے سوئزر لینڈ میں صفائی کو پورے ایمان کی شکل اختیار کرتے دیکھا، لوگ انتہائی مہذب، شائستہ اور دھیمے تھے، وہ اجنبیوں سے محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے اور پورے ملک میں صرف 16 سو پاکستانی تھے اور یہ سوئزر لینڈ کی تیسری بڑی خوبی تھی۔

میں سوئزر لینڈ کا یہ میچ لے کر پاکستان واپس آ گیا، اس کے بعد میں سوات جانے کے منصوبے بنانے لگا لیکن ہر گرمیوں میں یہ پروگرام التوا کا شکار ہو جاتا، کبھی وقت آڑے آ جاتا اور کبھی حالات اور مصروفیت ہمارے درمیان حائل ہو جاتی لیکن میں نے جولائی کے آخری ہفتوں میں مصروفیت کو شکست دے دی اور میں نے پاکستان کے سوئزر لینڈ میں قدم رکھ دیے۔

(کالم کا باقی حصہ اگلے صفحات میں ملاحظہ کیجئے)



## سرد حکومت سے درخواست

میں سوات میں داخل ہوا تو مجھے فوراً اس لہور پے کا واقعہ یاد آ گیا جس نے حج سے واپسی پر کہا تھا "اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ اور مدینہ رسول کا شہر ہے لیکن یار دہور لہور ہے" سوات کو دیکھ کر مجھے بھی سوئزر لینڈ یاد آ گیا اور میں نے بھی بے اختیار فرہ لگایا "سوات سوات ہے اور سوئزر لینڈ سوئزر لینڈ" مجھے محسوس ہوا جس شخص نے سوات کو پاکستان کا سوئزر لینڈ کہا تھا یقیناً اس قسم ظریف نے سوئزر لینڈ نہیں دیکھا ہوگا ورنہ وہ یہ "کل حق" کہنے سے پہلے سو بار سوچتا۔

میں نے محسوس کیا شاید اس شخص نے سوات کی قدرتی خوبصورتی، بہترے اور نظاروں کی وجہ سے اسے پاکستان کا سوئزر لینڈ قرار دیا ہوگا، اگر اس نقطے سے دیکھا جائے تو اس کی بات درست تھی، اللہ تعالیٰ نے سوات کو بھی سوئزر لینڈ جتنی خوبصورتی سے نوازا رکھا ہے لیکن صرف قدرتی خوبصورتی کافی نہیں ہوتی ملکوں اور علاقوں کو انسان کی مٹائی اور محنت بھی درکار ہوتی ہے اور یہ حقیقت ہے جب تک قدرت اور انسان کے درمیان ایک "ورکنگ ریلیشن شپ" پیدا نہیں ہوتا، اس وقت تک چیزیں مکمل نہیں ہوتیں۔ حج کو لیجیے اللہ تعالیٰ نے حج پیدا کیا، مٹی، ہوا اور پانی بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے لیکن جب تک انسان اس حج، مٹی، ہوا اور پانی کو کھیت کی شکل نہیں دیتا انسان اناج میں خود کفیل نہیں ہوتا، اس کی بھوک ختم نہیں ہوتی لہذا دنیا کے جس غلطے، جس کو نے انسان نے اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کر لیا وہ انسان، وہ کوٹا اور وہ غلط خوشحال ہو گیا، اس کا مقدر بدل گیا لیکن انسانوں کے جس گروہ نے سستی اور تاخیر کا مظاہرہ کیا وہ گروہ اور اس گروہ کا ملک ترقی کے عمل میں پیچھے رہ گیا، یہ تاریخ کا سب سے بڑا جھگ ہے، پانی اللہ تعالیٰ دیتا ہے لیکن اس پانی کو ڈیم میں بدلنا، اس کی نہریں بنانا اور ان نہروں کو کھیتوں اور گھروں تک پہنچانا انسان کا کام ہوتا ہے، موسم، ماحول اور حالات بھی اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے لیکن ان حالات، اس ماحول اور ان موسموں کو اپنے لئے منفعت بخش بنانا انسان کا کام ہوتا ہے، آپ اس ریفرفنس کو سامنے رکھ کر اصل سوئزر لینڈ اور پاکستانی سوئزر لینڈ کا تقابل کیجئے تو آپ کو دونوں میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوگا، قدرت نے دونوں خطوں کو خوبصورتی، موسم اور ایک جیسے جغرافیائی حالات بخشے تھے لیکن سوئزر لینڈ کے لوگوں نے ان حالات کے دامن



میں اپنا حصہ اُل کرا سے دنیا کا خوبصورت ترین ملک بنادیا جبکہ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں سوات بخشا تو ہم نے اس کا خوبصورت چہرہ نوج لیا، ہم نے اسے 21 ویں صدی کے جدید دور میں 9 ویں صدی کا پسماندہ قصبہ بنادیا، ہم نے اسے بدترین شکل میں ڈھال دیا۔

آپ اگر اسلام آباد سے سوات جائیں تو اس کا فاصلہ پونے دو سو کلومیٹر بنتا ہے، جدید اور مہذب ممالک میں یہ فاصلہ ایک سے ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو ہے لیکن لوگ یہ فاصلہ ساڑھے سات گھنٹے میں طے کرتے ہیں، اس کی وجہ سڑک ہے، ملاکنڈ سے یگنورہ تک سڑک انتہائی خستہ اور کھنڈر ہے، جن چار جگہوں پر اس کھنڈر کی مرمت جاری ہے لیکن اس مرمت کی رفتار اور کوالٹی اتنی بری ہے کہ محسوس ہوتا ہے اولیٰ یہ سڑک دو سال سے پہلے مکمل نہیں ہوگی اور اگر یہ مکمل ہو بھی گئی تو اس کی میعاد چھ ماہ سے زائد نہیں ہوگی، میں نے اپنی آنکھوں سے مزدوروں کو مٹی پر تارکول بچھاتے دیکھا، آپ خود سوچئے یہ تارکول مٹی کو کتنی دیر سنبھال سکے گی، یگنورہ سوات کا ہیڈ کوارٹر ہے، اس کے موسم اور پشاور کے موسم میں کوئی فرق نہیں، شہر میں وہی رش، شور، گرد اور گرمی ہے جس سے بھاگ کر لوگ سوات جیسی جگہوں کی تلاش میں نکلتے ہیں لہذا لوگوں کی کوشش ہوتی ہے وہ یگنورہ میں رکنے کی بجائے آگے اصل سوات کی طرف نکل جائیں، سوات کی اصل پہچان اس کے تین مقامات مالم جبہ، بحرین اور کالام ہیں لیکن بد قسمتی سے ان تینوں علاقوں کی سڑکیں بھی انتہائی خستہ ہیں، یگنورہ سے مالم جبہ اور کالام کا فاصلہ 50 اور 90 کلومیٹر ہے لیکن اگر ہم اپنی گاڑی سے وہاں جائیں تو ہمیں مالم جبہ پہنچنے کیلئے ساڑھے تین گھنٹے جبکہ کالام کیلئے ساڑھے پانچ گھنٹے سڑک ٹاپڑتا ہے، اس سفر کے دوران ایسے ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں دس کلومیٹر ٹی گھنٹے کی رفتار سے گاڑی چلانا پڑتی ہے۔ کالام اس وادی کا سب سے خوبصورت مقام ہے، اس مقام تک پہنچنا انتہائی دشوار اور مشکل ہے، مدین کے بعد کالام تک سڑک نوٹ چکی ہے، کالام سے آگے مہوڈنڈ جھیل ہے، یہ جھیل انتہائی خوبصورت اور پرسکون ہے، کالام جانے والے 95 فیصد لوگ مہوڈنڈ جاتے ہیں لیکن اس جھیل تک جانے کیلئے سڑک کی نعمت موجود نہیں، لوگوں کو اڑھائی سے ساڑھے تین ہزار روپے میں جیپ لینا پڑتی ہے اور یہ جیپ 35 کلومیٹر کا فاصلہ چار گھنٹے میں طے کرتی ہے، راستہ انتہائی غیر محفوظ اور پتھر پلا ہے اس میں بے شمار ایسے سوز آتے ہیں جہاں ہزاروں فٹ گہری کھائی اور جیپ کے ٹائروں کے درمیان ایک دواغ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، یگنورہ سے کالام اور کالام سے مہوڈنڈ تک راستے میں کوئی ٹوائے نہیں، مہوڈنڈ جھیل پر بھی اس قسم کی کوئی سہولت موجود نہیں، میں نے سارا راستہ خواتین اور بچوں کو مشکل میں دیکھا، مردان سے یگنورہ اور یگنورہ سے کالام اور کالام سے مہوڈنڈ تک ہر طرف گندگی کے ڈمیر لگے ہیں، ہر طرف رپیر، خالی بوتلیں، ٹین اور جھلکے پڑے ہیں۔ مسئلہ یہ گندہ اور راستوں کی یہ خستہ حالی نہیں اصل مسئلہ صوبہ سرحد کی حکومت ہے، حیرت ہوتی ہے یہ سارا گندہ اور یہ ساری بد نظمی اسلامی حکومت کی ناک کے عین نیچے جھیل رہی ہے اور حکومت اس سلسلے میں کچھ نہیں کر رہی مجھے سوات جا کر محسوس ہوا جو حکومت ایک سڑک اور ایک پمپنگ پلانٹ درست نہیں کر سکتی کل کلاں کو اگر اسے پورے ملک کا نظم و نسق مل گیا تو وہ کیا کرے گی۔

کالم نگاروں کے بارے میں عموماً کہا جاتا ہے یہ لوگ مسئلہ تو بیان کر دیتے ہیں لیکن اس کا حل نہیں دیتے۔ میں آج یہ گلہ بھی دور کرنا چاہتا ہوں، میں آج سرحد حکومت کو اس مسئلے کا حل بھی بتاتا ہوں، سوات کے تین بڑے مسئلے ہیں اول سڑکیں، دوم تفریحی مقامات پر گندگی اور سوم سیاسی مراکز اور ان کے راستوں میں ٹوئٹلس کی دستیابی، ان تینوں مسئلوں کے ایسے حل موجود ہیں جن پر ایک پیسہ خرچ نہیں ہوگا سب سے پہلے سڑکوں کو لیتے ہیں، سرحد حکومت وادی سوات کی ساری سڑکیں چٹکوں سے فائنس کرائے، وہ مختلف میٹروں سے بات چیت کرے، میٹروں کو سہولت بخشیں اور چٹریٹنگس بنانے پر راضی کرے، چٹک سڑکیں بنانے کے بعد انٹری اور ایگزٹ پوائنٹس پر ٹول پلازے بنادیں اور ان تفریحی مقامات میں داخل ہونے والے لوگوں سے فی گاڑی تین سے پانچ سو روپے ٹول ٹیکس وصول کر لیں، اس رقم سے میٹروں کی قسط بھی پوری ہو جائے گی اور سیاحوں کو بھی چھپوں کے کرائے سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اسی طرح حکومت مختلف ملٹی نیشنل کمپنیوں کو گندگی اٹھانے اور عارضی ٹوئٹلس بنانے کی ذمہ داری سونپ دے، اس وقت پاکستان میں مشروبات، سگریٹس، آئس کریم، ٹیلی کیوٹیکیشن اور ہینڈ رول کی 900 قومی اور بین الاقوامی کمپنیاں کام کر رہی ہیں، حکومت ان میں سے صرف دس کمپنیوں کا انتخاب کرے اور پوری سوات ویلی ان کمپنیوں میں تقسیم کر دے، کمپنیاں اپنے اپنے علاقے میں ڈس بیئرنگا دیں، وہاں اپنے باوردی سوپر تینمات کریں اور اس علاقے میں کوڑا اٹھانے اور جلانے والے ایک دو پونٹ لگا دیں تو اس سے سیاحوں کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا اور ان کمپنیوں کی ٹیک نامی میں بھی اضافہ ہوگا۔ اسی طرح کسی ٹیلی کیوٹیکیشن کمپنی یا مشروبات کی کسی فرم سے سوات کے راستے میں عارضی ٹوئٹلس بھی بنوائے جاسکتے ہیں، یہ کمپنی ان ٹوئٹلس کی صفائی اور سیدھے کیلئے باوردی ورکر ملازم رکھ لے۔ اس بندوبست سے لوگوں کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا، حکومت کی جیب سے کوئی پیسہ بھی خرچ نہیں ہوگا اور ان کمپنیوں کو بھی اپنی ٹیک نامی اور ایڈورٹائزنگ کا موقع مل جائے گا لیکن آخر میں پھر وہی بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے، یہ سب کچھ کرے گا کون؟ کنفیوشس نے کہا تھا اگر انسان چلنا چاہے تو اس کے سامنے ہزار راستے ہوتے ہیں لیکن اگر وہ حرکت نہ کرنا چاہے تو اس کے پاس دو ہزار بہانے ہوتے ہیں، ہماری حکومتیں بھی ایسی شہنشاہ ہیں جن کے پاس کام نہ کرنے کے دس دس ہزار بہانے ہوتے ہیں یہ حقیقت جانتا ہوں لیکن اس کے باوجود نہ جانے کیوں یہ دل چاہتا ہے ایک بار سرحد حکومت سے درخواست ضرور کی جائے ان سے اتنا ضرور کہا جائے اگر وہ سوات کو اپنا ایک ”ورکنگ ڈے“ دے دیں تو سوات حقیقتاً پاکستان کا سونڈر لینڈ بن سکتا ہے۔





## بلوچ قیادت بھی قصور وار ہے

علی کا تعلق بلوچستان کے علاقے ڈوب سے تھا، وہ کاندھلوی تنظیم یونیورسٹی میں ایم فل کر رہا تھا۔ وہ گزشتہ روز میرے پاس آیا، اس کے پاس دو فائلیں تھیں، اس نے فائلیں کھولیں، کاغذ لٹائے اور یہ سارے کاغذ میز پر پھیلا دیئے، میں خاموشی سے اس کی یہ کارروائی دیکھتا رہا۔

اس نے ایک کاغذ اٹھایا اور میری طرف لہرا کر بولا ”سر یہ اسلام آباد کا بجٹ ہے، 22 جون 2006ء کو ڈی اے کے چیئرمین نے 21 ارب 23 کروڑ 80 لاکھ روپے کے بجٹ کا اعلان کیا تھا، چیئرمین نے وفاقی حکومت کے 15 پرائیکٹس کا ذکر بھی کیا، ان پرائیکٹس پر 19 ارب 12 کروڑ روپے خرچ ہوں گے۔ وفاقی حکومت پر 19 ارب روپے بلیک سکلر ڈیولپمنٹ پروگرام (پی ایس ڈی پی) سے دے گی، سی ڈی اے اس رقم سے ایوان صدر میں ایک نئی کالونی تعمیر کرے گا، ایوان صدر میں پولیس کے لئے رہائش گاہیں بنائے گا، قومی اسمبلی کے سپیکر کا گھر بنائے گا، پارلیمنٹ ہاؤس کا انٹر کنڈریشٹ اپ گریڈ کرے گا، کلوز سرکٹ ٹی وی سسٹم لگائے گا، سیکرٹریٹ فارن آفس اور پارلیمنٹ ہاؤس کے سنٹرل انٹر کنڈریشٹ سسٹم کی مرمت کرانے گا، ایوان صدر، سینٹ ہال اور پارلیمنٹ ہاؤس کا فرنچیز بدلے گا اور پارلیمنٹ ہاؤس میں سینڈنگ کیٹیوں کے چیئرمینوں کے لئے نئے دفاتر بنائے گا“ میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا، اس نے کہا ”سر اسلام آباد میں صرف دس لاکھ لوگ رہتے ہیں اور اس کا کل رقبہ 906 مربع کلومیٹر ہے، حکومت اگلے سال دس لاکھ لوگوں اور 906 مربع کلومیٹر کے اس چھوٹے سے شہر پر 21 ارب 23 کروڑ 80 لاکھ روپے لگائے گی جبکہ ایوان صدر سے پارلیمنٹ ہاؤس تک نصف کلومیٹر کے دائرے میں 19 ارب 12 کروڑ روپے خرچ کئے جائیں گے“ میں خاموشی سے سنتا رہا، اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور دوسرا کاغذ اٹھا کر بولا ”اس کے مقابلے میں بلوچستان کی حکومت 2006-2007ء میں پورے صوبے پر 59 ارب 69 کروڑ روپے خرچ کرے گی، جس میں ملٹیٹ بینک کا 17 ارب روپے کا قرضہ بھی شامل ہے۔ اگر ہم یہ 17 ارب روپے نکال دیں تو یہ رقم 42 ارب روپے بن جاتی ہے، گویا اس سال پورے بلوچستان پر 42 ارب روپے جبکہ اسلام آباد پر 40 ارب 35 کروڑ 80 لاکھ (21 ارب 23 کروڑ 80 لاکھ + 19 ارب 12



کرڈ اور پے خرچ کئے جائیں گے۔ وہ رکا اس نے کاغذ اٹھایا اور اس کے درمیان میں انگلی رکھ کر بولا "آپ بلوچستان کا ترقیاتی بجٹ دیکھئے حکومت پورے بلوچستان کے ترقیاتی کاموں پر 10 ارب 82 کروڑ روپے خرچ کرے گی" میں خاموش رہا، وہ رک کر بولا "سر بلوچستان کا رقبہ 3 لاکھ 47 ہزار ایک سو 90 مربع کلومیٹر ہے، یہ پاکستان کا سب سے بڑا محروم اور غریب صوبہ ہے۔ سر کیا یہ ظلم نہیں حکومت 906 مربع کلومیٹر کے اسلام آباد اور دس لاکھ لوگوں پر 40 ارب روپے خرچ کرے جبکہ تین لاکھ 47 ہزار ایک سو 80 مربع کلومیٹر کے بلوچستان اور ایک کروڑ بلوچوں کی ترقی پر صرف دس ارب 82 کروڑ روپے خرچ ہوں" کیا یہ ظلم نہیں ایوان صدر سے پارلیمنٹ ہاؤس تک نصف کلومیٹر کی ترقی پر 19 ارب روپے خرچ کئے جائیں اور گوارہ سے لے کر ڈوب تک اور حب سے لے کر چمن تک ساڑھے تین لاکھ مربع کلومیٹر پر صرف 10 ارب 82 کروڑ روپے؟" وہ رکا اس نے سانس لیا اور پھر مسکرا کر بولا "لیکن سر اس کے باوجود جب ہم لوگ بولتے ہیں تو آپ لوگ ہمیں غدار کہتے ہیں آپ ہمیں قوم پرست کا خطاب دیتے ہیں۔" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے اسلام آباد کا بجٹ لیا، ایک نظر اس پر ڈالی اور ایک جگہ انگلی رکھ کر کہا "یہ دیکھو چیئرمین نے اعلان کیا ہے سی ڈی اے 21 ارب روپے میں سے 14 ارب 97 کروڑ 50 لاکھ روپے اپنے وسائل سے حاصل کرے گا جبکہ باقی رقم اس کے پاس پہلے سے موجود ہے" وہ خاموشی سے میری بات سنتا رہا، میں نے عرض کیا "اور جہاں تک ایوان صدر اور پارلیمنٹ ہاؤس پر 19 ارب روپے خرچ کرنے کا معاملہ ہے تو میں اس سلسلے میں تمہارے ساتھ متفق ہوں، واقعی حکومت کو چاہئے وہ پارلیمنٹ ہاؤس کے انٹرکنڈیکٹر کی اپ گریڈیشن کی بجائے اس رقم سے بلوچستان کے لوگوں کے لئے پینے کے پانی، روزگار، ہسپتالوں اور سکولوں کا بندوبست کرے" اس میں کوئی شک نہیں 19 ارب روپے بہت بڑی رقم ہوتی ہے اس رقم سے بلوچستان کے لاکھوں لوگوں کا مقدور بدل سکتا ہے لیکن تم جانتے ہو....." میں ایک لمحے کے لئے رکا اور اس کے بعد مسکرا کر بولا "بلوچستان کے عوام پر اس ظلم کے تمام تر ذمہ دار خود بلوچ ہیں" یہ بلوچستان کی سیاسی قیادت کا قصور ہے" اس نے چڑک کر میری طرف دیکھا میں نے عرض کیا "کیا تم بتا سکتے ہو پاکستان میں مہنگی ترین جگہ کون سی ہے" اس نے ذرا دیر سوچا اور اس کے بعد بولا "اسلام آباد کا ای سیون سیکٹر" میں نے انکار میں سر ہلا دیا "نہیں اس جگہ کا نام گوارہ ہے" بھٹو کے دور میں دس اور جنرل ضیاء الحق کے دور میں امریکہ نے گوارہ کی اتنی قیمت لگائی تھی جس سے اسلام آباد جیسے دس شہر بنائے اور خریدے جاسکتے ہیں پچھلے پانچ برسوں میں گوارہ میں 80 ہزار ایکڑ سرکاری زمین خریدی، اور چنگی گورگوارہ کی زمینوں سے سندھ، پنجاب اور بلوچستان کے دس ہزار پراپرٹی ڈیلر ارب پتی بن گئے، بلوچستان کی سیاسی قیادت ان ساری زمینوں کی خرید و فروخت میں شامل تھی، ان زمینوں کی تمام تر سودے بازی چیف منسٹر ہاؤس میں ہوئی تھی اور چیف منسٹر نے اس سے باقاعدہ حصہ وصول کیا تھا، مجھے پورٹس ایجنٹ کی شینڈلنگ کمپنی کی ایک رپورٹ پڑھنے کا اتفاق ہوا اس رپورٹ میں انکشاف ہوا حکومت نے بندرگاہ کے لئے 4 ہزار ایکڑ زمین چھوڑی تھی لیکن رزمین بھی

اچانک غائب ہو گئی لہذا اگر اسلام آباد کی انتظامیہ پلاسٹک سچ کر سال میں 15 ارب روپے جمع کر سکتی ہے تو کیا بلوچستان حکومت کو ادارہ کی زمینوں سے سود و سوارب روپے نہیں حاصل کر سکتی تھی؟ کیا وہ گواد کے پلاسٹک سچ کر بلوچستان کے لوگوں کا مفاد نہیں بدل سکتی؟" میں رکا" میں نے غور سے نوجوان کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر عرض کیا "بلوچستان کے چیف منسٹر جناب جام یوسف ہفتے میں تین دن اسلام آباد میں گزارتے ہیں جناب شوکت عزیز سے پہلے بلوچ سردار میر ظفر اللہ جمالی پاکستان کے وزیراعظم تھے نواز شریف کے دور میں سردار اختر میمن گل مسلم لیگ کے حلیف تھے اور بے نظیر بھٹو کی حکومت میں نواب ذوالفقار بگٹی بلوچستان کے وزیر اعلیٰ اور پیپلز پارٹی کے اتحادی رہے یہ لوگ بھی اسلام آباد آتے جاتے رہتے تھے یہ لوگ خود اپنی آنکھوں سے ایوان صدر سے پارلیمنٹ ہاؤس کے نصف کلومیٹر پر اربوں روپے خرچ ہوتے دیکھتے تھے اور یہ لوگ آج بھی دیکھ رہے ہیں لیکن کیا انہوں نے آج تک اس پر احتجاج کیا؟ حقیقت تو یہ ہے ان لوگوں نے آج تک صدر اور وزیراعظم سے اجازت نہیں کیا۔ جناب عالی ہمارے پورے بلوچستان کا تقریباً بیٹھ 10 ارب روپے ہے جبکہ آپ تین عمارتوں کی تزئین و آرائش پر 19 ارب روپے خرچ کر رہے ہیں، حضور مہربانی فرما کر یہ 19 ارب روپے ہمیں دے دیں، ہم اپنے لوگوں کو پانی، روٹی اور روزگار دینا چاہتے ہیں۔"

میں رکا، اس کی طرف جھکا اور مسکرا کر عرض کیا "میر ظفر اللہ جمالی پورے پاکستان کے وزیراعظم تھے، وہ اپنے دور میں وزیراعظم ہاؤس کے پرے اور صوفے بدلے رہے، وہ بھی قالیں اور دیواروں کا رنگ تبدیل کرتے رہے مگر انہوں نے بلوچستان کیلئے کچھ نہ کیا" وہ خاموشی سے میری بات سنتا رہا، میں نے اس سے عرض کیا "میرے عزیز اگر آج بلوچستان غریب ہے اگر آج بلوچستان محروم اور پسامند ہے تو اس کی قصوروار بلوچستان کی سیاسی قیادت ہے، تمہارے اصل قصوروار بلوچستان میں بیٹھے ہیں لیکن تم انہیں اسلام آباد میں تلاش کر رہے ہو" میں نے تھوڑی دیر سوچا اور خوابیدہ آواز میں بولا "سر ہمارا ظالم کون ہے میں آپ سے یہ نہیں پوچھنے آیا، میں تو آپ سے بس اتنا جاننا چاہتا ہوں ظالم کون ہے میں ہو یا اسلام آباد میں؟ کیا اس کا ضمیر اسے ملامت نہیں کرتا؟" میں نے قبضہ لگا لیا اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا "نہیں میرے عزیز ظالموں کے ضمیر نہیں ہوا کرتے۔"





## بس آنکھیں بند کریں

”تم پنجابی ہو اور ہمارے دشمن ہو“ اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، کمرے میں سنسنی پھیل گئی، ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے، مجھے پہلی بار احساس ہوا پنجابی ہونا بڑی بات ہے اور اس ملک کے بے شمار لوگ پنجابیوں کو دشمن سمجھتے ہیں یہ کراچی شہر تھا اور ہم اس بلوچ سردار سے سو سال پرانی رائل ٹرپڈ نے آئے تھے یہ رائل ٹرپڈ کپٹن سکاٹ نے اس بلوچ سردار کے پردادا کو دی تھی یہ اس نوعیت کی تیسری رائل ٹرپڈ تھی پہلی دور انگلیس لندن میوزیم میں ہیں میرے ایک دوست کو پرانی رائل ٹرپڈ پرانی ٹکواریں اور پرانے فخر جمع کرنے کا شوق ہے اس نے اپنے گھر میں اسلحہ خانہ بنا رکھا ہے اسے اس رائل ٹرپڈ کے بارے میں علم ہوا تو اس نے ایک بروکر سردار کے پیچھے لگا دیا بروکر نے بلوچ سردار کو ملاقات کیلئے تیار کر لیا اور یوں ہم تینوں کراچی پہنچ گئے سودے کے دوران میں نے اور میرے دوست نے آجس میں پنجابی میں گفتگو شروع کر دی ہمارے منہ سے پنجابی سن کر بلوچ سردار بھدک گیا اور اس نے رائل ٹرپڈ بیچنے سے انکار کر دیا میرے دوست نے جب پوچھی تو سردار غصے سے بولا ”تم پنجابی ہو اور ہمارے دشمن ہو“ ہم حیران رہ گئے اس کا کہنا تھا ”تم لوگوں نے بلوچستان پر حملہ کیا ڈیرہ بگٹی پر بم اور میزائل پھینکے ہمارے سردار کو قتل کیا ہمارے سینکڑوں لوگ مارے اور اب تم لوگوں نے سردار اختر مینگل کو جیل میں بند کر رکھا ہے“ میں نے اس سے عرض کیا ”سردار صاحب ڈیرہ بگٹی پر حملہ پنجاب یا پنجابیوں نے نہیں کیا یہ دفاعی حکومت کا فیصلہ تھا اور حکومت نے اس معاملے میں کسی سے مشورہ نہیں کیا تھا“ سردار نے نفرت سے سر مارا اور غصے سے بولا ”ملک پر پنجابیوں کی حکومت ہے ہم بلوچستان آپریشن کو پنجابیوں کا حملہ سمجھتے ہیں بلوچ قتل کو کبھی نہیں بھولتا“ ہم پنجاب سے اپنے بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کی موت کا بدلہ ضرور لیں گے“ میں نے عرض کیا ”صدر پرویز مشرف پنجابی نہیں ہیں وہ مہاجر اور سندھی ہیں وزیر اعظم شوکت عزیز بھی خالص پنجابی نہیں ہیں جام یوسف بھی بلوچی اور سندھی ہیں اس سارے منصوبے میں صرف ایک پنجابی شامل تھا اور وہ پنجابی چودھری شجاعت حسین تھے لیکن ساری دنیا جانتی ہے چودھری صاحب نے حملے کی مخالفت کی تھی وہ اس مسئلے کو نہ اکر ات کے ذریعے حل کرنا چاہتے تھے چودھری شجاعت اور مشاہد حسین نہ صرف تین بار ڈیرہ بگٹی گئے تھے بلکہ انہوں نے حملے کو نالہ کی کوشش بھی کی تھی لیکن آپ



اس کے باوجود پنجاب کو الزام دے رہے ہیں "بلوچ سردار نے پہلو بدلا اور اسی لہجے میں بولا "فوج ہو پولیس ہو انتظام ہو یا سیاستدان ہوں یہ سب لوگ پنجابی ہیں اور ہمارے دشمن ہیں آپ میرے مہمان ہیں آپ چائے پیئیں اور اللہ حافظ! میں آپ کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور نہ ہی سودا بلوچ دشمنوں کے ساتھ حساب کرتے ہیں سودے نہیں" ہم دونوں نے سردار کو منانے کی کوشش کی لیکن وہ رخ پھیر کر بیٹھ گیا ہم نے چائے کے آخری گھونٹ پھرے سلام کیا اور باہر آ گئے۔

ہم دونوں بری طرح شرمندہ اور پریشان تھے میرے دوست کا کہنا تھا ہماری حکومت کی پالیسیاں بلوچستان سرحد سندھ اور پنجاب کو بہت فاصلے پر لے گئی ہیں کوئی ان دیکھی طاقت ہمارے لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کر رہی ہے اگر حکومت نے اس نفرت پر توجہ نہ دی تو شاید ہمارے دشمنوں کو پاکستان کو نقصان پہنچانے کیلئے زیادہ تر دوندہ کرنا پڑے ہم سب ایک دوسرے کے ساتھ لڑنا کر ختم ہو جائیں گے میں نے اس سے وضاحت کی درخواست کی "دوبولا" حکومت نے بلوچستان پر لشکر کشی کی اس حملے میں نواب اکبر بگٹی مارا گیا جبکہ بگٹی قبیلے کے بیسیوں لوگ ہلاک ہو گئے حکومت نے اس کے بعد نواب اختر مینگل کو گرفتار کر لیا اور اس پر ہونے والے انسانیت سوز مظالم کی خبریں اخبارات میں شائع ہونے لگیں کسی ان دیکھی طاقت نے لاکھوں کی تعداد میں پمفلٹ شائع کئے اور یہ پمفلٹ بلوچوں میں تقسیم کر دیئے بلوچستان میں خفیہ ریلوے لائنیں اور یہ بلوچوں کے غمے کو نفرت کی شکل دینے لگے بلوچوں کا عصا اب پنجاب اور فوج کی طرف منتقل ہو رہا ہے "میرا دوست خاموش ہوا اور ذرا دیر رک کر بولا "تم جنوبی وزیرستان کے آپریشن کو دیکھو ہم نے امریکہ کی خواہش پر وزیرستان میں اپنے لوگوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہم امریکہ کی غلط اطلاعات پر وانا میں میزائل داغ رہے ہیں امریکہ کہتا ہے فلاں جگہ اتنے دہشت گرد چھپے ہیں ہم اس جگہ میزائل داغ دیتے ہیں بعد ازاں بی بی سی اور سی این این انکشاف کرتے ہیں اس جگہ دہشت گردوں کی بجائے محصور طالب علم تھے اور ہم نے تہہ پڑھتے بچوں کو بھوسے سے اڑا دیا یہ انکشافات صوبہ سرحد کے حوام میں حکومت 'فوج اور پنجاب کے خلاف نفرت پیدا کر دیتے ہیں وانا میں سو سو بے گناہ لوگوں کے جنازے اٹھتے ہیں یہ جنازے بھی نفرت کی ایک ٹویل لکیر ہیں 'لوگ کہتے ہیں نیو فورسز بغیر اطلاع جنوبی وزیرستان پر حملہ کر دیتی ہیں اور ہماری حکومت اپنی کمزوری چھپانے کیلئے یہ بدنامی اپنے ذمہ لے لیتی ہے ہم اگر جنوبی وزیرستان جا کر دیکھیں تو وہاں کے لوگ پنجاب اور فوج کو ذمہ دار سمجھتے ہیں "میرا دوست رکا اور ذرا سا سوچ کر بولا "ہم اب کشمیریوں کے دلوں میں بھی نفرت پیدا کر رہے ہیں ہم نے 25 برس تک کشمیر میں آزادی کا لالہ چلائے رکھا پاکستان کے تمام شہروں سے سینکڑوں ہزاروں نوجوان کشمیر گئے اور آزادی کی جنگ کا اندھن بنے مجبوز کشمیر میں کوئی ایسا گھر کوئی ایسا خاندان نہیں جس میں کوئی نہ کوئی شہید نہ ہو 25 برسوں میں کوئی ایسا ہفتہ نہیں گزرا جب سرینگر ڈھ اور جموں میں ہڑتال نہ ہوئی ہو لیکن پھر ہم نے کشمیر پر یونین لے لیا کشمیر اب دو ماہ کا مسئلہ محسوس ہوتا ہے دو ماہ میں آزاد اور مقبوضہ کشمیر کی سرحدیں کھل جائیں گی جس کے بعد پاکستان اپنے موقف سے کئی

کوس پیچھے ہٹ جائے گا کشمیر سے ہماری یہ پسپائی بھی نفرت کی بنیاد بنے گی آزاد اور مقبوضہ کشمیر کے دو لاکھوں خاندان جو آزادی کا راستہ دیکھ رہے تھے اور پاکستان کے وہ ہزاروں خاندان جنہوں نے کشمیر کی آزادی کیلئے اپنے بچوں کی قربانی دی تھی وہ حکومت کے خلاف ہو جائیں گے یہ نفرت بھی کسی نہ کسی شکل میں باہر آئے گی اور ہمیں اس کا تاوان بھی ادا کرنا پڑے گا۔

میرادوست ذرا دیر کیلئے رکا اور دوبارہ گویا ہوا "یہ ملک بہت مضبوط تھا ہمارے لوگوں میں جذبہ ایمان اور حب الوطنی تھی پاکستان کے پاس دنیا کی بہترین فوج تھی اور ہماری فوج پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت تھی لیکن حکومت کی چند سیاسی غلطیوں کی وجہ سے ہماری فوج کا بیج بھی خراب ہوا اور ہمارے لوگ فوج سے بھی نفرت کرنے لگے تم خود سوچو دانا کے جن گھروں پر میزائل گرے اور جن لوگوں کے بچے شہید ہوئے اگر انہیں بدلے لینے کا موقع ملے تو وہ کیا کریں گے؟ یہ کس پر حملہ کریں گے؟ اور اس حملے میں کون لوگ مارے جائیں گے؟ ذرا سوچو اگر بلوچستان کے لوگ انتقام کا فیصلہ کر لیں تو یہ کس سے انتقام لیں گے اور اگر کشمیر میں شہید ہونے والے بچوں کے لواحقین خون بہا کا مطالبہ کریں اور اگر کشمیری اپنی پچیس تیس سال کی قریبیوں کا تاوان وصول کرنا چاہیں تو وہ کس کا گریبان پکڑیں گے؟ وہ رکا اور مسکرا کر بولا "تم خود سوچو ہم نے دو بڑی سیاسی جماعتوں کی قیادت کو جلا وطن کر رکھا ہے ہم افغانستان کی سرحد کو غیر محفوظ بنا چکے ہیں ہم ایران کے دشمنوں کی صف میں شامل ہو کر ایرانیوں کا دل توڑ چکے ہیں ہم روز بروز ہی طبقے کا دل دکھاتے ہیں اور ہم نے یہ ملک ان لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا ہے جو کبھی قرآن مجید کے چالیس سپارے بنا دیتے ہیں اور کبھی سال میں دو دو قوس کا انکشاف فرما دیتے ہیں لہذا میرا خیال ہے اب اس ملک کو نقصان پہنچانے کیلئے کسی بیرونی طاقت کی ضرورت نہیں ہم سب ایک دوسرے سے لڑ کر ختم ہو جائیں گے بلوچ پنجابیوں کا گلہ پکڑ لیں گے اور سندھی اور پشتون ایک دوسرے کا گریبان پھاڑ دیں گے ہم ان سے فارغ ہوں گے تو کشمیری ہماری ٹانگ توڑ دیں گے مولوی کلین شیو کو مارے گا اور کلین شیو مولوی پر حملہ کر دے گا تم یقین کرو ہمارے درمیان نفرتوں کے بیج بو دیئے گئے ہیں اور اب ان بیجوں کو قد آور درخت بننے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

میرادوست خاموش ہو گیا میں نے ایک لمبا سانس لیا اور سر پشت کے ساتھ ہکا کر آنکھیں بند کر لیں میں نے سوچا ان حالات میں کیوں تپا لیس سب سے اچھی حکمت عملی ہے ہنس آنکھیں بند کریں اور ملی کا انتظار کریں۔





## بلوچوں کے ساتھ زیادتی ہوتی رہی

بس تھوڑی سی مسئلہ مندی اور دورانہ کشی کی ضرورت تھی، اگر ہم پچاس یا ساٹھ کی دہائی میں یہ فیصلے کر لیتے تو آج بلوچستان میں پنجابیوں کے گھر جلنے، علیحدگی کے نعروں لگنے اور نہ آج وہاں دفاق مخالف عناصر پیدا ہوتے۔ بلوچستان میں 1952ء میں قدرتی گیس لکھی تھی، اگر حکومت اس وقت گیس کی ڈسٹری بیوشن بلوچوں کو دے دیتی تو آج صورتحال مختلف ہوتی، حکومت بلوچستان کے بارہ بڑے قبائل لیٹی، ان بارہ قبائل کی بارہ کمپنیاں بناتی اور ہر کمپنی کو گیس کی ترسیل اور فروخت کے حقوق دے دیتی، یہ کمپنیاں پاکستان کے مختلف علاقوں کو گیس فروخت کرتیں، گیس کی اس ڈسٹری بیوشن سے بلوچ قبائل خوشحال ہو جاتے جس سے انہیں گیس اور گیس سپلائی کی افادیت کا اندازہ ہوتا، انہیں معلوم ہوتا اگر گیس کی سپلائی اور فروخت بند ہو گئی تو ان کی آمدنی بند ہو جائے گی لیکن ہم نے ایسا نہ کیا، ہم نے گیس کی ترسیل اور ڈسٹری بیوشن وفاقی حکومت کے حوالے کر دی، اس دوران مارچ گیس کی 30 سے 40 کمپنیاں بنیں، یہ کمپنیاں بھی پنجابی اور سندھی بزنس مینوں کی ملکیت تھیں، یہ کمپنیاں سوئی گیس سے مارچ گیس لیتیں اور اسے سلنڈروں میں بھر کر ملک میں فروخت کر دیتیں جس سے بلوچوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ان کی گیس مندی اور پنجابی لے جاتے ہیں اور بلوچوں کے حصے صرف پائپ لائن آتی ہے، ہماری اس پالیسی کے باعث بلوچوں کی اس گیس کے ساتھ کوئی وابستگی پیدا نہیں ہو سکی لہذا وہ پچھلے چالیس برس سے اس پائپ لائن کو بھروسے سے اڑاتے چلے آ رہے ہیں، گیس کی اس نفرت سے بھی بلوچ سرداروں اور اپنی پاکستانی حکومت نے خوب فائدہ اٹھایا، انہوں نے لوگوں کو پنجاب کے خلاف بھڑکایا، اس پر وہ بیگانہ کی وجہ سے بلوچ پنجاب سے حرید دور ہوتے چلے گئے گو اس میں پنجاب اور پنجابیوں کا براہ راست کوئی قصور نہیں تھا اور یہ سب کچھ دارالحکومت میں پیشی ہوئی سول اور ملٹری بیورو کر رہی تھی لیکن اس کا نقصان پنجاب اور پنجابیوں کو پہنچا۔

بلوچستان انڈسٹری کے حوالے سے بھی محروم ہے۔ بلوچستان کی گیس سے پنجاب، سندھ اور سرحد میں ایک لاکھ اٹھارہ ہزار چھوٹے بڑے صنعتی یونٹ چلتے تھے، کھاد اور سینٹ بنانے والی تمام فیکٹریاں گیس سے چلتی تھیں لیکن بلوچستان میں کوئی فیکٹری، کوئی مل اور کوئی صنعت نہیں تھی، حکومت بھی جب کوئی سرکاری صنعتی یونٹ



لگاتی تھی تو وہ بلوچستان سے گیس لیتی تھی اور یونٹ پنجاب یا سندھ میں لگاتی تھی، اگر حکومت اس معاملے میں تھوڑی سی وسعت قلبی کا مظاہرہ کرتی اور وہ بلوچوں کے ساتھ پارٹنرشپ کی بنیاد پر بلوچستان میں فیکٹریاں لگاتی تو آج وہاں کی صورتحال یکسر مختلف ہوتی، اگر ہم بلوچستان میں صرف کھاد کے چھ کارخانے لگا دیے تو بلوچوں کے حالات بدل جاتے لیکن ہم نے ہر دور میں بلوچوں سے فاصلہ رکھا، ہم نے ان کے وسائل کو استعمال کئے لیکن ان وسائل کے بدلے میں انہیں دیا کچھ نہیں، ہم نے بلوچوں کو ہمیشہ برطانوی حکمرانوں کی طرح ذلیل کیا، قیام پاکستان سے پہلے وائسرائے دہلی میں بیٹھ کر بلوچوں پر حکومت کرتا تھا اور کوئٹہ جیکب آباد اور فورٹ سنڈھین (خواب) میں اس کے کارندے ہوتے تھے جو اپنی کمشٹری حیثیت سے سرکاری احکامات پر عملدرآمد کراتے تھے لیکن پاکستان بنا تو پاکستان بننے کے بعد بلوچستان پر فوج پنجابی اور سندھی حکومت کرنے لگے، انہوں نے پنجابی اسٹنٹ کمشنروں، لڑپئی کمشنروں اور پولیس افسروں کی مدد سے بلوچوں کو دہانا شروع کر دیا، اگر ہم بلوچوں کو بلوچ افسر دے دیجے تو شاید ان کے دل میں ہمارے لئے اتنی نفرت پیدا نہ ہوتی۔

صوبائی خود مختاری چھوٹے صوبوں کا ازلی مطالبہ ہے، چھوٹے صوبے یہ کہتے ہیں وفاق دفاع اور امور خارجہ اپنے پاس رکھے اور باقی سارے اختیارات ہمارے حوالے کر دے، شیخ مجیب الرحمن بھی وفاقی حکومت سے یہی مطالبہ کرتا تھا، میں جب بھی اس مطالبے پر غور کرتا ہوں تو مجھے اس میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا، میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ ہم لوگ صوبوں کو وفاق کی زنجیر میں کیوں جکڑ کر رکھنا چاہتے ہیں، اگر ہم ایک خوبصورت سی فیڈریشن بنائیں اور صوبوں کو داخلی خود مختاری دے دیں، صوبے اپنے حالات، کلچر اور آبادی کے مطابق پالیسیاں بنالیں، وہ خود فیصلہ کریں، انہوں نے کس طرح تجارت کرنی ہے، انہوں نے کس طرح ٹیکس جمع کرنا ہے، انہیں کون سا نظام تعلیم چاہئے اور وہ اپنے معاشرے میں کس طرح انصاف قائم کر سکتے ہیں، ہم یہ سب ان پر چھوڑ دیں اور انہیں اپنے ٹیکس خود لگانے اور خود وصول کرنے کی اجازت دے دیں، انہیں دوسرے ممالک کے ساتھ تجارت کرنے کی آزادی بھی دے دیں تو میرا خیال ہے اس سے ملک میں مثبت تبدیلیاں آئیں گی، اس سے صوبوں کی معاشی اور اقتصادی حالت بھی بدل جائے گی۔ لوگوں میں اعتماد بھی پیدا ہوگا اور ان کے تمام گلے شکوے بھی اپنی مقامی قیادت کی طرف منتقل ہو جائیں گے، اس قسم کی داخلی خود مختاری امریکہ تک میں موجود ہے، امریکہ کی 50 ریاستوں کا قانون تک ایک دوسرے سے مختلف ہے وہاں صنعت کار فیکٹریاں لگانے کیلئے ریاستوں سے سہولتوں کے ٹینڈر مانگتے ہیں اور ریاستیں بزنس مینوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے ان کے ساتھ باقاعدہ ڈائیلاگ کرتی ہیں، اگر ہم بھی ایسا کر لیں تو سرحد، بلوچستان، سندھ اور پنجاب میں ایک صحت مندانہ ترقیاتی مقابلہ شروع ہو سکتا ہے جس کے بعد پنجاب بھارتی پنجاب سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، بلوچستان ایران کے بلوچ علاقوں کے وسائل اور صوبہ سرحد کے عوام افغانستان کے پشتون علاقوں کے قدرتی ذرائع سے استفادہ کر سکتے ہیں، اسی طرح سندھ عرب کی ریاستوں کے ساتھ کاروبار کر سکتا ہے لیکن شاید یہ انتظام ہمارے حکمرانوں کو "سوت" نہیں کرتا کیونکہ صوبائی خود مختاری کے بعد

ملک پر مارشل لا لگا ہوا مشکل ہو جائے گا، ایکشنوں میں دھاندلی اور لوٹا کر لسی کا سلسلہ بند ہو جائے گا اور وفاقی حکومت کے لئے اپنے شاہی اخراجات پورے کرنا مشکل ہو جائے گا اور شاید اس سے فوجی بجٹ میں بھی کمی لانا پڑے جو درست ممکن نہیں۔ مشرقی پاکستان میں بھی یہی ہوا تھا اگر ہم مشرقی پاکستان کو داخلی خود مختاری دے دیتے تو سارے تنازعے ختم ہو جاتے لیکن اس وقت سوال پیدا ہوا تھا اگر داخلی خود مختاری دے دی گئی تو جنرل یحییٰ خان کا کیا بنے گا؟ نئے نظام میں باوردی صدر کی مَنجائش مشکل تھی چنانچہ ہماری وفاقی قوتوں نے جنرل یحییٰ خان کی مَنجائش نکالنے کا لئے پورا پاکستان خارج کر دیا، ہم آج بھی یہی کر رہے ہیں ہم کچھ لوگوں کی مَنجائش پیدا کرنے کے لئے چھوٹے صوبوں کے احساس محرومی کو آگ لگا رہے ہیں ہم انہیں 1971ء کی طرح سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔

بلوچستان اور بلوچوں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے یہ ایک سنگینی ہوئی حقیقت ہے ہمیں نہ صرف اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے بلکہ بلوچوں کے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کا ازالہ بھی کرنا چاہیے ہم ساٹھ برس لیت ہیں اگر ہم نے مزید 60 مہینوں کی تاخیر کر دی تو مجھے خدشہ ہے ہم وہاں پہنچ جائیں گے جہاں وہاں کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں اور جہاں کچھ تادے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

## پنجابی قصور وار ہیں

مہاتیر محمد نے 16 جولائی 1981ء میں ملائیشیا کے وزیر اعظم کا حلف اٹھایا اس وقت ملائیشیا دو بڑے نسل گردہوں میں تقسیم تھا ملائیشیا میں 60 فیصد ملائی مسلمان تھے اور 32 فیصد چینی ان دونوں گروہوں میں صدیوں سے آویزش چلی آرہی تھی چینی باشندے فطرتاً سرماہ کار اور برنس مین تھے لہذا وہ ملائیشیا کی 70 فیصد فیکٹریوں، فرموں، کمپنیوں، منڈیوں، بازاروں اور کاروبار پر قابض تھے جبکہ ان کے مقابلے میں ملائی باشندے انتہائی ناگفتہ بہ حالت کا شکار تھے ان کے پاس تعلیم، قومی روزگار تھا اور نہ ہی اچھی اور خوبصورت زندگی لہذا ملائی مسلمان چینیوں سے شدید نفرت کرتے تھے وہ ان کی املاک پر حملے بھی کرتے رہتے تھے اس کے رد عمل میں چینی ملائی مسلمانوں کو اپنی فیکٹریوں اور کمپنیوں میں توکری نہیں دیتے تھے مہاتیر محمد آیا تو اس نے ایک عجیب قانون بنایا اس نے قانون بنایا جس چینی برنس مین کا کاروبار 5 ملین رگٹ تک پہنچ جائے گا وہ کسی ملائی مسلمان کو اپنے کاروبار میں 30 فیصد کا حصہ دار بنائے گا چینیوں نے شروع شروع میں اس قانون کی بھرپور مخالفت کی انہوں نے اسے ظلم زیادتی اور سرماہ کاری کی توہین بھی قرار دیا لیکن بہت جلد وہ مہاتیر محمد کے وٹن کے قائل ہو گئے مہاتیر محمد کا خیال تھا ملائی مسلمان بے روزگار، غریب، نا آسودہ اور ان پڑھ ہیں لہذا ملائیشیا میں ان کے ”سیکس“ ”نیمس“ ہیں اور یہ اسے اپنا ملک نہیں سمجھ رہے ہیں لوگ جب کاروبار میں شریک ہوں گے اور جب ملائی اور چینی ایک ساتھ بیٹھیں گے تو دونوں کی دوری ختم ہو جائے گی اور ملائی مسلمانوں کی ملائیشیا کے ساتھ دلچسپی اور محبت پیدا ہو جائے گی مہاتیر محمد کا خیال درست نکلا آج آپ ملائیشیا جائیں تو آپ کو وہاں کے چینی خود کو چینی اور ملائی خود کو ملائی کہتے نہیں بلکہ سب لوگ خود کو ملانین شہری کہیں گے۔

اگر ہم ملائیشیا کی صورتحال کو سامنے رکھ کر پاکستان کا جائزہ لیں تو ہمیں دونوں میں بڑی مماثلت دکھائی دیتی ہے 1971ء تک پاکستان پانچ قومیتوں کا ملک تھا اس میں بنگالی، پشتون، بلوچ، سندھی اور پنجابی تھے ان پانچوں میں پنجابی زیادہ خوشحال تھے اس خوشحالی کی چار بڑی وجوہات تھیں ایک پنجاب دوسرے صوبوں کی نسبت ایک اہوار اور زرخیز صوبہ تھا اس کے پاس زمین پانی اور دوسرے قدرتی وسائل تھے دوسرا یہ صوبہ ہزاروں سال برصغیر کا دروازہ رہا تھا دنیا بھر کی اقوام پنجاب میں آئیں اور اس میں رچ بس گئیں قوموں کے اس ”انٹرایکشن“



کے نتیجے میں اس خطے کی ذہانت میں اضافہ ہوا اور پنجابی دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ ذہین اور معاملہ فہم ہو گئے تیسرا پنجاب انگریزوں کا "مین فوکس" تھا انگریز نے یہاں تعلیمی ادارے بنائے جن کی وجہ سے پنجاب کی شرح خواندگی زیادہ ہو گئی اور بیوروکریسی میں پنجاب کے لوگوں کی تعداد بڑھ گئی اور چار پنجاب فوجی بھرتی کیلئے بڑا آئیڈیل موبہ تھا یہاں کے لوگ قد کاٹھ اور ڈسپلن میں دوسرے صوبوں سے بہتر تھے چنانچہ انگریز فوج میں ان کی تعداد زیادہ تھی پاکستان کے قیام کے بعد جب بھارت اور پاکستان کی فوج الگ الگ ہوئی تو پاکستانی فوج میں پنجابی جوانوں کی تعداد 72 فیصد تھی ان چار دہائیوں کے باعث قیام پاکستان کے بعد سول اور ملٹری بیوروکریسی پر پنجاب کا قبضہ ہو گیا یہ لوگ اچھے کاروباری بھی تھے یہ لوگ 50 اور 60 کی دہائی میں پنجاب سے نکلے اور انہوں نے بلوچستان، سندھ، سرحد اور بنگال کی منڈیوں پر قبضہ کر لیا آپ اس معاملے میں مشرقی پاکستان کی مثال لیجیے 1971ء تک بنگلہ دیش کی 80 فیصد فیکٹریاں پنجاب کی چینیوں اور منوں فیملی کے پاس تھیں پٹ سن بنگالی پیدا کرتے تھے لیکن اس کا منافع پنجابی بزنس مین کی جیب میں جاتا تھا، مچھلی بنگالی پکڑتا تھا لیکن اسے مارکیٹ میں پنجابی بیچتے تھے بیوروکریسی میں بھی یہی صورت حال تھی بنگلہ دیش کے 90 فیصد افراد کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا اس دور میں بلوچستان، سندھ اور سرحد کا بھی یہی حال تھا ایوب خان کے عہد میں پنجابی کا شکار پنجاب سے نکلے حکومت نے اس کی سرپرستی کی اور اس کا شکار نے سندھ اور بلوچستان میں کونڑوں کے سول زمین خرید لی اسے زمین کاشت کرنا آتی تھی لہذا وہ چند برسوں میں کا شکار سے زمیندار اور زمیندار سے جاگیر دار بن گیا جبکہ اس کے مقابلے میں مقامی لوگ غریب سے غریب تر اور بے بس سے بے بس تر ہوتے چلے گئے جس کے نتیجے میں مقامی لوگوں نے پنجابیوں کو قاصب اور شیر سے بھنا شروع کر دیا موقع پرست لینڈروں اور بیرونی طاقتوں نے اس نفرت کا فائدہ اٹھایا پنجاب سے یہ نفرت 60ء کی دہائی کے آخر تک مشرقی پاکستان میں بنگلہ دیش، سرحد میں پشتونستان، بلوچستان میں گریٹر بلوچستان اور سندھ میں سندھو دیش کی تحریک بن گئی اس وقت سول اور ملٹری بیوروکریسی پر پنجابیوں کا اثر اور سوخ تھا، علیحدگی پسندی نے ان تحریکوں کو طاقت سے دبانے کی کوشش کی یوں یہ تحریکیں جنگ کی شکل اختیار کر گئیں اس جنگ کے نتیجے میں 1971ء میں ہمارا اکثریتی صوبہ ہم سے الگ ہو گیا اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔ میرا دعویٰ ہے اگر 1979ء میں افغانستان میں امریکی جہاز اور ایران میں انقلاب نہ آتا تو ہمیں شاید صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی مشرقی پاکستان جیسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا۔

1971ء تک جب بنگالی عوام صوبائی خود مختاری اور پنجاب کی افسر شاہی سے چھکارے کے مطالبے کرتے تھے تو ہم "سازھے چارٹ کے کالے بنگالی" کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے ہم نے بنگالیوں کی فوج میں بھرتی پر بھی پابندی لگا رکھی تھی ہم کہتے تھے ان کی چھاتی کا سائز ٹھیک نہیں ان کے قد چھوٹے ہیں لیکن جب یہ لوگ ہم سے آزاد ہوئے اور انہیں اپنا ملک خود چلانے کا موقع ملا تو انہوں نے ہم سے کہیں بہتر طریقے سے ملک چلا کر دکھایا آج آپ ان کی کرنسی دیکھئے ان کی کرنسی ہم سے زیادہ مضبوط ہے آپ ان کی ایکسپورٹ ان کی صنعت ان کی تجارت دیکھئے وہ ہم سے دو تین گنا ہے اور آپ ان کا نظام دیکھئے ان کی جمہوریت دیکھئے اور ان کے ملک میں

لامینڈ آرڈر کی صورتحال دیکھئے وہ "ساڑھے چار لٹ کے کالے بنگالی" ہم سے ہر لحاظ سے بہتر ہیں، بنگلہ دیش کے بعد ہمیں سنبھل جانا چاہیے تھا لیکن ہم نے بلوچستان، سندھ اور سرحد میں اپنی زیادتیوں کا سلسلہ جاری رکھا، آپ آج تینوں چھوٹے صوبوں کے کاروبار دیکھ لیجئے زراعت اور باغبانی دیکھ لیجئے اور آپ ان صوبوں کی بیوروکریسی دیکھ لیجئے آپ کو ان میں پنجاب نظر آئے گا لہذا آج یہ اس اثر و رسوخ کا نتیجہ ہے ہمارے چھوٹے صوبے شدید احساس محرومی کا شکار ہیں آج جب بلوچ یہ دیکھتا ہے کہ مل نہیں لگتا ہے، گیس اور کوئلہ بلوچستان سے نکلتا ہے لیکن یہ استعمال پنجاب میں ہوتا ہے، جب سندھ یہ دیکھتا ہے کہ زمینیں ہماری ہیں لیکن ان پر فصلیں پنجابی کاشت کرتا ہے، سندھ ہمارا ہے لیکن اس سے ڈالر پنجابی کماتا ہے، جب پشتون دیکھتا ہے کہ ٹریٹ ہمارا ہے لیکن سیکرٹری پنجابی ہے، پولیس ہماری ہے لیکن ایس ایس پی سے آئی جی تک پنجابی ہیں تو اس کے دل میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ان پنجابی افسروں کو اپنی محرومی کا ذمہ دار قرار دینے لگتا ہے، ہمارے علاقائی لیڈر اور بیرونی طاقتیں اس صورتحال کا فائدہ اٹھاتی ہیں چنانچہ یہ معمولی سی معاشی مشکلات علیحدگی تک جاتی ہیں، ہم اگر غور کریں تو چھوٹے صوبوں کے شہر کے سولیندر درست نہیں ہیں تو یہ سولیندر غلط بھی نہیں ہیں ان میں کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے، اگر میں اقلیت میں ہوتا اور میرے ساتھ ایسا برتاؤ ہوتا تو بھینا میرا عمل بھی سبکی ہوتا، آپ گوادر کو دیکھ لیجئے، گوادر بلوچوں کی ملکیت تھا، پنجاب کے سرمایہ کاروں نے وہاں جا کر ہزاروں روپے میں زمین خریدی، کروڑوں میں بیچی اور ارب پتی ہو کر واپس آ گئے لیکن اس کے باوجود آپ کہتے ہیں بلوچ آپ سے بلاوجہ نفرت کرتے ہیں، ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیے کیا اس ظلم کے بعد بھی بلوچ آپ سے نفرت نہ کریں۔

اگر ماضی کی حکومتیں تھوڑی سی عقل مندی کا مظاہرہ کرتیں، اگر وہ مہاتیر محمد کی طرح محروم علاقوں اور ان علاقوں کے وسائل کا تخمینہ لگاتیں اور مقامی آبادی کو کاروبار میں حصہ دے دیتیں تو آج یہ صورتحال نہ ہوتی، اگر حکومت 50 یا 60 کی دہائی میں یہ قانون بنا دیتی جو کہنی جس علاقے میں کاروبار کرے گی وہ مقامی بلوچوں، سندھیوں اور پشتونوں کو کاروبار میں بیس یا چالیس فیصد شیئرز دے گی تو آج یہ حالت نہ ہوتی، ہمارے سامنے عربوں کا ماڈل ہے عربوں نے پچاس برس پہلے قانون بنایا تھا، عربوں ملک سے آنے والا ہر کاروباری مقامی بدو سے مل کر بزنس کرے گا، اس قانون کا یہ نتیجہ نکلا آج اوٹ چرانے والے بدو بزنس مین بن چکے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں ہمارے میں نکل امری اور کئی گیس ٹکٹے سے پہلے بھی ان پڑھ اور بے روزگار قبائلی تھے اور آج جب ان کی زمین سے کھربوں روپے کی گیس نکل رہی ہے تو وہ آج بھی بے روزگار اور ان پڑھ قبائلی ہیں اس صورتحال میں اگر ہم پنجابی یہ دعویٰ کریں ہم پنجابیوں کا کوئی قصور نہیں تو یہ غلط ہوگا، ہم مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ حقیقت ہے پنجابی اس میں قصور وار ہیں۔





## کام چور

میرے دوست کی ناک سے خون نکل رہا تھا میں نے اس کے ہاتھ میں تو لیدیا اس نے تو لئے سے اپنی ناک دبالی ہم لوگ تیزی سے ہسپتال کی طرف دوڑے ہسپتال قریب ہی تھا میں نے گاڑی پارک کی اور اسے لے کر اندر داخل ہو گیا سائے امیر جنسی میں کوئی شخص نہیں تھا بیڈ خالی پڑے تھے گاؤنٹر پر کرسیاں اور میز اوندھی پڑی تھی اور ڈاکٹر کے آفس پر تالا لگا تھا ہم دونوں حیران رہ گئے میرے دوست کی تکسیر بند نہیں ہو رہی تھی میں نے اسے کرسی پر بٹھایا اور کسی وارڈ بوائے نرس یا ڈاکٹر کی تلاش میں نکل گیا مجھے باہر کوریڈور میں ایک سوچے بٹھانے والے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اس سے پوچھا "امیر جنسی میں کس کی ڈیوٹی ہے" اس نے سراٹھا کر امیر جنسی کی طرف دکھا اور نرس کر بولا "آج چھٹی ہے" میں نے پوچھا "لیکن کس چیز کی" اس نے قہقہہ لگایا "آج چودہ اگست ہے سب لوگ گھروں میں آزادی کا جشن منا رہے ہیں" مجھے یہ چھٹی عجیب لگی میں نے اپنے دوست کو اٹھایا اور پرائیویٹ کلینک کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

میں نے راستے میں سوچا ہسپتال ہو یا پرائمری سکول یا شاخ آپکچھ ہم مجموعی طور پر ایک چھٹی پسند قوم ہیں۔ پاکستان میں بارش ہو جائے تو ہم بارش کو بہانہ بنا کر چھٹی کر لیتے ہیں بارش نہ ہو تو ہم خشک سالی کو غنڈہ بنا کر گھر بیٹھ جاتے ہیں۔ سردی ہو جائے تو ہم درخواست لکھ بھیجتے ہیں۔ گرمی ہو جائے تو عرضی آ جاتی ہے۔ سنت آجائے تو دفتر کے دفتر ویران ہو جاتے ہیں۔ عید آجائے تو خوشی میں چھٹی کر لیتے ہیں۔ محرم ہو تو سوگ میں گھر جا بیٹھتے ہیں اور پاکستان سچ جیت جائے تو چھٹی ہو جاتی ہے ہمار جائے تو تعطیل عام ہی محسوس ہوتی ہے۔ آپ عید سے ایک ہفتہ پہلے کسی دفتر چلے جائیں آپ کو جواب ملے گا عید کے بعد آئیے گا۔ ذرا عید کا رش نکال لیں۔ بس جی عید کی وجہ سے کام رکے ہوئے ہیں ان شاء اللہ عید کے بعد کام ہو جائے گا وغیرہ۔ آپ عید کے بعد چلے جائیں وہی صاحب کہیں گے عید کی وجہ سے سارے کام رکے ہوئے تھے اب ان شاء اللہ ہفتے دس دن میں آپ کا کام ہو جائے گا۔ یہ تو یوں روٹین کے کام اگر خدا انخواستہ آپ نے کسی سے رقم لیتی ہو یا آپ کا کوئی عمل کسی دفتر میں پھنسا ہوا ہے تو بس پھر آپ ناک سے لکیریں نکال کر ہی رقم وصول کریں گے۔ کبھی بارشوں کی وجہ سے آپ کا بل پاس نہیں



ہوگا۔ کبھی بیچ اس بل کے سامنے کھڑا ہوا جائے گا، کبھی ٹینکوں کی کلوزنگ اسے روک کر کھڑی ہو جائے گی اور کبھی دھوپ سردی، خزاں اور بہار اس کا راستہ روک لے گی آپ ہفتوں بلکہ مہینوں ایک دفتر سے دوسرے اور ایک صاحب کے دربار سے دوسرے صاحب کے دربار میں دوڑتے کھاتے رہیں گے لیکن آپ کو رقم نہیں ملے گی۔

اس وقت شاید ہم دنیا میں سب سے زیادہ چھٹیاں کرنے اور کام چوری کے سب سے زیادہ عذر تلاش کرنے والی قوم ہیں۔ ہنگامی چھٹیاں میڈیکل لیوز، ارن لیوز اور ڈیپارٹمنٹ لیوز تو رہیں ایک طرف ہماری قومی چھٹیوں کی تعداد بھی ہوش رباعد تک زیادہ ہے۔ اس وقت بھارت میں سالانہ چھ قومی تعطیلات ہوتی ہیں۔ چین 10، روس 8، سنگاپور 6، نیوزی لینڈ 7، امریکہ 12، برطانیہ 8 اور ہانگ کانگ میں قومی سطح پر 12 چھٹیاں منائی جاتی ہے۔ اسلامی ممالک کی صورتحال بھی کچھ ایسی ہی ہے بحرین میں یکم جنوری اور 16 دسمبر کو عید یکم جنوری 25، فروری اور یکم جنوری 8، فروری 21، مارچ 14 اور 17 جولائی، تقریک جنوری 22، فروری 3، ستمبر اور 25 دسمبر، سعودی عرب 30 مئی، 4 جون، عید الفطر اور عید النضی، متحدہ امارات یکم جنوری، یکم مئی، 7 اگست، 14 اکتوبر اور 2 دسمبر، شام یکم جنوری 8، مارچ 17، اپریل 1، یکم مئی اور 25 دسمبر، یمن یکم جنوری، یکم مئی، 13 جون، 22 جون، 24 ستمبر، 14 اکتوبر، 30 نومبر اور 31 دسمبر، سوڈان یکم جنوری 3، مارچ 18، اپریل 25، مئی 13، اکتوبر اور 25 دسمبر اور اردن میں یکم اور 15 جنوری، 22 مارچ، یکم مئی، 25 مئی، 13 اکتوبر اور 25 دسمبر کو قومی سطح پر چھٹی ہوتی ہے جبکہ پاکستان میں ہر سال 17 سے 23 قومی تعطیلات منائی جاتی ہیں جبکہ ہم جو چھٹیاں ان چھٹیوں کے ساتھ ملا کر کرتے ہیں ان کی تعداد ان سے دوگنی بلکہ تینگنی ہے۔ جب بھی کوئی قومی تعطیل ہوتی ہے تو ہمارے سرکاری اور نیم سرکاری ملازم اس کے ساتھ ایک آدھ چھٹی لے کر اس چھٹی کو تین چار دن میں بدل لیتے ہیں اور اس "سازش" کی مہربانی سے اس سرکاری ملازم کا کام دو تین ہفتے پیچھے چلا جاتا ہے۔

ہماری چھٹیوں کی روایات بھی بہت دلچسپ ہیں مثلاً ایک بار میں ایک سرکاری دفتر گیا تو میں نے دیکھا دن کے گیارہ بجے سارا عملہ دفتر سے نکل کر بسوں میں سوار ہو رہا تھا۔ میں نے وجہ دریافت کی تو معلوم ہوا مجھے کے چیف کو اللہ تعالیٰ نے تیس سال کی ازادہائی دوڑ دھوپ کے بعد چاند سا بیٹا دیا ہے اور اب سارا عملہ مبارک باد دینے ان کے گھر جا رہا ہے۔ ہمارے گاؤں میں ایک بار ماسٹر صاحب کی بھینس "انتقال" کر گئی۔ یقین کیجئے مرحومہ کے سوگ میں سکول میں تین دن چھٹی رہی۔ سوگ کے دن پورے ہونے کے بعد بھی سال چھ مہینے تک ماسٹر صاحب ریاضی کے مسائل سمجھانے کی بجائے مرحومہ کی باتیں سناتے رہے تھے۔ مرحومہ بھینس کو یاد کرتے ہوئے ماسٹر صاحب کی آنکھیں بھر جاتی تھیں جس کے جواب میں احتیاطاً بچوں کی نگاہیں بھی بندہ جاتی تھیں۔ ہم میں سے جو زیادہ سیانے تھے وہ ماسٹر صاحب سے اظہارِ محبت کیلئے ایک آدھ حج بھی جڑ دیتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک مرحومہ کی صاحبزادی "کنی" نے بالغ ہو کر دو دو دینا شروع نہ کر دیا۔ میں اس واقعے کو اپنی زندگی کا

حیران کن واقعہ سمجھتا تھا لیکن جب جہان ہوا تو پتہ چلا ہمارے ملک میں صاحبوں کے کتے مرنے پر بھی دفتر بند ہو جاتے ہیں جبکہ بھینس اور کئی تو پھر بھی نجیب الطریقین جانور ہیں۔

میں نے یورپ بھی دیکھا ہے وہاں آندھی ہو طوفان ہو صاحب کا کتا مرے یا والد محترم قوم بچ جیت جائے یا برف پڑنے لگے سورج سوائیزے پر آ جائے یا دن بارو بجے اندھیرا چھا جائے وہاں دفتر کھلے رہتے ہیں اور لوگ اپنی اپنی میزوں پر اپنا اپنا کام کر رہے ہوتے ہیں۔ وہاں چھٹی کرنے آج کا کام کل پر چھوڑنے یا خدشہ کرنے کا نہ کھجانے یا سگریٹ پینے کا کوئی تصور نہیں۔ یہ ہوتے ہیں ملک ایسے کرتی ہیں تو میں ترقی۔ مرحوم اختر حمید خان فرمایا کرتے تھے جب تک ملک سے چوروں اور کام چوروں کا خاتمہ نہیں ہوتا ملک ترقی نہیں کر سکتا لہذا ہمیں چوروں کے ساتھ ساتھ کام چوروں سے بھی نپٹنا ہوگا ہمیں چھٹی افیا سے بھی جان چھڑانا ہوگی۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

## کرپٹ

ابراہام لنکن رات تین بجے سوتا تھا اور صبح چھ بجے جاگ جاتا تھا، وہ رات بارہ بجے کے قریب نائلیں پڑھنا شروع کرتا تھا اور دو بج کر 55 منٹ تک نوٹس لیتا رہتا تھا، سونے سے ایک منٹ پہلے تک اس کے ہاتھ میں قلم ہوتا تھا اور وہ کسی فائل کے کسی فقرے کے نیچے لکیر کھینچ رہا ہوتا تھا، وہ جتنی بچانے کے بعد اس فائل کو سائیز نیپل پر رکھ دیتا تھا، صبح چھ بجے جونہی اس کی آنکھ کھلتی تھی اس کا ہاتھ بے اختیار سائیز نیپل کی طرف جاتا تھا اور وہ فائل اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتا تھا، وہ امریکا کا پہلا اور شاید واحد صدر تھا جس نے اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ کام میں صرف کیا، اس نے زندگی بھر تفریح نہیں کی لہذا اس نے ولیم شکسپیر کے ڈراموں سے دس گنا زیادہ صفحے لکھے اور ہارورڈ یونیورسٹی کی ایک چوتھائی کتابوں جتنے صفحات پڑھے، اس نے زندگی بھر تین گھنٹوں سے زیادہ نیند نہیں لی۔ لنکن کو 15 اپریل 1865ء کو فرصت کے دو گھنٹے ملے اور اس نے یہ دو گھنٹے تھیر میں گزارنے کا فیصلہ کیا لیکن فرصت کے ان دو گھنٹوں کے دوران وہ قتل ہو گیا۔ اس کی موت کے بعد کسی امریکی مورخ نے لکھا تھا ”کام لنکن کی زندگی تھا، جونہی کام سے باہر نکلا اس کی زندگی ختم ہو گئی“، لنکن سے ایک بار کسی نے اس شب بیداری کے بارے میں پوچھا تو لنکن نے اسے جواب دیا تھا ”میرے لیے تین گھنٹے کی نیند کافی ہے لہذا میں سمجھتا ہوں میں اس کے علاوہ جو وقت چنگ پر گزاروں گا وہ بددیانتی ہوگا، وہ کرپشن ہوگی“ ابراہام لنکن نے مزید کہا ”جو لوگ قدرت کی دی ہوئی صلاحیتوں سے پورا کام نہیں لیتے وہ کرپٹ ہوتے ہیں، وہ بھی قدرت کے سامنے جوابدہ ہیں۔“

مجھے نہیں معلوم ہمارے دانشور، علماء، کرام اور ہمارے مسٹر کلین وزیراعظم جناب شوکت عزیز ابراہام لنکن کے اس فلسفے سے کہاں تک متفق ہیں لیکن مجھے لنکن کی بات میں بڑا وزن محسوس ہوتا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کرپشن صرف رشوت، لوٹ کھسوٹ اور کالے دھن تک محدود نہیں، کرپشن کی تعریف میں مالی بددیانتی ایک انتہائی چھوٹا اور معمولی جرم ہے، اصل جرم اس کے بعد شروع ہوتے ہیں اور بد قسمتی سے ہم نے آج تک ان جرائم پر غور کیا اور نہ ہی ہم نے سمجھی ان کے تدارک کے لیے کوشش کی۔ اصل کرپشن نیت اور صلاحیتوں سے پورا کام نہ لینا ہوتی ہے مثلاً اگر طالب علم 45 منٹ کے پریز میں 30 منٹ تک دماغی طور پر غیر حاضر رہتا ہے تو یہ بھی کرپشن ہے، استاد تیار



کے بغیر کلاس میں آ جاتا ہے تو یہ بھی کرپشن ہے، ایک ڈاکٹر کو اللہ تعالیٰ نے روزانہ میں مریض دیکھنے کی ہمت اور صلاحیت دے رکھی ہے لیکن وہ پانچ دس مریضوں کے بعد کلینک سے اٹھ جاتا ہے تو یہ بھی کرپشن ہے، انجینئر سائٹ کا دورہ نہیں کرتا، پنڈاری کاغذ پر غلط لکیر کھینچ دیتا ہے، کانٹریبل چوک میں کسی شریف شہری کی بگڑی اچھال دیتا ہے۔ ایس ایچ او کسی کو بلا جہ پکڑ لیتا ہے، چیز اسی ایک میز کی فائل دوسری میز پر چھوڑ آتا ہے، دودھ والا دودھ میں پانی ملا دیتا ہے، سائیکس گھوڑے کو وقت پر پانی نہیں پلاتا، تندورچی خورد میں روٹیاں جلا دیتا ہے، باورچی سالن میں نمک نہیں ڈالتا، موذن وقت پر اذان نہیں دیتا، امام صاحب رکعت لمبی کر دیتے ہیں، گاڑی چلانے والا ٹریفک کے قوانین کی پابندی نہیں کرتا، کسان فصل کو پانی نہیں دیتا، ایم اے پاس نوجوان خود کو چیز اسی اور ٹھکر کی نوکری تک محدود کر لیتا ہے، کبھی کا مالک ملازمین کی تعداد میں اضافہ نہیں کرتا، بیمار بازار سے دوا نہیں خریدتا، پروفیسر کتا میں نہیں پڑھتا، سریلے گلے کا مالک گاٹا نہیں گاتا، کھلاڑی میدان میں نہیں اترتا، مسلمان نماز، روزے اور زکوٰۃ کی پابندی نہیں کرتا، مسٹری اینٹ نہیں لگاتا، مزدور سالے میں پورا سینٹ نہیں ڈالتا، کیسٹ دواؤں میں اجزاء کی ترتیب درست نہیں رکھتا، ایم این اے اسمبلی نہیں جاتا، وزیر وزارت کا کام نہیں کرتا اور وزیراعظم دفتر نہیں بیٹھتا تو یہ بھی کرپشن ہے۔ وزیراعظم صاحب اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن کیا پاکستان جیسے غریب ملک میں 70 وزراء کی کابینہ کرپشن نہیں؟ کیا وزیراعظم نامزد ہونے کے بعد انکیشن لڑتا کرپشن نہیں؟ کیا سال میں ستر ستر غیر ملکی دورے کرتا اور ہر دورے میں سو سو لوگوں کو ساتھ لے جاتا کرپشن نہیں؟ کیا انٹر لوزر دکان کے فنڈز سے دوا رب روپے نکال کر فوج کے حوالے کر دیتا کرپشن نہیں؟ کیا 728 سول عہدوں پر ریٹائر فوجی افسر تعینات کر دیتا، کیا 78 سیکرٹریوں کو ڈیزل دوا رب روپے کے پلاٹ دے دیتا اور کیا لینڈ مافیا کو نوازنے کے لیے پنڈی کھسب میں اینٹرپورٹ کی اجازت دے دیتا کرپشن نہیں، کیا باوردی جمہوریت اور نیب زدہ سیاستدانوں کو اقتدار سونپ دیتا کرپشن نہیں، کیا رچرڈ آرشیب کا حکم اور اس حکم پر سر تسلیم خم کر دیتا کرپشن نہیں، کیا وزیراعظم ٹونی علیئر کے اعزاز میں اذان رکوا دیتا، کیا امریکہ کے حکم پر حدود آڈینٹس میں تسلیم کر دیتا اور کیا انصاف سے آیتیں حذف کر دیتا کرپشن نہیں اور کیا اسلامی ملک میں شراب اور بدکاری کی اجازت دے دیتا کرپشن نہیں، وزیراعظم صاحب ایک لمحے کیلئے سوچیں اور جواب دیں۔

9 دبیر کو پوری دنیا میں کرپشن کا عالمی دن تھا۔ اس دن ہمارے وزیراعظم صاحب نے فرمایا تھا ”صدر پرویز مشرف اور میں مالی کرپشن سے پاک ہیں“ وزیراعظم صاحب نے درست فرمایا ہو گا اس میں کوئی شک نہیں آج تک صدر پرویز مشرف اور وزیراعظم شوکت عزیز پر مالی کرپشن کا کوئی الزام نہیں لگا لیکن پچھلے دس برسوں سے جو کچھ ملک میں ہو رہا ہے ہم اسے کس خانے میں رکھیں گے اور وزیراعظم کی توجہ کے لیے عرض ہے پاکستان میں آج تک جنرل ضیاء الحق سے بڑا کوئی مسٹر بلین نہیں گزرا تھا۔ انہوں نے پوری زندگی ایک پیسے کی ہیرا بھیری نہیں کی تھی لیکن اپنی تمام تر ایمانداری کے باوجود انہوں نے پاکستان میں تاریخ کی سب سے بڑی کرپٹ کلاس پیدا کی تھی، انہوں نے عمروں اور راج تک کو رشوت کی شکل دے دی تھی، وہ نظریہ ضرورت سے مغلوب ہو کر اپنے

جہاز۔ سیاستدانوں کے منہ سوتیوں سے بھر دیتے تھے۔ ان کے دور میں غیر مستحق لوگوں کو چھتے پلاٹ ملے اس کی تاریخ میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ جنرل ضیاء الحق پہلے حکمران تھے جن کے دور میں بیرون کے سٹیکروں کی کلاس پیدا ہوئی جن کے دور میں سرکاری جہازوں میں بیرون سٹیکر ہوتی رہی اور ان کے پروردہ لوگ نقشوں کے بیٹوں اور جج کے احراموں میں بیرون رکھ کر سعودی عرب لے جاتے رہے۔ جناب وزیراعظم صاحب کی توجہ کے لیے عرض ہے سردار فاروق احمد لغاری ایک تجھ گزاردہ تھے، ان پر آج تک مالیاتی کرپشن کا کوئی الزام نہیں لگایا گیا انہوں نے اقتدار کے دوران کیا کیا؟ انہوں نے ذاتی عہدہ پر ایک منتخب حکومت کو کمر بھجوا دیا، کیا یہ کرپشن نہیں تھی؟ پاکستان کی بیوروکریسی کی تاریخ میں قلام اسحاق خان جیسا کوئی دوسرا ایماندار افسر نہیں گزرا لیکن انہوں نے کیا کیا انہوں نے اپنی انا کی تسکین کے لیے دو منتخب اسمبلیاں توڑ دیں؟ کیا یہ کرپشن نہیں؟ پیچھے رہ گئے ہمارے موجودہ صدر جنرل پرویز مشرف تو، ہمارے صدر معظم نے خود فرمایا تھا ”اگر نواز شریف مجھے نہ چھوڑتے تو وہ آج بھی وزیراعظم ہوتے“ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیجئے ”کیا یہ کرپشن نہیں ایقین کیجئے صرف رشوت لینے والا شخص کرپٹ نہیں ہوتا بلکہ ہر وہ شخص جو اللہ کی دی ہوئی نعمت اور قابلیت سے پورا کام نہیں لیتا اور ہر وہ شخص جو اپنے اختیار کو دوسروں کی ناک تک وسیع کر دیتا ہے، جو اپنی ٹانگیں دوسرے کی چادر تک پھیلا دیتا ہے جو شور بے دالی پلیٹ میں بوٹیاں ڈال دیتا ہے اور ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بینائی سے شیطان کی سوئی میں دھاگہ ڈال دیتا ہے وہ شخص بھی کرپٹ ہوتا ہے وہ شخص بھی بے ایمان ہوتا ہے لیکن انہوں ہم نے کرپشن کو صرف مال دولت اور نیب تک محدود کر دیا۔ انہوں ہماری نظر میں پیسے لے کر کام کرنے والا تو کرپٹ ہے لیکن وہ شخص جو دفتر آ کر کام نہیں کرتا اور جو دفتر کے اسے سی اور بیٹرس میں بیٹھ کر سارا سارا دن کھیاں مارتا ہے ہم اسے ایماندار سمجھتے ہیں ہم اسے مواخذے اور احساب سے ہرا سمجھتے ہیں ہم کیسے لوگ ہیں۔



## ایماندار

میں نے عرض کیا "سروہ بہت ایماندار افسر ہے" وہ مسکرائے اور نرم آواز میں بولے "کیا آپ پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں" میں نے عرض کیا "سروہ ایک پیسے کا روادار نہیں، اس پر آج تک رشوت، لوٹ کھسوٹ، ہیرا پھیری اور خرد برد کا کوئی الزام نہیں لگا اور اس کے گھر میں صرف دو نوکر ہیں۔" انہوں نے قہقہہ لگایا اور ہنستی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگے: "ایمانداری کے معاملے میں ہماری اپرویج قطعی غلط ہے، ہم صرف اس شخص کو ایماندار سمجھتے ہیں جو روپے پیسے میں خرد برد نہ کرے، جو رشوت نہ لے، جو سرکاری فنڈز میں ہیرا پھیری نہ کرے اور جو مال نہ بنائے جبکہ ایمانداری ایک وسیع تر اصطلاح ہے۔ مالیاتی گزبڑ اس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے ایمانداری اور بے ایمانی کے تقصیر سے پہلے ہیں بے شمار دوسری چیزیں دیکھنا پڑتی ہیں۔"

میرے لئے یہ فلسفہ انوکھا تھا، میں نے ان سے عرض کیا "جناب عالی ہم تو آج تک صرف اس شخص کو ایماندار سمجھتے آئے ہیں جو لین دین میں کھرا ہو، جو مالیاتی معاملات میں درست ہو لیکن آپ نے ہمارے اس تصور کی شکل ہی بدل دی" وہ مسکرائے اور مسکرا کر بولے "تم میرے چند سوالوں کا جواب دو" میں ہمدن گوش ہو گیا۔ وہ بولے "کیا وہ صاحب قانون بنا سکتے ہیں" میں نے ہاں میں سر ہلا دیا، وہ بولے "کیا وہ صاحب اس قانون پر عملدرآمد بھی کر سکتے ہیں" میں نے ہاں میں سر ہلا دیا، وہ بولے "کیا وہ صاحب لوگوں کو انصاف دلا سکتے ہیں، لوگوں کی تعلیم کا بندوبست کر سکتے ہیں اور لوگوں کو دوا، پانی اور اچھا ماحول دے سکتے ہیں" میں نے ہاں میں سر ہلا دیا، وہ بولے "کیا وہ صاحب معاشرتی انصاف قائم کر سکتے ہیں، وہ لوگوں کیلئے جاب کا بندوبست کر سکتے ہیں، وہ ملک سے دی آئی پی کلچر ختم کر سکتے ہیں، وہ ملک میں تقار کا نظام نافذ کر سکتے ہیں، کیا وہ میرٹ کو قطعی بنا سکتے ہیں اور کیا وہ مہنگائی کنٹرول کر سکتے ہیں" میں نے ہاں میں سر ہلا دیا، وہ بولے "کیا وہ اس ملک کے صدر یا وزیر اعظم ہیں" میں نے نفی میں سر ہلا کر عرض کیا "نہیں سروہ صدر، وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ نہیں ہیں لیکن وہ اقتدار کے اس کوریڈور میں ضرور موجود ہیں جہاں لوگوں کے مقدر کا فیصلہ ہوتا ہے، جہاں قوم کی سمت طے ہوتی ہے" انہوں نے قہقہہ لگایا اور اس قہقہے کے درمیان پوچھا "کیا ان صاحب نے اقتدار کے کوریڈور میں رہ کر وہ تمام کام کر دیے جن کی اللہ تعالیٰ



سے انہیں صلاحیت بخشی تھی، کیا انہوں نے لوگوں کو انصاف دے دیا، میرٹ قائم کر دیا، مہنگائی کنٹرول کی، وی آئی بی چھڑم کر دیا، کیا انہوں نے مریشوں کو دوا، شہریوں کو پانی اور بجلی لسل کو صاف ماحول دے دیا، کیا انہوں نے اچھے قوانین بنائے، کیا ان کے عہد میں لائیڈ آرڈر کی صورتحال بہتر ہوئی، کیا ان کے دور میں قتل، ڈاکے، چوریاں، ہیرا پھیری، لوٹ کھسوٹ اور فراڈ بند ہو گئے، کیا ان کے دور میں پولیس اور شہری انتظامیہ ٹھیک ہو گئی، کیا ان کے دور میں سرخ فیتہ لوٹ گیا، کیا ان کے اقتدار میں مسائل کی افسر تک رسائی آسان ہو گئی، کیا ان کے دور میں ملک سے بھکاری ختم ہو گئے اور کیا ان کی وجہ سے ملک میں امیر غریب کا فرق مٹ گیا؟ میں نے انکار میں سر ہلا دیا، وہ بولے:

جب حالات جوں کے توں ہیں، جب دس سال پہلے اور آج کے پاکستان میں کوئی فرق نہیں، جب لوگ گاؤں کے بغیر گھروں سے نہیں نکلتے، جب اخبارات جرائم کی خبروں سے آلودہ ہیں اور جب عام شخص کیلئے اس ملک میں سانس لینا مشکل ہے تو پھر تم کس بنیاد پر انہیں ایماندار کہہ رہے ہو، میرے بچے ایمانداری کا تعلق صرف مال و دولت اور رشوت اور لوٹ کھسوٹ سے نہیں، اس کا تعلق صلاحیت اور اختیار کے استعمال سے ہوتا ہے، وہ حاکم جو ایک شلوار، ایک قمیض، ایک درمی اور بیس ہائی بارہ فٹ کے ایک کمرے میں پوری زندگی گزار دے لیکن اس کے اختیار اس کے اقتدار سے کس شخص کو کوئی فائدہ نہ پہنچے، اس حاکم سے وہ چیز اسی ہزار روپے بھر اور ایماندار ہے جو صاحب کے کمرے سے نکل کر سائیکل کو خوش خبری سنا رہا ہے جس کے وجود جس کے اختیار سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

میں خاموشی سے ان کی بات سن رہا تھا، وہ بولے: ”اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: اے نبی! یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں ہم اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں آپ ان سے فرما دیجئے جو ان کی ضرورت سے زیادہ ہو اس آیت کا کیا مطلب ہے؟“ وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے، میں نے عرض کیا: ”بھئی! صدقہ اور خیرات“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور فرمانے لگے: ”لیکن صدقہ اور خیرات کا تعلق صرف مال اور دولت سے نہیں، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر صلاحیت، ہر انعام، ہر خوبی، ہر اختیار، ہر عہدہ اور ہر قسم کا اقتدار بھی اس دائرے میں آتا ہے اور ان کے سلسلے میں بھی اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔ اقتدار، اختیار، خوبی، انعام اور صلاحیت میں جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں تقسیم کر دے یقیناً کرو حشر کے دن ایمانداری کا تعین اسی تقسیم کی بنیاد پر ہوگا“ میں نے پوچھا: ”مثلاً“ وہ بولے: ”مثلاً جس ڈاکٹر کو اللہ تعالیٰ نے علاج کی سکت بخشی ہے لیکن وہ مریشوں کا علاج نہیں کرتا وہ ڈاکٹر بے ایمان ہے، جس جج کو اللہ نے عدل کا اختیار دے رکھا ہے لیکن وہ لوگوں سے انصاف نہیں کرتا وہ جج بے ایمان ہے، جس پولیس افسر کو اللہ نے جرم اور بے گناہی کے فیصلے کی اتھارٹی دے رکھی ہے لیکن وہ بے اختیار استعمال نہیں کرتا وہ پولیس افسر بے ایمان ہے اور جس دوفر کو اللہ نے اچھے نمائندے منتخب کرنے کا اختیار دے رکھا ہے لیکن وہ جان بوجھ کر ایک بدکردار اور بے ایمان سیاستدان کو منتخب کرتا ہے وہ دوسری بے ایمان ہے، جو کارسوار سائیکلوں اور موٹر سائیکلوں کو راستہ نہیں دیتا، جو شخص اپنا گندھ سڑک پر پھینک جاتا ہے، جو استاد شاگردوں کو اپنا سارا علم شرافت نہیں کرتا، جو محقق غور سے پرے نہیں بڑھتا اور جولاہی میں کھسے بر پوری تار نہیں لگا تا وہ لاکھوں روپے محنت سے محروم ہو جاتا۔“

سوار بھی بے ایمان ہے، میرے بچے اللہ نے ہمیں آنکھیں، ناک، کان، ہاتھ، پاؤں، دل، دماغ اور پیچھے دے دے رکھے ہیں جو لوگ اپنے ان اعضاء سے پورا کام نہیں لیتے، جو ان اعضاء کو لوگوں کی بھلائی میں صرف نہیں کرتے، وہ لوگ بھی بے ایمان ہیں، وہ لوگ بھی غاصب ہیں۔

وہ خاموش ہو گئے، میں نے عرض کیا: ”آپ کو اپنی زندگی میں کوئی ایماندار شخص ملا؟“ انہوں نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ ”میں نے زندگی میں سندھ کے ایک ہندو کو جتنا دیانت دار پایا تھا مجھے آج تک اس جیسا کوئی دوسرا شخص نہیں ملا، بھٹو کے دور میں راشن ڈپو ہوتے تھے، لوگوں کو چینی اور آٹا ان ڈپوز سے ملتا تھا، اس ہندو کے پاس راشن ڈپو تھا، جب تک آٹے کی آخری ٹھی اور چینی کا آخری دانہ اس کے ڈپو میں رہتا تھا وہ اپنے ڈپو کا دروازہ بند نہیں کرتا تھا، اس کا کہنا تھا، یہ راشن لوگوں کی امانت ہے اور اگر وہ یہ امانت ادا کئے بغیر مر گیا تو وہ اپنے بھگوان کو کیا منہ دکھائے گا، میں نے پوری زندگی اس ہندو سے بڑا دیانت دار شخص نہیں دیکھا، تم بتاؤ کیا تمہاری زندگی میں بھی کوئی ایسا شخص ہے۔“

میں نے ذرا سا سوچا اور پھر اٹکا میں سر ہلا دیا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

## شاید ہم کبھی

میں اور شاہ جی لندن میں چند دن اکٹھے رہے تھے شاہ جی کا تعلق حکمران کلاس سے تھا وہ تیسری نسل سے اس خٹے کے بادشاہ چلے آ رہے ہیں ان کے دادا برطانوی دور میں وزیر تھے والد ایوب خان سے ذوالفقار علی بھٹو تک گورنر وزیر اعلیٰ اور سینئر وزیر رہے جبکہ شاہ جی بے نظیر بھٹو سے میر ظفر اللہ جمالی کی حکومت تک مختلف حیثیتوں سے اقتدار کے ایوانوں میں آتے جاتے رہے وہ اس وقت بھی جوڑ توڑ کے بادشاہ کہلاتے ہیں اور پنجاب کی وائیس کی طرح سیاست کے پیٹ میں جھانکنے کا ملکہ رکھتے ہیں میری ان کے ساتھ پرانی یاد اللہ ہے آج سے تین سال پہلے ہم دونوں لندن گئے اس سفر کا مقصد گپ شپ اور چند دن عافیت میں گزارنا تھا ہم دونوں نے یہ دن میر و تفریح اور لمبی لمبی بحثوں میں گزارے تھے ایک دن شاہ جی اور میں آکسفورڈ سٹریٹ میں گھوم رہے تھے شاہ جی اچانک میری طرف مڑے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا "یار کبھی ہم لوگ بھی گوروں کی طرح ترقی کر سکیں گے" میں نے سٹریٹ میں گھومتے پھرتے جھوم کی طرف دیکھا اور زار زار دہک کر جواب دیا "شاہ جی شاید کبھی نہیں" شاہ جی کا دوسرا سوال تھا "کیوں" میں نے ہنس کر جواب دیا "اس کا جواب میں آپ کو پاکستان جا کر دوں گا" شاہ جی خاموش ہو گئے۔

ہم چند دن بعد پاکستان واپس آ گئے بات آئی مگنی ہو گئی شاہ جی سیاست بازی میں مصروف ہو گئے اور میں اپنی محنت مزدوری میں لگ گیا ایک دن ایک سفارتی تقریب میں شاہ جی سے ملاقات ہو گئی شاہ جی کے پاس اس دن بہت وقت تھا لہذا ہم دونوں صوفے پر بیٹھ گئے ہمارے سامنے مختلف انیسویں کے سفارتکار چنچی آواز میں ایک دوسرے سے گپ شپ کر رہے تھے محفل میں سفارتی تکلف اور شائستگی تھی شاہ جی کو اچانک آکسفورڈ سٹریٹ یاد آ گئی اور وہ میری طرف مڑ کر بولے "میں نے تم سے لندن میں ایک سوال پوچھا تھا اور تم نے وعدہ کیا تھا تم اس کا جواب پاکستان میں دو گئے" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ان سے عرض کیا "شاہ جی ہمارے ملک کی پسماندگی کی وجہ آپ لوگوں کے دوہرے معیار ہیں" شاہ جی نے مجھے گھور کر دیکھا میں نے عرض کیا "شاہ جی ہم لوگ جب لندن میں تھے تو آپ گوروں کی طرح زندگی گزار رہے تھے آپ قطار میں کھڑے ہوتے تھے لوگوں کو



مسکرا کر دیکھتے تھے دوسروں کیلئے دروازہ کھولتے تھے ہمارے فلیٹ میں کوئی ملازم نہیں تھا آپ میرے اور اپنے لئے ناشتہ خود بناتے تھے آپ نے 7 دن اپنے برتن بھی خود دھوئے تھے آپ اپنا سامان خود اٹھاتے تھے اور آپ ٹائی اور کوٹ کے بغیر زندگی گزارتے تھے اور آپ اس وقت ایک عام مہذب اور پڑھے لکھے شخص کی طرح اٹھ بیٹھ رہے تھے لندن میں آپ کا رویہ مکمل طور پر ترقی یافتہ اور مہذب تھا "شاہ جی بڑے غور سے میری بات سننے رہے" میں نے عرض کیا "لیکن شاہ جی جوں ہی آپ اسلام آباد میں اترے آپ نے تہذیب اور شانگلی کا لبادہ اتار کر ایک طرف رکھ دیا اور آپ کے اندر سے نوآبادیاتی نظام کا ایک خالم اور اکٹڑ جاگیردار باہر آ گیا" میں نے دیکھا آپ جوں ہی جہاز سے باہر آئے پروٹوکول کا ایک افسر آپ کا انتظار کر رہا تھا آپ نے پاسپورٹ اور سامان کے "ٹیک" اس کے حوالے کر دیئے شاہ جی آپ نے دوسرے مسافروں کے ساتھ امیگریشن کی نظامت میں کھڑا ہونا پسند نہیں کیا تھا آپ وی آئی پی لائنوں میں بیٹھ گئے اور آپ کا سامان کنسٹبلز کے بغیر باہر آ گیا "شو فرنے آپ کیلئے گاڑی کا دروازہ کھولا آپ پچھلی نشست پر بیٹھے اور آپ نے سواپل پر اپنے عمل کو جھانڈا شروع کر دیا "شاہ جی میری بات سننے رہے" میں نے عرض کیا "آپ لوگوں کی یہ سماجی منافقت اس ملک کی ترقی کے راستے کی واحد رکاوٹ ہے آپ لوگ باہر سے تہذیب شانگلی اور اخلاقی اقدار سیکھ کر آتے ہیں لیکن جوں ہی آپ کے قدم پاکستان کی زمین کو چھوتے ہیں تو آپ کے اندر کا جاگیردار جاگ جاتا ہے آپ فوراً آقا بن جاتے ہیں اور آپ ساری شانگلی ساری تہذیب بھلا دیتے ہیں "شاہ جی خاموشی سے میری گفتگو سننے رہے" میں نے عرض کیا "مجھے میاں نواز شریف نے جناب شوکت عزیز کے بارے میں ایک واقعہ سنایا تھا مجھے میاں صاحب نے بتایا تھا 1998ء میں جب حکومت نے ایٹمی دھماکہ کیا اور اس کے رد عمل میں اقوام متحدہ نے پاکستان پر معاشی پابندیاں لگا دیں تو حکومت شدید دباؤ میں آگئی اس وقت دنیا بھر سے پاکستانی اسلام آباد آتے تھے اور ملک کو اس صورتحال سے نکالنے کیلئے نئی نئی معاشی تکنیک سمجھاتے تھے اور وہ ان کی باتیں غور سے سنتے تھے ایک دن جناب شوکت عزیز امریکہ سے پاکستان تشریف لائے اور لاہور کے گورنر ہاؤس میں ان کی نواز شریف سے ملاقات ہوئی شوکت عزیز نے نواز شریف کو بتایا پاکستان میں حکمرانوں اور عوام کے معیار میں بڑا فرق ہے پاکستان کے پچاس فیصد عوام خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں جبکہ حکمران سو سوا یکڑے الیوانوں میں عیش کر رہے ہیں جناب شوکت عزیز نے گورنر ہاؤس پر نظر ڈال کر میاں نواز شریف کو مشورہ دیا "میاں صاحب آپ یہ گورنر ہاؤس خالی کرادیں آپ وزیراعظم ہاؤس اور الیوان صدر چھوڑ دیں اور یورپ کے حکمرانوں کی طرح دو دو تین تین بیڈروم کے فلیٹس میں شفٹ ہو جائیں اور اس کے بعد عوام سے محبت اور جدوجہد کی درخواست کریں" مجھے یقین ہے لوگ آپ کا ساتھ دیں گے اور ملک اس معاشی مشکل سے باہر آ جائے گا" میاں نواز شریف نے مجھے بتایا ان کو شوکت عزیز کی بات نے بہت اچل کیا اور انہوں نے ان لائنوں پر سوچنا شروع کر دیا لیکن کسی عملی نتیجے سے پہلے ان کی حکومت ختم ہو گئی اور وہ مختلف قسم کے حالات سے گزرتے ہوئے جلا وطن ہو گئے ان کے بعد جناب شوکت عزیز پاکستان کے وزیراعظم

بنے اور انہوں نے اسی شاہانہ وزیراعظم ہاؤس میں رہنا شروع کر دیا مجھے نواز شریف نے بتایا جب شوکت عزیز صاحب سائیکل کے وزیراعظم ہاؤس میں شفٹ ہوئے اور انہوں نے نواز شریف سے تین گنا پروٹوکول انجوائے کرنا شروع کیا تو وہ حیران رہ گئے نواز شریف نے بتایا ان کی خواہش ہے کہ ان کی ملاقات شوکت عزیز صاحب سے ہو تو وہ ان سے پوچھیں ”جناب اب آپ وزیراعظم ہاؤس کیوں نہیں چھوڑ دیتے“ شاہ جی میری بات سنتے رہے میں نے عرض کیا ”شاہ جی 2004ء کے رمضان میں مجھے وزیراعظم شوکت عزیز کے اظہارِ اندر میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا ڈونر کے آخر میں جب سوال وجواب شروع ہوئے تو میں نے انہیں نواز شریف کا یہ پیغام پہنچا دیا وزیراعظم صاحب نے قہقہہ لگایا اور مسکرا کر جواب دیا ”1998ء اور 2004ء کے حالات میں بڑا فرق ہے اس وقت ملک ڈیفالٹ کر رہا تھا جبکہ اب ہم نے خزانہ بھر دیا ہے“ میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

میرے اور شاہ جی کے درمیان خاموشی کا طویل وقفہ حائل ہو گیا اس وقفے کے آخر میں شاہ جی نے کھنگار کر گلا صاف کیا اور غصے سے لرزتی آواز میں بولے ”تمہارے اندر ڈل کلاس کا پکیس بول رہا ہے تم اشتراکی دور کی فلموں اور تاولوں سے باہر نہیں نکل سکے“ میں نے قہقہہ لگا کر عرض کیا ”شاہ جی لندن اور پاکستان میں آخری فرق آپ کا یہ ردِ عمل ہے لندن میں آپ میری بڑی سے بڑی بدتمیزی کو اختلاف رائے سمجھ کر برداشت کر جاتے تھے لیکن یہاں اس بلک میں آپ میرے اختلاف رائے کو بھی بدتمیزی سمجھ رہے ہیں وہاں لندن میں آپ اور میں محض دو انسان تھے اور ہم دونوں نام اور ہنری کی طرح برابری کی سطح پر گفتگو کرتے تھے لیکن یہاں آپ اپر کلاس اور میں ڈل کلاس ہوں شاہ جی آپ لوگوں کی ایسی وہ اخلاقی اور معاشرتی منافقت ہے جو اس ملک کو آگے نہیں بڑھنے دے رہی میں نے آپ لوگوں کی اس منافقت کو سامنے رکھتے ہوئے آپ سے عرض کیا تھا شاید ہم کبھی کوروں جتنی ترقی نہ کر سکیں“ شاہ جی اٹھے انہوں نے غصے سے میری طرف دیکھا اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔



## سواتین دن میں

یہ جاوید ہاشمی کے آزادوں کی بات تھی۔ وہ اس وقت میاں نواز شریف کی کابینہ میں وفاقی وزیر صحت تھے۔ وہ شام کو مارگلہ کی پہاڑیوں میں واک کرتے تھے، میں بھی ان دنوں روزانہ مارگلہ کی پہاڑیوں میں جاتا تھا اور اکثر جاتے ہوئے اور بعض اوقات واپس آتے ہوئے ان کے ساتھ کراؤ ہو جاتا تھا، ہم چند منٹ گپ شپ کرتے تھے اور پھر اپنے اپنے راستے پر چل پڑتے تھے، ہم بعض اوقات اکٹھے واپس بھی چلے جاتے تھے، مجھے وہ دن تو یاد نہیں لیکن اس دن کی تمام یادیں ابھی تک مجھے یاد ہیں، اس دن ہماری گپ شپ ذرا سی لمبی ہو گئی تھی، میں نے گفتگو میں جاگیرداروں کو مسائل کی اصل جڑ قرار دے دیا تھا، میں نے ان سے عرض کیا تھا ”یہ آپ لوگ ہیں جن کی وجہ سے ملک آگے نہیں بڑھ رہا“ جاوید ہاشمی نے تہقید لگایا اور اپنے مخصوص سرائیکی لہجے میں بولے ”یار جاگیردار یاں تو کب سے ختم ہو چکی ہیں، ان کی جگہ اب بے شمار دوسری جڑیں لے چکی ہیں“ میں ان کی بات سنتا رہا، ہاشمی صاحب نے انکشاف کیا ”میں کئی نسلوں سے جاگیردار ہوں لیکن چند سال پہلے میں نے اسلام آباد میں ایک گھر خریدا، یہ گھر خریدنے کے لیے مجھے اپنی پانچ مربیعے آبائی زمین بیچنا پڑی تھی“ یہ بات سنانے کے بعد جاوید ہاشمی نے مجھ سے پوچھا ”تم جانتے ہو وہ مکان کس کا تھا“ میں نے انکار میں سر ہلا دیا، ہاشمی صاحب بولے ”یہ مکان ایک ریٹائرڈ فیڈرل سیکرٹری کا تھا“ میں خاموشی سے سنتا رہا، وہ بولے ”سیکرٹری صاحب کو یہ پلاٹ سی ڈی اے نے ریٹائرمنٹ کے بعد 26 ہزار روپے میں الاٹ کیا تھا انہوں نے اس پلاٹ پر چند لاکھ روپے لگائے تھے اور کروڑوں روپے جیب میں ڈال کر اپنے دوسرے مکان میں شفٹ ہو گئے تھے“ ہاشمی صاحب بولے ”تم خود فیصلہ کرو کیا وہ جاگیردار بڑا ہے جسے ایک مکان خریدنے کے لیے اپنی ساری زمین بیچنا پڑی یا وہ فیڈرل سیکرٹری جو چند ہزار روپے لگا کر کروڑوں روپے کا مالک بن گیا تم خود فیصلہ کرو کیا تو مملکت کے لیے میری خدمات زیادہ ہیں یا پھر اس سیکرٹری کی جس نے ٹھنڈے کمرے میں نوکری شروع کی اور ماتحتوں کی ہتھیلیوں پر بیٹھ کر تیس سال گزار دیئے“ وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔

میرے پاس ان کے اس سوال کا جواب نہیں تھا، جواب تو میرے پاس موجود حکومت کے اس اقدام کا بھی نہیں جس کے ذریعے ہمارے اسپورٹس وزیراعظم شوکت عزیز نے 22 گریڈ کے 86 افسروں کو دو دو کروڑ



روپے کا مالک بنادیا، یہ اقدام بھی اچھا وزیراعظم کی دوسری پالیسیوں کی طرح معیشت سے گھر پور ہوگا اور اس سے بھی پاکستان سے غربت ختم کرنے میں بڑی مدد ملے گی، وزیراعظم نے پچھلے ماہ 48 وفاقی سیکرٹریوں کو اسلام آباد کے ایک ہیجے سیکرٹری 12 میں چھ چھ سو گز کے پلاٹ دینے کا اعلان کیا، یہ پلاٹ فیڈرل سیکرٹریوں کی اعلیٰ کارکردگی کے صلے میں دیے گئے، سیکرٹری حضرات کو ان پلاٹوں کے ساتھ میں فیصد اضافی تنخواہ اور تاحیات دو ملازم بھی ملیں گے، وزیراعظم کے اس اعلان کے فوراً بعد سرکاری دینی، وزیراعظم نے اس سرکاری منظوری دی اور نومبر کے شروع میں سیکرٹریوں کو پلاٹ الاٹ کر دیے گئے، یہ خبر جب عام ہوئی تو مختلف صوبوں میں کام کرنے والے 22 گریڈ کے دوسرے افسروں نے پیریم کورٹ سے رجوع کی دھمکی دے دی، سیکرٹریوں نے وزیراعظم صاحب سے رابطہ کیا اور وزیراعظم نے محروم رہ جانے والے ان 38 افسروں کو بھی پلاٹ دے دیے، ان افسروں میں 19 ایسے افسر بھی شامل تھے جو ریٹائرمنٹ کے بعد کنٹرولڈ پروجیکٹ پر دوبارہ بھرتی ہوئے تھے، یہ پاکستان کی تاریخ کا پہلا فیصلہ تھا جس پر ریکارڈ تیزی سے عملدرآمد ہوا، یہ سارا عمل محض سات تین دنوں میں مکمل ہو گیا اور 86 سیکرٹری اور چیف سیکرٹری دو دو ڈاؤنڈرہائی از حائی کر دو روپے کے مالک بن گئے، یہ موجودہ حکومت کا ایک شاہکار فیصلہ تھا، اس فیصلے کے مطابق یہ پلاٹ ان تمام پلاٹوں کے علاوہ ہوں گے جو سیکرٹری حضرات مختلف اوقات میں فیڈرل گورنمنٹ ایمپلائز ہاؤسنگ سکیم کے تحت لیتے رہے ہیں اور یہ پلاٹ خالصتاً وزیراعظم صاحب نے سیکرٹریوں کی کارکردگی سے متاثر ہو کر عنایت کئے تھے۔

اگر ہم اپنے موجودہ سیکرٹریوں کا ٹریک ریکارڈ دیکھیں تو یہ سیکرٹریوں کا تیسرا اور چوتھا پلاٹ ہے، اسلام آباد میں پچھلے تیس برس سے فیڈرل گورنمنٹ ایمپلائز ہاؤسنگ سکیم کام کر رہی ہے، یہ سکیم ہر سیکٹر میں سرکاری ملازموں کو پلاٹ دیتی ہے اور ہمارے تمام سینئر افسر اس سکیم کے ذریعے پلاٹ لے چکے ہیں۔ حکومت نے ان لوگوں کو آئی ایٹ سیکٹر میں تین تین لاکھ روپے میں پلاس دیئے تھے، سیکرٹریوں نے یہ پلاٹ آسان قسطوں پر حاصل کیے تھے اور آج ان پلاس کی مالیت دو دو کروڑ روپے ہے۔ اس کے علاوہ وفاق کی تمام وزارتوں اور ڈویژنوں کی اپنی اپنی ہاؤسنگ سکیمیں بھی ہیں، ہمارے تمام سیکرٹری ان ہاؤسنگ سکیموں میں بھی پلاٹ لے چکے ہیں، ہمارے فیڈرل سیکرٹریوں کی اکثریت کا تعلق "ڈی ایم جی" سے ہے، یہ لوگ زندگی میں بے شمار خصلوں اور ڈویژنوں میں ڈپٹی کمشنر اور کمشنر رہ چکے ہیں اور انہوں نے اپنے اپنے دور میں وہاں بے شمار ہاؤسنگ سکیمیں بھی بنوائی تھیں، انہوں نے ان سکیموں میں بھی پلاٹ لئے تھے، ہمارے ایک سیکرٹری صاحب نے جب ترقی پائی تھی تو ملک کے نامور کالم نگار جناب اجمل نیازی نے انکشاف کیا تھا "یہ صاحب 64 پلاٹوں کے مالک ہیں" سیکرٹری صاحب نے قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی لیکن جب اجمل نیازی نے اپنے نیازی ہونے کا ثبوت دیا تو وہ خاموش ہو گئے، یہ صاحب بھی حکومت کی اس نوازش سے استفادہ کرنے والوں لوگوں میں شامل ہیں اور اس نئے پلاٹ کے بعد وہ اب 65 پلاٹوں کے مالک بن چکے ہیں، ہمارے سیکرٹریوں میں بے شمار ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو بائج سے دس برس بیرون ملک ملازمت "کٹ" کر آئے ہیں، یہ لوگ بیرون ملک ڈالروں اور پاؤنڈوں میں مجموعہ لیتے رہے تھے اور وہاں

سے کروڑ بچی ہو کر واپس آئے تھے لہذا اگر ان لوگوں کے اٹاٹوں کی پڑتال کی جائے، اگر ان کے اکاؤنٹس چیک کیے جائیں یا ان کے پلائوں کی تفصیل جمع کی جائے تو یہ لوگ ارب بچی ہوں گے لہذا میرا دعویٰ ہے ہمارے اکثر سیکرٹریوں کے پاس برادرم ہمایوں اختر عبدالرحمن اور ہمارے امیر ترین وزیر خارجہ جناب خورشید محمود قصوری سے زیادہ دولت ہے چنانچہ پھر ایسے مختصر حضرات کی دولت میں بیک جنٹل قلم دروازہ حالی کروڑ روپے کا اضافہ فرما دینا کہاں کی نیکی ہے۔

ہمارے محبوب وزیر اعظم نے سیکرٹریوں کو پلاٹ پیش کرتے ہوئے بڑی خوبصورت دہلی دی تھی، میں پچھلے کئی دنوں سے ان کی اس دہلی کے نقشے میں جھٹلا ہوں وزیر اعظم نے فرمایا "ہم نے یہ پلاٹ اپنی فینسی کی بنیاد پر الاٹ کئے ہیں" میں نے جب سے یہ بیان پڑھا ہے میں اپنی فینسی کے لفظ سے لطف اندوز ہو رہا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے اگر ہم ان کروڑ بچی سیکرٹریوں کی پانچ سال کی کارکردگی دیکھیں گے تو ہمیں ان کی پرفارمنس ٹینس میں ایک بھی ایسی فائل نہیں ملے گی جس پر انہوں نے وزیر اعظم، صدر، وزیر اعلیٰ، گورنر یا وزیر کے احکامات سے اختلاف کیا ہو گا لہذا اگر وزیر وزیر اعلیٰ، گورنر، وزیر اعظم اور صدر صاحب کے احکامات سے اتفاق کرنا اپنی فینسی ہے تو یہ لوگ اس میں واقعی یا کمال اور ہنرمند ہیں اور ان کی "اپنی فینسی" کا گراف حقیقتاً اس حد کو چھو رہا ہے جس کے صلے میں اگر انہیں اسلام آباد کا ایک پورا سیکٹر الاٹ کر دیا جائے تو بھی ان کا حق منک اور انہیں ہوتا، ویسے بھی ان لوگوں نے وزیر اعظم کی اس سری پر سواتین دنوں میں مملکت آباد کر کے اپنی اپنی فینسی کا ٹیوٹ دے دیا لہذا یہ لوگ اس انعام کے پورے پورے حق دار ہیں، ہم خوش قسمت سے ایک ایسے اسلامی ملک میں رہ رہے ہیں جس میں حاکم وقت زمین پر اللہ کا نائب ہوتا ہے اور جو اس کی بیعت میں اور سرزمین سے سبقت لے جاتا ہے صرف وہی اپنی فینسی کے معیار پر پورا اترتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں جو لوگ ضابطوں اور اصولوں کو اپنا مقصد حیات بنالیتے ہیں اس ملک میں ان کی حیثیت فقیر کے گیلے چھتروں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ یہ لوگ حقیقتاً معاملہ فہم اور سمجھ دار ہیں یہ جانتے ہیں حکومت حضرت موسیٰ کی ہوا فرعون کی ان کا کام بس "اپنی فینسی" ہے انہوں نے بس حاکم وقت کو خوش رکھنا ہے وہ جگہ کھدے تو صبح ہے اور اگر وہ شام کھدے تو بس شام ہے باقی سب کچھ اس ہے یہ لوگ واقعی بڑے "اپنی فینسی" اور کارگر ہوتے ہیں بس ان میں ایک خالی ہوتی ہے یہ کسی کے نہیں ہوتے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا بھنو صاحب جن لوگوں کی "اپنی فینسی" کی تعریف کیا کرتے تھے وہی لوگ بعد ازاں نہ صرف جنرل فیاض الحق کے مقرب افسروں میں شامل ہوئے بلکہ انہی نے بھنو صاحب کے "ڈیجھ وارنٹ" پر دھتکا بھی کئے "میں دعویٰ ہے کہتا ہوں جو لوگ آج "اپنی فینسی" کی بنیاد پر جناب شوکت عزیز سے پلاٹ لے رہے ہیں اگر خدا نخواستہ ان لوگوں کو سن موہن سنگھ کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل گیا تو یہ ان سے بھی ایک دو پلاٹ اٹھنے لیں گے یہ انہیں بھی اپنی اپنی فینسی سے متاثر کر لیں گے۔





## علیحدگی کی وجہ

اس کا کہنا تھا "یہ جدائی ہمارے لئے اچھی تھی، ہم نے الگ ہو کر ہر شعبے میں ترقی کی اور ہم بڑی تیزی سے پسماندہ ممالک کی فہرست سے نکل کر ترقی پذیر قوموں میں شامل ہو رہے ہیں" وہ سانس لینے کے لئے رکا، ہمارے سامنے "ڈیم سکوائر" کی روٹی تھی، "ایمسٹرڈیم سیاہوں سے لہالب بھرا تھا، لوگ دھوپ سینک رہے تھے، تصویریں کھینچ رہے تھے اور غرام کے پیچھے بھاگ رہے تھے جبکہ ہم دونوں ریسٹوران کے شیشے سے ایمسٹرڈیم کی نال اور کینال میں ڈوبتی بھانجی موٹر بوس دیکھ رہے تھے۔ وہ بنگلہ دیش کا صفائی تھا، اس کا نام مظہر السلام تھا اور ہم دونوں چند دن کے لئے ایمسٹرڈیم میں اکٹھے ہو گئے تھے، میں پاکستان سے میرے لئے گیا تھا اور وہ پن پکیوں پر تحقیق کے لئے ہالینڈ پہنچا تھا، میں نے ہالینڈ کے محکمہ سیاحت سے "بے الگ ٹیسٹ" کیلئے درخواست کی اور ٹیسٹ ریٹینک افسر نے مجھے مظہر السلام کا ٹیلی فون نمبر دے دیا، مظہر ڈیم سکوائر کے قریب ایک سٹوڈیو فلیٹ میں رہ رہا تھا، فلیٹ کا کرایہ زیادہ تھا لہذا اسے کسی ایسے مسلمان سیاح کی تلاش تھی جو اس کے ساتھ فلیٹ اور کچن شیئر کر سکے ہوں میں اس کے پاس پہنچ گیا اور ہم دونوں کی دوستی ہو گئی، وہ سارا دن پن پکیوں کے جنگل میں گھومتا رہتا تھا اور میں کبھی فلیٹ چلا جاتا تھا، کبھی بیک، کبھی اوٹرش اور کبھی ڈیم سکوائر کے سینکڑوں ہزاروں سیاہوں میں گم ہو جاتا تھا، وہ شام کو واپس آتا تو ہم چرسیوں کے قہوہ خانوں میں بھاٹکنا شروع کر دیتے، وہ بھی میری طرح سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن اسے چرسی دیکھنے کا بہت شوق تھا، وہ جب کسی حینہ کو چرسی کے نشے میں دھت دیکھتا تھا تو اس پر ایک عجیب سرشاری سی طاری ہو جاتی تھی اور وہ گردن ہلا کر کہتا تھا "یہ ہوئی نہ بات، مثالی اب آسمان پر گھوم رہی ہے۔"

یہ 14 اگست کی بات تھی، میں نے اسے جلدی بلایا اور ہم دونوں ریسٹوران کی تیسری منزل سے ایمسٹرڈیم میں بھاٹکے گئے، میں نے اس سے اچانک پوچھا "یار مظہر السلام اگر بنگلہ دیش پاکستان کا حصہ ہوتا تو آج تم بھی میرے ساتھ آزادی منارہے ہوتے" آج ہم دونوں بہت خوش ہوتے، اس نے گرم کافی کا لمبا سا گھونٹ بھرا اور مسکرا کر بولا "لیکن شاید ہم دونوں بیک وقت خوش نہ ہوتے، ہم بنگالی آپ لوگوں کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے تھے، ہماری ثقافت، ہماری سوچ اور ہماری ذہنیت میں بڑا فرق تھا، ہم دونوں نے کبھی نہ کبھی الگ ہونا



ہی تھا" میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا وہ بولا "مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان میں روایات اور ثقافت کا بہت فرق تھا" آپ پر "ٹھوڈل لارڈز" حادی تھے آپ کے کلچر میں ایک وڈیا "سردار یا چودھری ہوتا ہے اور باقی سب کی "کین اور ہاری" آپ کا وڈیا تمام ہاریوں اور کینوں پر حکومت کرتا ہے یہ کلچر جب دیہات سے نکل کر شہروں میں داخل ہوتا ہے تو وہاں پیر و کرٹ سیاستدان اور جرنیل وڈیرے بن جاتے ہیں اور عوام ہاری "کین اور کئی" آپ لوگ اس کلچر میں پر دان چڑھے تھے آپ لوگ دو طبقوں میں بھی تقسیم تھے "ظالم یا مظلوم" آپ کے مظلوم پوری زندگی ظالم کلاس میں شامل ہونے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ ظالم اپنی پوزیشن برقرار رکھنے کی سعی کرتے رہتے ہیں جبکہ ہم لوگ پھر اکلاس کے لوگ ہیں "پچھرے آزاد مشن ہوتے ہیں" یہ زندگی بھر سردار بنتے ہیں اور نہ ہی کسی کی سرداری قبول کرتے ہیں "یہ آزاد رہتے ہیں اور دوسروں کو آزاد رکھتے ہیں" یہ لوگ نیم ورک کے عادی ہوتے ہیں ان میں سے ہر شخص اپنا رول متعین کر لیتا ہے اور اس کے بعد چپ چاپ کام کرتا رہتا ہے ہمارے ہاں اگر کوئی شخص ایک بار چھوٹا مقام لے تو وہ زندگی بھر چھوٹے نہیں رکھتا ہمارے معاشرے میں کوئی کسی کا ہاس نہیں ہوتا سب مل کر کوشش کرتے ہیں اور آخر میں نتائج آپس میں بانٹ لیتے ہیں ہمارے برعکس آپ لوگوں کو ہر وقت ایک لیڈر ایک جاگیر دار ایک جرنیل اور ایک ڈکٹیٹر کی ضرورت ہوتی ہے آپ لوگ ڈکٹیٹر کے بغیر ترقی نہیں کر سکتے جبکہ ہم لوگ ڈکٹیٹر کے ساتھ ترقی نہیں کر سکتے "آپ اور ہمارے درمیان یہ بہت بڑا فرق تھا"۔

وہ بولتا وہاں اور میں منتار ہا "اس نے بتایا" آپ لوگ دہا توں سے ہماری آزاد منش فطرت کا اندازہ لگا لیجئے۔ ہندوستان کی تاریخ میں کوئی فاتح، کوئی ظالم، آزما ہمیں زیادہ دیر تک غلام نہیں رکھ سکا۔ جو بھی جرنیل بنگال پہنچا وہ بالآخر وہاں سے پسپا ہوا۔ مثل بنگال آئے لیکن انہیں بنگال چھوڑنا پڑا۔ انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ آزادی بنگالی رجسٹ نے شروع کی، داسراٹے کی گاڑی پر پہلا حملہ بنگالیوں نے کیا، ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ دو بڑی سیاسی جماعتیں ہیں۔ ان دونوں سیاسی جماعتوں نے بنگال میں جنم لیا اور انگریزوں نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کیا لیکن بنگالیوں نے انگریزوں کو یہ فیصلہ واپس لینے پر مجبور کر دیا وغیرہ۔ ہم حقیقتاً آزاد لوگ ہیں، ہم کسی جرنیل، کسی جاگیر دار اور کسی وڈیرے کو برداشت نہیں کرتے۔ "وہ رکھا، اس نے سانس لیا اور اس کے بعد بولا "آپ ظلم کرنے اور ظلم سہنے کے عادی ہیں لیکن ہم لوگ ظلم کرتے ہیں اور نہ ہی ظلم سہتے ہیں چنانچہ ہم لوگ آپ سے الگ ہو گئے، ہمیں اس جدائی کا فائدہ ہوا، ہم نے پچھلے 35 برسوں میں ہر شعبے میں ترقی کی، ہم نے فوج اور سیاست کو الگ الگ کر دیا۔ ہمارے سیاستدانوں کے درمیان یہ اتفاق ہو چکا ہے۔ بنگلہ دیش میں حالات جیسے بھی ہوں وہ فوج کو اقتدار میں نہیں آنے دیں گے۔ ہم نے فوج کا سائز چھوٹا کر دیا اس وقت پوری اسلامی دنیا میں بنگلہ دیش کا فوجی بجٹ سب سے کم ہے۔ ہماری کرنسی پاکستان کے مقابلے میں مضبوط ہے۔ ہمارا کمیونیکیشن نیٹ روک پاکستان سے بڑا اور مضبوط ہے۔ ہمارے تمام دیہات میں سڑکیں، بجلی، اسکول، ہسپتال اور ٹیلی فون موجود ہیں۔ ہم بڑی تیزی سے درآمدی ملک سے برآمدی ملک بن رہے ہیں، ہم ہر سال پاکستان کے مقابلے میں

چالیس گنا زیادہ گارمنٹس برآمد کرتے ہیں، ہم نے گرامین بینک بنایا، یہ بینک اب تک دو کروڑ بنگالیوں کا مقدر بدل چکا ہے۔ یہ دنیا کا پہلا بینک ہے جو کسی پسماندہ ملک سے ترقی یافتہ ممالک میں انکیسپورٹ ہوا۔ دنیا کے 68 ممالک نے اپنے شہروں میں گرامین بینک کے ماڈل کو کاپی کیا، نمکول (او آر ایس) بنگلہ دیش کی ایجاد ہے۔ ہماری یہ ایجاد اس وقت پوری دنیا میں استعمال ہو رہی ہے۔ ہماری ایک "این جی او" بریک نے بنگلہ دیش کی آخری سرحد تک سکول کھول دیئے۔ ہم لوگ تعلیم میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں، ہمارے تمام دیہات میں ڈاکٹر اور ڈسپنسریاں موجود ہیں۔ ہماری یونیورسٹیاں، کالج اور سکول سال میں تین سو دن کھلتے ہیں اور بنگلہ دیش کا شمار دنیا کے ان دس ممالک میں ہوتا ہے جن کی طرف ملٹی نیشنل کمپنیاں تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ آج حالت یہ ہے آپ کا "ٹاور" گازیوں کا ٹریڈنگ سسٹم بناتا ہے لیکن یہ ٹریڈنگ سسٹم پاکستان سے پہلے بنگلہ دیش میں نصب ہوتا ہے۔ بنگلہ دیش دنیا کا واحد اسلامی ملک ہے جس میں شیعہ اور سنی کی لڑائی نہیں، جس میں دہشت گردی نہیں ہو رہی اور جس میں خود کش حملہ آور پیدا نہیں ہو رہے، ہمارے بازار بھی آباد ہیں اور تعلیمی ادارے بھی جبکہ آپ لوگ 06-2005ء میں بھی انہی مسائل کا فکار ہیں جن میں آپ 1947ء میں مبتلا تھے۔ آپ سے جدائی کا دکھ ہمیں بھی ہوا تھا۔ آج بھی بنگلہ دیش کے ایسے ہزاروں لاکھوں لوگوں کی گھڑیاں پاکستانی وقت بتاتی ہیں لیکن امریکان لوگوں کو بھی پاکستان میں شامل ہونے کا موقع دیا جائے تو شاید یہ لوگ بنگلہ دیش چھوڑنا پسند نہ کریں؟ کیونکہ یہ لوگ پاکستان سے محبت کرتے ہیں، پاکستان کے لحوالہ لاؤ اور ڈکٹیٹروں سے نہیں "دور کا اور لمبا سانس بھر کر بولا" ہم لوگوں نے 1971ء میں فیصلہ کر لیا تھا کہ ہم ڈکٹیٹروں کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے، ہم نے جب 1971ء میں آپ کو چھوڑا تھا تو اس وقت پاکستان میں ایک ہاورڈی بزنس کی حکومت تھی، آج 35 برس بعد بھی آپ کے ملک میں یونیفارم حکومت کر رہی ہے، میں آج یہاں ایمسٹرڈیم میں بیٹھ کر دھوئی کرتا ہوں، بنگلہ دیش میں کبھی مارشل لا نہیں لگے گا لیکن کیا تم یہ دھوئی کر سکتے ہو؟ میں خاموش رہا، وہ بولا "تمہاری یہ چپ ہماری علیحدگی کی وجہ تھی، ہم بول پڑتے تھے لیکن تم لوگ خاموش رہتے تھے اور خاموش رہتے ہو، ہم اس وقت بھی تم لوگوں سے آگے تھے اور ہم لوگ آج بھی تم سے آگے ہیں۔"





## کیا پوری اسلامی دنیا میں

رانا خاندان 1965ء میں برطانیہ منتقل ہوا، وہ لوگ اپنے بچوں کو بہتر اور خوشحال مستقبل دینا چاہتے تھے۔ رانا سجاد کی عمر اس وقت پانچ سال تھی، یہ لوگ سکاٹ لینڈ کے شہر گلاسگو میں اقامت پذیر ہو گئے، رانا سجاد کو مقامی سکول میں داخل کر دیا گیا، رانا صاحب نے کالج تک تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد ذاتی کاروبار شروع کر دیا، 1984ء میں ان کی ملاقات لوئیس کیمپبل سے ہوئی، لوئیس ایک سولہ سالہ خوبصورت سکاٹش لڑکی تھی، لوئیس رانا سجاد کی محبت میں گرفتار ہوئی، اس نے اپنا مذہب اور گھریلو چھوڑا، مسلمان ہوئی اور دونوں نے شادی کر لی، اللہ تعالیٰ نے انہیں چار بچوں سے نوازا، سب سے بڑا بیٹا عمر تھا، عمر 1986ء میں پیدا ہوا، 1988ء میں تیسرے پیدا ہوئے، آدم 1990ء میں پیدا ہوا اور 1994ء میں مصباح ارم نے آنکھ کھولی۔ مصباح ارم اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔

2000ء میں لوئیس اور رانا سجاد کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے، لوئیس مسلمان ہونے کے باوجود اسلامی تعلیمات پر عمل نہیں کر رہی تھی، جبکہ رانا سجاد تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہو رہا تھا، یہ اختلاف بڑھتے چلے گئے یہاں تک کہ لوئیس نے گھر چھوڑ دیا اور وہ اپنے ایک کزن کینی کیمپبل کے ساتھ رہنے لگی، کینی مغربی معاشرے کا نمائندہ شخص تھا، اس میں وہ سارے عیب موجود تھے جسے ہم عیب کہتے اور عیب سمجھتے ہیں، لوئیس کینی کی گرل فرینڈ بن گئی، لہذا رانا سجاد نے 2001ء میں لوئیس کو طلاق دے دی، لوئیس نے بچے رانا سجاد کے پاس چھوڑ دیئے، اس وقت مصباح کی عمر صرف سات سال تھی، رانا سجاد اکثر سفر پر رہتا تھا لیکن وہ جہاں بھی جاتا تھا اپنے بچوں کو ساتھ رکھتا تھا، بچے اس دوران والد کے بہت قریب آ گئے، رانا سجاد نے 2002ء میں مستقل طور پر پاکستان شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا، بچے بھی اس کے ساتھ پاکستان آ گئے، یہ لوگ لاہور میں رہنے لگے، چند ماہ بعد جیسندہ اور آدم نے مستقل طور پر لاہور میں رہنے کا فیصلہ کیا، جبکہ بڑا بیٹا عمر تعلیم مکمل کرنے کے لئے واپس گلاسگو چلا گیا، مصباح کی عمر اس وقت آٹھ برس تھی اور برطانوی قانون کے مطابق اسے اپنی ماں کے پاس واپس جانا تھا، لہذا مصباح اپنی ماں کے پاس سکاٹ لینڈ چلی گئی، لوئیس اپنے بوائے فرینڈ اور مصباح کے ساتھ گلاسگو سے سٹینر (Stranraer) شفٹ ہو گئی۔ لوئیس کثرت شراب نوشی اور نشیات کی عادی ہو چکی تھی، وہ نشے کے عالم میں مصباح پر تشدد کرتی تھی،



مصباح رانا سجاد کے ساتھ رہ کر عبادت کی عادی ہو چکی تھی وہ نماز پڑھنا چاہتی تھی لیکن لوئیس اور اس کا بوائے فریڈ اسے نماز سے روکتے تھے وہ اسے حرام گوشت کھانے اور شراب پینے پر بھی مجبور کرتے تھے ان لوگوں نے اس کا نام بھی بدل دیا تھا وہ اسے مصباح کی بجائے مولیٰ جلاتے تھے مصباح اس ماحول میں شدید ٹھنڈ کا شکار ہو گئی۔ مصباح کا اپنے بھائیوں اور بہن تھینڈ کے ساتھ رابطہ تھا وہ انہیں اپنے اوپر ہونے والے مظالم کے بارے میں بتاتی رہتی تھی بچے یہ باتیں اپنے والد کو بتا دیتے تھے چنانچہ رانا سجاد نے اپنی بیٹی کو پاکستان لانے کا فیصلہ کیا رانا سجاد اور تھینڈ اگست 2006ء میں سکاٹ لینڈ گئے تھینڈ مصباح کے سکول گئی اور اسے لے کر والد کے پاس ہوئی آگئی یہ لوگ Stranraer سے گلاسگو آئے اور اسی روز گلاسگو سے پاکستان آ گئے لوئیس نے جب مصباح کو قلعہ پایا تو اس نے فوراً پولیس اسٹیشن میں رپورٹ لکھوا دی لوئیس کا کہنا تھا اس کے سابق خاوند نے اس کی بائبل بیچی کو اغوا کر لیا ہے اور وہ اسے پاکستان لے جا کر کسی بوڑھے کے ساتھ بیاہ دے گا برطانوی میڈیا نے اس خبر کو ایٹھ بنا دیا اور لوئیس 24 گھنٹے ٹیلی ویژن سکرین پر دکھائی دیے گئے وہ سکاٹ لینڈ کے اخبارات کی ”ایڈسوری“ بھی بن گئی یہ معاملہ فوراً انٹرپول کے پاس گیا اور انٹرپول نے حکومت پاکستان کو مطلع کر دیا گلاسگو کے ایم پی اور پاکستانی برطانوی سیاستدان چودھری سرور نے مداخلت کی وہ پاکستان آ گئے۔

چودھری سرور 28 اگست کو مصباح سے ملے انہوں نے ملاقات کے بعد میڈیا کو بتایا ”مصباح اپنی مرضی سے پاکستان آئی ہے اور اس پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں تھا“ دو دن بعد رانا سجاد نے پولیس کانسٹیبل کی اور مصباح کو میڈیا کے سامنے بٹھا دیا مصباح نے پوری دنیا کے میڈیا کو بتایا وہ اپنی والدہ اور اس کے بوائے فریڈ کے ساتھ خوش نہیں تھی وہ اپنی مرضی سے والد کے پاس آئی ہے اور وہ اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ پاکستان رہتا چاہتی ہے اسی دوران لوئیس کے وکیل نے سکاٹ لینڈ حکومت کو مصباح کی تحویل کی درخواست دے دی وکیل نے 2003ء میں برطانیہ اور پاکستان کے درمیان ہونے والے سمجھوتے کو جواز بنایا سکاٹ لینڈ نے حکومت پاکستان کو لکھ دیا اور حکومت رانا سجاد پر دباؤ ڈالنے لگی رانا سجاد نے مصباح کی تحویل کیلئے لاہور ہائی کورٹ میں رٹ کر دی ہائی کورٹ نے 2 ستمبر 2006ء کو مصباح کو رانا سجاد کی عارضی تحویل میں دے دیا لیکن مصباح کا پاسپورٹ جمع کر لیا گیا اور اسے عدالت کی حدود میں رہنے کا حکم دے دیا گیا ستمبر میں مصباح ازم کائیس قومی اور عالمی شکل اختیار کر گیا تمام پاکستانی اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن محلوں پر مصباح کی خبریں اور انٹرویوز چلنے لگے لوئیس نے پاکستان میں کیس لڑنے کا فیصلہ کر لیا اس کے بعد عدالتی جنگ شروع ہو گئی رانا سجاد 29 ستمبر کو یہ جنگ ہار گیا ہائی کورٹ نے مصباح کو 7 دن کے اندر برٹش ہائی کمیشن کے حوالے کرنے کا حکم دے دیا رانا سجاد نے فیڈرل شریعت کورٹ میں اپیل کر دی اسی دوران چیف جسٹس آف پاکستان نے ذاتی دلچسپی لی اور مقدمہ سپریم کورٹ میں چلا گیا سپریم کورٹ کا فیصلہ تشکیل پایا اور کیس کی سماعت شروع ہو گئی لیکن فیصلے سے پہلے لوئیس کی وکیل ناہیدہ محبوب الہی نے ”آؤٹ آف کورٹ“ سمجھوتے کا عندیہ دے دیا جس کے بعد لوئیس اور رانا سجاد کے درمیان حاد کانٹا سمجھ - ط

پا گیا۔ یوں مصباح کو پاکستان میں رہنے کی اجازت مل گئی، میں نے دس جنوری 2007ء کو مصباح کو خوشی سے روئے اور اپنے والد کے گلے لگتے دیکھا تو مجھے بہت خوشی ہوئی، یہ پاکستان کے ساتھ ساتھ اسلامی ثقافت کی بھی فتح تھی، مصباح ہماری اخلاقی برتری ثابت ہوئی تھی لیکن پھر 6 فروری کا دن آ گیا، اس دن نے مجھ سمیت بے شمار پاکستانیوں کا دل دہلا دیا۔

پھر فروری 2007ء کو پاکستانی اخبارات میں مصباح ارم کے حوالے سے ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی ”پاکستانی نژاد سکاٹش بچی مصباح ارم کا نوٹ سکول میں داخلہ لے گی“ یہ خبر بین الاقوامی نژاد انجمنی اے ایف پی نے جاری کی تھی اور یہ پاکستان سمیت دنیا کے تمام اخبارات میں شائع ہوئی تھی، نژاد انجمنی نے اس خبر میں دعویٰ کیا ”مصباح ارم کے والد سجاد احمد رانا نے بتایا وہ کسی اچھے سکول کے متلاشی تھے جس پر ان کے دوستوں نے انہیں مشورہ دیا وہ مصباح کو کیتھولک سکول میں داخل کر دیں کیونکہ وہاں کا تعلیمی معیار اور نظم و ضبط شاندار ہے“ انجمنی نے دعویٰ کیا ”مصباح ارم کے والد کا کہنا ہے وہ اپنی بیٹی کو کیتھولک سکول میں بھجوانے کے معاملے میں متعصب نہیں ہیں“ میں نے جب یہ خبر پڑھی تو میرا سر شرم سے جھک گیا اور میں نے سوچا کیا ہم لوگ مصباح جیسی بچی کو پاکستان میں ایک معیاری تعلیمی ادارہ بھی فراہم نہیں کر سکتے؟ وہ بچی جو اسلام کی محبت میں سکاٹ لینڈ کی تہذیب چھوڑ کر آئی تھی کیا ہم اس بچی کو معیار کے نام پر ایک بار پھر کیتھولک تہذیب میں دھکیل دیں گے؟ میں نے سوچا اس ملک میں ایک ہزار کے قریب ادب پتی ہیں کیا یہ ادب پتی لوگ پاکستان میں کا نوٹ معیار کا ایک اسلامی سکول بھی قائم نہیں کر سکتے؟ میں نے سوچا وہ کون لوگ تھے جنہوں نے پوری دنیا میں کا نوٹ جیسے تعلیمی ادارے قائم کئے اور بچے عالمی معیار کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور کیا ایک ارب 55 کروڑ مسلمانوں میں کوئی ایک بھی ایسا مسلمان نہیں جو اسلامی ممالک میں اسلامی کا نوٹ سکول بنا سکے؟ جو 58 اسلامی اور 109 عیسائی ممالک میں مدینہ سکول، مکہ سکول یا اسلامک انجیو کیشنل سکول بنا سکے اور یہ سکول معیار اور نظم و ضبط میں ہارورڈ یونیورسٹی، کیمرج سکول اور کا نوٹ کا مقابلہ کر سکیں؟ میں نے سوچا مصباح کا امتحان دس جنوری کو ختم ہو گیا لیکن ہمارا امتحان فروری سے شروع ہوا اور یہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔





## دل کے ارب پتی

خاور نقوی صاحب میرے ایک مہربان ہیں۔ خاور صاحب نے پچھلے دنوں میانوالی کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک ہیڈ ماسٹر کا ذکر کیا 'یہ ہیڈ ماسٹر صاحب سادات سے تعلق رکھتے تھے اور انہوں نے اپنے اطفال' محبت اور محنت سے پورے علاقے کی تقدیر بدل دی' انہوں نے اس گاؤں میں علم اور تعلیم کی ایک ایسی کھیتی تیار کی جس کی فصل اب پورا ملک کھا رہا ہے' نقوی صاحب کا کہنا تھا یہ ہیڈ ماسٹر صاحب دل کے ارب پتی تھے اور اگر اس ملک کو دل کے ایسے چند ارب پتی مل جائیں تو یہ ملک ترقی کی قطار میں سر اٹھا کر کھڑا ہو سکتا ہے' نقوی صاحب کا فرمانا تھا 'آپ نے اپنے کالم بعنوان 'پوری اسلامی دنیا میں' پاکستانی نژاد سکاٹش بچی مصباح ارم کے حوالے سے جو معلومات بھجھ پہنچائی ہیں وہ واقعی ایک لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس بچی نے مغربی تہذیب کے سختی رویوں سے جان چھڑا کر پاکستان کو اپنا مسکن بنایا۔ اس منزل پر آپ نے بجا طور پر دکھ کا اظہار کیا کہ اس بچی کے بچے جذبے کو ایک معیاری تعلیمی ادارہ بھی نصیب نہ ہو سکا جس میں وہ یہاں کی تہذیب و ثقافت کے مطابق تعلیم حاصل کر سکے، یہاں بھی اسے کیتھولک سکول کا رخ کرنا پڑا، اسے کیتھولک تہذیب کو اپنانا پڑا۔ آپ نے یہ المناک سوال اٹھایا ہے، کیا اس ملک کے ایک ہزار کے قریب ارب پتی لوگ کا ٹوٹ معیار کا ایک سکول بھی قائم نہیں کر سکتے؟ آپ سے عرض ہے ارب پتی لوگ معیاری ادارہ قائم کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں مگر آپ جاننے ہیں تعلیم ان کی ترجیحات میں شامل نہیں، ان کی ترجیحات امارت، مزید امارت اور لامتناہی امارت ہے، ان لوگوں نے تعلیم کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ آپ نے اس طبقے کا ذکر کیا ہے جس کے بچے سوہلیات سے آراستہ سکولوں میں یا بیرون ملک تعلیمی اداروں میں تعلیم پاتے ہیں لہذا یہ لوگ اس ملک میں کسی معیاری تعلیمی ادارے پر اپنی جیب سے پیسہ کیوں خرچ کریں گے؟ اس سے انہیں یہ خطرہ لاحق ہو گا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو عام لوگوں کے بچے ان کے بچوں کے مقابلے میں آجائیں گے جس کے نتیجے میں ان کی اولاد غریب عوام کی اولاد پر ٹکرائی نہیں کر سکے گی۔ اس کے علاوہ ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ کوئی لامتناہی کام کرنے کے لئے دولت مند یا ارب پتی ہونا ضروری نہیں، دل کا ارب پتی ہونا ضروری ہوتا ہے"



خاور نقوی صاحب نے مزید لکھا ”میں آپ کو دل کے ایک ارب پتی کی کہانی سنانا چاہتا ہوں“ اس نے ایک دور افتادہ اور پسماندہ گاؤں میں بے سروسامانی کے عالم میں نقطہ دل کی دولت کے مل بوتے پر ایک سکول سکول دیا۔ دل کے اس ارب پتی کا نام سید مہطا محمد شاہ تھا۔ انہوں نے 1952ء میں گورنمنٹ پرائمری سکول نورنگہ ضلع میانوالی میں بے دی لچر کی حیثیت سے تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ انہوں نے اس کے بعد مسلسل محنت سے ایس دی، فاضل فارسی، ایف اے، سی ٹی، بی اے اور بی ایڈ کے امتحانات پاس کیے۔ انہوں نے کچھ عرصہ گورنمنٹ پرائمری سکول نورنگہ کے ہیڈ ماسٹر کے طور پر بھی کام کیا اور جب اس ادارے کو نڈل سکول کا درجہ ملا تو انہوں نے اس کے سربراہ کی حیثیت سے بھی فرائض سرانجام دیے۔ انہوں نے ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے ایسی بے لوث، پر خلوص اور مثالی خدمت کی کہ پورے علاقے میں ان کا نام ہیڈ ماسٹر صاحب مشہور ہو گیا۔ ان کے قریبی رشتہ دار بھی انہیں ہیڈ ماسٹر صاحب کے نام سے یاد کرتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب خانی اندر رہیں تھے۔ کوکڑاٹے جاڑے کی طویل راتوں اور چٹپلاتی گرمی کے لمبے دنوں میں بھی ان کا سلسلہ تدریس جاری رہتا تھا۔ نورنگہ وریائے سندھ کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے کئی بار دریا کی زد میں آ جاتا تھا۔ موسم گرما میں دریا پھر کر کناروں سے اٹھ اٹا تھا اور نورنگہ جمیل کی شکل اختیار کر لیتا تھا، جس کے نتیجے میں اہل نورنگہ کے کچے مکان اور چھپرپانی کی نذر ہو جاتے تھے۔ سیلاب کے دنوں میں علاقے کی فصلیں پانی میں حیرتی نظر آتی تھیں، کبھی دریا غیض و غضب میں زمین کے کنارے کا شغل اختیار کرتا تھا تو پانی گھروں کو بنیادوں اور درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ دیتا تھا۔ دریا کی اس منہ زور طغیانی اور ہیبت ناک جولاہی میں بھی ہیڈ ماسٹر صاحب کسی درخت کی چھاؤں میں خشکی کا کوئی ٹکڑا تلاش کر لیتے تھے اور وہاں بیٹھ کر غریب کسانوں، شتر بانوں، چرواہوں اور محنت کشوں کے خاک نشین بچوں کو علم کے نور سے منور کرنے کی بھرپور کوشش کرتے رہتے تھے اس لگن اور انتھک محنت کی وجہ سے دور دور تک ان کی شہرت ہوئی اور دور دراز سے لوگ اپنے بچوں کو ان کے پاس داخل کروانے آنے لگے، وہ اپنی جب سے نادار طلباء کے اخراجات بھی برداشت کرتے تھے، ان کے قیام و طعام کا بندوبست بھی کرتے تھے اور وہ رات کو اٹھ اٹھ کر ان کی دیکھ بھال بھی کرتے تھے، تعلیم کے ساتھ تربیت اور نظم و ضبط بھی ان کے طریق تدریس کے اہم اجزاء تھے۔ جب ان کے ہونہار طلباء اس ادارے سے فارغ التحصیل ہو جاتے تو وہ ان کی آئندہ تعلیم اور عملی زندگی کے بارے میں شہروں میں متیم اپنے دوستوں اور عزیز واقارب سے مشورہ کرتے تھے اور اس طرح اپنے طلباء کی مکمل رہنمائی کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو نیم بھی نھتی ملی تھی لیکن وہ ان سے فقط ڈیوٹی نام میں کام لیتے تھے جبکہ انہوں نے اضافی وقت صرف اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔

اس محنت اور جانفشانی کا یہ ثمر نکلتا تھا کہ اس سکول کا نتیجہ نہ صرف سو فیصد رہتا تھا بلکہ اس سکول کے جتنے طلبہ پرائمری اور نڈل کے دہلیے کے امتحانات میں شریک ہوتے تھے وہ سب کامیابی حاصل کرتے تھے، ان کے بعض طلباء ضلع اور ریجن کی سطح پر اول پوزیشن بھی حاصل کرتے تھے۔ اس ادارے کے طلباء نے فصاحت و سلیقہ

کے علاوہ اہم ہم نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس مثالی کارکردگی کی بناء پر سکول ضلع کا بہترین سکول قرار پایا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو کئی بار ڈپٹی کمشنر ضلع میانوالی سے نقد انعامات اور تحریری اسناد بھی ملیں تھیں۔ بلاشبہ یہ سب اعزازات اپنی جگہ قابل قدر ہیں لیکن ان کا سب سے بڑا اعزاز ان کے وہ شاگرد ہیں جو آج نہایت اہم سرکاری عہدوں پر فائز ہیں، ہیڈ ماسٹر صاحب دارفانی سے کوچ کر چکے ہیں مگر وہ آج بھی اپنے شاگردوں کی صورت میں زندہ ہیں۔ بات کا نوٹ سکول سے شروع ہوئی تھی۔ شہروں میں دیکھا جائے تو ایک طرف بڑے بڑے ناموں والے اور تمام جدید سہولیات سے آراستہ و پیراستہ تعلیمی ادارے ہیں جبکہ دوسری طرف نورنگ جیسا گاؤں ہے اور اس گاؤں میں بے سروسامان بے درود و یار مشکلات و مسائل میں گھرا ہوا ایک تعلیمی ادارہ ہے جس میں دل کے ایک ارب پتی نے قابل قدر اور یادگار کام کر دکھایا۔ میں جب بھی اس سکول کو ملک کے بڑے تعلیمی اداروں کے ساتھ تقابلی نگاہ سے دیکھتا ہوں تو مجھے یہ مراعات یافتہ ادارے اس بے خانہاں سکول کے مقابلے میں پیچ نظر آتے ہیں۔ آج سرزمین وطن سید عطاء محمد شاہ صاحب جیسے دل کے ارب پتیوں کے انتظار میں ہے جو ملک کے کسی حصے میں نادار عوام کے بچوں کے لئے دل سوزی اور تندی کے ساتھ گورنمنٹ ملل سکول نورنگ جیسے تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھیں۔“

خاور نقوی صاحب سے سید عطاء محمد شاہ صاحب کے بارے میں سن کر دل سے ہوک سی اٹھی اور مجھے اپنے وہ تمام استاد یاد آ گئے جو ہمیں شاہ صاحب مرحوم کی سپرٹ سے پڑھاتے تھے ہمارے پاس اچھے سکول نہیں تھے سکولوں میں کمرے، بیچ اور تختہ سیاہ بھی نہیں ہوتے تھے ہم لوگ نگلی اور خنڈی زمین پر بیٹھتے تھے اور ہمیں اس وقت کا نوٹ کے سپینلنگ تک نہیں آتے تھے لیکن ہمارے پاس شاہ صاحب جیسے استادوں کی شکل میں اللہ کی نعمت موجود تھی۔ آج یہ اس نعمت کا اعجاز ہے میں اور میرے طبقے کے لوگ نہ صرف اس معاشرے میں پورے قدر سے کھڑے ہیں بلکہ کا نوٹ سکولوں سے فارغ التحصیل کلاس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لوگوں کا حق بھی مانگ رہے ہیں۔ یہ سب دل کے ان ارب پتیوں کی مہربانی تھی جنہوں نے خود بھوکے رہ کر ہم جیسے لوگوں کو علم اور فکر کا رزق دیا تھا جنہوں نے علم کو کاروبار نہیں بلکہ عبادت بنایا تھا۔



## ریڈزون

شیخ صاحب نے کہا اس کر جواب دیا "میں ہسپتال شفٹ ہو رہا ہوں" میں نے انہیں غور سے دیکھا وہ ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک صحت مند دکھائی دے رہے تھے ان کے چہرے کی سرخی اور آواز کی کلنگ بھی قائم تھی وہ مسکرائے "مجھے معلوم ہے تم وجہ پوچھو گے" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا انہوں نے اپنے گنج پر ہاتھ بھرا اور پراسرار لہجے میں بولے "یاد رکھیں صدر بٹش پاکستان کے دورے پر آ رہے ہیں" وہ خاموش ہو گئے یہ حیرت کا دوسرا ہم تھا میں نے عرض کیا "حضور صدر بٹش کا آپ کے ساتھ کیا تعلق" شیخ صاحب نے تہتہ لگا دیا "یار میں 55 برس کا ہو چکا ہوں ڈاکٹر کہتے ہیں پاکستان جیسے ممالک میں 55 برس ہائی ریسک عمر ہے اور اس عمر کے باہوں کو کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے انہیں ہارٹ ایک ہو سکتا ہے انہیں برین ہیموریج" فالج اور شوگر ہو سکتی ہے اور کسی بھی وقت ان کے گردے نفل ہو سکتے ہیں" وہ سانس لینے کیلئے رکے انہوں نے پانی کے جگ کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ گویا ہوئے "صدر بٹش پاکستان آ رہے ہیں وہ جتنی دیر اسلام آباد میں رہیں گے پورا شہر میز رہے گا تمام سڑکوں پر ٹرانسپورٹ معطل رہے گی تمام ٹریفک بند کر دی جائے گی اس دوران اس شہر میں پرند و تک پر نہیں مار سکے گا" وہ رکے جگ کی طرف دیکھا اور پھر گویا ہوئے "میں 55 سال کا بڑھا ہوں میں سوچتا ہوں اگر ان دنوں مجھے کچھ ہو گیا تو میں ہسپتال کیسے پہنچوں گا" قریب ترین ہسپتال بھی میرے گھر سے 25 کلومیٹر دور ہے اور اس ہسپتال کے راستے میں بھی ٹھیک ٹھاک ریڈزون پڑتا ہے"

مجھے شیخ صاحب کا مسئلہ سمجھ آ گیا "میں نے ان سے عرض کیا" ماشاء اللہ آپ کی پلاننگ تو لا جواب ہے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے اگر ان دنوں خدا نخواستہ آپ کے گھر کا کوئی دوسرا فرد بیمار ہو گیا تو کیا بنے گا یہ تمام بیماریاں آپ کی بیگم صاحب آپ کے دونوں بیٹوں اور آپ کی بہوؤں کو بھی تو لگ سکتی ہیں" شیخ صاحب نے میری طرف دیکھا اور تہتہ لگا کر بولے "میں پورے خاندان کا بندوبست کر کے ہسپتال چار ہا ہوں میری ایک بہو امید سے ہے میں نے اسے اس کے سینکے بھجوا دیا ہے میں نے پوتوں اور پوتیوں کو سکول سے چھٹی کرا دی ہے اور دو اپنے نھیاں چلے گئے ہیں میرے دونوں بیٹوں کو دفتروں سے چھٹی ہے ان کے دفتر ریڈزون میں آتے ہیں اور حکومت



نے جمعرات کو یہ سارا علاقہ خالی کر لیا تھا وہ یہ دن مری میں گزاریں گے میری بیگم میرے ساتھ ہسپتال رہے گی جبکہ تمام نوکراپے اپنے گھروں میں رہیں گے ان کا منصوبہ بن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اور میں نے ان سے عرض کیا "آپ ایک صحت مند شخص ہیں ڈاکٹر آپ کو ہسپتال کیوں داخل کریں گے" شیخ صاحب نے قہقہہ لگایا "مجھے یہ راستہ ڈاکٹر ہی نے دکھایا تھا ڈاکٹر قصوری میرے پرنسپل فزیشن ہیں انہوں نے گزشتہ ۱۰ مجھے فون کیا اور مجھے یہ اطلاع دی اسلام آباد کے تمام صاحبِ ثروت دو دن کیلئے ہسپتال داخل ہو رہے ہیں ہمارے پاس ایک کمرہ اور دو بیڈ خالی ہیں اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں یہ بیڈ اور یہ کمرہ آپ کیلئے بک کر اسکتا ہوں آپ تیس ہزار روپے جمع کرائیں اور دو دن ہسپتال میں سوچ کریں میں نے ڈاکٹر سے سوچنے کیلئے وقت مانگا تو اس نے کہا شیخ صاحب ہمارے پاس ایک لمبی چوڑی ڈیننگ لسٹ ہے اگر آپ نے فوراً فیصلہ نہ کیا تو شام تک آپ کو یہ کمرہ ایک لاکھ روپے میں بھی نہیں ملے گا بندائیں درگیا اور میں نے فوراً بنگلہ کراچی میں ابھی تیس ہزار روپے جمع کر کر آیا ہوں" میرے لیے یہ بات انکشاف کی حیثیت رکھتی تھی میں نے ان سے پوچھا "ہسپتال میں آپ کے علاوہ کون کون ہے" شیخ صاحب نے قہقہہ لگایا "وہ تمام لوگ جو تیس چالیس ہزار روپے انفرڈ کر سکتے ہیں ان لوگوں نے تو اپنے ہاؤس چھوڑ دیے اور لیکن تک ہسپتالوں میں شفٹ کر لیے ہیں آج کل ہسپتال ہسپتال کم اور پبلک ہسپتال زیادہ لگ رہے ہیں"

میں خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا وہ مسکرائے "یار میں اس بات پر حیران ہوں ہش ہماری عزت میں اضافہ کیلئے پاکستان آ رہے ہیں یا پھر اس ملک کے لوگوں کو سزا دیے ان کی آمد سے چار دن پہلے پورا شہر سیزر کر دیا گیا مارگلہ کی پہاڑیوں پر تو جیس لگادی گئیں تمام گاڑیوں کی تلاشی شروع ہوگئی جمعرات تک امریکہ کے 730 کمانڈرز اسلام آباد پہنچ گئے تھے وہ اپنے ساتھ اپنی گاڑیاں سکیورٹی آلات اور سیکورٹی سسٹم بھی لائے تھے انہیں سیٹلائٹ کی سہولت بھی حاصل تھی وہ لوگ اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر اسلام آباد کا چپہ چپہ دیکھ رہے تھے ہماری فوج اور ہماری پولیس بھی ہماری جیبوں ہمارے کپڑوں کی تلاشی لے رہی تھی میرا بیٹا راول ڈیم پر واک کرنے جاتا ہے کل شام اسے راستے میں روک لیا گیا اس کا شناختی کارڈ چیک کیا گیا اس سے اس کا ریک پوچھا گیا اس نے بتایا وہ ایک پرائیویٹ فرم میں اکاونٹنٹ ہے تو سکیورٹی افسر نے اس سے کہا آپ اگلے چار دن اس جگہ واک نہیں کر سکتے یار میں پچھلے تیس برس سے اس شہر میں رہ رہا ہوں لیکن میں نے پچھلے دو دنوں میں خود کو اس شہر میں جتنا اجنبی اور مشکوک پایا ہے اتنا میں نے کبھی محسوس نہیں کیا مجھے محسوس ہوتا ہے اس شہر اس ملک کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں میں ایک احتمال پسند اور روشن خیال پاکستانی نہیں ہوں میں ایک دہشت گرد اور شدت پسند شخص ہوں یار میں گھر سے نکلتا ہوں تو مجھے اس ملک کا وہ سپاہی بھی مشکوک نظروں سے دیکھتا ہے جو مجھے دس برسوں سے جانتا ہے یار مجھے امریکی گاڑیاں اور امریکی سیٹلائٹ تک گھورتے ہیں یار مجھے یوں محسوس ہوتا ہے یہ ہش صاحب صرف مجھے میری اوقات سمجھانے آ رہے ہیں اور وہ صرف مجھے ذلیل کرنے کیلئے پاکستان آ رہے ہیں یار میں انفرڈ کر سکتا ہوں اس لیے میں یہ دو دن ہسپتال میں لیٹ کر ہش صاحب کا حجاب جھیل لوں گا لیکن یار تم ان لوگوں کے بارے

میں سوچو جو یہ دو دن گھروں میں گزاریں گے یا سوچو اگر ان لوگوں کو ایمر جنسی میں ہسپتال جانا پڑ جائے کسی نے ایمر جنسی میں شہر سے باہر جانا ہو یا کسی نے ہنگامی حالت میں شہر میں آنا ہو تو اس کا کیا بنے گا وہ کہاں جائے گا یا رکھا دنیا کے کسی دوسرے ملک میں بھی ایسا ہوتا ہے یا راس سے تو اچھا ہے جب بھی ہمارے حکمرانوں کو بیش صاحب کی زیارت کی حاجت ہو تو وہ پوری کاجینہ کو ساتھ لیں اور امریکہ چلے جائیں بیش صاحب سے ہاتھ ملائیں تصاویر کھینچوائیں اور مسکراتے مسکراتے واپس آ جائیں کم از کم ہماری جان تو بچ جائے مجھے محسوس ہوا شیخ صاحب ذرا سے جذباتی ہو گئے ہیں اور وہ جذبات کی رو میں بہہ کر یہ تک بھول گئے ہیں وہ ایک پاکستانی شہری ہیں وہ جذبات کی رو میں خود کو کسی اچھے ملک کا اچھا شہری سمجھنے لگے ہیں ان کا خیال ہے جس طرح برطانیہ فرانس اور جاپان کے شہری ایسے دوروں کے دوران حکومتوں کو اپنے شہری حقوق سلب کرنے کی اجازت نہیں دیتے بالکل اسی طرح اس ملک کے حکمران اپنے شہریوں کی ضروریات اور مجبور ہوں کا بھی خیال رکھیں گے مجھے محسوس ہوا شیخ صاحب کی روحانی حالت خراب ہو چکی ہے لہذا انہیں یہ دو دن واقعی ہسپتال میں گزارنے چاہئیں انہیں واقعی ہسپتال شفٹ ہو جانا چاہیے۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

## مہنگائی

جناب سلیمان شاہ وزیراعظم شوکت عزیز کے شیر ہیں ان کا شمار پاکستان کے نامور اقتصادی ماہرین میں ہوتا ہے چند روز پہلے "جیو" کے ایک پروگرام میں مجھے ان سے گفتگو کا شرف حاصل ہوا ان کے ساتھ خزانے کے وزیر ملک عمر ایوب بھی تھے عمر ایوب پاکستان کے سابق صدر ایوب خان کے پوتے ہیں یہ پروگرام "مہنگائی" کے حوالے سے تھا پروگرام کے شروع میں عمر ایوب نے مہنگائی کی وہ ایسی حیران کن وجوہات بیان کیں جنہوں نے میرے چمکے چمکے اعضاء انہوں نے فرمایا "پاکستان اقتصادی لحاظ سے ترقی کر رہا ہے اور دنیا میں جو ملک ترقی کرتے ہیں ان میں مہنگائی کا سیلاب آتا ہے دوسرا دنیا میں پٹرول کی قیمتیں بڑھی ہیں جس کا اثر پوری دنیا کی معیشت پر دکھائی دے رہا ہے" میں نے ان سے عرض کیا "مصور اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں" انہوں نے مہربانی فرما کر مجھے امان دے دی میں نے عرض کیا "پٹرول کی قیمتیں تو پوری دنیا میں بڑھی ہیں لیکن مہنگائی صرف پاکستان میں آئی ہے برطانیہ میں دودھ اور ذیل روٹی کی قیمتیں 1967ء میں طے ہوئی تھیں ان میں آج تک کوئی اضافہ نہیں ہوا امریکہ میں کھانے پینے کی اشیاء کی قیمتیں وہی ہیں جو آج سے پانچ برس پہلے تھیں اسی طرح لہلہ ایسٹ میں بھی قیمتیں مستحکم ہیں حتیٰ کہ بھارت تک میں پٹرول کی قیمتیں اشیائے ضرورت پر اثر انداز نہیں ہوئیں جبکہ پاکستان میں پچھلے پانچ برسوں میں ضروریات زندگی کی قیمتوں میں تین گنا اضافہ ہوا دوسرا دنیا میں صرف پاکستان واحد ملک نہیں جو ترقی کر رہا ہے اس وقت دنیا میں ایسے 30 ممالک ہیں جن کی معیشت مستحکم ہو رہی ہے لیکن ان میں سے کسی ملک میں مہنگائی نہیں ہوئی" جناب سلیمان شاہ نے میری بات کاٹی اور پوری اقتصادی قوت سے بولے فرمایا "پاکستان میں مہنگائی ہے ہی نہیں آپ غلط کہہ رہے ہیں" ان کے اس دعوے سے وہاں سراپا لگی پھیل گئی اور ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

جناب سلیمان شاہ کی بات درست تھی اگر ان کے زاویے سے دیکھا جائے تو پاکستان نہ صرف ایک مستحکم ملک ہے بلکہ اس میں چیزوں کے نرخ تیزی سے گزر رہے ہیں لیکن یہ الگ بات ہے اس سسٹم کا فائدہ کسی عام شخص کو نہیں پہنچ رہا دنیا میں چیزیں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک وہ جنہیں ہم ضروریات زندگی کہتے ہیں یہ دو چیزیں ہوتی



ہیں جن کے بغیر کوئی ذی روح زندہ نہیں رہ سکتا مثلاً آنا دالیں، کھجی، دودھ اور ہنریاں جبکہ دوسری چیزوں کو ہم سامان قعیش کہتے ہیں یہ چیزیں زندگی کو آرام دہ بناتی ہیں لیکن ان کی کمی یا غیر موجودگی سے زندگی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا مثلاً ریفریجریٹر، ٹیلی ویژن، گاڑیاں اور ڈائمنگ ٹیبل وغیرہ پوری دنیا میں حکومتیں اشیائے ضرورت پر نظر رکھتی ہیں وہ ان کی قیمتیں بڑھنے نہیں دیتیں کیونکہ وہ جانتی ہیں ایک عام غریب آدمی سے لے کر صدر تک سب کی زندگی کا دار و مدار انہی اشیاء پر ہوتا ہے جبکہ حکومتیں ان کے مقابلے میں سامان قعیش کی قیمتوں کی کوئی پروا نہیں کرتیں ان کی قیمتیں خواہ دس گنا بڑھ جائیں حکومتوں کو پروا نہیں ہوتی لیکن بد قسمتی سے پاکستان میں اس سے الٹ ہے پاکستان میں سامان قعیش کی قیمتیں تو تیزی سے گھرنے لگی ہیں جبکہ اشیائے ضرورت کے نرخ آسمان کو چھو رہے ہیں مثلاً آپ ایک سال کی قیمتیں نکال کر دیکھ لیں آپ کو معلوم ہوگا 60 کلو گرام کا وہ نیلی وڈن جو سال پہلے تین ساڑھے تین لاکھ روپے میں ملتا تھا وہ آج لاکھ سے بڑھ لاکھ روپے میں دستیاب ہے اسی طرح دو لاکھ کا کھجکاں ایک لاکھ روپے میں اور 185 لاکھ کی گاڑی 60 لاکھ روپے میں مل رہی ہے اس کے برعکس اشیائے ضرورت میں سے کبھی کبھی غائب ہو جاتا ہے کبھی دالیں، کبھی چینی اور کبھی آلو، کبھی پیاز ناقابل خرید ہو جاتے ہیں کبھی چینی مہنگی ہو جاتی ہے اور کبھی گھی، جناب سلیمان شاہ اور ان کی حکومت جب قیمتوں کی قیمتوں پر نظر ڈالتی ہے تو انہیں یہ ملک سستا لگتا ہے جبکہ اس کے مقابلے میں جب ایک عام شہری ضروریات زندگی کی تلاش میں باہر نکلتا ہے تو اسے وہ پیچھا چھوٹا اور آلو بڑے دکھائی دیتے ہیں اور اس کے منہ سے چیخ نکلتی جاتی ہے وہ وہاں دینے لگتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے یہ مہنگائی ہے کیوں؟ اور دیکھو اسے کس طرح کنٹرول کیا تھا؟ پوری دنیا میں حکومتیں ضروریات زندگی پر ٹیکسوں کی شرح کم رکھتی ہیں وہ ٹیکس کا یہ خسارہ سامان قعیش پر بھاری ٹیکس لگا کر پوری کرتی ہیں لیکن پاکستان میں حکومت سرمایہ حاصل کرنے کیلئے ان ڈائریکٹ ٹیکس بڑھا دیتی ہے اس وقت حکومت 32 فیصد ڈائریکٹ ٹیکس لے رہی ہے جبکہ ان ڈائریکٹ ٹیکس 68 فیصد تک ہیں اس ان ڈائریکٹ ٹیکس کا نتیجہ مہنگائی کی شکل میں نکلتی رہا ہے اب سوال یہ ہے پاکستان میں ڈائریکٹ ٹیکس وصول کیوں نہیں کئے جاتے؟ اس کی وجہ بڑی دلچسپ ہے دنیا بھر میں حکومتیں جن لوگوں سے ڈائریکٹ ٹیکس وصول کرتی ہیں پاکستان میں وہ لوگ یا تو حکومت کا حصہ ہوتے ہیں یا پھر وہ حکومت سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتے ہیں لہذا حکومت اپنا خسارہ پورا کرنے کیلئے اندھا دھند ان ڈائریکٹ ٹیکس لگا دیتی ہے جس کے نتیجے میں ضروریات زندگی قوت خرید سے باہر ہو جاتی ہیں آپ حکومت سے پوچھئے وہ لوگوں کو 20 روپے لینڈ پٹرول کیوں نہیں دیتی، حکومت پٹرول کے ہر لیٹر پر 24 روپے ٹیکس کیوں لیتی ہے؟ اگر حکومت عوام کو پٹرول کے ہر لیٹر پر 24 روپے کی چھوٹ دے اور یہ خسارہ بالائی طبقے سے وصول کرے تو پاکستان کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے لیکن حکومت ایسا کبھی نہیں کرے گی کیونکہ اس کے نتیجے میں حکومت میں شامل لوگوں کو اپنی جگہیں خالی کرنا پڑیں گی اور یہ ممکن نہیں۔

میں نے اس پروگرام کے دوران اپنے محرز ساتھیوں سے پوچھا تھا کیا آپ لوگوں کو دودھ کی قیمت

معلوم ہے وہ گھبرا گئے 'میں' فیس پڑا اور میں نے ان سے کہا آپ ہماری بد قسمتی ملاحظہ کیجئے ہماری اقتصادی پالیسیاں وہ لوگ بنا رہے ہیں جنہیں دودھ کے نرخ تک معلوم نہیں ہیں اور یہ وہ جنس ہے جو پاکستان کے 15 کروڑ لوگ روزانہ استعمال کرتے ہیں 'میں' نے انہیں بتایا مہاترا گاندھی نے نہرو کو وصیت کی تھی "نہرو دیکھو تم جب تک بھارت میں آنے 'سائیکل اور سینما کے کٹ کی قیمت نیچے رکھو گے تمہاری حکومت چلتی رہے گی" نہرو نے گاندھی سے وجہ پوچھی تھی تو انہوں نے فرمایا تھا "یہ وہ اشیاء ہیں جو اس ملک کا غریب شہری استعمال کرتا ہے" نہرو نے یہ بات پلے باندھ لی تھی لہذا وہ موت تک بھارت کا وزیر اعظم رہا لیکن ہمارے حکمران قیامت تک حکمران رہنا چاہتے ہیں مگر وہ غریب کو اس کا حق دینے کیلئے تیار نہیں ہیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

## سات سوالوں کے سات جواب

دنیا میں یہودی دکاندار اور گجراتی بے منافع خوردگی میں یہ طوطی رکھتے ہیں ان لوگوں کے نفع اور نقصان کے اپنے ہی پیمانے ہوتے ہیں یہ لوگ منافع میں کمی کو نقصان تصور کرتے ہیں مثلاً ایک گجراتی بنیالگی میں بیٹھ کر رو رہا تھا کسی نے رونے کی وجہ پوچھی تو وہ روتے ہوئے بولا "مجھے دو لاکھ روپے نقصان ہو گیا" پوچھنے والے نے نقصان کی تفصیل دریافت کی وہ آنکھیں پونچھ کر بولا "مجھے پچھلے پختے مرچوں میں دس لاکھ روپے منافع ہوا تھا لیکن اس بار صرف آٹھ لاکھ روپے بچے ہیں"

مجھے نفع نقصان کا یہ پیمانہ قومی اسمبلی میں جناب عمر ایوب کی تقریر میں کرایا دیا گیا خزانہ کے وزیر مملکت نے 22 مارچ کو قومی اسمبلی میں پٹرول کی قیمتوں کے حوالے سے اپوزیشن سے سات سوال پوچھے ان کا فرمانا تھا "ان سوالوں کا دیا شدہ ارادہ جواب ساری قوم کو صحیح فیصلے تک پہنچنے میں مدد دے گا" ان سات سوالات کو آج سات دن ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک اپوزیشن کی طرف سے ان کے جواب نہیں آئے لہذا قوم ایک ہفتہ گزرنے کے باوجود صحیح فیصلے تک نہیں پہنچ سکی چنانچہ میں نے اس سلسلے میں براہِ دم عمر ایوب کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ایک پاکستانی ہونے کی حیثیت سے قوم کو صحیح فیصلے تک پہنچانا میری بھی اتنی ہی ذمہ داری ہے جتنی ذمہ داری اپوزیشن ارکان کے ہازر کندھوں پر استوار ہوتی ہے براہِ دم عمر ایوب کا پہلا سوال تھا "کیا پاکستان 80 فیصد تیل عالمی منڈی سے نہیں خریدتا؟" عمر ایوب کا سوال درست ہے واقعی پاکستان اپنی ضرورت کا 80 فیصد تیل درآمد کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سچ ہے پاکستان دنیا میں تیل درآمد کرنے والا واحد ملک نہیں دنیا کے 180 ممالک میں 91 ممالک سو فیصد پٹرول درآمد کرتے ہیں 32 ممالک 70 سے 90 فیصد 11 ممالک 50 فیصد اور 27 ممالک اپنی ضرورت کا 30 سے 50 فیصد تیل درآمد کرتے ہیں دنیا میں 6 ممالک تیل کے معاملے میں خود کفیل ہیں جبکہ 13 ممالک تیل درآمد کرتے ہیں پوری دنیا عالمی منڈی سے روزانہ 184 اعشاریہ 3 ملین بیرل تیل خریدتی ہے اور پاکستان بھی تیل خریدنے والے ان 161 ممالک میں سے ایک ملک ہے ان کا دوسرا سوال تھا "کیا حکومت نے 2004ء میں پٹرول کی قیمتیں برقرار رکھنے کیلئے 39 ارب روپے خرچ نہیں کئے؟" عمر ایوب



کے اس سوال کا جواب ہے ”نہیں“ حقیقت یہ ہے حکومت پٹرول پر 45 سے لے کر 55 فیصد تک ٹیکس وصول کرتی ہے اس وقت بھی حکومت عالمی منڈی سے 432 ڈالر میٹرک ٹن خام تیل خرید رہی ہے اس خام تیل سے پٹرولیم کی دس مصنوعات حاصل کی جاتی ہیں سب سے پہلے نفعائیہ کے طیاروں کیلئے جیٹ آئل نکالا جاتا ہے اس کے بعد ہائی آکٹین پمپر پٹرول ہائی سپیڈ ڈیزل لائٹ ڈیزل فرس آئل انچوسن گرہس ٹوربیٹکٹ آئل اور سڑکوں پر بچھانے والی تارکول اس ایک میٹرک ٹن خام تیل سے ایک ہزار 3 سو 62 لیٹر پٹرول نکلتا ہے اگر ایک میٹرک ٹن خام تیل سے صرف پٹرول نکالا جائے اور باقی 9 اشیاء ضائع کر دی جائیں تو بھی یہ پٹرول 18 روپے 39 پیسے لیٹر پڑتا ہے یہ 18 روپے 39 پیسے لیٹر پٹرول بازار میں 45 روپے 60 پیسے لیٹر بچھا جا رہا ہے آپ خود فیصلہ کریں حکومت اس پر کتنا ٹیکس لے رہی ہے جبکہ اس خام تیل سے حاصل ہونے والی دوسری مصنوعات اس منافع کے علاوہ ہیں اب آتے ہیں ان 39 ارب روپے کی طرف یہ درست ہے حکومت نے 2004ء میں اپنے ٹیکس میں کمی کی تھی جس کے نتیجے میں تیل کی مد میں حاصل ہونے والے ٹیکس میں 39 ارب روپے کم ہو گئے تھے حکومت ان 39 ارب روپوں کو نقصان قرار دے رہی ہے ان کا تیسرا سوال تھا ”اگر حکومت عوام کو تیل کی مد میں 70 سے 80 ارب روپے سبسڈی دے تو کیا ملک مالی طور پر تباہ نہیں ہو جائے گا“ اس کا جواب بھی ہے ”نہیں“ کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے یہ سبسڈی دراصل سبسڈی ہے ہی نہیں آپ خزانے میں سے ایک پیسہ نہیں دیں گے“ آپ تیل کے منافع میں سے 70 سے 80 ارب روپے کی قربانی دیں گے دوسرا اگر مان لیا جائے یہ سبسڈی ہے تو بھی آپ یہ سبسڈی کسی دشمن کو نہیں دے رہے آپ یہ اپنے عوام اپنے ملک کے لوگوں کو دے رہے ہیں ان لوگوں کو جو آپ کی رعایا ہیں اور آپ نے جن کے حقوق کی حفاظت کا حلف اٹھایا ہے پوچھا سوال تھا ”کیا حکومت کے مخالفین پاکستان کو مالی طور پر تباہ نہیں کرتا چاہے“ اس کا جواب بھی ہے ”نہیں“ سوال یہ ہے تیل کے معاملے میں حکومت کی مخالفت کون لوگ کر رہے ہیں؟ یہ لوگ بھی ارکان اسمبلی ہیں یہ بھی عوام کے نمائندے ہیں اور انہیں بھی پاکستان کے عوام نے اپنی بات ایوان اقتدار تک پہنچانے کیلئے اسمبلی بھیجا ہے لہذا یہ لوگ مخالفت کر کے اپنا فرض ادا کر رہے ہیں اپنی آنکھیں دھندلا رہے ہیں پانچواں سوال تھا ”کیا شوکت عزیز حکومت تیل پر ٹیکس لگانے والی پہلی حکومت ہے؟“ عمر ایوب کا یہ سوال درست ہے واقعی تیل پر ٹیکس لگانے والی یہ پہلی حکومت نہیں ماضی میں بھی تیل پر ٹیکس لگتا رہا تھا لیکن سوال یہ ہے اگر ماضی کی حکومتیں عوام پر ظلم کرتی رہی ہیں تو کیا آنے والی حکومت پر یہ ظلم جاری رکھنا فرض ہو چکا ہے کیا ماضی کی زیادتیاں حال اور مستقبل کی زیادتیوں کا جواز بن سکتی ہیں اگر ماضی میں سوتل ہوتے تھے تو کیا آج بھی سوتل ہونے چاہئیں ان کا چھٹا سوال تھا ”اگر حکومت تیل پر ٹیکس نہیں لگائے گی تو کیا وہ یہ کہ دوسرے ٹیکسوں کے ذریعے پوری ٹیکس کرے گی“ عمر ایوب کا یہ سوال دراصل سوال نہیں جواب ہے ہاں حکومت پٹرول پر ٹیکس ختم کر دے اور یہ کمی انکم ٹیکس جیسے دوسرے ڈائریکٹ ٹیکسوں سے پوری کرے حکومت تمام بڑی گاڑیوں پر پٹرول ٹیکس لگانے لیک کیٹال سے بڑے پلاٹوں پر ٹیکس لگا دے اور دوسری گاڑی اور دوسرے گھر

۶ - پر بھاری ٹیکس لگا دے تو یہ کمی بڑی آسانی سے پوری ہو جائے گی ان کا ساتواں سوال تھا ”کیا بھارت میں پٹرول کی قیمتیں پاکستان سے زیادہ نہیں ہیں“ عمر ایوب کی بات درست ہے واقعی بھارت میں پٹرول کی قیمتیں زیادہ ہیں وہاں پٹرول پچاس روپے لیٹر تک رہا ہے لیکن اس وقت میکسیکو اور برازیل میں پٹرول کی قیمتیں بھارت سے بھی زیادہ ہیں وہاں پٹرول پاکستانی کرنسی میں 92 روپے لیٹر ملتا ہے لہذا اگر دنیا کے کسی ملک میں کوئی چیز مہنگی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں آپ بھی اپنے ملک میں اس کی قیمت بڑھا دیں دوسری بات بھارت میں پٹرول مہنگا ہے لیکن وہاں دودھ آٹا سبزیاں انھی چینی اور دالیں سستی ہیں اگر آپ کا معیار بھارت ہے تو آپ نے اس کی بھری میں یہ چیزیں سستی کیوں نہیں کیں؟ کیا یہ زیادتی نہیں؟ اگر یہ زیادتی نہیں تو صدر پرویز مشرف نے حکومت کو ہنگامی کم کرنے کا حکم کیوں دیا؟ وزیراعظم نے اس سلسلے میں کئی کئی کیوں بتائی؟“

یہ تو تھے براہِ عمر ایوب کے سات سوال اور ان کے جواب اب میں ان سے صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں ”حکومت 143 وفاقی وزراء اور ۱۷ صوبائی وزراء کے چیرمینوں اور پارلیمانی سیکرٹریوں کو مفت پٹرول فراہم کرتی ہے ان میں سے 70 وزراء صوبے میں جتنا پٹرول چاہیں مفت حاصل کر سکتے ہیں جبکہ باقی لوگوں کی حد مقرر ہے سوال یہ ہے پٹرول کی قیمتوں میں اضافے کے بعد جب پوری قوم بحران کا شکار ہے تو ان 143 لوگوں میں سے وہ کون سا شخص ہے جس نے یہ اعلان کیا ہو میں آج سے مفت پٹرول نہیں لوں گا میں قوم کے مفاد میں اپنی یہ مراعات واپس کر رہا ہوں“

قوم کو صحیح فیصلہ کرنے کیلئے اب عمر ایوب کے جواب کا انتظار رہے گا۔



## ذمہ داری

1956ء میں لالہ بہادر شاستری بھارت میں ریلوے کے وزیر تھے ان کے دور میں جنوبی بھارت میں ریل کا حادثہ ہوا اس حادثے میں 33 لوگ مارے گئے لالہ بہادر شاستری نے حادثے کی ذمہ داری قبول کی اور وزارت سے استعفیٰ دے دیا ان کے استعفیٰ سے ایک برس بعد 29 ستمبر 1957ء کو ساہیوال میں بھی ریل کا ایک حادثہ ہوا جس میں اڑھائی سو لوگ جاں بحق ہو گئے اس دور میں ایک مشہور مسلم لیگی رہنما پاکستان ریلوے کے وزیر تھے قومی اسمبلی میں کسی رکن نے لالہ بہادر شاستری کا واقعہ بیان کیا اور وفاقی وزیر سے استعفیٰ ہونے کی درخواست کی محترم وزیر اس وقت ایوان میں موجود تھے وہ فوراً اپنی نشست پر کھڑے ہوئے اور مسکرا کر بولے ”میں الحمد للہ مسلمان ہوں اور کسی مسلمان کو کسی ہندو کی جیروں میں نہیں کرنی چاہیے“ ایوان میں ایک فلک شگاف قہقہہ گونجا اور ساہیوال کے اڑھائی سو مظلوموں کا خون اکھواڑی کیمٹی کی فائلوں میں جذب ہو گیا۔

پاکستان دو لحاظ سے بد قسمت ملک ہے اس ملک میں جب بھی ریلوے کا کوئی حادثہ ہوتا ہے حکومت اور میڈیا اسے تاریخی حادثہ قرار دیتے ہیں اور دم آج تک پاکستان کی کسی اہم شخصیت نے ریلوے کے کسی تاریخی حادثے کی ذمہ داری قبول نہیں کی 1947ء سے 2005ء تک ریلوے کے کسی وزیر کسی مشیر کسی چیئر مین اور کسی ڈائریکٹر جنرل نے کسی حادثے کے بعد استعفیٰ نہیں دیا آج تک ریلوے کے کسی بڑے ذمہ دار کو سزا نہیں ہوئی پاکستان میں ریلوے کے حادثے میں دو افراد جاں بحق ہو جائیں یا پانچ سو لوگ آج تک سزا کا عمل کاغذ پر بدلنے والوں ڈرائیوروں اور سٹیشن ماسٹروں سے اوپر نہیں گیا آپ دلچسپ امر ملاحظہ کیجئے 1990ء میں بے نظیر بھٹو کی حکومت تھی 3 جنوری 1990ء کو ساہیوال کے مقام پر ریلوے کا حادثہ ہوا اس حادثے میں 307 لوگ جاں بحق ہو گئے اس وقت یہ پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ تھا ظفر لغاری ریلوے کے وزیر تھے لوگ مطالبہ کر رہے تھے وفاقی وزیر اس حادثے کی ذمہ داری قبول کریں اور استعفیٰ دے دیں ظفر لغاری بھی خود کو حادثے کا ذمہ دار سمجھتے تھے لہذا انہوں نے استعفیٰ دینے کا فیصلہ کر لیا کابینہ کے اجلاس میں انہوں نے بے نظیر بھٹو کے کان میں سرگوشی کی ”میں استعفیٰ لکھ کر لے آیا ہوں“ ابھی ان کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ کسی دوسرے وزیر نے بھتر مہر کو



اپنی طرف متوجہ کر لیا، محترم اس وزیر سے فارغ ہوئیں تو وہ ریلوے حادثے اور ظفر لغاری جیوں کو بھول چکی تھیں، ظفر لغاری نے استعفیٰ چھاڑا پاؤں کے قریب پڑی نوکری میں ڈالا اور سر جھٹک کر وہ بارہ کاروبار سلطنت میں مصروف ہو گئے۔

پاکستان میں پچھلے پندرہ برسوں میں ریل کے 25 بڑے حادثے ہو چکے ہیں ان حادثوں میں اب تک تین ہزار لوگ مر چکے ہیں، یہ حادثے اور ان حادثوں میں مرنے والوں کی تعداد دنیا میں سب سے زیادہ ہے، کل 13 جولائی کو گھوٹکی میں تین مسافر ٹرینیں ٹکرائیں، یہ پاکستان کا پہلا ”ملٹی پل ریلوے ایکسیڈنٹ“ ہے یہ ایکسیڈنٹ ثابت کرتا ہے ریلوے کا نظام انتہائی نااہل اور سفاک لوگوں کے ہاتھوں میں ہے دنیا کہتی ہے اگر وہ ٹرینیں ٹکرائیں تو یہ حادثہ ہو سکتا ہے لیکن اگر ایک ہی جگہ تین ٹرینیں ٹکرائیں تو یہ حادثہ نہیں غفلت، نااہلی اور سفاکی ہوتی ہے لہذا 13 جولائی کے اس حادثے نے وفاقی وزیر سے لے کر گھوٹکی ٹیشن کی انتظامیہ تک سب کی سفاکی، نااہلی اور غفلت ثابت کر دی لیکن مجھے یقین ہے اس حادثے کی ذمہ داری بھی پاکستان کا کوئی بڑا شخص قبول کرے گا اور نہ ہی استعفیٰ دے گا، یہ حادثہ بھی ڈرائیور کا غلط لٹے والے ٹکڑے یا سگنل دینے والوں کے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا، دو چار مہینے تک اس کی انکوائریاں ہوں گی اور اس کے بعد اسے بھی داخل دفتر کر دیا جائے گا اور اس کے بعد مزید دو چار ہزار مسافروں کو موت کی ہڈی پر چڑھا دیا جائے گا، یہ ہیں ہماری روایات، ہم نے آج تک پاکستان کے کسی حادثے کو جرم قرار نہیں دیا، ہم نے آج تک کسی وزیر کو ان حادثوں کا مجرم قرار نہیں دیا، مجھے یقین ہے اگر ہم ایک بار سرحد کے اس پار دیکھ لیں تو ہم شرم سے پانی پانی ہو جائیں، بھارت میں بھی ریلوے ہے وہاں بھی یہی ہڈی پر چڑھی ہے لیکن آپ بھارت جا کر دیکھ لیں آپ کو وہاں کے ریلوے سٹیشنوں اور پاکستان کے سٹیشنوں کے کلچر، عمارتوں، زبان اور نظام میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوگا، دہلی ریلوے سٹیشن اور لاہور کے سٹیشن کے چمکے تک ایک ہی برانڈ اور ایک ہی شکل کے ہیں لیکن جہاں تک حادثوں اور ان کے رد عمل کی بات ہے تو پاکستان اور بھارت کے رویوں میں زمین آسمان کا فرق ہے وہاں اگر اس قسم کا کوئی حادثہ ہو جائے تو ریلوے وزیر پہلا شخص ہوتا ہے جو اپنا استعفیٰ پیش کرتا ہے، اگست 99ء کو مغربی بنگال کے علاقے دیباج پور میں دو ٹرینیں ٹکرائیں، اس حادثے میں بھارت کے 500 مسافر مارے گئے تھے، اس وقت پیش کار بھارت کے وزیر ریلوے تھے انہوں نے فوراً اپنا استعفیٰ وزیر اعظم اٹل بھاری واجپائی کو پیش کر دیا، پوری قوم نے ان کے اس اقدام کو سراہا جبکہ ہمارے ملک میں کئی بار ایسے حادثے ہوئے، کئی بار سینکڑوں مسافر جاں بحق ہوئے لیکن کسی نے ہمارے کسی وزیر سے استعفیٰ طلب کیا اور نہ ہی کسی نے پیش کش کی۔

میں نے گزشتہ روز ایک وفاقی وزیر کو لال بہادر شاستری کا واقعہ سنایا اور ان سے عرض کیا ”آپ ریلوے کے وزیر کو مستعفی ہونے کا مشورہ دیں“ انہوں نے فرمایا ”یہ ٹرینیں وفاقی وزیر نہیں چلا رہے تھے“ میں نے ان سے عرض کیا ”مستور 1956ء میں لال بہادر شاستری اور 1999ء میں جمشید کار بھی ٹرینیں نہیں چلا رہے تھے عوام نے

ان سے استعفیٰ کا مطالبہ بھی نہیں کیا تھا لیکن اس کے باوجود ان لوگوں نے عوام کا مقدمہ اپنے ضمیر کی عدالت میں پیش کیا ضمیر نے ان کے خلاف فیصلہ دیا اور یہ لوگ مستعفی ہو گئے۔ میرے مہربان وزیر نے قہقہہ لگایا اور میری آنکھوں میں جھانک کر بولے "بھارت اور پاکستان میں بڑا فرق ہے ہمیں ہمیشہ اپنے زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے" میں نے ہاں میں گردن ہلا دی وہ صحیح فرما رہے تھے واقعی ہمارے اور بھارت کے زمینی حقائق میں بڑا فرق ہے ہم مضبوط اور روشن خیال لوگ ہیں ہم ہر قسم کا وارمہد جاتے ہیں جبکہ بھارت کے سیاستدان کمزور اور بے بس ہیں وہ عوام کی نظروں کی تہش برداشت نہیں کر سکتے لہذا ان میں اور ہم میں بڑا فرق ہے میں وہاں سے واپس آ گیا لیکن راستے میں مجھے بار بار الال بہادر شاستری کے وہ الفاظ یاد آرہے تھے جو اس نے 1956ء میں استعفیٰ دیتے ہوئے لوگ سچا میں کہے تھے انہوں نے کہا تھا "میں جسنانی طور پر ایک کمزور شخص ہوں لوگ میرے نرم لہجے کو بھی میری کمزوری سمجھتے ہیں لیکن میں آج یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں میں صرف ظاہری طور پر کمزور ہوں میرے اندر توانائی بھی ہے خفاقت بھی اور ضمیر بھی میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں میں قوم کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں ریلوے کے وزیر کی حیثیت سے مسافروں کی جان اور مال کی حفاظت میری ذمہ داری تھی اور میں یہ ذمہ داری نبھانے میں ناکام رہا اس حادثے نے ثابت کر دیا میں اس عہدے کے اہل نہیں تھا لہذا میں چنانچہ استعفیٰ پیش کرتا ہوں اور قوم سے درخواست کرتا ہوں وہ یہ ذمہ داری کسی ایسے اہل اور ذمہ دار شخص کو سونپ دے جو ان کی حفاظت کر سکیں جو انہیں تحفظ دے سکے"



## اللہ کے سفیر

امد علی سید میر سے دوست ہیں وہ بچے کے لحاظ سے نیلی ویرن پروڈیوسر ہیں اور ان کی ساری زندگی پلی ٹی وی میں گزری ان کی تنظیم بھی ریڈیو پاکستان کی تنظیمی ہوئی پروڈیوسر تھی یہ دونوں میاں بیوی چند ماہ قبل برطانیہ شفٹ ہو گئے میر سے لئے یہ خبر انتہائی حیران کن تھی میں دونوں میاں بیوی کو بڑے قریب سے جانتا ہوں یہ دونوں محبت وطن اور سچے فنکار تھے اور الیکٹرانک میڈیا میں بھی دونوں کا بڑا نام تھا یہ دونوں مالی اور خاندانی لحاظ سے بھی بڑے خوشحال اور مضبوط تھے لہذا ان کے باہر منتقل ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی مجھے جب ان کی ہجرت کی خبر ملی تو میں نے ایک مشرک دوست سے اس کی وجہ پوچھی میرے یہ دوست شاہ جی سے برطانیہ میں مل کر آئے تھے انہوں نے بتایا شاہ جی کا ایک بچہ معذور ہے دونوں میاں بیوی پچھلے دس بارہ سال سے اس بچے کی نگہداشت کر رہے تھے دونوں اپنی ڈیوٹی کا شیڈول اس طرح مرتب کرتے تھے کہ ان میں سے کوئی ایک ہر وقت بچے کے ساتھ رہے بچہ ان برسوں میں بڑا ہو گیا لہذا اب ان دونوں کیلئے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا بچہ ایٹارل تھا چنانچہ اسے اکیلا نہیں چھوڑا جاسکتا تھا شاہ جی اور ان کی تنظیم نے پاکستان میں ایٹارل بچوں کے تمام ادارے دیکھے لیکن وہ کسی ادارے سے مطمئن نہ ہوئے ایک آدھ ادارہ اچھا لگا لیکن اس ادارے کے اخراجات بھی بہت زیادہ تھے اور وہ دونوں خوشحال ہونے کے باوجود اس ادارے کی فیس ادا نہیں کر سکتے تھے شاہ جی لندن آتے جاتے رہتے تھے انہوں نے وہاں ایٹارل بچوں کے ادارے دیکھے تو انہیں ان کا ماحول بہت اچھا لگا لہذا دونوں میاں بیوی بچوں سمیت برطانیہ منتقل ہو گئے وہ جب برطانیہ پہنچے تو برطانوی حکومت نے نہ صرف اس ایٹارل بچے کا وظیفہ لگا دیا بلکہ حکومت نے بچے کے میڈیکل تعلیم اور تربیت کے اخراجات بھی اپنے ذمے لے لئے حکومت نے اس ایٹارل بچے کی وجہ سے شاہ جی اور ان کے خاندان کو بعض ایسی رعایتیں بھی دے دیں جو عام شہریوں یا امیگرینٹس کو نہیں ملتیں شاہ جی کا کہنا تھا سوشل بچوں کے ادارے کی ایک وین روزانہ ان کے گھر آتی ہے ان کے بچے کو سکول لے جاتی ہے وہاں وہ اس بچے کو دوسروں کے سہارے کے بغیر زندگی گزارتا اور اپنا صلح نظر سمجھانے کا طریقہ سکھاتے ہیں وہ اسے کھیلنے کو لے اور تفریح کرنے کے طریقے بھی بتاتے ہیں ہر تیسرے دن ایک نرس ان کے گھر آتی ہے



اور بچے کو اپنا کمرہ درست کرنے، ہاتھ روم صاف کرنے اور کپڑے پہننے کے طریقے سکھاتی ہے وہ بچے کے ساتھ گپ شپ بھی کرتی ہے شاہ جی کا کہنا تھا جب سے وہ برطانیہ آئے ہیں یوں محسوس ہوتا ہے ان کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ حل ہو گیا اور ان دونوں میاں بیوی نے زندگی میں پہلی بار آزادی اور فراغت کے ساتھ کام کرنا شروع کیا ہے اور اب انہیں گھر واپس جانے کی فکر نہیں ہوتی 'میرے دوست نے شاہ جی سے واپسی کے بارے میں پوچھا تو شاہ جی نے فوراً جواب دیا "ہم اپنے بچے کیلئے یہاں آئے ہیں لہذا جب تک پاکستان میں ہمارے بچے کو ایسی سہولتیں نہیں ملتی ہیں ہم برطانیہ ہی میں رہیں گے"

کل 3 ڈیبر کو معذور بچوں کا عالمی دن تھا' میں نے جب صبح کے اخبارات میں معذور بچوں کے بارے میں رپورٹیں دیکھیں تو مجھے بے اختیار شاہ جی اور ان کا بچہ یاد آ گیا اور میں نے سوچا کیا ہماری حکومت ہمارا معاشرہ اور ہمارے لوگ معذوروں کے سلسلے میں اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں اور کیا ہمارے ملک میں معذوروں کو ان کے حقوق مل رہے ہیں' مجھے محسوس ہوا ہم لوگ معذوروں کو ایک فیصد سے بھی کم توجہ دیتے ہیں اور یہ ان لوگوں کا رویہ ہے جنہوں نے دنیا میں معذوروں کے حقوق کی بنیاد رکھی تھی' جنہوں نے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار معذوروں کو سٹیٹ کی ذمہ داری قرار دیا تھا' حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں معذوروں کیلئے بیت المال سے نہ صرف خصوصی وظیفہ جاری ہوتا تھا بلکہ معذور بچوں کے والدین کو بھی ریاست کی طرف سے خاص رعایتیں دی جاتی تھیں ان کے دور میں اندھوں کو حکومت کی طرف سے خصوصی خادم مہیا کیے جاتے تھے یہ خادم روزمرہ کے کاموں میں ان کی مدد کرتے تھے' حضرت عثمانؓ کے دور میں حکومت معذوروں کو گھر تک بنا کر دیتی تھی جبکہ مساجد میں ان کیلئے خصوصی وضو خانے بنائے جاتے تھے' خلفائے راشدین کے بعد بھی تمام اسلامی حکمرانوں اور ریاستوں نے ایسا مل اور خصوصی بچوں کیلئے خاص قسم کے قوانین پاس کئے ہسپانیہ اور ہندوستان میں معذوروں کو بعض ملازمتوں میں ترجیح دی جاتی تھی شاہ جہاں اور اورنگزیب کے دور میں 80 فیصد سرکاری منشی اور وثیقہ نویس نامحوں سے معذور تھے جبکہ زیادہ تر ہرکارے بازوؤں یا آنکھ سے محروم ہوتے تھے لیکن آج اسلام کے نام سے بننے والی ریاست میں معذوروں کی بحالی کا کوئی قانون ہے اور نہ ہی ان کیلئے فنڈ جبکہ آپ اس کے مقابلے میں غیر اسلامی ممالک میں جا کر دیکھ لیں آپ کو محسوس ہو گا وہ لوگ معذروں 'اینا بل اور خصوصی شہریوں کو انتخابی پروڈوکول دیتے ہیں آج یورپ میں اس وقت تک کسی عمارت کا نقشہ منظور نہیں ہوتا جب تک اس عمارت میں خصوصی افراد کی نقل و حمل کا بندوبست نہ ہو جائے' تمام ترقی یافتہ ممالک کے پبلک ٹرانسپورٹ میں خصوصی افراد کیلئے ٹوائلٹ ہوتے ہیں اور یہ ٹوائلٹ دوسرے ٹوائلٹس کے مقابلے میں سائز اور خوبصورتی میں کہیں اچھے ہوتے ہیں یورپ کے تمام ممالک کے شاہجگ سفروں میں خصوصی افراد کیلئے "ریسپ" بنے ہوتے ہیں' تمام سینما ہاؤسز' کلبوں' پاررومز' کیسینوز' چجر' ہوٹلوں' ٹریڈوں اور جہازوں میں خصوصی لوگوں کیلئے خصوصی راستے اور نشستیں ہوتی ہیں' تمام پارکنگ میں ان کی گاڑیوں کیلئے جگہ مخصوص ہوتی ہے' برطانیہ میں غلط پارکنگ بہت بڑا جرم ہے اور ملک سے لے کر دویہ اعظم تک کوئی شخص اس

قانون سے سہرا نہیں لیکن معذور افراد برطانیہ کے جس مقام اور جس شاہراہ پر چاہیں گا ڈی کھڑی کر دیں کوئی شخص ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا، ذنارک کے تمام سکنز میں اندھوں کیلئے گھنٹیاں لگی ہیں جو غبی سگنل گرین ہوتا ہے یہ گھنٹیاں جتنا شروع ہو جاتی ہیں جبکہ دیگر ترقی یافتہ ممالک میں معذوروں کا علاج، تعلیم تربیت اور نگہداشت مفت ہے اور حکومت پیداؤش سے لے کر انتقال تک ان کی تمام ضرورتوں کی ذمہ دار ہوتی ہے اس کے مقابلے میں آپ اپنے ملک کا جائزہ لیں تو اس ملک میں خصوصی شہری اور معذور بچے انتہائی افسوسناک صورتحال کا شکار ہیں چند سال پہلے تک اسلام آباد جیسے شہر میں معذوروں کیلئے پارکنگ اور ریپ نہیں تھے اللہ تعالیٰ سی ڈی اے کے موجودہ چیئرمین کا سران لاشاری کا بھلا کرے انہوں نے آکر شہر میں ان لوگوں کیلئے ریپ اور پارکنگ بنوائیں پورے ملک میں خصوصی افراد کی بحالی کیلئے کوئی اچھا سنٹر نہیں، حکومت نے آج تک معذوروں کیلئے کسی خصوصی بچک کا اعلان نہیں کیا لہذا پاکستان کے تمام معذور بچے والدین کی ذمہ داری ہو کر رہ گئے ہیں اور حکومت نے آج تک ان کی ذمہ داری نہیں اٹھائی۔

ہم جب ایک مسلم معاشرے کا غیر مسلم اور لادین معاشرہ سے تقابل کرتے ہیں تو ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور ہم سوچتے ہیں وہ لوگ ہم سے ہزاروں گے بہتر ہیں جو بے دین ہونے کے باوجود شرگ تک خوف خدا سے لبریز ہیں ہمارے ملک میں لوگ سجدے کر کر کے ماتھے پر غراب ڈال لیتے ہیں لیکن ان کے خصوصی افراد مزکوں پر بھیک مانگ رہے ہوتے ہیں میں جب بھی یورپ کی ترقی دیکھتا ہوں تو مجھے اس کے پیچھے ان معاشرہ کے معذوروں، غریبوں اور لاچاروں کی دعائیں نظر آتی ہیں میرا ایمان ہے زندگی کی نعمتوں اور صلاحیتوں سے محروم لوگ بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کے سفیر ہوتے ہیں یہ لوگ معاشرہ میں اللہ کا پیغام لے کر اترتے ہیں اور جو معاشرے اللہ تعالیٰ کے ان سفیروں سے محبت سے پیش آتے ہیں جو ان کو علاج، معاالجے، تعلیم اور نگہداشت کی سہولت فراہم کرتے ہیں اور جو ان پر اپنا حق من اور دھن قربان کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی ترقی، خوشحالی، عروج، رونق اور خوشی میں اضافہ فرما دیتے ہیں وہ ان پر نعمتوں اور انعامات کے دروازے کھول دیتے ہیں وہ انہیں برطانیہ، جاپان اور امریکہ بنا دیتے ہیں اور جو ملک اللہ تعالیٰ کے ان سفیروں کو پاگل خانوں، سڑکوں اور چوکوں میں گھڑا کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان قوموں کے ہاتھ میں مشکول دے کر انہیں اقوام عالم کی دلیلیز پر لا بٹھاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان ملکوں سے نعمتیں چھین لیتا ہے اور اللہ انہیں بھکاری بنا دیتا ہے۔





## جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے

”اوسے سائیڈ پر ہو جاؤ“ ایک نہایت کھردری، غیر مہذب اور بھدی آواز میری سماعت سے گرائی۔ میں غصے سے پیچھے مڑا لیکن میرے پیچھے ایک مہذب، پڑھا لکھا اور خوبصورت شخص کھڑا تھا۔ اس نے قیمتی اٹالووی سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے بالوں پر جل لگا تھا، اس کی آنکھوں پر دھوپ کا مہنگا چشمہ تھا اور اس کے بدن سے اعلیٰ درجے کی خوشبو آ رہی تھی، میں ایک لمحے کیلئے ٹھٹک گیا۔ میں ابھی مجھے میں تھا کہ دوسری مرتبہ وہی کھردری آواز آئی ”سائیڈ پر ہوناں“ میں نے دیکھا اس مہذب شخص کے پیچھے انتہائی آٹھ دس اجنڈہ غیر مہذب اور بد معاش قسم کے لوگ کھڑے تھے، ان کے ہاتھوں میں کھانکھنیاں تھیں۔ انہوں نے لمبے گھیرے کی شلواریں اور کھلے کرتے پہن رکھے تھے اور ان کے گلے میں چادر میں لٹک رہی تھیں ان سب نے اس مہذب شخص کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا، میں چند لمحوں کے لیے سیکٹے میں آگیا اور میں نے گھبرائی آواز میں پوچھا ”کیا مطلب“ بد معاشوں میں سے ایک نے اپنا کھردرا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا اور مجھے ایک طرف دھکیل کر بولا ”میں کہہ رہا ہوں ڈاکٹر صاحب کو راستہ دو، سائیڈ پر ہو جاؤ“ میں نے مزاحمت کی کوشش کی لیکن وہ کھردرا ہاتھ مجھ سے زیادہ طاقتور تھا۔ میں سائیڈ پر ہو گیا، اس مہذب شخص نے کلینک میں پاؤں رکھا۔ آگے بڑھا اور وہ سارے بد معاش اسے حصار میں لے کر چل پڑے۔

مجھے اس سارے معاملے کی سمجھ نہیں آ رہی تھی، میں تھوڑی دیر گیٹ پر کھڑا رہا اور اس کے بعد میں بھی اندر آگیا اور اپنے دوست کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا وہ سارے بد معاش میرے دوست کے کمرے کے باہر کھڑے تھے، وہ سوجھ بوجھوں پر ناؤ دیتے تھے، کھانکھنیاں لہراتے تھے اور دائیں بائیں دیکھتے تھے، میں اندر داخل ہونے لگا تو ایک بد معاش نے آگے بڑھ کر دروازے کے فریم پر ہاتھ رکھ دیا، میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ کھردری آواز میں بولا ”تم ابھی اندر نہیں جا سکتے“ میں نے وجہ پوچھی تو بولا ”اندر ہمارے ڈاکٹر صاحب ہیں جب تک وہ باہر نہیں آتے کوئی اندر نہیں جا سکتا“ مجھے غصہ آگیا اور میں نے پیش میں دروازے پر دستک دے دی۔ وہ لوگ آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے جکڑ لیا، میں ان کے ساتھ الجھ پڑا جس کے بعد کلینک میں شور ہو گیا میرا شور اندر گیا تو میرا دوست باہر آگیا وہ میری حالت دیکھ کر گھبرا گیا اور بھاگ کر اندر واپس چلا گیا ذرا دیر بعد اندر سے وہی مہذب آواز باہر آئی ”بھئی انہیں اندر آنے دیں، یہ ہمارے دوست ہیں“ بد معاشوں نے فوراً میرا



سربان چھوڑا، میری شرمت کی سلونیس درست کیں اور مجھے بڑے آرام سے اندر دھکیل دیا۔ اندر وہی مہذب شخص کرسی پر بیٹھا تھا اور میرا دوست اس کے پہلو میں کھڑا ہو کر شرمندگی اور محنت سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا منہ سرخ تھا اور میرے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ مہذب شخص اٹھا، اس نے انگریزی میں میرے ساتھ معذرت کی اور مجھے ساتھ والی کرسی پر بٹھادیا۔ ہم تینوں چپ چاپ بیٹھ گئے، میرے دوست کی نظریں نیچی تھیں۔

کمرے کی فضا بوچھل تھی، میرے دوست نے حالات بہتر بنانے کیلئے قہقہہ لگایا اور ان صاحب کی طرف اشارہ کر کے بولا "آپ ہیں ڈاکٹر عزیز، ملک کے مشہور کارڈیا لو جسٹ" "وہ ساتھ ہی میری طرف مڑا اور مسکرا کر بولا "آپ کو کون نہیں جانتا، آپ ہیں....." میں خاموش رہا، چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد ڈاکٹر عزیز بولے "میرے گارڈ نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی، میں معافی چاہتا ہوں، یہ گنوار لوگ ہیں، یہ کسی کے شنئس سے واقف نہیں ہیں" میں نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا، ڈاکٹر عزیز بولے "میں نے یہ لوگ اپنی حفاظت کیلئے رکھے ہیں اور میرا تجربہ ہے آپ کے گارڈز جتنے گنوار، اجڈ اور غیر مہذب ہوں گے" اس محاورے میں آپ کو اتنی ہی عزت ملے گی" میں نے پہلی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کی طرف دلچسپی سے دیکھا، ڈاکٹر صاحب مسکرائے "میں ایک کامیاب ڈاکٹر ہوں، گراچی، لاہور اور اسلام آباد میں میرے کلینک ہیں، میں ہفتے میں دو دن دینی بھی جاتا ہوں لہذا یہ گارڈز میری جان، میری پرنٹنس اور میرے شنئس کی حفاظت کرتے ہیں، اگر یہ میرے ساتھ نہ ہوں تو میں اغواء ہو جاؤں، جان سے جاؤں یا دس بیس کروڑ دے کر جان چھڑاؤں" میں چپ چاپ سنتا رہا، وہ بولے "گارڈز سے پہلے ملک میں میری کوئی عزت نہیں تھی، میں بینک میں اکاؤنٹ منیجر تھا تو مجھے گھنٹہ لاکھ میں کھڑا رہنا تھا اور میری باری نہیں آتی تھی۔ مریضوں کے لواحقین میرے کلینک میں میری بے عزتی کر جاتے تھے، لوگ میری گاڑی پر سرکچ ڈال دیتے تھے، کارپوریشن کا قلم دس دس دن میرے گھر کے سامنے سے بکرا نہیں اٹھاتا تھا اور لوگ مزک پر مجھے راستہ نہیں دیتے تھے لیکن جس دن سے میں نے گارڈز رکھے ہیں پورا ملک میری عزت کر رہا ہے، میں بینک جاتا ہوں تو فیجر مجھے رہیو کرنے کیلئے باہر آ جاتا ہے، میرے گارڈز کی ایک گاڑی میرے آگے اور دوسری پیچھے چلتی ہے لہذا ساری گاڑیاں ہمیں راستے دیتی جاتی ہیں اور ٹریفک پولیس تک اشارہ توڑنے پر مجھے نہیں روکتی چنانچہ مجھے محسوس ہوتا ہے میں زندگی میں اس سے پہلے جھک مارتا رہا ہوں"

میں نے کرسی پر پہلو بدلا اور ان سے عرض کیا "آپ نے یہ سب کہاں سے سیکھا" ڈاکٹر صاحب مسکرائے "میں نے یہ فارمولا اس ملک کے حکمرانوں سے سیکھا، میرے ملک کے حکمرانوں نے مجھے سکھایا اس ملک میں صرف وہی شخص کامیاب اور محفوظ ہے جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہے۔ حکمرانوں نے مجھے بتایا اس ملک کا سب سے بڑا قانون، سب سے بڑا آئین اور سب سے بڑا دستور ڈنڈا ہے۔ ڈنڈا پاکستان کی ہر روایت، ہر قانون اور ہر ضابطہ بدل سکتا ہے اور اس ملک میں جس شخص کے پاس ڈنڈا نہیں وہ وہو تہائی اکثریت کے باوجود بے بس اور لاچار ہے۔ اس شخص کا اس ملک میں کوئی ٹھکانہ نہیں" میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا، وہ بولے "آپ صدر ایوب خان سے صدر پرویز مشرف تک پاکستان کے تمام فوجی سربراہوں کو کچھ لیجئے، یہ لوگ کس قانون کے تحت صدر بنے

تھے ”وہ رکے اور دوبارہ بولے ”ان لوگوں کا قانون ڈنڈا تھا، ان کے پاس طاقت تھی لہذا محترمہ سفاک جناح ہوں، شیخ مجیب الرحمن ہوں، ذوالفقار علی بھٹو ہوں پھر یانواز شریف کوئی سیاسی لیڈر ان کے سامنے نہیں تھہر سکا، انہوں نے اسے اٹھا کر ڈسٹ بین میں پھینک دیا“ میں خاموش رہا، وہ بولے ”جبکہ ان کے مقابلے میں ڈنڈے والے اس وقت تک حکمران رہے جب تک زندگی اور صحت نے انہیں مہلت دی اور پارلیمنٹ سے لے کر عدالت اور مذہب سے لے کر عوام تک کوئی ادارہ کوئی قانون ان کا بال تک پیکا نہ کر سکا۔ ان لوگوں نے ذاتی اقتدار کے لیے اسمبلیاں توڑیں، آئین منسوخ کیے، اپنی مسلم لیگیں بنائیں اور اپنی مرضی کے ایکشن کرائے مگر کسی نے ان کا ہاتھ نہ روکا، یہ لوگ پوری زندگی اپنی مرضی کرتے رہے اور جب ان کا انتقال ہوا تو انہیں پورے اعزاز سے دفن کیا گیا، کیوں؟ کیونکہ ان کے پاس ڈنڈا تھا“ وہ رکے اور تھوڑی دیر بعد بولے ”ڈنڈے کا یہ غلط اس ملک کے جس شخص کو سمجھ آگیا وہ کبھی ہو گیا، آپ یقین کریں اس ملک کی پولیس عوام کی حفاظت کیلئے معرض وجود میں نہیں آئی یہ صرف ڈنڈے والوں کی سیوریٹی اور ان کے دشمنوں کو کچلنے کے لیے بنائی گئی ہے، اس ملک کی عدالتیں کمزوروں اور مظلوموں کو انصاف فراہم کرنے کے لیے نہیں بنیں۔ یہ ڈنڈے والوں کے ناجائز اقتدار کو قانونی شکل دینے کیلئے بنی ہیں اور سی بی آر سے لے کر عدلیہ تک اس ملک کا کوئی ادارہ عوام کے لیے نہیں بنا، یہ تمام ادارے حکمران کلاس کی عیاشی کے لیے پیسے جمع کرنے کے لیے بنے ہیں چنانچہ میں جان گیا اگر میں نے اس معاشرے میں زندہ رہنا ہے تو مجھے بھی ہاتھ میں ڈنڈا اٹھانا ہوگا“

میں حیرت سے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ بولے ”تم مدرسہ ہفصہ کی مثال لو، اس مدرسے کی پانچ ہزار طالبات نے ہاتھوں میں ڈنڈے اٹھا رکھے تھے۔ تم ان ڈنڈوں کی طاقت دیکھو، ان طالبات نے 21 جنوری سے چلڈرن لائبریری پر قبضہ کر رکھا ہے لیکن حکومت کو جو الٹی تک قبضہ چھڑانے کی جرأت نہیں ہوئی ان ڈنڈوں کے پیچھے چمک کر مولانا عبد العزیز اور مولانا عبدالرشید غازی نے اپنی پولیس اور اپنی عدلیہ بنالی، انہوں نے اسلام آباد کے اس مربع کلومیٹر میں شریعت نافذ کر دی لیکن تاریخ کے طاقتور ترین صدر جنرل پرویز مشرف بھی خاموش بیٹھے رہے وہ کبھی علماء کرام سے مدد کی اپیل کر رہے تھے اور کبھی مول سوسائٹی کو مداخلت کی دعوت دے رہے تھے کیوں؟ کیونکہ مدرسہ ہفصہ کی طالبات کے پاس پانچ ہزار ڈنڈے تھے“ وہ رکے اور میری طرف مڑ کر بولے ”ان طالبات کو ڈنڈے اٹھانے پر کس نے مجبور کیا تھا؟“ میں خاموش رہا، وہ گویا ہوئے ”ان کے ہاتھ میں بارہ اکتوبر نے ڈنڈے دیے تھے یہ لوگ سمجھ گئے تھے اگر ایک ڈنڈے سے سارا آئین اور قانون فارغ ہو سکتا ہے تو پانچ ہزار ڈنڈے حکومت کی ساری رٹ بھی لپیٹ سکتے ہیں“ وہ رکے اور دوبارہ بولے ”اب تم بتاؤ حکومت نے دس جولائی 2007ء تک ان کے خلاف ایکشن کیوں نہیں لیا“ میں خاموش رہا، وہ بولے ”حکومت جانتی تھی ان کے ہاتھوں میں ڈنڈے ہیں اور اس ملک میں جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہو کوئی شخص اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا“ ڈاکٹر اٹھے سلام کیا اور گارڈز کے جلو میں کیٹنگ سے باہر نکل گئے۔





## میں جانتا ہوں یہ پاگل ہے

ڈاکٹر رشید چودھری ملک کے مشہور نفسیات دان تھے، انہوں نے لاہور میں "نوشہین ہاؤس" کے نام سے ایک شاندار ادارہ بنایا، یہ دماغی امراض کا ادارہ ہے جس میں شیڈ فرجیا، پاگل بن اور منیشن کا علاج ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایک دلچسپ اور شاندار انسان تھے، ان کی باتوں میں بڑی گہرائی اور دانائی تھی، میں ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کیلئے کبھی کبھی لاہور جاتا تھا، ایک دن میں ان کے پاس گیا تو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے میری زندگی کا رخ بدل دیا، یہ میری زندگی کا واحد واقعہ ہے جو مجھے روکا دیا، آتا ہے اور یہ ہر بار مجھے کسی نہ کسی بحران، کسی نہ کسی خرابی سے بچا جاتا ہے، میں ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا تو وہاں ایک صاحب بیٹھے تھے، ان کی عمر پچاس اور بچپن کے درمیان تھی اور وہ شکل سے اچھے خاصے معزز انسان دکھائی دیتے تھے، ڈاکٹر صاحب نے میرا حال احوال پوچھا، ہم نے آپس میں چند جملوں کا تبادلہ کیا، اس دوران وہاں موجود صاحب نے نہایت غلطی سے ہم دونوں کی طرف دیکھا اور درحقیقت سے بولے "ڈاکٹر صاحب میں آپ سے گفتگو کر رہا تھا" آپ نے مجھے چھوڑ کر اس لوٹے سے ہاتھیں شروع کر دیں، آپ دونوں کو میری موجودگی میں ایک دوسرے سے سلام لینے کی جرات کیسے ہوئی، میں اس صاحب کے طرز تکلم اور بدتمیزی پر حیران رہ گیا لیکن ڈاکٹر صاحب بڑے پیار سے بولے "یہ نوجوان میرا دوست ہے اور میں آپ سمیت اپنے تمام دوستوں کا احترام کرتا ہوں" وہ صاحب حریفے میں آگئے اور انہوں نے اونچی آواز میں ڈاکٹر صاحب کو گالیاں دینا شروع کر دیں، انہوں نے پہلے انگریزی میں بکواس کیا، اس کے بعد نہایت شیطانی اردو میں مغلظات کہیں اور آخر میں وہ پنجابی پر اتر آئے، میں نے زندگی میں اتنی غلیظ گالیاں کبھی نہیں سنی تھیں لیکن ڈاکٹر صاحب مسکرا مسکرا کر ان کی طرف دیکھتے رہے، وہ صاحب گالیاں دے دے کر ہٹ گئے تو ڈاکٹر صاحب نے چہرہ اویلا یا اور ان کی طرف اشارہ کر کے بولے "آپ مرزا صاحب کو اندر لے جائیں، میں ابھی آتا ہوں" مرزا صاحب نے فوراً چہرہ اویلا کبھی مغلظات میں شامل کر لیا، ڈاکٹر صاحب نے قہقہہ لگایا اور میری طرف دیکھ کر بولے "ہور کی حال اے" میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا "اس شخص نے آپ کو اتنی گالیاں دیں لیکن آپ کو لہو نہیں آیا" ڈاکٹر صاحب آگے جھک کر بولے "کیونکہ میں جانتا ہوں یہ شخص پاگل ہے اور کسی پاگل



شخص کی بات کا برا ماننا ہے وقوفی ہوتی ہے۔ میرے ذہن میں ایک فلیش سا ہوا اور دو لمحہ وہ دفتر وہ وہ سارا منظر اور ڈاکٹر صاحب کے خیالات ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میرے دماغ میں نقش ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب بعد ازاں انتقال کر گئے لیکن آج بھی جب کوئی شخص میرے ساتھ نامقول بات کرتا ہے کوئی مجھے غیر ضروری بحث میں ٹھیسنے کی کوشش کرتا ہے یا پھر کوئی شخص بلا وجہ میرے ساتھ الجھنے لگتا ہے تو مجھے فوراً ڈاکٹر رشید چودھری کا دفتر یاد آ جاتا ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے میرے سامنے مرزا صاحب بیٹھے ہیں اور اگر میں نے ان کی بات کا برا ماننا تو اس کو برا دے کر ارض پر مجھ سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں ہوگا۔

میرے ایک دوست اس معاملے میں ڈاکٹر رشید چودھری سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ میں نے انہیں کبھی غصے میں نہیں دیکھا، میں نے ایک بار ان سے پوچھا "آپ کو غصہ نہیں آتا" وہ مسکرا کر بولے "غصہ انسانی فطرت ہے، میں انسان ہوں لہذا مجھے بھی غصہ آتا ہے" میں نے عرض کیا "لیکن میں نے آپ کو کبھی غصے میں نہیں دیکھا" وہ دوبارہ مسکرائے "میں نے اپنے غصے کو سولائزڈ کر لیا ہے، میں نے اسے مہذب شکل دے دی ہے" میں نے عرض کیا "مجھے بات سمجھ نہیں آتی" وہ بولے "ہمیں زندگی میں دو قسم کے لوگ غصہ دلاتے ہیں، ایک وہ لوگ ہیں جو جان بوجھ کر پوری منصوبہ بندی سے ہمارے ساتھ چھیڑ چھاؤ کرتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ حادثاتی ہوتے ہیں، پہلی قسم کے لوگ ہمارے دشمن ہوتے ہیں یہ لوگ ہمیں تنگ کر کے نفسیاتی لطف لیتے ہیں، مجھے جب پہلی قسم کا کوئی شخص تنگ کرتا ہے تو میں فوراً اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کیا یہ دکھ، یہ تکلیف اور یہ توہین اس لذیت سے زیادہ تھی جو اب جہل اور ابولہب نبی کریم ﷺ کو پہنچاتے رہے، میں فوراً توبہ کرتا ہوں اور میری ساری ٹینشن اور ساری ادھن کو اپنی دور ہو جاتی ہے۔ دوسری قسم کے لوگ حادثاتی ہوتے ہیں، یہ غصہ لے کر گھر سے نکلتے ہیں اور کوئی ایسا شخص تلاش کرتے ہیں جس کے سر پر اپنے غصے کی گھنڑی رکھ سکیں، مجھ سے جب بھی کوئی ایسا شخص الجھتا ہے تو میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کیا یہ شخص علم، عقل، سماجی رتبہ اور تہذیب میں مجھ سے بہتر ہے؟ کیا میرے جیسے پڑھے لکھے، شائستہ اور معزز شخص کو ایک ریڑھی بان، کٹھے والے، کرپا نہ مرچنٹ، کنڈیکٹر، ڈرائیور، مزدور، چھڑا سی یا ٹھکر سے الجھنا چاہیے لہذا میں فوراً مسکرا کر آگے بڑھ جاتا ہوں" مجھے ان کی بات ادھوری لگی "میں نے پوچھا "لیکن آپ کو برا تو لگتا ہوگا، آپ کو غصہ بھی آتا ہوگا، آپ اس کا کیا کرتے ہیں" وہ مسکرائے "میں نے اپنے غصے کو پریکٹیکل بنا دیا ہے" میں خاموشی سے سنتا رہا، وہ بولے "میں نے ایک غریب طالب علم کو اعلیٰ تعلیم دلوائی، اسے یونیورسٹی میں ملازمت لے کر دی اور وہ اب طالب علموں کو شائستگی کی تعلیم دیتا ہے، وہ انہیں برداشت کرنے اور مسکرنے کا آرت سکھاتا ہے یہ میرے غصے کی ایک پریکٹیکل شکل ہے اس کی اور بھی بے شمار صورتیں ہیں مثلاً میں اپنے دوستوں کو برداشت کرنے کا ہنر سکھاتا رہتا ہوں، میں ہر مہینے سیرت کی کتابیں خریدتا ہوں اور لوگوں کو تحفہ دیتا ہوں، میں مسلمان رشیدی جیسے لوگوں کی گستاخیوں کا جواب دینے کے لیے عالمی سطح کے پانچ سالہ تیار کردہ ہوں، میں بھل کو گالی دینے کی بجائے لوگوں کو امر کی معاشرے کی خامیاں بتاتا ہوں اور میں لوگوں کو ورزش کرنے، معیاری کتابیں پڑھنے اور روزے رکھنے کی

تریب دیتا ہوں، میری یہ کوششیں میرے غصے کو کھا جاتی ہیں۔ میں نے ان سے عرض کیا، "اگر کوئی شخص آپ کی نگری، نسیبائی اور اخلاقی غیرت پر حملہ کرے تو بھی آپ کو غصہ نہیں آتا۔" انہوں نے قہقہہ لگایا، "آپ کا یہ لیکن میں گالی کا جواب گالی اور دھمکی کا جواب دھمکی میں دینے کی بجائے اپنی غیرت، اپنی عزت کو مزید مضبوط بنالیتا ہوں، میں اپنے نظریات، اپنی فکر اور اپنے اخلاق کو مزید قوت دے دیتا ہوں، میں یہ سمجھتا ہوں وہ نظریہ اور وہ فکر، فکر نہیں جو ایک بد اخلاق اور بد نظریہ شخص کی گالی سے متاثر ہو جائے میں یہ سمجھتا ہوں دھمکی، گالی اور غصہ کمزوروں کے ہتھیار ہوتے ہیں اور اگر ہماری شخصیت کے قلعے مضبوط ہیں تو یہ ہتھیار کنکڑ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔"

اگر ہم انسانی تاریخ کو نکال کر دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے دنیا کی تمام لڑائیوں، کشمکشوں، اختلافات اور جنگوں کا آغاز کسی ایک نامستول بات یا کسی ایک گالی سے ہوا تھا، کسی پاگل شخص نے ایک اعتقاد بات کی ہے دوسرے نے اس بات کا جواب دیا اور اس کے بعد فرو سے لے کر قوموں تک کی زندگی عذاب ہو گئی۔ خاندان سے لے کر ملک تک قتل و غارت گری کا شکار ہو گئے۔ اگر لوگ ڈاکٹر رشید چودھری کی طرح ایک لمحے کے لیے اپنے مخاطب کو پاگل سمجھ لیں اور اس کی بات یا گالی کا جواب نہ دیں، اگر وہ دوسروں کے ساتھ اچھے سے پرہیز کریں گے تو یقین کیجئے غصے اور بدتمیزی کی یہ چنگاری فوراً بجھ جائے، ہم اگر غصے کا نفسیاتی تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے ہماری زندگی میں جب بھی کوئی شخص بدتمیزی کرتا ہے، کوئی ہمارے ساتھ دھمکی سے مخاطب ہوتا ہے تو ہم اسے سمجھ دار، غافل اور ذہین شخص سمجھ بیٹھتے ہیں اور اس کے ساتھ بحث میں الجھ جاتے ہیں، ہم اسے سمجھانے، بھانے یا سبق سکھانے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں چنانچہ اس کا وہی نتیجہ نکلتا ہے جو ایک پاگل اور سمجھدار شخص کی بحث کا نکلے گا، میرا دعویٰ ہے عام کلی محلے کی لڑائی سے لے کر عالمی جنگیں تک کسی ایک رد عمل، کسی ایک جواب سے شروع ہوتی ہیں۔ ہم کسی ایک نامستول اعتراض، کسی ایک واہیات بات یا کسی ایک گالی کا جواب دیتے ہیں اور اس کے بعد لوگوں کا اختلاف پورے شہر یا پورے ملک کو اپنی پیٹ میں لے لیتا ہے، اگر ہم خود کو کسی نامستول رویے، کسی فضول بات کا جواب دینے سے روک لیں تو ہماری پوری زندگی، بحران سے بچ جائے کیونکہ گالی کا جواب دینا بہادری نہیں ہوتا، گالی پر مسکرا دینا بہادری ہوتا ہے۔



## شاید ہمیں

خاتون اردو سیکنگ تھی مگر اس نے مضمون پنجابی میں لکھنا تھا، اس کا خیال تھا میں ایک پکا ٹھکانہ پنجابی ہوں لہذا میں اس کی مدد کر سکتا ہوں اس نے مجھ سے پوچھا ”سر جزیرے کی پنجابی کیا ہوگی“ میری ہنسی نکل گئی۔ وہ پنجابی کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھی۔ پچھلے پچاس برسوں میں پنجابی زبان نے دوسری زبانوں کا جتنا اثر لیا اس ملک کی کوئی دوسری علاقائی زبان اتنی متاثر نہیں ہوئی اس وقت اردو اور انگریزی سب سے زیادہ پنجاب میں بولی جا رہی ہیں لہذا اگر دیکھا جائے تو پنجابی زبان میں جس قدر اردو اور انگریزی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اتنے سندھی، پشتو، بلوچی، براہوی، ہندکو اور سرائیکی میں نہیں ہوتے، ہم شہروں میں رہنے والے پنجابی لوگ اس ثقافتی پلغار سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں انگریزی ہماری کاروباری مجبوری ہے جبکہ اردو ہماری قومی زبان ہے لہذا ان دونوں مجبوریوں نے مل کر پنجابی زبان کا طبع بگاڑ دیا، آج عالم یہ ہے ایک پنجابی لڑکے کی شادی پنجابی لڑکی کے ساتھ ہوتی ہے تو دونوں پہلے دن اردو بولنا شروع کرتے ہیں اور پوری زندگی بولتے چلے جاتے ہیں اگر آپ اردو بولنے والے پنجابی گھرانوں میں جا کر دیکھیں تو آپ کو وہاں عجیب منظر دکھائی دے گا آپ دیکھیں گے خاتون اپنی ساس اور سر کے ساتھ پنجابی میں گفتگو کر رہی ہے اور خاوند اپنے دوست احباب، پڑوسیوں اور دکانداروں سے پنجابی بول رہا ہے لیکن جوں ہی دونوں کا آتنا سامنا ہوتا ہے دونوں اردو بولنا شروع کر دیتے ہیں، یہی صورتحال بچوں کے ساتھ ہے بعض گھرانوں میں میاں بیوی آپس میں پنجابی بولتے ہیں لیکن بچوں کے ساتھ وہ اردو میں گفتگو کرتے ہیں، پنجابیوں کے مقابلے میں پشتو لوں، بلوچوں اور سندھیوں کا رویہ یکسر مختلف ہے یہ لوگ گھروں سے لے کر دفاتروں اور کاروباری مراکز تک احساس کستری کے بغیر اپنی زبان میں گفتگو کرتے ہیں لہذا ان لوگوں کی زبانیں بڑی حد تک بیرونی اثرات سے محفوظ ہیں جبکہ ہم پنجابیوں کو عام روزمرہ کے الفاظ تک نہیں ملتے اور ہم پنجابی میں اردو اور انگریزی کے لفظ جوڑتے چلے جاتے ہیں۔ میں واپس خاتون کی طرف آتا ہوں خاتون نے مجھ سے ”جزیرہ“ کی پنجابی پوچھی تھی مجھے معلوم نہیں تھی میں نے اپنے چند پنجابی دان دوستوں سے رابطہ کیا لیکن انہیں بھی معلوم نہیں تھا ”ذرا سا غور و فکر اور بحث و تحقیق کے بعد معلوم ہوا پنجابی زبان میں ”جزیرہ“ کا لفظ ہی نہیں اور



اس کی وجہ پنجاب کا جغرافیہ ہے پنجاب کی سرحدیں کیونکہ سمندر سے بہت دور ہیں چنانچہ پنجابی زبان کو سمندر اور جزیرے جیسے الفاظ کی ضرورت نہیں پڑی لہذا پنجابی زبان ان الفاظ سے محروم ہے۔

زبانیں کیسے بنتی ہیں اور کن کن مراحل سے ہو کر بنتے ہوتی ہیں یہ ایک مکمل سائنس ہے جس میں اس سائنس سے ناواقف ہوں لیکن میں ایک بات جانتا ہوں زبانوں کا جغرافیہ ثقافت اور لوگوں کے مزاج سے بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے زبانیں ہمیشہ ماحول سے جنم لیتی ہیں اور لوگوں کا مزاج ان میں رنگ بھرتا ہے پچھلے دنوں ملک کے نامور ادیب شاعر اور مصنف اول کے کالم نگار جناب عطاء الحق قاسمی صاحب کے ساتھ بھری گپ شپ ہو رہی تھی اس گپ شپ کے دوران ہم لوگوں نے ”ڈسکور“ کیا پوری پنجابی زبان میں شکر یہ اور معافی کے الفاظ نہیں ہیں ان دو بنیادی الفاظ کی کمی ہماری تاریخ اور ہماری ثقافت کو ظاہر کرتی ہے ہم لوگ کیونکہ کسی کے مشکور ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی سے معافی مانگتے ہیں لہذا ہماری زبان میں یہ دونوں لفظ موجود نہیں ہیں ہم لوگ کندھامار نے کے باہر ہیں اور کندھامار نے کے بعد اس کی زد میں آنے والے شریف انسان کی طرف آنکھ تک اٹھا کر نہیں دیکھتے لہذا آج تک ہماری زمین میں شکر یہ اور معافی جیسے الفاظ کاشت نہیں ہوئے میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں اگر اسلام میں شکر یہ ادا کرنا تنگی نہ ہوتا تو پنجابی اسلام قبول کرنے کے بعد بھی کسی کے مشکور نہ ہوتے۔ عطاء الحق قاسمی صاحب کا کہنا تھا پنجابی کی طرح اردو میں ”کھرے“ کا لفظ نہیں ہے وہ انتظار حسین جیسے سکھ بھارتی اردو دان تک سے پوچھ چکے ہیں لیکن آج تک کوئی اردو دان کھرے کا حروف نہیں پیش کر سکا اس کی وجہ اردو دان طبقے کا ”لیونگ سینڈرز“ تھا یہ لوگ نکلے کے ساتھ کھر نہیں بناتے تھے جبکہ پنجاب میں ہر نکلے کے ساتھ کھرا ہوتا تھا چنانچہ پنجابی کھرے کے لفظ سے واقف ہیں اس کے بعد وہاں بحث چھڑ گئی جس میں ہم لوگوں نے ”ڈسکور“ کیا انگریزی زبان میں غیرت کا لفظ نہیں ہے اس کی وجہ انگریزی ثقافت ہے انگریزی ثقافت میں کیونکہ غیرت کا جذبہ نہیں ہوتا لہذا انگریزی زبان کو آج تک لفظ غیرت کی ضرورت نہیں پڑی۔

اس بحث کے بعد میں نے محسوس کیا جس طرح زبانیں نئے جذبیوں، نئی روایات اور نئے ماحول کے مطابق نئے الفاظ ایجاد کرتی رہتی ہیں بالکل اسی طرح زبانوں سے غیر ضروری الفاظ خارج بھی ہوتے رہتے ہیں۔ زبانوں کے لفظ مرتے بھی رہتے ہیں مثلاً آپ جمہوریت کو لے لیجئے، یہ لفظ ہمارے معاشرے میں بڑی تیزی سے غیر ضروری اور بے وقعت ہوتا جا رہا ہے لہذا اعوام نے اس پر توجہ دینا بند کر دی ہے میرا خیال ہے اگلے دس پندرہ برسوں میں یہ لفظ ہماری لغات سے خارج ہو جائے گا، اسی طرح انصاف، قانون اور مساوات کے الفاظ ہیں یہ بھی بڑی تیزی سے بے وقعت اور پھیکے ہوتے جا رہے ہیں، یہ لفظ بھی بہت جلد ہمارا ساتھ چھوڑ دیں گے، اسی طرح بعض الفاظ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے معانی بھی بدل لیتے ہیں۔ مثلاً آپ سیاست کو لے لیجئے یہ لفظ 1930ء سے 1978ء تک مقدس سمجھا جاتا تھا لیکن 1979ء کے بعد اس لفظ کے تقدس میں بڑی تیزی سے کمی آئی یہاں تک کہ 2008ء تک پہنچ کر اس کے معنی سمجھوتہ، منافقت، ابن الوقتی اور بے اصولی ہو گئے، روشن خیالی کا

مطلب سمجھی وسعت قلبی، برداشت اور دوسرے کی رائے کا احترام ہوتا تھا لیکن اب اس کا مطلب بے حیائی، فحاشی اور عریانی ہو چکا ہے، اعتدال کا لفظ سمجھی تو اذن کے لیے استعمال ہوتا تھا لیکن اب اس کا مطلب امریکہ نوازی اور اسلام دشمنی بن چکا ہے، موہشت گردی سمجھی ڈکیتی اور قتل و غارت گری کے لیے استعمال ہوتا تھا لیکن آج یہ لفظ اہل ایمان کے لیے استعمال ہوتا ہے، آج اس کا مطلب قرآن وسنت پر عمل کرنے والے لوگ ہیں، حکومت کی نظر میں مجاہد کا لفظ سمجھی انتہائی محترم ہوتا تھا اور ہمارے ملک میں ”اے جاگ ذرا مرد مجاہد جاگ“ جیسے ٹی ٹرانے تک بنائے اور سنائے جاتے تھے لیکن اب یہ لفظ بھی متروک ہو چکا ہے اور حکومت کی دشمنی میں اس کے معانی بھی بدل چکے ہیں لہذا اگر ہم اپنے معاشرے میں آنے والی تبدیلیوں کا جائزہ لیں تو یوں محسوس ہوتا ہے شاید آنے والے دنوں میں ہماری دشمنیوں سے ماں اور باپ کے الفاظ بھی ختم ہو جائیں، شاید ہمیں آنے والے دنوں میں ایمانداری، دیانت، خودداری، انصاف، عزت نفس، وقار، احساس، ہمدردی اور عقل جیسے الفاظ کی بھی ضرورت نہ رہے اور شاید آنے والے دنوں میں ہماری ہر دشمنی کا آغاز ضرورت سے ہوا اور ہماری ہر نعمت نظریہ ضرورت پر ختم ہو۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

## لوڈ شیڈنگ

دنیا میں طوفانِ نوح سے پہلے عقاب زمین پر رہتے تھے یہ چھوٹی قامت کے پرندے تھے یہ درختوں پر مگھولے بناتے تھے مرغیوں کی طرح زمین پر چلتے تھے اور بطخوں کی طرح "نوسے پانچ" جیسی روٹھن لائف گزارتے تھے طوفان سے پہلے حضرت نوح نے عقابوں کو کشتی میں سوار ہونے کی دعوت دی لیکن عقابوں نے یہ پیش کش مسترد کر دی ان کہنا تھا دنیا میں کتنا برا طوفان آ جائے گا پانی زیادہ سے زیادہ سمندر سے باہر نکلے گا لوگوں کی فصلیں زیر آب آئیں گی اور بات فتم ہو جائے گی اور ہم اس دوران درختوں پر چڑھ جائیں گے حضرت نوح نے انہیں سمجھانے کی بڑی کوشش کی لیکن جب یہ نہ مانے تو انہوں نے عقابوں کے چند اڑے کشتی میں رکھے اور سفر پر روانہ ہو گئے طوفان کے بعد زندگی کا نیا سفر شروع ہو گیا انہوں نے عقابوں کے بچے نکلے اور انہوں نے جب اپنے آباؤ اجداد کی بے وقوفی کا قصہ سنا تو انہوں نے ہجرت پکڑ لی اور پہاڑوں کو اپنا بسیرا بنالیا وہ دن ہے اور آج کا دن ہے عقاب بلندی پر اڑتے ہیں اور پہاڑوں پر رہتے ہیں برسوں پہلے کسی نے عقاب کو سمجھایا طوفان گزر چکا ہے اب یہ واقعہ دوبارہ پیش نہیں آئے گا لہذا تم واپس اپنی روٹھن کی طرف آ جاؤ عقاب نے یہ مشورہ سنا اور اسے بڑا دلچسپ جواب دیا اس نے کہا "قدرت کسی کی پابند نہیں ہوتی اگر اللہ تعالیٰ نے کسی دن "پلے بیک" کا ارادہ کر لیا تو ہمارا کیا ہے گا"

ماہرینِ حیاتیات جانداروں کے حراج کی ان تہذیبوں کو "فراست" کہتے ہیں ان کا خیال ہے قدرت کے اقدامات سے استفادہ نہ کرنے والے جاندار زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتے ماہرین کا کہنا ہے دنیا میں وہ قومیں اور وہ ملک بھی زوال پذیر ہو جاتے ہیں جو اپنے بحرانوں اور تحریکوں سے سبق نہیں سیکھتے ماہرین اس سلسلے میں مصر سے مونیخو داؤد تک دنیا کی بے شمار قدیم تہذیبوں کی مثال دیتے ہیں وہ بتاتے ہیں ان تہذیبوں نے بھی عقابوں جیسی غلطیوں کی تھیں چنانچہ آج یہ مٹی کے ڈھیر بن کر رہ گئی ہیں ماہرین ہاگز اکی تہذیب کی مثال دیتے ہیں یہ لوگ دریائے سرسوتی کے کنارے آباد تھے اور ان لوگوں نے آباد ہوئے وقت یہ فراموش کر دیا تھا اگر دریائے اپنا رخ پھیر لیا تو ان کا کیا بنے گا مصر کے لوگوں نے بھی یہ بھلا دیا تھا اگر ریت کا بہت بڑا طوفان آ گیا اور آج واحد میں کھربوں ریت ان کی بستیوں پر آ گری تو ان کا کیا بنے گا اسی طرح قدیم تہذیب کے لوگ یہ بھول گئے تھے اگر پہاڑوں کے کلیشیر پھسل گئے اور یہ کلیشیر ان کے شہروں پر آ کرے تو ان کا کیا بنے گا بائبل کے لوگوں نے بھی یہ



فراموش کر دیا تھا اگر حملہ آوروں نے شمال سے حملہ کر دیا تو وہ شہر کی حفاظت کیسے کریں گے اور قسطنطنیہ کے لوگوں نے بھی یہ نہیں سوچا تھا اگر کسی نے خشکی پر جہاز چلا دیے تو ان کا کیا بے گامہرین کا خیال ہے دنیا کی بے شمار قدیم تہذیبوں نے شہر آباد کرتے ہوئے قدرتی وسائل کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا انہوں نے قدرتی آفات کے امکانات کو بھی فراموش کر دیا اور انہوں نے انسانی مسائل اور وسائل میں بھی توازن برقرار نہیں رکھا تھا لہذا یہ ملک ٹوٹ گئے یا پھر فنا ہو گئے مابہرین نوآبادیاتی دور کی مثال بھی دیتے ہیں مابہرین کا کہنا ہے یورپی اقوام ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک پر قبضہ کرتے ہوئے یہ بھول گئی تھیں ہم اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ان ممالک کو مستند پار سے کیسے کنٹرول کریں گی یورپی اقوام کی اس غلطی نے انہیں نہ صرف یورپ میں واپس واپس دیا بلکہ وہ اپنے اصل علاقوں سے بھی محروم ہو گئیں آج یہ اقوام ان لوگوں کے شدید دباؤ میں ہیں جن پر کبھی یہ لوگ حکومت کرتے تھے مابہرین کا کہنا ہے قدرت ہر انسان کو ایک یا دو بار اپنی غلطی کی اصلاح کا موقع دیتی ہے لیکن اللہ کسی قوم کو غلطیاں کرنے یا دہرانے کا چانس نہیں دیتا لہذا قوموں کی ایک آدھ غلطی انہیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اقوام کی فہرست سے خارج کر دیتی ہے مابہرین کا خیال ہے قوموں کو ایک ایک قدم چھوٹ چھوٹ کر اٹھانا چاہیے انہیں ہزار سال تک کی منصوبہ بندی کرنی چاہیے اور انہیں اس منصوبہ بندی سے ایک لمحے کیلئے دائیں بائیں نہیں ہونا چاہیے۔

حیاتیات کا یہ فلسفہ سو فیصد درست ہے قوموں کے پاس غلطیوں کی گنجائش بھی نہیں ہوتی اور قوموں کی زندگیوں میں بہت کم ایسی غلطیاں ہوتی ہیں جن کی اصلاح ممکن ہوتی ہے ہارننگ کے لگانے اکثر دشمنوں کو بینا ممکن نہیں ہوتا آپ مشرقی پاکستان کی مثال لیجئے ہم آج لاکھ کوشش کر لیں لیکن ہم بھگدڑیں کو دوبارہ مشرقی پاکستان نہیں بنا سکیں گے اسی طرح پوری اسلامی دنیا مل کر بھی خلافت کا دور واپس نہیں لاسکتی اور دنیا کی کوئی طاقت آج روس کو دوبارہ سوویت یونین نہیں بنا سکتی ہم لوگ یہ حقیقت جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم غلطی پر غلطی کرتے چلے جا رہے ہیں اور ہم کسی غلطی سے سبق نہیں سیکھتے آپ بجلی کے موجودہ بحران کو لیجئے پاکستان میں بجلی کا سب سے بڑا بحران 1994ء میں پیدا ہوا تھا اس دور میں حکومت نے بجلی بچانے کیلئے ٹیلی ویژن نشریات تک کی "لوڈ شیڈنگ" شروع کر دی تھی مجھے اچھی طرح یاد ہے اس دور میں "پیک آؤرز" میں ٹیلی ویژن کی نشریات دو گھنٹے کیلئے بند کر دی جاتی تھیں اس دور میں حکومت نے غیر ملکی کمپنیوں کو بجلی کی صنعت میں سرمایہ کاری کی دعوت بھی دی تھی حکومت نے سرمایہ کاری کے روزنرمز کر دیے جس کے نتیجے میں بے شمار چھوٹی بڑی کمپنیاں پاکستان آئیں اور انہوں نے بجلی کے بزنس میں سرمایہ کاری کی حکومت کی اس پالیسی کے باعث 1996ء تک نہ صرف بجلی کا یہ بحران ختم ہو گیا بلکہ پاکستان کے پاس بجلی زائد ہو گئی یہ بے نظیر بھنوں کی حکومت تھی اور آصف علی زرداری بدقسمتی سے اس اچھے کام میں فرنٹ پر تھے جب 1997ء میں نواز شریف کی حکومت آئی اور سیف الرحمن خان کو احتساب کی ذمہ داری سونپ دی گئی تو خان صاحب نے اپنے احتساب کا آغاز بجلی سے کیا وہ "آئی پی بی" کو ملک سے غداری ثابت کرنے میں جت گئے تھے انہوں نے تمام کمپنیوں کے نمائندوں کو بلایا اور انہیں نئے نرخ پر مجبور کر دیا اس دور میں قانونی بجلی بھارت کو فروخت کرنے کا فیصلہ بھی ہوا تھا یہ سلسلہ 2000ء تک جاری رہا تھا 2000ء میں حکومت

کواچانک محسوس ہوا پاکستان میں بجلی کی مانگ میں اضافہ ہو رہا ہے اور اگر پیداوار میں اس کے مطابق اضافہ نہ ہوا تو مستقبل قریب میں ملک بجلی کے شدید بحران کا شکار ہو جائے گا چنانچہ حکومت نے 2002ء میں پاور پالیسی بنائی اور غیر ملکی کمپنیوں کو ایک بار پھر پاکستان میں قمرل پلانٹس لگانے کی دعوت دے دی یہ پالیسی تو بن گئی لیکن 2007ء تک اس پالیسی پر عملدرآمد نہ ہو سکا اس دوران گیارہ کمپنیوں نے پاور پلانٹس لگانے کی اجازت بھی لی لیکن اس اجازت اور عملدرآمد کے درمیان بیوروکریسی حائل ہو گئی اور 2007ء تک ایک بھی کمپنی پاکستان میں پاور پلانٹ نہ لگا سکی اس وقت صرف ایک کمپنی نے پاور پلانٹ کی تعمیر شروع کی ہے یہ پلانٹ لاہور کے مضافات میں لگ رہا ہے اور اس کی پیداوار بھی 2009ء میں شروع ہوگی حکومت چاہتی تھی چھوٹے سائز کے ہائیڈل پاور پلانٹ لگانے کیلئے پانچ سے چھ سال کا عرصہ چاہیے جبکہ قمرل پلانٹس کو تیسرے پیدوار کیلئے دو سے اڑھائی سال کا عرصہ درکار ہوتا ہے حکومت کے نوٹس میں یہ حقیقت سائز سے سات برس پہلے آگئی تھی لیکن حکومت نے ان سائز سے سات برسوں میں بجلی کے شعبے میں ایک پیسے کی سرمایہ کاری نہیں کی 2007ء اپریل میں جب بجلی کا بحران شروع ہوا تو حکومت نے اس کے حل کیلئے روایتی طریقہ استعمال کرنا شروع کر دیا حکومت نے لوڈ شیڈنگ اور شام آٹھ بجے تمام دوکانیں اور شاپنگ سنٹر بند کرنے کا حکم دے دیا اس حکم سے بجلی تو بچ گئی لیکن معیشت کو دس کھرب روپے کا نقصان پہنچ گیا حکومت اب دن رات پاور پلانٹس لگانا شروع کر دے گی اور ان کے نتیجے میں دو تین برسوں میں ہمدی ضرورت سے زیادہ بجلی پیدا ہونے لگے گی اور اس کے بعد یقیناً آنے والی حکومت آصف علی زرداری کی طرح جناب سلیمان شاہ کا احتساب بھی شروع کر دے گی لہذا وقت ثابت کرے گا ہم 2007ء میں ٹھیک تھے اور نہ ہی 2010ء میں ہمارا رویہ درست ہوگا۔

یہ بحران بھی ثابت کر رہا ہے ہم ایک عجیب قوم ہیں ہم گرمی میں پانی کی کمی کے باعث مرتے ہیں اور مون سون میں ہم سیلاب میں غرق ہو جاتے ہیں ہم نے آج تک نقطہ سے بچنے کی کوئی لائیک ٹرم پلاننگ کی اور نہ ہی ہم عوام کو سیلاب سے بچانے کا کوئی جامع منصوبہ تیار کر رہے ہیں ہم عجیب قوم ہیں ہم کبھی بھارت کو فالتو بجلی بیچتے ہیں اور کبھی لوڈ شیڈنگ پر مجبور ہو جاتے ہیں ہم کبھی قمرل پاور پلانٹس کو ملک سے غداری قرار دیتے ہیں اور کبھی یہ ہماری سب سے بڑی ضرورت بن جاتے ہیں ہم کیسے لوگ ہیں ایسی قوموں کے بارے میں نوٹن بی نے کہا تھا "یہ برف پر کھڑی قومیں ہیں جن کی بنیادیں کھل رہی ہیں" جوں جوں وقت گزر رہا جا رہا ہے ہم لوگ خود کو نالائق اور کوتاہ فہم ثابت کرتے جا رہے ہیں لہذا اگر دیکھا جائے تو ہم میں اور موجودہ ڈاؤ کے لوگوں میں کوئی فرق نہیں وہ لوگ پانی کی کمی کے باعث مر گئے تھے اور ہم لوگ لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے دم توڑ رہے ہیں۔





## منافقت

ان کی آواز میں تلخی تھی، میں نے عرض کیا، میں ڈرائیونگ کر رہا ہوں، آپ کا فون نہیں سن سکتا اگر آپ کل فون کر لیں تو بہتر ہوگا لیکن انہوں نے انکار کر دیا، میں نے گاڑی فوراً سائیڈ پر کھڑی کر دی۔

مجھے اکثر محسوس ہوتا ہے ہم موبائل فون کے سلسلے میں انتہائی سفاک ہیں، ہم میں ابھی فون کی اخلاقیات پیدا نہیں ہوئیں، پوری دنیا میں موبائل کو ”پرائیویٹ پراپرٹی“ سمجھا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں لوگ وزینگ کارڈز پر موبائل فون کا نمبر درج نہیں کرتے وہاں اگر کوئی شخص کسی کو موبائل نمبر دے تو وہ اس سے یہ ضرور پوچھتا ہے ”کیا میں آپ کے موبائل پر فون کر سکتا ہوں“ امریکہ میں لوگ پہلے گھریا دفتر کے نمبر پر فون کرتے ہیں اگر مطلوبہ شخص وہاں دستیاب نہ ہو تو وہ موبائل پر مختصر سی کال کرتے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں لوگ موبائل کو ”پبلک پراپرٹی“ سمجھتے ہیں، ہم لوگ کسی بھی وقت کسی کے موبائل پر کال کر دیتے ہیں اور اس کی مجبوری کا خیال کئے بغیر بلا ٹکان بولنے چلے جاتے ہیں۔ میں بھی موبائل فون کے متاثرین میں شامل ہوں، میں نے ایک دن اپنے موبائل کا پروفائل نکال کر دیکھا تو معلوم ہوا مجھے سات گھنٹوں میں ایک سو نو کالیں آئی تھیں اور یہ تمام کالیں شکوکوں اور شکایتوں سے لبریز تھیں، میں نے اس دن اپنے لئے موبائل کی اخلاقیات وضع کیں اور ان پر سختی سے کاربند ہو گیا، میں نے کسی کے موبائل فون پر کال کرنی ہو تو میں پہلے ”ایس ایم ایس“ کرتا ہوں، اسے اپنا تعارف کراتا ہوں اور اس سے فون کرنے کی اجازت مانگتا ہوں، اگر اس کا مثبت جواب ملے تو میں اسے کال کر لیتا ہوں بصورت دیگر اس کے جواب کا انتظار کرتا ہوں۔ میں جب بھی کسی کے موبائل پر فون کرتا ہوں تو میں اس سے یہ ضرور پوچھتا ہوں ”آپ مصروف تو نہیں ہیں؟“ آپ ڈرائیونگ کر رہے؟ اور کیا میں آپ سے اتنے منٹ بات کر سکتا ہوں؟“ میں ہمیشہ کوشش کرتا ہوں میں دوسروں کو ٹیلی فون پر بری خبر نہ سناؤں، اس کی وجہ میرے ایک دوست ہیں، میرے یہ دوست کہا کرتے ہیں ”ہم نے ٹیلی فون کو ڈیپریشن پھیلانے والا آلہ بنا دیا ہے“ وہ کہتے ہیں ”آپ دن میں پچاس بار فون اٹھائیں، آپ کو دوسری طرف سے ہمیشہ بری خبر ملے گی، کوئی نہ کوئی شخص آپ کی فینشن اور ڈیپریشن میں اضافہ کرے گا“ میں اپنے دوست کی بات سے اتفاق کرتا ہوں، ہم لوگ حقیقتاً اپنا ڈیپریشن اپنی فینشن اور اپنی



فرسٹریشن فون کے ذریعے دوسروں تک فخل کرتے رہتے ہیں، سو ہاں فون کا ایک مسئلہ ہماری آواز بھی ہے، ہم جب بھی فون کرتے ہیں تو ہم اپنی آواز میں دنیا جہان کی بد قیڑی، کڑنگی، تکبر اور غصہ بھر لیتے ہیں، ہم یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے دوسری طرف صدر بش جیسا ہے اور ہم نے ٹیلی فون کے ذریعے اس سے افغانستان اور عراق کے تمام شہداء کا بدلہ لینا ہے، لوگوں کی اس عادت کا مجھے ذاتی طور پر تجربہ ہو چکا ہے، پچھلے دنوں بعض علماء کرام مجھ سے ناراض ہو گئے اور ان حضرات نے پاکستان کے طول و عرض پر پھیلے اپنے ہزاروں شاگردوں کو ٹیلی فون پر تعینات کر دیا، یہ مومنین مجھے فون کرتے اور میرے السلام علیکم کے جواب میں انتہائی لطیف کالیاں دیتے، علماء دین کا یہ پہلو میری آنکھوں سے اوجھل تھا لہذا میں خیرانہ رو گیا، بعد ازاں اپنے چلا اس ٹیلی فونک کھینک کے روح رواں میرے ایک سابق جاسوس دوست تھے، انہوں نے علماء دین کو بتایا تھا میرے عقائد میں ملاوٹ آگئی ہے اور جب تک میری ماں، بہن کو کچا کی نہیں دی جائے گی میرا فکری اور نظریاتی قبلہ درست نہیں ہوگا چنانچہ میرا لون نے مجھے دس دن میں چار ہزار کالز کیں اور جب تک میں نے اپنے عقائد کی درستی کا اعتراف نہ کر لیا، ان لوگوں کا ٹیلی فونک جہاد جاری رہا لہذا کہنے کا مطلب ہے، ہم لوگوں نے سو ہاں کواڈیت رسائی کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔

میں ان صاحب کی طرف واپس آتا ہوں، میں نے گاڑی سائیڈ پر روک لی، وہ صاحب بوے غصے سے فرما رہے تھے، آپ نے پچھلے دنوں پاکستان کے نشان کے بارے میں کالم لکھا تھا، آپ نے لکھا تھا 51 برس تک پاکستان کا سرکاری نشان "ایمان، اتحاد اور تقلم" کی بجائے "اتحاد، ایمان اور تقلم" رہا، میں نے فوراً اپنا جرم تسلیم کر لیا، وہ غصے سے بولے، "ہمارے سرکاری نشان میں ایمان پہلے نمبر پر آئے یا دوسرے درجے پر؟ آپ مجھے بتائیے اس ملک میں ایمان ہے کہاں؟" میں نے محضرت کی اور ان سے درخواست کی میں نے کسی جگہ پہنچا ہے اور اگر وہ مجھے کل فون کر لیں تو میں زیادہ تفصیل سے گفتگو کر سکوں گا، انہوں نے غصے سے فون بند کر دیا، میں آگے چل پڑا لیکن ان کے بتائے نقطے پر سوچنا شروع کر دیا، ان کی بات درست تھی، ہمارا سرکاری نشان ایمان، اتحاد اور تقلم پر مشتمل ہے، ہماری تمام سرکاری دستاویزات پر یہ قومی کنشٹ درج ہے لیکن اس ملک میں ان تینوں چیزوں کا انتہائی فقدان ہے، ہم سب سے پہلے ایمان کی طرف آتے ہیں، ایمان کے تین درجے ہوتے ہیں، برائی کو قوت بازو سے روکنا، برائی کو زبان سے روکنا اور دل میں برائی کو برائی سمجھنا، ہم بد قسمتی سے ان میں سے کسی درجے میں نہیں آتے، ہم نے برائی کو نظریہ ضرورت کی شکل دے دی ہے۔ ہم برائی کو ذہنی حقائق کہنے لگے ہیں، مسجد ایمان کا مرکز اور داؤمی اور نماز ایمان کا لباس ہوتے ہیں لیکن ہماری مسجدیں خفاق اور فرقہ پرستی کا میدان بن چکی ہیں۔ ہماری مسجدوں میں فرقہ پرستی کا فساد کاشت ہوتا ہے، ہم خانہ خدا میں بیٹھ کر دوسرے مسلمانوں کو کافر ثابت کرتے ہیں، ہم پولیس کے بغیر اپنی مسجدوں میں نماز ادا نہیں کر سکتے اور ہم نے اس ملک میں اہل ایمان کو بدشت گرد بنا دیا ہے، ہماری ایمانداری کا یہ حال ہے اس ملک میں دودھ، دوا اور پانی تک خالص نہیں ملتا، لوگ عمروں اور حوں کے نام پر فراڈ کرتے ہیں اور گدھوں کی اون سے جائے نمازیں بناتے ہیں، لوگ جعلی رنگ اور گھٹیا کپڑا بیچنے کیلئے قسم اٹھا لیتے ہیں، لوگ قرآن

اٹھا کر جھوٹی گواہیاں دیتے ہیں، ہمارے ڈاکٹر مریضوں کے گردے چوری کر لیتے ہیں اور ہمارے سیاستدان پارلیمنٹ میں حلف اٹھا کر لوٹے ہو جاتے ہیں اور ہمارے ایمان کی یہ حالت ہے ہم بٹ کو خوش کرنے کے لئے اپنے سینکڑوں ہزاروں لوگوں پر ہم برسا دیتے ہیں، ہم دانا میں تو ہیں گاڑ دیتے ہیں، ہماری دوسری کمنٹ اتحاد تھا۔ آپ کراچی سے لے کر لنڈی کوتل تک اتحاد کا مطالعہ کر لیجئے، ہم 60 برس بعد بھی پٹھان، بلوچی، سندھی اور پنجابی ہیں، ہم آج تک پاکستانی نہیں بن سکے، ہم آج تک کسی مسئلے پر ایک نہیں ہو سکے، ہم آج بھی ڈیم بنانے پر ایک دوسرے سے الجھ رہے ہیں، ہمارے بلوچ کو پنجابی نہیں آتی اور ہمارا پنجابی پشتو اور سندھی نہیں سمجھ سکتا۔ ہمارے اتحاد کا یہ عالم تھا ہم نے 1971ء میں اپنا آدھا ملک کاٹ کر پھینک دیا تھا اور آج تک اس کا رتا ہے پر فخر کر رہے ہیں، ہماری اپوزیشن جماعتیں تک کسی مشترک ایجنڈے پر متفق نہیں ہو پاؤں۔ ہماری ایم ایم اے چار سال میں استغفوں پر اتفاق رائے قائم نہیں کر سکی اور ہماری ہر سیاسی جماعت کئی کئی بار سیکورٹی ریسک اور تعداد قرار دی جا چکی ہے اور ہماری تیسری کمنٹ نظم تھا، آپ اس ملک کی سڑکوں پر نظم و ضبط کا مظاہرہ دیکھ لیجئے، اس ملک میں 61 برس بعد بھی قطار نہیں بن سکی، آج بھی لوگ ایک دوسرے کے کندھے پر چڑھ کر بجلی کا ٹل ادا کرتے ہیں، لوگ حج کے فارم کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبان ہوتے ہیں اور نظاری کی کھجور کے لیے دوسرے کو کبھی مارتے ہیں، سڑکوں پر ہر گاڑی دوسری گاڑی سے آگے ٹکنا چاہتی ہے، ہر چوک پر درجنوں گاڑیاں سنگٹل توڑتی ہیں اور لوگ فائر بریگیڈ اور ایسیو لینسوں کے راستے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہمارے ملک میں نظم و ضبط کا یہ عالم ہے یہاں کوئی بھی شخص کسی بھی وقت، کسی بھی ادارے کا سربراہ بن سکتا ہے اور اسے کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔

مجھے ان صاحب کی بات میں بڑا وزن محسوس ہوا، مجھے لگا ہم اخلاقی، سیاسی اور سماجی ہر شعبے میں منافقت کا شکار ہیں، ہم لوگ اپنے ہر شعبے میں منافقت کا بیج بوٹے ہیں، اس بیج کو منافقت کا پانی اور کھاد دیتے ہیں اور اس کے بعد توقع کرتے ہیں اس پر ترقی اور خوشحالی کے پھل اور پھول لگیں گے، ہم اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دیتے ہیں اور اس کے بعد اس سے کرم اور رحم کی دعاؤں کرتے ہیں، ہم لوگ منافقت کے زمیندار ہیں، ہم میریوں پر سب اگانا چاہتے ہیں اور ہم بانسوں کے رس سے گڑ بنانا چاہتے ہیں۔





## کمپونیکیشن ایج

”یہ ہمارے دوست ہیں، طاقتور صاحب، آپ سے ملنے کیلئے امریکہ سے آئے ہیں“ اسد نے طاقتور صاحب کا تعارف کرایا اور میں نے ان کی طرف ہاتھ بڑھا دیا، ابھی میرا ہاتھ ان کے ہاتھ تک نہیں پہنچا تھا کہ ان کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ طاقتور صاحب نے الیکسکے زئی کہا، موبائل کی سکرین دیکھی اور ویلو کا فہرہ لگا کر موبائل کان سے لگا لیا۔ میں نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا، طاقتور صاحب بڑی دیر تک امریکی لہجے میں گفتگو کرتے رہے اور ہم دونوں ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرتے رہے، فون بند ہوا تو انہوں نے صدر ہال کے سٹائل میں سواری کہا اور ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن ہاتھ کے ہاتھ تک پہنچنے سے پہلے میرا موبائل بج گیا۔ میں نے جلدی جلدی ہاتھ ملایا اور میز کی طرف بھاگ کھڑا ہوا، میرا فون مسلسل بج رہا تھا، فون پر جنرل صاحب کا نام چمک رہا تھا۔ میں جنرل صاحب کی کال ”انگور“ نہیں کر سکتا تھا لہذا میں نے فوراً فون اٹھایا اور اس کے بعد ہم دونوں صدر ام حسین کی پھانسی اور اس کے باہد اثرات پر گفتگو کرنے لگے۔ جنرل صاحب کو میرے نظریات اور خیالات سے شدید اختلاف تھا جبکہ میں انہیں قائل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ ہماری گفتگو 15 منٹ تک جاری رہی۔ اس دوران اسد اور طاقتور صاحب کھڑے رہے اور میں کمرے میں ٹھہر کر فون سن رہا۔ جنرل صاحب نے تھک کر فون بند کیا تو میں دوبارہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔ طاقتور صاحب اس وقت موبائل پر کسی فیڈرل سیکرٹری سے لائٹری کے نمبر پر سبسکس کر رہے تھے اور اسد دہلی دہلی آواز میں اپنی بیوی سے چھوٹی بیٹی کی طبیعت پوچھ رہا تھا۔ وہ دونوں کمرے کے مختلف کونوں میں موبائل کان سے لگائے کھڑے تھے اور میں کبھی ایک کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی دوسرے کی طرف، وہ دونوں بڑی بے چارگی سے میری طرف دیکھتے تھے لیکن دوسری طرف موجود لوگ ان کا پیچھا پھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اسد نے اپنی بیوی کو جھانڈ پلائی، لیجے سے فون بند کیا اور میری طرف چل پڑا، وہ ابھی بمشکل میرے قریب پہنچا تھا کہ طاقتور صاحب نے موبائل مٹھی میں دبایا اور دہلی آواز میں کہا ”تم نے سیکرٹری صاحب سے بات کرنی تھی“ اسد نے فوراً اثبات میں گردن ہلاتی اور واپس پلٹ گیا، طاقتور صاحب نے سیکرٹری سے اسد کا تعارف کرایا اور فون اس کے ہاتھ میں دے کر میری طرف متوجہ ہو گئے، انہوں نے گرم جوش سے دوبارہ ہاتھ ملایا اور بولے ”میں آپ کا بہت بڑا فین ہوں“ میں نے خوش دلی سے انہیں ہتھی دیکھا تا شروع



کردی۔ ثاقب صاحب نے ابھی بمشکل میرے دانت دیکھے ہوں گے کہ میرا موبائل بج اٹھا، میں نے مسکریں پر نظر ڈالی، میری بیوی کا فون تھا، میں نے ایکسکسے زلی کہا اور فون اٹھا لیا، میں نے بیوی سے پانچ منٹ میں رنگ بیک کا وعدہ کیا لیکن بیوی نے میری بات سنی ان سنی کردی اور مجھے بتانا شروع کر دیا "ابا جی کی شوگر بہت بڑھ گئی ہے اور انہیں فوراً ہسپتال پہنچانا ہوگا" میں ہاں ہاں، اچھا اچھا اور ٹھیک ہے ٹھیک ہے قسم کے جواب دیے لگا۔ اس دوران ثاقب صاحب مجھے بے چارگی سے دیکھتے رہے، میں نے اپنی بیوی سے بڑی مشکل سے دس منٹ مانگے فون بند کیا اور ثاقب صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ثاقب صاحب نے جیب سے اپنا وزٹنگ کارڈ نکالا لیکن ابھی یہ کارڈ ان کے ہاتھوں ہی میں تھا کہ اسد نے زور سے سرگوشی کی "ثاقب سیکرٹری صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں" ثاقب صاحب کارڈ لے کر اسد کی طرف چلے گئے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ کان جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور فوراً بیوی کو فون ملانے لگا، میری بیوی دس منٹ سے پہلے "رنگ بیک" وصول کر کے حیران رہ گئی اور اس نے ایک بار پھر ابا جی کی شوگر کی رام کہانی سنانا شروع کر دی۔ اس دوران ثاقب صاحب اور اسد نے فون بند کیا اور آکر میرے سر پر کھڑے ہو گئے، میں شرمندگی اور خفت کے ملے جلے احساس سے انہیں دیکھنے لگا، وہ میری خفت پہچان گئے چنانچہ اسد نے فون پر دوبارہ نیچی کا حال پوچھنا شروع کر دیا اور ثاقب صاحب "ایس ایم ایس" کرنے لگے۔ میری بیوی کی کہانی ختم ہوئی تو درمیان میں زیدی صاحب کا فون آگیا، زیدی صاحب ایک مٹی پھسل کھینے کے "کنٹری ہیڈ" ہیں اور ہماری کچنی ان کے ساتھ بڑے لیول پر کام کرتی ہے چنانچہ میں ان کی کال بھی "آنموز" نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے شدید پریشانی میں ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ابھی تک اپنے اپنے فون کے ساتھ مگن تھے۔ میں نے فوراً فون اٹھا لیا، زیدی صاحب میرے سٹاف کی کوتاہیوں کی طویل فہرست لے کر بیٹھے تھے، ہم نے ڈاکو مسٹری پچھلے ہفتے مکمل کرنی تھی لیکن وہ ابھی تک کراچی میں پہنچے تھی۔ ہم نے ان کے لیے چار سیمینار کرنے تھے اور ان سیمیناروں کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ میں نے زیدی صاحب سے دس منٹ کا وقت مانگا اور اس کے بعد لاہور اور کراچی میں رابطے شروع کر دیے، فلم سلیٹنگ کے لوگوں سے رابطہ کیا، ایونٹ مینجمنٹ کے لوگوں کو فون کیے اور ساری اپ ڈیٹ لے کر زیدی صاحب کو رپورٹ دے دی۔ میں اس کام سے فارغ ہوا تو اسد وائش روم جا چکا تھا جبکہ ثاقب صاحب لیپ ٹاپ کھول کر "ای میلز" کا جواب دے رہے تھے۔ مجھے وائش روم سے اسد کے چیخنے کی آواز میں آ رہی تھیں وہ پانی اور کوڑا کے شور کے ساتھ ساتھ موبائل پر کسی کے ساتھ جھگڑ رہا تھا۔ میں نے کھڑک کر گلہ صاف کیا اور ثاقب صاحب سے مخاطب ہوا "آپ امریکہ میں کیا کرتے ہیں" ثاقب صاحب نے چونک کر سر اٹھایا، مسکرا کر ہاتھ میں دبے کارڈ کی طرف دیکھا اور دوبارہ لیپ ٹاپ کی مسکریں کی طرف مڑ کر بولے "آئی نیڈ اوٹھی دن منٹ" میں مسکرا کر رہ گیا۔ ثاقب صاحب کی انگلیاں تیزی سے کی بورڈ سے کھیلنے لگیں۔ میں نے موبائل فون اٹھا لیا، مجھے اس وقت تک 13 ایس ایم ایس مل چکی تھیں۔ میں نے ایس ایم ایس پڑھنا شروع کر دیں۔ اسد وائش روم سے نکلا تو وہ ایک ہاتھ سے جلیٹ ہانڈھنے کی کوشش کر رہا تھا اور

دوسرے ہاتھ سے اس نے موبائل کان کے ساتھ لگا رکھا تھا، اس کا جرس کتنا کسی آواز کو کتنا کے ساتھ بھاگ گیا تھا اور وہ موبائل پر اپنے ملازموں کو کتنا تلاش کرنے کی ہدایات دے رہا تھا۔ اس نے ہینشل ہیٹ باندھی لیکن زپ بدستور کھلی رہی۔ میں دوبارہ ایس ایم ایس پڑھنے لگا، ثاقب صاحب ای میل کے جواب ایسے رہے اور اسد موبائل پر کتنا تلاش کر رہا ہا، اس کھیل میں ایک گھنٹہ گزر گیا میں نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا، شام کے چار بج چکے تھے، اور یا مقبول جان کا جہاز لینڈ کر چکا تھا اور میں نے اسے ایئر پورٹ سے لینا تھا۔ میں نے اسد کو اشارہ کیا، اس نے فون ہولڈ کر لیا اور میرے منہ پر جھک گیا، میں نے اسے اپنا مسئلہ بتایا، اس نے مجھے اشارے سے جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے ثاقب اور اسد دونوں کی طرف ہاتھ ہلایا اور دفتر سے باہر آ گیا۔

گاڑی تک آتے آتے میرا فون مزید دوسرے بج چکا تھا۔ یہ دونوں کالز بھی تھیں، ار جٹ ہوں گی لیکن میرا گاڑی میں بیٹھنا زیادہ ضروری تھا لہذا میں نے کالز "آنکورد" کیں اور دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں نے چابی گھماتے گھماتے "مسڈ کالز" دیکھیں، اف خدا یا یہ دونوں کالز انتہائی اہم تھیں، میں نے ایک ہاتھ میں سینیٹرنگ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے فون ڈائل کرنے لگا۔ دونوں فون "بزی" مل رہے تھے، میں نے ٹھیک اس لمحے سوچا، کیونکہ میں نے اس زمانے نے دور بیٹھے لوگوں کے مابین فاصلے تو مٹا دیے ہیں لیکن اس نے سامنے موجود لوگوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے۔ اس کیونکہ میں ایج کی وجہ سے سات براحتوں پر پھیلی دنیا ہماری ایک ہیلو کے فاصلے پر آگئی ہے لیکن ہمارے پاس سامنے بیٹھے شخص کے لیے وقت نہیں بچا اور ہم دوری اور نزدیکی کے ایک ایسے گورکھ دھندے میں بھٹک گئے ہیں جس میں دور رہنے والے ہمارے نزدیک آگئے ہیں لیکن نزدیک رہنے والے لوگ ہم سے بہت دور چلے گئے ہیں، ہم جب چاہیں پوری دنیا سے رابطہ کر سکتے ہیں لیکن ہمیں سامنے بیٹھے شخص کے سلام کا جواب دینے میں گھنٹہ لگ جاتا ہے میں نے سوچا کیونکہ میں ایج کی یہ دنیا کیسا گلوبل ویلج ہے جس میں قلب شمالی کا باشندہ تو میرے کان کے ساتھ لگ رہا ہے لیکن میرے ہمسائے اور میری صحبت کے نیچے رہنے والے میرے بھائی کو میری "ہیلو" کیلئے سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔





## پروٹوکول

میرے آگے بیچھے دائیں بائیں سینکڑوں گاڑیاں تھیں، بمپر سے بمپر اور لائٹ سے لائٹ جڑی تھی ہر طرف ہالاکارچی تھی ڈرائیور نے تھوڑی دیر انجن سٹارٹ رکھا پھر گاڑی بند کر کے نیچے اتر ااور صورتحال جاننے کیلئے گاڑیوں کے ہجوم میں گم ہو گیا، میں نے شیشہ کھولا اور پریشانی میں آگے بیچھے دیکھنے لگا ہر طرف دھواں ہی دھواں اور شور ہی شور تھا 'ڈرائیور نے واپس آ کر اطلاع دی "رودت لگا ہے کوئی وی آئی پی گزرنے والا ہے" میں نے بیچھے ٹیک لگائی مجھے یقین تھا میں اب وقت پر ایئر پورٹ نہیں پہنچ سکوں گا" میرے آگے ایک پرانی فونکسی کھڑی تھی 'گاڑی کی پچھلی سیٹ پر درسیانی عمر کی ایک خاتون بیٹھی تھی میں نے اس خاتون کو بار بار بے چینی سے کروٹیں بدلتے دیکھا وہ ششے سے باہر جھانکتی پہلو بدلتی آگے بھٹکتی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بزرگ کے کان میں کچھ کہتی ساتھ بیٹھی بوڑھی خاتون سے مشورہ کرتی اور پھر بیچھے گر جاتی 'پانچ سات منٹ کے وقفے سے وہ دوبارہ سیدھی ہوتی اور یہ سارا عمل دہرائی 'اس کی بے چینی اتنی نمایاں تھی کہ تمام گاڑیوں میں بیٹھے لوگ اسے نوٹ کر رہے تھے ڈرائیور بعد میں نے محسوس کیا وہ خاتون چیخ رہی ہے اور اس گاڑی میں بیٹھے لوگوں کے چہروں پر سراسیمگی پھیل رہی ہے میرے ساتھ میری بیوی تھی وہ بھی اس خاتون کی پریشانی نوٹ کر رہی تھی اس نے میری طرف دیکھا میں نے ہاں میں گرون ہلا دی وہ نیچے اتری اس گاڑی کا شیشہ بجایا خاتون سے بات کی اس کی والدہ اور خاتون کو نیچے اتارنا ساتھ والی گاڑی میں بیٹھی تیسری عورت کے کان میں سرگوشی کی وہ خاتون بھی نیچے اتری اور وہ چاروں عورتیں سڑک سے نیچے اتر کر اور درختوں میں گم ہو گئیں 'تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئیں تو وہ خاتون کسی حد تک شانت تھی میں نے بیوی سے مسئلہ پوچھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اس نے بتایا خاتون کو ہسپتال لے جایا رہا ہے اس کے گرد سے خراب ہیں اسے اس وقت ٹوائلٹ کی شدید ضرورت تھی ہم تینوں عورتوں نے اپنی اپنی چادروں سے اس کیلئے عارضی ٹوائلٹ بنادیا تھا 'یاب ٹھیک ہے لیکن یہ واقعہ عارضی ہے آدھ گھنٹے بعد اس کے گردوں میں دوبارہ درد اٹھے گا۔

میں نے اگلی گاڑی کی طرف دیکھا 'ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بزرگ آنکھوں پر رد مال رکھ کر شیرنگ پر جھکے ہوئے تھے اور میرے نے فخت سے پہنچے کیلئے چہرے پر چادرتان رکھی تھی میں نے آگے بیچھے نظریں دوڑائیں تمام گاڑیوں میں اس سے ملتی جلتی صورتحال تھی 'سکول سے واپس آنے والے بچوں کے ہونٹ خشک اور زبا نہیں لٹک رہی تھیں 'عورتیں سراسیمگی کے عالم میں دائیں بائیں دیکھ رہی تھیں 'میری طرح وقت کے پابند لوگ بار بار



گھڑیاں دلیہ رہے تھے اور پریشانی میں پیشانیوں پر دستک دے رہے تھے تمام لوگوں نے کانوں سے موبائل نگار کھے تھے اور فون پر اپنے بارہوا کو اپنی مصیبت کی روداد سنارہے تھے۔ انہیں نے گھڑی دیکھی جہاں چھوٹے میں صرف پینتالیس منٹ باقی تھے مجھے یقین ہو گیا میں انہیں پورٹ نہیں کھینچ سکوں گا۔ میں وہاں سے واپس بھی نہیں جاسکتا تھا لہذا میرے پاس مہر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ پورے 35 منٹ بعد "سائرن" کی آواز آئی پانچ منٹ تک پولیس اور پروٹوکول کی گاڑیاں گزرتی رہیں اور اس کے بعد ٹریفک ریشٹنا شروع ہوئی چند بے صبرے ڈرائیوروں نے مہارت کا مظاہرہ کیا اور ٹریفک پھنس گئی گاڑیاں تھڑکیں سے الجھ گئیں ٹریفک کانسٹیبلوں نے معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی لیکن جب وہ ٹریفک کی الجھن دور یاں سلجھانے میں ناکام ہو گئے تو انہوں نے اپنے اپنے موٹر سائیکل کو گنگ مادی اور میدان چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ ہم سب لوگ پورا اکٹھا ایک دوسرے کے ساتھ الجھتے رہے جب گاڑی کھلی سڑک تک پہنچی تو ایک گھنٹہ 45 منٹ ہو چکے تھے راستے میں میری بیوی نے مجھ سے پوچھا "ان لوگوں میں سریش بھی ہو گئے" میں نے جواب دیا "یقیناً" اس نے پوچھا "وہ مریض جو موت سے پانچ منٹ کے فاصلے پر ہوتے ہیں اگر وہ اس صورتحال کا شکار ہو جائیں تو ان کا کیا بننا ہوگا" میں نے اوپر کی طرف دیکھا اس نے پوچھا "استحسان کیلئے جانے والے طالب علموں کی کیا حالت ہوتی ہوگی" میں نے کندھے اچکائے اور اس نے آخری سوال پوچھا "اگر کسی نے تمہاری طرح انہیں پورٹ جانا ہو تو وہ کیا کرنا ہوگا؟" میں نے فوراً جواب دیا "ایسے تمام لوگوں کو اپنی اپنی جیت پر دن دے جایا کرتا ہے۔"

یہ اسلام آباد کا روز کا معمول تھا۔ میں دن میں بیسیوں مرتبہ یہ کھیل دیکھتا تھا اور سوچتا تھا "کیا حکمرانوں کے کانوں تک روٹ کے شکار ان لوگوں کی سسکیاں نہیں پہنچتیں" کیا ان لوگوں کو خبر نہیں ہوتی وہ جن سٹیشن سڑکوں سے گزرتے ہیں ان کے دائیں بائیں سینکڑوں گاڑیاں کھڑی ہیں اور ان گاڑیوں میں اس وقت ہزاروں لوگ جھولیوں پھیلا پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں" مجھے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملتا تھا لیکن چند روز قبل میں نے اخبارات میں پڑھا صدر نے ایوان صدر میں اعلیٰ سطحی میٹنگ بلائی ہے اور سیکرٹری داخلہ کو روٹ کا وقت کم کرنے کا حکم دے دیا ہے مجھے یہ خبر پڑے کہ بہت خوشی ہوئی مجھے محسوس ہوا اس حکم سے عام شخص کی زندگی میں تھوڑا بہت سکون آ جائے گا اسے اس سے ضرور ریلیف ملے گا" اگلے دن خبر ملی صدر نے اس فیصلے پر عملدرآمد کا حکم بھی جاری کر دیا ہے میری خوشی دو چند ہوئی میں نے سوچا دیر سے سب مگر عام آدمی کی آواز بجا کر حکمرانوں کے کانوں تک پہنچ گئی ہے اور اب لوگوں کے مسائل حل ہو جائیں گے لیکن میں اس حکم کے اگلے دن کلب روڈ پر ٹکا تو میں دوبارہ اس صورتحال میں پھنس گیا پتہ چلا صدر کا حکم محض کانڈی تھا اور یہ حکم پیدائش کے فوراً بعد فائلوں میں گم ہو گیا یہ انتہائی خوفناک بلکہ سنگدلانہ بات تھی پروٹوکول اور سیکورٹی پوری دنیا میں ہوتی ہے لیکن سیکورٹی اور پروٹوکول کے مورچے شہری زندگی پر نہیں کھودے جاتے اس کی عمارت عام آدمی کے معمول پر تعمیر نہیں ہوتی لیکن ہمارے ملک میں سارے نظام الٹ ہیں یہاں حکومت اور حکمرانوں کی کوئی آسائش اس وقت تک مکمل نہیں بھی جاتی جب تک اس آسائش کو دو چار سولہ لوگوں کا لہو نہ پلایا جائے جب تک لوگوں کو آزیت نہ پہنچے ہمارے حکمرانوں کا پروٹوکول مکمل نہیں ہوتا ہمارے ملک میں حکمران خدمت کرنے کیلئے اقتدار میں نہیں آتے وہ عوام کو تکلیف اور آزار دینے کیلئے سناقتدار پر جلوہ افروز ہوتے ہیں۔



کاشفِ ازار  
Dec-2010

## رن لاہور رن

اس نے میکینک لوگوں کے مسائل میں سرکھانا شروع کر دیا، میں نے اس سے کہا ”نام دیکھو ہم لوگ امریکہ سے زیادہ روشن خیال اور اعتدال پسند ہیں، ہم پچھلے دو برسوں سے میراتھن کر رہے ہیں، تم بتاؤ کیا امریکہ میں میراتھن ہوتی ہیں؟“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا، میں نے کہا ”ہم نے نہ صرف میراتھن کرائی بلکہ ہماری ریس میں خواتین اور مرد دونوں نے حصہ لیا، یہ تمہارا دیکھنے کے لئے پورا لاہور سڑکوں کے کنارے کھڑا تھا اور باقی ملک ٹیلی ویژن کی سکرین پر یہ کھیل دیکھ رہا تھا، تم بتاؤ کیا تمہاری زندگی میں کبھی رن نیو یارک رن یا رن واشنگٹن رن یا رن شکاگو رن ہوا؟“ اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا، میں نے کہا ”امریکہ میں جب عوامی سطح پر کسی اقدام کی مخالفت ہوتی ہے تو گورنمنٹ اپنی پالیسی بدل لیتی ہے، وہاں ہمیشہ اکثریت کی رائے کو اقلیت پر فوقیت حاصل ہوتی ہے لیکن پاکستان میں حکومت روشن خیالی پر کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کر رہی، یہاں حکومت عوامی رد عمل پر کالا بارغ ڈیم جیسے ایئر پریچھے ہٹ جاتی ہے لیکن جب روشن خیالی کی بات آتی ہے تو حکومت پوری قوت سے ڈٹ جاتی ہے، تم ہماری میراتھن ریس دیکھو، دونوں مرتبہ اپوزیشن جماعتوں نے احتجاج کیا، عوام کی اکثریت نے اس احتجاج کا ساتھ دیا لیکن اس احتجاج کے باوجود نہ صرف یہ ریس ہوئی بلکہ کامیابی کے ساتھ پایہ تکمیل تک بھی پہنچی، تم بتاؤ کیا تمہارے ملک میں ایسا ہوتا ہے؟“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا، میں نے کہا ”اب تم امریکہ سے باہر نکلو اور ذرا سوچ کر بتاؤ کیا برطانیہ، جرمنی، فرانس، اٹلی، چین، جاپان، روس، سوئیڈن اور آسٹریا میں بھی میراتھن ہوتی ہے؟ کیا جاپان، چین، فلپائن، تھائی لینڈ، ملائیشیا اور سنگا پور میں میراتھن ہوتی ہے؟ کیا روس، یوکرین، پولینڈ اور بوسنیا میں میراتھن ہوتی ہے؟ اور کیا آسٹریلیا، کینیڈا اور برازیل میں میراتھن ہوتی ہے؟“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا، میں نے کہا ”لیکن اس کے باوجود تم ہمارے ملک ہمارے معاشرے کو پس ماندہ، قدامت پسند اور ایکسٹریمٹ کہتے ہو؟“ میں خاموش ہو گیا۔

نام نے دونوں ہاتھوں سے سر کھایا، ایٹش ٹرسے کے کونے پر رکھا سگریٹ اٹھایا، کش لیا اور ناک سے دھواں اگل کر بولا ”میں جب بھارت میں تھا تو میں نے وہاں ایک بڑی دلچسپ فلم دیکھی تھی، اس فلم کا ایک سین میرے دماغ میں ریکارڈ ہو کر رہ گیا، میں جب بھی بھارت کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے فوراً وہ فلم اور اس فلم کا وہ سین یاد آ جاتا ہے، اس فلم کی ہیروئن غریب اور بیمار تھا، میرا اپنے والدین پر زور دے کر ہیروئن کے ساتھ



شادی کر لیتا ہے جس کے بعد بیرونی کچے مکان سے محل میں آ جاتی ہے اس محل میں اسے ہر قسم کا آرام ملتا ہے لیکن اسے عزت اور خوشی نہیں ملتی وہ وہاں بے یقین اور پریشان رہتی ہے ایک دن بیرون کا باپ اپنی بیٹی سے ملنے آتا ہے بیٹی اپنے باپ کو دیکھ کر بڑی خوش ہوتی ہے وہ اس کے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کرتی ہے لیکن باپ ان باتوں میں چھپا ہوا کرب محسوس کر لیتا ہے وہ اس سے پوچھتا ہے تم یہاں خوش تو ہو؟ بیٹی فوراً اندھ کر ڈرائیونگ روم کے پردے کھینچ دیتی ہے اور کھڑکی سے باہر کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہے ڈیڈی یہاں سے باہر دیکھیں آپ کو پورا سمندر دکھائی دے گا باپ اس کی بات سنی ان کی کرتا ہے اور اس سے دوبارہ پوچھتا ہے تم یہاں خوش تو ہو وہ قہقہہ لگا کر جواب دیتی ہے میرا بیڈ روم سوئفٹ لمبا اور سوئفٹ چوڑا ہے اس میں والٹر بیڈ ہے اس کی دیواروں کا رنگ لگا دکھائی ہے اور اس کی کھڑکی باغ کی طرف کھلتی ہے باپ اس سے تیسری سرب پوچھتا ہے بیٹی تم یہاں خوش تو ہو وہ پھر مسکرا کر جواب دیتی ہے اس گھر میں بھارت کا سب سے بڑا ریفریجریٹر سب سے بڑائی وی اور سب سے سبکی گاڑیاں ہیں جس قالین پر آپ کھڑے ہیں اس کی قیمت تیس لاکھ روپے ہے اور یہ صوفے ان لوگوں نے اٹلی سے خریدے تھے باپ اسے کندھے سے ہٹا کر ہلاتا ہے اور سخت آواز میں کہتا ہے میں تم سے پوچھ رہا ہوں تم یہاں خوش تو ہو وہ باپ کی طرف غور سے دیکھتی ہے اس کے کندھے پر سر رکھتی ہے اور پھوٹ پھوٹ کر روناشروع کر دیتی ہے تمام خاموش ہو گیا۔

ہمارے درمیان بڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وہ اس وقت کے دوران سر کھجاتا رہا یا پھر سر گریٹ پتارہا جب وقت طویل ہو گیا تو میں نے اس سے پوچھا تم کہنا کیا چاہے ہو وہ مسکرایا اس نے ناک سے دھواں اگلا اور سونے ہوئے لہجے میں بولا صرف ریس سے خوشحالی اور روشن خیالی نہیں آتی صرف میرا تھن ترقی کا جواز نہیں ہوتی معاشرہ کیلئے قانون انصاف حقوق تعلیم اور صحت بھی ضروری ہوتی ہے دن لاہور دن سے پہلے ہیلاٹ لاہور ہیلاٹ کا مرحلہ آتا ہے اس کے بعد ایجوکیشن لاہور ایجوکیشن کی ریس ہوتی ہے اس کے بعد رائٹس لاہور رائٹس کی دوڑ ہوتی ہے اس کے بعد جسٹس لاہور جسٹس کی بازی لگتی ہے اس کے بعد پولیس لاہور پولیس کی میرا تھن ہوتی ہے اور اس کے بعد کہیں جا کر دن لاہور دن کی باری آتی ہے میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا وہ بولا کیا تم لوگوں کے پاس پینے کے لئے صاف پانی ہے؟ اس وقت پاکستان کے 80 فیصد عوام گندہ اور ستر صحت پانی پی رہے ہیں کیا تمہارے عوام کو دوا ہیلاٹ کینسر اور ہسپتال مل رہے ہیں؟ تم لاہور کے کسی ہسپتال میں چلے جاؤ تمہیں باہر گیت تک مریض ہی مریض ملیں گے میں نے اپنی آنکھوں سے ایک ایک بیڈ پر دو دو مریض دیکھے ہیں تمہارے ملک میں ایک ایک سرجن سو سو آپریشن کرتا ہے ناکام سے لے کر کینسر تک تمام بیماریوں کی دوائیں مریض کو اپنی جیب سے خریدنی پڑتی ہے اور لوگ ڈاکٹروں کے نسخے اٹھا کر سڑکوں پر بھیک مانگتے ہیں تم تعلیم کی حالت دیکھو تمہارے ملک کا ایک بھی تعلیمی ادارہ دنیا کے ہزار بڑے تعلیمی اداروں میں شامل نہیں تم لوگ اچھا ڈاکٹر اچھا انجینئر اچھا شہر اور اچھا مسلمان کسے کہتے ہو؟ وہ شخص جو فارن کوالیفائیڈ ہو تمہارے ملک میں انسانی حقوق کی صورتحال بھی انتہائی خراب ہے تم لوگ سو نیا ناز اور عیاراں مالی جیسے واقعات کی وجہ سے پوری دنیا میں بدنام ہو رہے ہو تمہارے ملک میں چائلڈ لیبر ہے مزدوروں کی تنخواہیں کم ہیں تمہاری جیلوں میں مجرموں کے



ساتھ انتہائی اخلاق سوز سلوک ہوتا ہے اور تمہارے ملک میں کسی ملازم کو سوشل سکیورٹی حاصل نہیں، تم لوگ انصاف کی پانچویں فہرست میں آتے ہو، تمہاری عدالتوں میں لاکھوں مقدمات زیر التوا ہیں، تمہارے نظام عدل میں لوگوں کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں تیس تیس سال لگ جاتے ہیں، آج بھی سینکڑوں ہزاروں بے گناہ لوگ تمہاری جیلوں میں بے گناہی کی سزا بھگت رہے ہیں، تمہارے ملک میں ججوں کے کردار پر انگلی اٹھائی جاتی ہے، تمہارے ملک میں ایک کورٹ دوسری کورٹ پر کرپشن کا الزام لگاتی ہے، تمہارے ملک میں عدالتوں کے رجسٹرار جیلوں میں بند ہیں اور تمہارے ملک میں قانون نام کی کوئی چیز نہیں، تم لوگ قتلوں میں سادی دنیا سے آگے ہو، تمہارے ملک میں ذکیٹیاں اور چوریاں معمول بن چکی ہیں، تمہارے ملک میں ہر گھر کے سامنے مسلح گارڈ کھڑے ہیں، تمہارے ملک میں کوئی امیر شخص گارڈز کے بغیر گھر سے نہیں نکلتا، تمہارے ملک کی پولیس غیر معیاری اور غیر انسانی ہے، تمہارے ملک میں با اختیار شخص کے لئے کوئی قانون نہیں اور تمہارے ملک میں مضبوط اور با اختیار شخص ٹریفک کے اشارے پر کناٹا پٹی تو ہیں سمجھتا ہے میرا خیال ہے تم لوگوں کو میرا تھن ریس سے پہلے ایک سماجی میرا تھن کی ضرورت ہے ایک قانونی، عدلی اور اخلاقی میرا تھن کی ضرورت ہے لیکن تم لوگ اس پر توجہ دینے کی بجائے دن لاہور دن جیسے کاموں میں مصروف ہو، وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے پوچھا، لیکن ہم روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی طرف بڑھ رہے ہیں، اس نے قبضہ لگایا، جس ملک میں صحت، تعلیم، روزگار، انصاف، قانون اور انسانیت کا احترام نہ ہو، جس میں بڑے اور چھوٹے کے لئے الگ الگ معیار ہوں، جس میں انسانی حقوق نہ ہو، جس میں ٹریفک سنگٹل کا احترام نہ ہو اور جس میں خالص دوائیاں نہ ملتی ہوں، وہ معاشرہ صرف میرا تھن ریس سے روشن خیالی اور اعتدال پسندی نہیں ہو سکتا، اعتدال پسندی انصاف کی کوکھ سے جنم لیتی ہے اور وہ قانون کے ہاتھوں میں ملی کر جوان ہوتی ہے اور تب کہیں جا کر روشن خیالی کی شکل اختیار کرتی ہے لیکن تم لوگ اس فلم کی ہیروئن کی طرف فالین کھڑکی، ہینڈرڈ بائی ہینڈرڈ فٹ کے بیڈروم، بڑے فرنیچر، بڑے ٹیلی ویژن اور سمندر کے کنارے موجوں کی روشن خیالی سمجھ رہے ہو، تم اسے اعتدال پسندی سمجھ رہے ہو، بھائی میرے جب تک لوگ دائیں بائیں کان اور بائیں بائیں کان نہیں پکڑیں گے وہ اعتدال پسندی نہیں ہوں گے، ڈاننگ ٹیبل اور چھری کا تنوں سے پہلے تمہارے پاس روٹی ہونی چاہیئے، میرا تھن سے پہلے تمہارے پاس انصاف اور تعلیم ہونی چاہیئے، تم لوگوں کے پاس جا کر نہ کہتے ہیں نہیں اور تم دن لاہور دن کے نعرے لگاتے ہو، سرک پٹا، گئے ہولڈٹ، ٹامپ آف کنٹری، یو آؤٹ، ٹامپ آف پچل، یو آؤ۔



## ترجیحات

دوسری جنگ عظیم کے دوران جب نازی فوجیں یورپ کو تاراج کرتی ہوئی دنیا کے دوسرے کونے تک پہنچ چکی تھیں۔ اس دور میں ہٹلر نے چرچل کو چیلنجس کی "اگر اتحادی فوج جرمنی کے دو بڑے تعلیمی اداروں ہائیزل برگ اور گوٹن جن پر بم نہ گرانے کا وعدہ کرے تو نازی فوج برطانیہ کی دو یونیورسٹیوں آکسفورڈ اور کیمبرج پر بمباری نہیں کرے گی" چرچل نے یہ آفر قبول کر لی۔ اس دور میں برطانوی وزیراعظم کے ایک ساتھی نے آفر قبول کرنے کی وجہ پوچھی تو چرچل نے مسکرا کر جواب دیا "اگر پورا برطانیہ تباہ ہو گیا لیکن آکسفورڈ اور کیمبرج بچ گئیں تو ہم سمجھیں گے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا لیکن اگر کیمبرج اور آکسفورڈ تباہ ہو گئیں اور برطانیہ بچ گیا تو جان لیں پورا برطانیہ تباہ ہو گیا" اس معاہدے کے بعد دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کے نوے فیصد بچوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج میں جنم لیا کیونکہ برطانوی والدین سمجھتے تھے ان کے بچوں کی پیدائش کیلئے اگر اس وقت اگر کراہی پر کوئی محفوظ جگہ ہے تو وہ آکسفورڈ اور کیمبرج ہیں بالکل اسی طرح اس دور میں پیدا ہونے والے زیادہ تر جرمن بچوں کی پیدائش کے خانے میں بھی ہائیزل برگ اور گوٹن جن لکھا گیا۔

نازیوں اور اتحادیوں کا یہ معاہدہ بنیادی طور پر تعلیم اور تعلیمی اداروں کی اقوامیت کا اعتراف تھا۔ یہ معاہدہ ثابت کرتا تھا دنیا کا کوئی ملک اور کوئی قوم تعلیم اور وہ بھی جدید تعلیم کے بغیر ترقی نہیں کر سکتی اور یہ بھی حقیقت ہے جب تک کسی قوم کی یونیورسٹیاں کالج اور سکول آباد رہتے ہیں ان کے ٹیچر ہالوں میں علم اور ادب پر گفتگو جاری رہتی ہے اس وقت تک اس قوم پر زوال نہیں آتا۔ آج سے پانچ ہزار سال پہلے کا دور ہوا آج سے ڈیڑھ سو برس بعد کا زمانہ قوموں کے عروج و زوال کی داستان کلاس روموں میں لکھی جاتی رہی اور کلاس روموں ہی میں لکھی جائے گی اس سلسلے میں مصر کی مثال بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ 1952ء میں جب مصر میں انقلاب آیا اور انقلابیوں نے شاہ فاروق کو ملک بدر کر دیا تو ملک میں شاہ کے 70 ملین پاؤنڈ کے اثاثے تھے۔ انقلابیوں نے یہ اثاثے اور بدلتا جاگیرداروں کی جاگیر ۳۰ لاکھ کر سکول بنانے شروع کر دیے۔ اس دور میں مصر میں دو دو نوں میں تین تین سکول کھولے گئے تاریخ بتاتی ہے مصر کے اندر صرف چھ ماہ میں اتنے سکول بنے جتنے 50 برسوں میں تعمیر نہیں ہوئے تھے۔ اس حکمت عملی کا یہ نتیجہ نکلا آج جوئی کے عالمی اداروں میں کام کرنے والے مسلم ماہرین میں مصریوں کا حصہ 70 فیصد ہے۔ ایک طرف تو یہ صورتحال ہے اور دوسری طرف پاکستان کے 70 فیصد راکٹ اسکول،



آج بھی ٹرانٹ نہیں ہیں۔ پاکستان میں ایسے 65 ہزار سکول ہیں جن میں طالب علم اپنے ماٹ اپنے گھروں سے لاتے ہیں۔ صرف سندھ میں ایسے گیارہ ہزار سکول ہیں جو اسٹاٹس ہونے کے باعث بند پڑے ہیں۔ پاکستان دنیا کے ان ممالک میں شمار ہوتا ہے جن کے ساتھ کال آئی کیو لیول اور تعلیمی معیار پست ترین ہے۔ پاکستان ایشیا کا وہ ملک بھی ہے جو تعلیم پر سب سے کم خرچ کرتا ہے اور جس میں اسٹادی تنخواہ یکیشری میں کام کرنے والے مزدور سے کم ہے جس کی سب سے بڑی یونیورسٹی ایک سال میں ایشیا کی یونیورسٹیوں میں 39 ویں درجے سے 61 ویں گریڈ پر آ کر گر گئی ہے اور جسے دنیا تعلیم کے شعبے میں سب سے کم سرمایہ کاری کرنے والا ملک ڈیکلیر کر کے کی تیاری کر رہی ہے لیکن ہمارا کمال دیکھئے ہم اس صورتحال کے باوجود دنیا فتح کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں ہم اسرائیل سے لبنان پر بمباری کا بدلہ لینے کے منصوبے بنا رہے ہیں ہم لال قلعے پر چھڑے لہرانے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور ہم جاپان بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں ذرا سوچئے ایک ایسا ملک جس میں کل 60 یونیورسٹیاں ہوں وہ اس جاپان کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہے جس کے صرف ایک شہر ٹوکیو میں ایک ہزار یونیورسٹیاں ہیں۔

ہم جاپان بن سکتے ہیں اگر ہماری حکومت اپنا بجٹ مختصر کر کے صرف تعلیم اور تعلیمی اداروں کو اپنا فوکس بنا لے۔ ملک میں جدید ترین تعلیمی اداروں کا جال پھیلا دے ٹیکنالوجی کی پچاس ساٹھ فی یونیورسٹیاں بنائے شہروں، قصبوں اور دیہات سے جس جتن کر ٹیلنٹ جمع کرے اور انہیں مفت تعلیم دے ہماری معاوضے پر باہر سے پاکستانی ماہرین منگوائے انہیں تعلیمی اداروں میں نوکریاں دے اور ایک ایسی ٹی پو پیداکرے جو علم ہنر اور صلاحیت میں کسی سے کم نہ ہو حکومت یہ کام بڑی آسانی سے کر سکتی ہے اور حساب پیورونے ڈیٹا سٹروں اور لیسروں سے 200 ارب روپے برآمد کئے تھے یہ وہ رقم ہے جس کی ریکوری کا کوئی امکان نہیں تھا حکومت یہ سمجھے یہ رقم لیسروں سے واپس نہیں لی اور وہ مصر کی تقلید کرتے ہوئے اس رقم سے پاکستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں ایسے سکول کالج اور یونیورسٹیاں کھول دے جن میں صرف سائنس کی تعلیم دی جائے تو مجھے یقین ہے اس سے ملک میں انقلاب آ جائے گا مجھے کوئی صاحب بتا رہے تھے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک نے پاکستان کو پینکشنش کی ہے اگر حکومت تعلیم اور صحت کا بجٹ بڑھا دے تو یہ ادارے اس اضافی بجٹ کے برابر پاکستان کا سو معاف کر دیں گے حکومت اس آفر کا فائدہ بھی اٹھا سکتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ بنیادی سوال وہیں کھڑا ہے کہ یہ سب کچھ کون کرے گا اور کیوں کرے گا؟ ہمارے حکمرانوں کی ترجیحات میں صرف وہ اشیاء اور وہ کام شامل ہیں جن میں انہیں ذاتی فوائد نظر آتے ہیں لہذا یہ لوگ کسی ایسے منصوبے کسی ایسی پالیسی کو جگہ نہیں دیتے جس سے ملک و قوم کو فائدہ پہنچ سکے جس سے قوم کا مقدر بدل جائے۔ حکومت نے اگر نواب اکبر خان کو موت کے گھاٹ اتارنا ہوا تو تحفظ حقوق نسواں کا بل پیش کرنا ہو تو وہ دونوں لگاتی ہے لیکن اگر تعلیم روزگار صحت اور عوامی بہبود کا کوئی منصوبہ ہو تو وہ دو سال تک فائل ہی جتم نہیں لیتی لہذا جس ملک جس معاشرے میں حکومت کی ترجیحات کا یہ عالم ہو اس میں روشنی کی کرن کہاں سے چمکے گی اس میں لوگوں کے حالات کیسے بدلیں گے؟ لہذا ہم لوگ کوئے کے انڈوں سے فہس نکلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔





## کشکول

"یہ بادشاہ اور درویش کی کہانی ہے" وہ میری طرف دیکھ رہے تھے، ان کے چہرے پر شہد میں بیٹکی مسکراہٹ تھی "بادشاہ نے درویش سے کہا مانگو کیا مانگتے ہو؟ درویش نے اپنا کشکول آگے کر دیا اور عاجزی سے بولا "حضور صرف میرا کشکول بھر دیں" بادشاہ نے فوراً اپنے گلے کے ہار اتارے، انگوٹھیاں اتاریں، جیب سے سونے چاندی کی اشرفیاں نکالیں اور درویش کے کشکول میں ڈال دیں لیکن کشکول بڑا تھا اور مال و متاع کم، بادشاہ نے فوراً خزانے کے انچارج کو بلایا، انچارج بہرے جواہرات کی پوری لے کر حاضر ہو گیا، بادشاہ نے پوری کشکول میں الٹ دی تھیں جوں جوں جواہرات کشکول میں گرتے گئے کشکول بڑا ہوتا گیا یہاں تک کہ تمام جواہرات غائب ہو گئے، بادشاہ کو اپنی بے عزتی کا احساس ہوا اور اس نے خزانے کا منہ کھولنے کا حکم دے دیا، مزدور خزانے میں جاتے سونے چاندی اور جواہرات کی بوریاں اٹھاتے اور لا کر کشکول میں ڈال دیتے لیکن کشکول بھرنے کا کام نہیں لے رہا تھا، خزانے کے بعد وزراء اور درباریوں کی باری آئی، ساری کاہینہ نے اپنی جبین اپنی تجوریاں اور اپنے بیک بلیس کشکول میں ڈال دیئے لیکن یہ سارا مال و متاع بھی کشکول کے پینڈے میں غائب ہو گیا اور کشکول خالی کا خالی رہا، اس کے بعد شہر کی باری آئی، بادشاہ نے فکڑ کو اشارہ کیا، فوج شہر میں داخل ہوئی، اس نے پورے شہر کی دولت جمع کی اور لا کر کشکول میں ڈال دی لیکن نتیجہ پچھلے نتیجے سے مختلف نہیں تھا، بادشاہ نے نکل کی طرف دیکھا، لوگوں نے بادشاہ کا محل اٹھا کر کشکول میں ڈال دیا، اس کے بعد منتر کالونی، وزیراعظم ہاؤس اور پارلیمنٹ کی باری آئی، یہ سارے ہاؤس بھی کشکول میں ڈال دیئے گئے، شہر کے سارے کارنر پلاٹ، سارے کمرشل ایریا، سارے فیکے، سارے پرمٹ، ساری امدادی رقوم، سارے چنک، سارے پلازے اور ساری ہاؤسنگ سکیس کشکول میں ڈال دی گئیں لیکن کشکول خالی رہا، بادشاہ نے رعایا کی طرف دیکھا، انتظامیہ نے ایک ایک کر کے لوگوں کو بھی کشکول میں پھینکا شروع کر دیا یہاں تک کہ سارا شہر خالی ہو گیا لیکن کشکول خالی رہا، آخر میں بادشاہ ہار گیا اور درویش جیت گیا، درویش نے کشکول بادشاہ کے سامنے انا، مسکرایا، سلام کیا اور واپس مڑ گیا، بادشاہ درویش کے پیچھے بھاگا اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا "حضور مجھے صرف اتنا بتا دیں یہ کشکول کس چیز کا نام ہے؟" درویش مسکرایا

”اے نادان بادشاہ یہ خواہشات سے بنا ہوا کنگول ہے اسے صرف قبر کی مٹی بھر سکتی ہے۔“  
 وہ خاموش ہو گئے، میں نے عرض کیا ”جناب میں اس کہانی کا مقصد نہیں سمجھا“ وہ مسکرائے ”دنیا اور دنیا داری درویش کے کنگول کی طرح ہوتی ہے آپ اس کنگولا میں جو چاہے بٹھتا چاہے ڈال دیں یہ ہمیشہ خالی رہے گا“ انسان کا چھوٹی گاڑی سے بڑی گاڑی تک کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا، ہماری زندگی میں ایک کمرے کی خواہش پھیلنے پھیلنے کوٹھی بنتی ہے اور اس کے بعد یہ خواہش پوری دنیا کے جزیروں اور ملکوں کی تلاش میں گھل گھڑی ہوتی ہے ایک دفتر، ایک شینو اور ایک چپراسی کی خواہش پھیلنے پھیلنے ایوان صدر بن جاتی ہے، ایک دن کا اقتدار، مشرک بھیل جاتا ہے اور ایک دستخط کا اختیار، سکندر اعظم بن کر دنیا سے رخصت ہوتا ہے، ایک نقد، دسترخوان بنتا ہے اور دسترخوان چالیس ایکڑ کے ڈاسنگ ہالوں میں تبدیل ہو جاتا ہے، ایک کمرہ، ایک تصویر اور ٹیلی ویژن سکرین پر اپنی ایک جھلک پھیلنے پھیلنے پوری دنیا کے ٹیلی ویژنوں اور پوری دنیا کے اخباروں تک پہنچ جاتی ہے، ایک خوبصورت، توانا اور گرم جوش عورت کی خواہش چند ماہ میں حرم بن جاتی ہے اور چند ڈالر دیکھتے ہی دیکھتے ملین اور ٹریلین بن جاتے ہیں اور اس کے بعد انسان دنیا کے تمام نوٹوں پر اپنی تصویر چھپوانے کی خواہش میں مبتلا ہو جاتا ہے، کسی ایک گستاخ کو گستاخی کی سزا سنانے کی خواہش پھیلنے پھیلنے پھانسی گھاٹ بن جاتی ہے اور انسان پورے ملک کو پھانسی لگا کر بھی مطمئن نہیں ہوتا، انسان صرف بال بٹانے یا شیو کرنے کے لئے شیشے کے سامنے کھڑا ہوتا ہے، لیکن پھر خود کو دیکھنے کی خواہش پوری زندگی پر محیط ہو جاتی ہے، انسان مایک پر ایک بھوک مارتا ہے اور اس کے بعد بولنے کی خواہش کا غلام بن جاتا ہے وہ پوری زندگی مایک سے چپک کر گزار دیتا ہے اور انسان چاروں کے لئے اقتدار میں آتا ہے لیکن وہ باہر ہو یا اورنگ زیب آخری سانس تک اقتدار سے لٹکا رہتا ہے چنانچہ خواہش ایک ایسا کنگول ہے جو کبھی نہیں بھرتا ہے، جو کبھی لبالب نہیں ہوتا، وہ رک گئے۔

میں نے ہنس کر عرض کیا ”حضور خواہش دنیا کی سب سے بڑی طاقت بھی ہے اگر انسان کے باطن میں خواہشیں جنم نہ لیں تو شاید دنیا میں کوئی شخص آگے نہ بڑھتا، ایک غلام صدیوں تک غلام، ایک جاہل صدیوں تک جاہل اور ایک مظلوم صدیوں تک مظلوم رہتا، یہ خواہش ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہم سوچتے ہیں، اگر ایڈی سن بلب بنا سکتا ہے تو میں کیوں نہیں بنا سکتا، اگر رائٹ برادرز جہاز بنا سکتے ہیں تو میں کیوں نہیں بنا سکتا اور اگر ٹیٹس دس ہائی بارہ فٹ کے ایک کمرے کی کھنی کو دنیا کی امیر ترین کارپوریشن بنا سکتا ہے تو میں مائیکروسافٹ کیوں نہیں بنا سکتا، حضور یہ ہمارے سارے ”کیوں“ ہماری خواہش کی جڑوں میں جنم لیتے ہیں اور یہ آنے والی زندگی میں ایسی ڈرامائیٹک فورس بن جاتے ہیں جو شروع میں انسان کو آگے لے جاتی ہے اور اس کے بعد پورے معاشرے کو ترقی اور خوشحالی کی شکل دے دیتی ہے، اگر انسان خواہشوں کو گناہ سمجھتا تو آج دنیا میں بلب ہوتا اور نہ ہی ریل گاڑی، اگر انسان قناعت کو زندگی کا مقصد بنا لیتا تو ہم آج تک غار میں ہوتے اور جم پر پتے باندھ کر زندگی گزارتے، وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے، میں نے عرض کیا ”حضور آج ہم انسان بن چکے ہیں، ہم خود کو خدا قرار دیتے ہیں۔“

خوشبوئیں نظر آتی ہیں یہ سب انسانی خواہشوں کی پیداوار ہیں اور آج ہمیں دنیا میں جتنی آزادی اور جتنے حقوق نظر آتے ہیں ان سب نے خواہشوں کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ اگر انسان اپنی غربت اور اپنی بیماری کو اپنا مقدر سمجھ لے اور خواہش کو زندگی سے خارج کر دے تو آپ یقین کیجئے وہ زندگی میں کبھی صحت مند اور خوشحال نہ ہو سکے۔ ایک غلام غلامی میں زندگی گزار دے اور ایک مزدور اینٹیں ڈھوتا ہوا فوت ہو جائے یہ خواہش ہوتی ہے جو مزدور کو ٹھیکیدار اور غلام کو آزاد بناتی ہے۔ وہ خاموشی سے سینے رہے میں نے عرض کیا "امید ہمیشہ خواہش کے وجود سے جنم لیتی ہے۔" اگر خواہش نہ ہو تو دنیا سے امید ختم ہو جائے۔ میں نے عرض کیا دنیا میں دو قسم کی خواہشیں ہوتی ہیں، نیک خواہشیں اور بد خواہشیں۔ نیک خواہشوں اور بد خواہشوں میں صرف نیت کا فرق ہوتا ہے مثلاً "دولت کی خواہش قارون میں بھی تھی اور حضرت رابعہ بصری بھی اللہ تعالیٰ سے خزانے طلب کرتی تھیں لیکن ان دونوں کی خواہش میں فرق تھا۔ قارون دنیا کا امیر ترین شخص کہلانے کے لئے دولت جمع کر رہا تھا جبکہ حضرت رابعہ بصری دنیا کے تمام غریبوں کو غربت سے نکالنے کے لئے دولت مانگ رہی تھیں لہذا ایک کی خواہش کھکول بن گئی اور دوسرے کی خواہش اسے قطب کے درجے تک لے گئی۔" یہ صرف نیت کا فرق تھا جس نے قارون کو قارون اور رابعہ بصری کو رابعہ بصری بنایا۔ دنیا میں جھولی پھیلا نا مہیوب سمجھا جاتا ہے لیکن جب سرسید احمد خان نے علی گڑھ یونیورسٹی کے لئے بازار حسن میں جھولی پھیلائی تو وہ معزز شخص کہلانے اسی طرح آج جب عبدالستار رایدہ می کراچی کی گلیوں میں جھولی پھیلاتا ہے تو لوگ آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ چومتے ہیں یہ کیا ہے؟ یہ خواہش کی نیت کا فرق ہے۔ میں رکا اور ان سے عرض کیا "خواہشیں بری نہیں ہوتیں خواہشوں کی نیتیں اچھی اور بری ہوتی ہیں یہ ہماری نیت ہے جو ہماری خواہش کو کھکول کی شکل دیتی یا اسے عبادت بنا دیتی ہے۔"

میں نے ان سے عرض کیا "خواہش امید ہوتی ہے اور امید دنیا کی سب سے بڑی عبادت ہوتی ہے۔"





## ہم سب نمکین ہو جائیں

رانا اکرام ربانی صاحب پرانے سیاستدان ہیں وہ پنجاب میں وزیر رہے۔ انہوں نے 2002ء میں انکیشن لڑا وہ یہ انکیشن جیت سکتے تھے لیکن اپنی انا کے ہاتھوں ہار گئے وہ آج کل فراغت کے دن گزار رہے ہیں چند ماہ پہلے شادی کی ایک تقریب میں میری ان کے ساتھ ملاقات ہو گئی میزبان نے تعارف کی کوشش کی مگر میں نے آگے بڑھ کر رانا صاحب کا ہاتھ تمام لیا اور عرض کیا میں رانا صاحب کو نہ صرف جانتا ہوں بلکہ دل سے ان کی قدر بھی کرتا ہوں۔ ان کا تعلق ان چند سیاستدانوں سے ہے جنہوں نے اصول پر سمجھوتہ نہیں کیا جنہوں نے ہمیشہ ایمانداری، خلوص اور یک جہتی کو ذرا راہ بنائے رکھا جنہوں نے ہر دور میں سیاست کو کچھ نہ کچھ یا اس سے کبھی وصولی کی کوشش نہیں کی۔ رانا صاحب نے میرا شکریہ ادا کیا اور ہم دونوں ایک کونے میں بیٹھ گئے رانا صاحب اپنا سیاسی اتار چڑھاؤ بتانے لگے۔ انہوں نے بتایا انہوں نے سیاست کیسے شروع کی انکیشن کیسے لڑے کیسے وزیر بنے رشوت اور لوٹ کھسوٹ سے بچنے کے لئے انہیں کون کون سے پاپڑ پیٹنے پڑے انہیں انکیشن میں کیسے ہرایا گیا اور آخر میں انہوں نے پارٹی کیسے چھوڑی وغیرہ۔ میں نے ایک بار پھر ان کی ایمانداری کی تعریف کی انہوں نے تڑپ کر میری طرف دیکھا اور ٹھٹھے ٹھار لہجے میں بولے ”میں آج اپنی اس ایمانداری اس اصول پسندی اور اس سیاسی اخلاص پر شرمندہ ہوں“ میں نے انہیں حیرت سے دیکھا وہ گویا ہوئے ”تجربے اور وقت نے ثابت کیا اس ملک میں جن لوگوں نے کچھ کمالیاد ہی صحیح رہے اور جنہوں نے یہ موقع کھو دیا وہ بچھڑاتے رہے مجھے دیکھ لو مجھے اس ایمانداری کا کیا صلہ ملا آج میرے ہاتھ میں سیاست ہے اور نہ ہی مال۔“ ہم دیر تک اس شرمندگی اس بچھڑتاوے پر گفتگو کرتے رہے رانا صاحب نے بیسیوں مثالیں دیں انہوں نے مجھے ایسے بیسیوں لوگوں کی مثال دی جو خالی ہاتھ سیاست میں آئے تھے لیکن انہوں نے وقت اور موقع سے فائدہ اٹھایا وہ فرش سے عرش پر جا پہنچے اور آج ہمیشہ کر رہے ہیں۔ احتساب کے درجنوں جگہ بنے ان کے خلاف کیس اور ریفرنس بھی دائر ہوئے لیکن ان لوگوں کو کوئی فرق نہ پڑا۔ ان میں سے کچھ نے دے دلا کر جان چھڑائی چند ایک حضرات قانون کے مورچے میں پناہ گزین ہو گئے اور جو باقی بچ گئے انہوں نے وفاداریاں بدل کر جان اور مال دونوں بچائے، پیچھے رہ گئے رانا صاحب جیسے

”بے وقوف“ تو ان کا دامن خالی تھا اور خالی ہے وہ گھاٹ کے رہے اور نہ ہی انہیں کمر نصیب ہوا۔

رانا صاحب تو وہاں سے اٹھ کر چلے گئے لیکن اپنے پیچھے سوچ کی ایک سنگتی بوٹی لمبی ٹیکر چھوڑ گئے اور میں وہ تک ان کے تھیس پر غور کرتا رہا۔ مجھے خواجہ صاحب یاد آ گئے ’خواجہ صاحب ایک ریٹائر ہو کر ریٹ تھے وہ پاکستان کے تمام کلیدی عہدوں پر فائز رہے تھے لیکن انہوں نے ایمان اور ایمانداری کو ہاتھ سے نہ جانے دیا لہذا جب ریٹائر ہوئے تو ان کے پاس سر چھپانے کے لئے چھت تک نہیں تھی جو بیس انداز کیا تھا وہ کوآپریٹو بینک کے اراکین انہوں نے باقی زندگی پنشن اور دکھ میں گزار دی، روز صبح ان کی آنکھ بیوی کے طعنوں اور اولاد کے شکوؤں سے کھلتی تھی اور حالات کے بوجھ اور ضروریات کی گرانی تلے بند ہوتی تھی ’خواجہ صاحب نے بھی آخری زندگی بچھتاوے میں گزار دی‘ وہ بھی کہا کرتے تھے ”نیکی بندے کو وہاں کرنی چاہئے جہاں نیکی کی کوئی قدرت ہو“ جس معاشرے میں ایمانداری کا دوسرا نام بے وقوفی ہو وہاں ایمانداری سے پرہیز لازم ہے۔“ یہ رانا صاحب ہوں یا خواجہ صاحب ہمارے معاشرے میں ایسے سنگٹروں کو وار بکھرے پڑے ہیں۔ ہم سب کی زندگی میں کوئی نہ کوئی خواجہ صاحب کوئی نہ کوئی رانا صاحب موجود ہیں۔ یہ لوگ پہلے اکثریت میں ہوتے تھے لیکن اب اقلیت کی شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں ہمارا ہر آنے والا دن ایسے لوگوں کی نعشوں پر طلوع ہو رہا ہے جو کبھی خمیر کو عدالت سمجھتے تھے جو یہ سوچتے تھے دنیا عارضی کھیل ہے اور اس کھیل میں سب کچھ ہار دینا بے وقوفی ہوگا اور جو یہ کہتے تھے ”اہل بیتان سے بڑی کوئی دولت اور چٹائی سے بڑی کوئی طاقت نہیں“ انہوں نے وہ لوگ آج اس معاشرے سے سہلے جا رہے ہیں۔ یہ معاشرہ یہ ملک ان لوگوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے میں سوچتا ہوں زندہ ملک اور تابندہ معاشرے ایسے لوگوں کی حفاظت کے لئے کتنے جتن کرتے ہیں لیکن ہماری نظروں کے سامنے ایسے لوگ معدوم ہوتے جا رہے ہیں مگر ہم خاموشی سے تماشا دیکھ رہے ہیں۔

مجھے جاپان یاد آ گیا۔ جاپان میں زمین نہیں ہے لہذا وہاں سبزہ اور ہریالی بھی نہیں لیکن جاپانیوں نے ایک عجیب عادت پال رکھی ہے انہیں گھر دکان یا دفتر کا جو کتنا خالی ملتا ہے وہ اس میں بیج بو دیتے ہیں وہاں پودا لگا دیتے ہیں لہذا جاپان دنیا کا واحد ملک ہے جس میں آپ کو گھلوں میں سبزی ملتی ہے میں نے ایک جاپانی سے جب دریافت کی تو اس نے ہنس کر جواب دیا ”ہم جانتے ہیں ہمارے ملک میں ہریالی کم ہے لہذا ہم ہریالی بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں ہم سبزیاں در آمد کرتے ہیں لہذا ہم کوشش کرتے ہیں ہم ایک لمباڑا ایک آلو اور مٹر کی چند پھلیاں ہی سہی لیکن کچھ تو اپنا لگائیں“ کچھ تو اپنا کھائیں۔“ میں نے سوچا ہمارے ملک میں بھی ایمانداری، خلوص اور وفاداری کم ہے لہذا ہمیں بھی جاپانیوں کی طرح گھروں، دکانوں اور دفاتروں میں اس کے بیج بونے چاہئیں۔ ہمیں بھی گھلوں میں اس کی پیڑیاں لگانی چاہئیں ش۔ ہمارے سامنے جو لوگ بچھتاوے کی سڑک پر قدم رکھ رہے ہیں ہم کم از کم ان کا حوصلہ تو بڑھا سکتے ہیں ہم ان کو عزت تو دے سکتے ہیں ہم ان کی نیکی ان کی ایمانداری کا اعتراف تو کر سکتے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں انہوں کی پڑ پڑاتی لو بیانیے کے لئے اپنے ہاتھ جلا بیٹھتے ہیں

نہ۔ ہم کیسے لوگ ہیں ہمارے سامنے زندگی کے بھانپڑ میں برف کاشت ہو رہی ہے لیکن ہم خاموشی سے قماشاد کچھ رہے ہیں۔

کوئی شخص درخت کاٹ رہا تھا کسی راہ گیر نے احتجاج کیا تو درخت کاٹنے والے نے کلبھاڑی کندھے پر رکھ کر پوچھا ”یہ سڑک یہ درخت تمہارا ہے“ راہ گیر نے جواب دیا ”نہیں لیکن میں یہاں سے روز گزرتا ہوں“ مجھے معلوم ہے دس سال بعد میرا بیٹا بھی یہاں سے گزرے گا۔ اگر آج میں احتجاج نہیں کروں گا، اگر میں آج اس درخت کو کٹنے سے نہیں بچاؤں گا تو کل میرے بیٹے کو تکلیف ہوگی یہ سڑک اس کے لئے جہنم بن جائے گی۔“ یقین کیجئے اگر ہم نے بھی ایمان اور نیکی کے ان چراغوں کی حفاظت نہ کی تو ہماری اولاد نیکی اور ایمان کے لفظ تک بھول جائے گی اور یہ ملک ”کاسیاب“ لوگوں کا ملک اور یہ معاشرہ موقع سے فائدہ اٹھانے والے لوگوں کا معاشرہ بن کر رہ جائے گا میرے پاس چند روز پہلے کراچی کے سابق ناظم نعمت اللہ خان صاحب تشریف لائے تھے انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا ”ہم لوگ ایماندار لوگوں کو کیسے بچا سکتے ہیں“ میں نے جواب دیا ”حوصلہ افزائی“ وہ بولے ”وہ کیسے“ میں نے عرض کیا ”ہم لوگ اپنے ایماندار لوگوں سے ملیں، ان کی تعریف کریں، انہیں تقریبات میں خصوصی جگہ دیں اور لوگوں سے ان کا اچھا تعارف کرائیں، ان کی آل اولاد کی حوصلہ افزائی کریں اور اگر یہ لوگ معاشی ضروریات سے مجبور ہو کر کوئی کاروبار کریں تو ہم ان سے سودا خریدیں، ہماری یہ حوصلہ افزائی نہ صرف ان لوگوں کے ارادے کو مضبوط بنائے گی بلکہ ان کی عزت افزائی کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کو بھی حوصلہ ہوگا اور وہ بھی ایماندار ہونے کی کوشش کریں گے یوں معاشرے میں نیکی قائم رہے گی“ خان صاحب نے تائید فرمائی، میں نے ان سے عرض کیا ”فضلوں کو بچانے کیلئے کمیٹیوں کے گرد باز لگانا پڑتی ہے، ہماری حوصلہ افزائی برائی اور اچھائی کے درمیان باز ہوتی ہے اگر ہم آج یہ باز نہیں لگائیں گے تو کل کو دیرانے اور کمیت میں کوئی فرق نہیں رہے گا، کل کو کان کا نمک پیٹھے پائوں کو بھی کھارا بنادے گا اور ہم سب ٹھیکین ہو جائیں گے۔“





## غلاموں کے غلام

گاؤ قادر اول دنیا کا پہلا شخص تھا جس نے جرائم کو سائنسی بنیادیں فراہم کیں وہ ریاست کے اندر ریاست اور اندر در اندر جیسی اصطلاحوں کا بھی بانی تھا اس نے باقاعدہ ایسے ادارے بنائے جن میں مجرموں کو جرائم کی تربیت دی جاتی تھی اس نے مجرموں کا ایک بین الاقوامی نیٹ ورک بھی تشکیل دیا اس کے بارے میں کہا جاتا تھا وہ ٹیلی فون کی تختی بجنے سے پہلے دنیا کے ہر کونے میں پہنچ جاتا تھا اس نے نشیات اسلحہ اور جعلی دستاویزات کی تیاری کیلئے باقاعدہ لیبارٹریاں بنائیں اور ان لیبارٹریز کو جرائم کے نئے نئے طریقے دریافت کرنے پر لگا دیا اس نے قاتلانہ حملوں کے چار عالمی سکواڈ بنائے اور ان سکواڈز میں ایسے ایسے سنگدل اور خوفناک لوگ بھرتی کیے گئے جو لوگوں کو قتل کرنے کے بعد ان کے خون سے ہاتھ اور منہ دھوتے تھے چنانچہ دنیا میں ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب دنیا کے بڑے بڑے حکمران گاؤ قادر کے نام سے گھبراتے تھے اور گاؤ قادر ایک بوجہ خوف کی ایک آمدنی اور مرگوں کے اندر اتر جانے والا ایک ڈرین گیا۔

گاؤ قادر کی شروعات بہت دلچسپ تھی وہ ایک چھوٹا سا مجرم تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اسے قیادت کی بے تہا شہ صلاحیتوں سے نوازا رکھا تھا وہ گروپ اور ریگٹ بنانے کا ماہر تھا وہ دہشت گردی انسان تھا لہذا وہ ہمیشہ دس بیس برس آگے کی بات سوچتا تھا اس نے 1934ء میں ایک دلچسپ منصوبہ بنایا اس نے چند یونیورسٹی پروفیسرز اور ریٹائر سیاستدان کی خدمات حاصل کیں پروفیسروں نے اٹلی کی تمام مختلف یونیورسٹیوں کا دورہ کیا اور گاؤ قادر کو تمام باصلاحیت طالب علموں کی فہرٹیں بنا دیں اور بزرگ سیاستدان نے اسے ان تمام لوگوں کے نام اور پتے فراہم کر دیے جو مستقبل قریب میں بڑے سیاستدان ثابت ہو سکتے تھے گاؤ قادر نے ان تمام طالب علموں اور سیاستدانوں کی مالی اور سماجی معاونت شروع کر دی اس نے ان تمام طالب علموں کو وظائف دیئے انہیں امریکہ اور برطانیہ کی اعلیٰ یونیورسٹیوں میں تعلیم دلوائی اور اس کے بعد انہیں اٹلی کے بڑے بڑے سرکاری انیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں میں بھرتی کرادیا اس نے چھوٹے چھوٹے سیاستدانوں کی پشت پناہی کی اور انہیں سیاست کے مرکزی دھارے میں داخل کرادیا اس نے قانون دان جمع کیے اور ان میں سے بے شمار وکیلوں کو بیچ بیخودیا اس نے اپنے

بائٹ کے لوگوں کو سفیر مشیر اور وزیر بنوایا اس نے اپنے لوگوں کو صنعت کار، تاجر اور بروکر بنوایا اور اس نے اپنے لوگوں کو بینکار اور ماہر معیشت بنوایا یہ تمام لوگ ابتدا میں اٹلی اور اس کے بعد پورے یورپ میں پھیل گئے اور انہوں نے آگے چل کر بے شمار ملکوں کی معیشت اور سیاست اپنے ہاتھ میں لے لی گاڑ گاڑ دوم نے اپنے والد کے سلیے کو امریکہ لاطینی امریکہ اور مغربی یورپ تک پھیلا دیا اور اس نے آدمی دنیا کو اپنے دائرے میں لے لیا ایک وقت ایسا تھا جب گاڑ گاڑ کے حکم سے پورے یورپ کے قوانین بدل جاتے تھے اور وہ شخص حقیقتاً دنیا پر حکومت کرتا تھا اور دنیا میں جس شخص نے گاڑ گاڑ کے خلاف رپٹ لکھنی ہوتی تھی وہ گاڑ گاڑ کا ہر کارہ لکھتا تھا جس نے اس رپٹ پر دستخط کرنے ہوتے تھے جس نے مہر لگانی ہوتی تھی جس نے اس کی گرفتاری کا حکم جاری کرتا ہوتا تھا جس نے چھاپہ مارنا ہوتا تھا جس نے اسے عدالت میں پیش کرتا ہوتا تھا جس وکیل نے اس کے خلاف الزامات لگانے ہوتے تھے جس سیاست دان نے اس کے خلاف قانون بنانا ہوتا تھا اور جس وزیر جس وزیر اعظم نے اس کے خلاف پریس کانفرنس کرتی ہوتی تھی وہ بھی اس کے "پے رول" پر ہوتا تھا وہ بھی اپنی ہر صبح کا آغاز گاڑ گاڑ کے پاؤں چوک کر کرتا تھا چنانچہ وہ دنیا کے اختیار اور اقتدار کی نسوں میں اتر گیا تھا اور وہ دنیا کا حقیقی بادشاہ سمجھا جاتا تھا۔

1973ء میں امریکہ نے گاڑ گاڑ کے اس سسٹم کو "اون" کر لیا اور اسے اپنی خارجہ پالیسی بنا لیا۔ گاڑ گاڑ کا سسٹم امریکہ تک کیسے پہنچا اس کیلئے ہمیں دو مقام جنگ کا مطالعہ کرنا پڑے گا 6 مارچ 1965ء میں ویتنام کی سرزمین پر امریکہ کا پہلا فوجی اتر آیا یہ جنگ 8 برس جاری رہی اس جنگ میں امریکہ نے شدید مالی سیاسی اور فوجی نقصان اٹھایا اور 29 مارچ 1973ء کو امریکہ کا آخری فوجی پہا ہو کر ویتنام سے نکلا امریکہ یہ جنگ ہار گیا لیکن جنگ نے اسے گاڑ گاڑ بنا دیا امریکہ نے پہلی بار محسوس کیا وہ اسلئے اور فوج کے ذریعے پوری دنیا پر حکومت نہیں کر سکتا لہذا اگر اس نے دنیا کی واحد سپر پاور بننا ہے تو اسے گاڑ گاڑ کے فارمولے پر عمل کرنا ہوگا اسے تیسری دنیا میں یونیورسٹی کے استاد سے لے کر وزیر اعظم تک ہر عہدے پر اپنے لوگ بٹھانا ہوں گے اسے بدور کر لیں فوج عدلیہ پولیس اور سیاست دنیا کا ہر بڑا شعبہ اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا امریکہ نے سوچا اور اس کے بعد اس پر حملہ آرم شروع کر دیا اس نے تیسری دنیا کے اچھے طالب علم اٹھائے انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے دھینے دیئے انہیں یورپ اور امریکہ کی بہترین یونیورسٹیوں میں تعلیم دلائی اور اس کے بعد انہیں ان کے ممالک میں حساس عہدوں پر بٹھا دیا امریکہ نے نوجوان بدور کر میں کو اپنے ملک میں کورس کرائے اور ان کو سز کے دوران ان کی برین واشنگ کر دی اس نے فوجی افسروں کو اپنی عسکری اکیڈمیوں میں ٹریننگ دی اور انہیں امریکی بنا کر واپس بھجوا دیا اس نے قانون دانوں کو امریکی فلسفے کی ٹریننگ دے کر بھجوا دیا اس نے ٹیکس کے شعبوں میں اپنے بندے بھرتی کرادیئے اس نے انٹرنیٹ اور برنس میں اپنے لوگ ڈال دیئے اور اس نے سیاست میں اپنے حامیوں کو پہلی صف میں کھڑا کر دیا یوں صرف بیس برس میں امریکہ پوری تھرڈ ورلڈ اور آدمی سے زیادہ سیکنڈ اور فرسٹ ورلڈ کا گاڑ گاڑ بن گیا وہ دنیا کا حقیقی بادشاہ بن گیا اس نے دنیا پارک اور دانشمن میں وزراء اعظم کی جیکٹری لگائی اور دھڑا دھڑ وزیر اعظم بنا



کر تیسری دنیا انیکسپورٹ کرنا شروع کر دیئے یہ وزیراعظم چہرے مہرے حرکات و سکنات اور زبان و بیان میں مقامی لوگوں جیسے ہوتے ہیں لیکن یہ انداز سے پورے امریکی ہوتے ہیں اور یہ مقامی ملکوں میں رہ کر امریکی مفادات کی حفاظت کرتے ہیں امریکہ تیسری دنیا کو افریقہ دار میں وزراء خزانہ وزراء تجارت اور ٹیکس کے مشیر بھی فراہم کرتا ہے وہ مقامی تاجروں صنعت کاروں اور ریل سٹیٹ ٹرانسپورٹرز کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور ان لوگوں کی مدد سے تیسری دنیا کی معیشت سے کھیلتا ہے وہ سینڈیا کو بھی اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور اس کے ذریعے ملکوں کی ثقافت بدل دیتا ہے وہ تیسری دنیا کے 103 ممالک کا بجٹ بھی تیار کرتا ہے اور وہ سات سمندر پار بیٹھ کر تیسری دنیا کیلئے دالوں چینی انکھی اور پٹرول کے نرخ بھی طے کرتا ہے۔ وہ پوری تیسری دنیا سے کھیلتا ہے۔

آپ پاکستان کی مثال لیجئے اس وقت پاکستان میں تین بڑی سیاسی جماعتیں ہیں ان تینوں جماعتوں کے "وزراء خزانہ" ورلڈ بینک کے باقاعدہ ملازم ہیں آپ کو آج بتا سکتا ہوں اگر ملک میں پیپلز پارٹی کی حکومت آئی تو اس کا وزیر خزانہ کون ہوگا اور مسلم لیگ ن اور ایم ایم اے برسر اقتدار آئی تو ان کا وزیر خزانہ کون ہوگا؟ یہ تمام وزراء خزانہ ماشاء اللہ عالمی بینک اور آئی ایم ایف کے ملازم ہیں اور آج مختلف سیاسی جماعتوں کے پلیٹ فارم سے قومی اسمبلی اور سینٹ میں بیٹھے ہیں آپ سی بی آر کا جائزہ لے لیں آپ اسٹاک کوآرڈینیشن کمیٹی وزارت خزانہ وزیراعظم کے مشیروں اور صوبائی حکومتوں کے وزراء خزانہ کا پروفائل نکال کر دیکھ لیں یہ کون لوگ ہیں؟ یہ سب ماشاء اللہ گاڈ فادر کے ہر کارے ہیں اور ان سب لوگوں کا فلسفہ اور ایجنڈا ایک ہے آپ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر اب سٹاک ایکسچینج کے موجودہ بحران کا جائزہ لیں صرف ایک ہفتے میں پاکستان کی سٹاک ایکسچینج میں 10 کھرب کا گھٹلا ہوا یہ دس کھرب دس دن میں دس لاکھ لوگوں کی جیب سے نکل کر دس تاجروں کی جیب میں چلے گئے کیوں؟ یہ گاڈ فادر کی مرضی تھی دوسرا سوال سٹاک ایکسچینج کا یہ بحران پچھلے ماہ سے متوقع تھا اس بحران کی طرف بار بار وزیراعظم کی توجہ مبذول کرائی گئی لیکن انہوں نے فنانس کمیشن کا اجلاس نہیں ہونے دیا کیوں؟ کیونکہ گاڈ فادر کی مرضی تھی یہ پیشنگ نہ ہو اور گاڈ فادر اس بحران کے ذریعے کچھ لوگوں کو نوکری سے فارغ کرانا چاہتا تھا اور کچھ نئے لوگوں کو سامنے لانا اور حکومت کو مزید سال چھ مہینے فراہم کرنا چاہتا تھا گاڈ فادر اس بحران کے ذریعے چند "فریب" لوگوں کو امیر بنانا اور کچھ لوگوں کی اقتصادی ہوانگالنا چاہتا تھا چنانچہ یہ بحران پیدا ہوا اور اگلے چند دنوں میں مزید آگے بڑھے پاکستان کی معیشت کو اگلے چھ ماہ تک اس قسم کے مزید جھٹکے کھٹکے رہیں گے۔

یہ گاڈ فادر کی مرضی ہے اور ہم سب اس کے غلاموں کے غلام ہیں۔





## کاش ہم تئلیاں ہوتے

سڑک پر رینگوں کا دریا بہہ رہا تھا ہزاروں لوگ قطار میں کھڑے ہو کر دیکھ رہے تھے اور ان کے چہروں پر سیاحوں کی حیرت اور بچوں جیسا اشتیاق تھا یہ دنیا کا انوکھا ترین نظارہ تھا پرل ریمگ کی لاکھوں تئلیاں زمین سے پانچ فٹ اوپر حیر رہی تھیں انہوں نے قطار میں بتا رکھی تھیں اور وہ ایک ترتیب سے آگے بڑھتی چلی جا رہی تھیں میں نے ٹیلی ویژن کا سوچ بند کر دیا سکرین بے رنگ ہو گئی۔

یہ تائیوان کا منظر تھا تائیوان میں ملک ویڈ (Milk Weed) نام کی تئلیاں پائی جاتی ہیں یہ تئلیاں سر دیاں تائیوان کی جنوبی وادیوں میں گزرتی ہیں لیکن جو لمبی بہار کا آغاز ہوتا ہے یہ تئلیاں لاکھوں کی تعداد میں جنوب سے شمال کی طرف سفر شروع کر دیتی ہیں یہ دنیا میں تئلیوں کی دوسری بڑی ہجرت ہوتی ہے اس قسم کی ایک نقل مکانی سر دیوں کے شروع میں شمالی امریکہ اور کینیڈا سے میکسیکو کی طرف ہوتی ہے کینیڈا سے میکسیکو جانے والی تئلیوں کا نام ”مونارچ“ ہے اور یہ بھی لاکھوں کے گروپ میں سفر کرتی ہیں تائیوان کی ملک ویڈ تئلیوں کے سفر کی تین بڑی خصوصیات ہوتی ہیں اول دس لاکھ تئلیاں روزانہ جنوب سے شمال کی طرف سفر کرتی ہیں دوم یہ قطار میں گروہوں کی شکل میں اڑتی ہیں اور موسم ان کا یہ سفر صدیوں سے جاری ہے تئلیوں کی یہ ہجرت معمول کے مطابق چل رہی تھی لیکن تائیوان کی حکومت نے 1970ء میں قری وے انجینئرنگ پیرو بنائی اور اس پیرو نے ملک کے شمالی حصے کو جنوب سے ملانے کیلئے ایک بڑی شاہراہ کی تعمیر شروع کر دی یہ شاہراہ 31 اکتوبر 1978ء کو مکمل ہو گئی لیکن جب 1979ء کا اپریل آیا تو معلوم ہوا قطعی سے ”قری وے“ کی تین نمبر سڑک تئلیوں کے روٹ پر بنادی گئی اور اس سال جب تئلیوں نے سفر شروع کیا تو وہ دھڑا دھڑا ٹریفک حادثوں کا شکار ہونے لگیں تئلیاں اپنے نرم پروں اور کمزور سانس کی وجہ سے زیادہ بلندی پر نہیں اڑ سکتیں لہذا ان کی پرواز اور گاڑیوں کی اونچائی میں زیادہ فرق نہیں ہوتا لہذا تئلیاں جب سفر پر روانہ ہوتی ہیں تو یہ گاڑیوں سے ٹکرانے لگتی ہیں اور موقع پر ہلاک ہو جاتی ہیں چنانچہ اس سال لاکھوں تئلیاں راستے میں مر گئیں اور اس کے بعد یہ معمول بن گیا جو نجی اپریل شروع ہوتا تئلیاں سفر کیلئے نکلتیں اور مرنے چلی جاتیں 2005ء میں تائیوان کی ایک این جی او نے نیشنل جیو گرافک مجیکل کے ساتھ مل

کمرسروے کیا تو پتہ چلا ایک منٹ میں گیارہ ہزار پانچ سو تھپیاں اس سڑک پر سفر کرتی ہیں جبکہ پورے دن میں ایک ملین تھپیاں اس سڑک پر پہنچتی ہیں لیکن ان میں سے صرف ایک لاکھ تھپیاں ٹھالی وادیوں میں پہنچ پاتی ہیں 9 لاکھ تھپیاں راستے ہی میں دم توڑ جاتی ہیں 'تائیوان کے لوگوں' حکومت اور غیر سرکاری تنظیموں کیلئے یہ اعداد و شمار انتہائی افسوسناک تھے چنانچہ حکومت نے 2006ء میں اس کا بڑا دلچسپ حل نکالا اس نے فری وے کی لین نمبر تین پر میلوں لمبا جال لگا دیا یہ جال سڑک کے شروع میں نیچے اور آگے چل کر نیچا اوٹھا تھا جال لگانے کا مقصد یہ تھا کہ جب تھپیاں سفر پر روانہ ہوں تو وہ جال کے اوپر چلی جائیں اور حادثے سے بچ جائیں یہ تکنیک بڑی حد تک کامیاب ہوئی اور 2006ء میں تھپیوں کی ہلاکت میں کمی واقع ہوئی لیکن اس کے باوجود ہزاروں تھپیاں جال کے اندر آ جاتی تھیں اور سامنے سے آنے والی ٹریک کا شکار ہو جاتی تھیں 2007ء میں حکومت نے دو کام کئے اس نے جال بھی لگا دیا اور فری وے کی لین نمبر 3 ٹریک کیلئے بھی بند کر دی یہ لین نمبر 3 اپریل سے 29 اپریل تک بند رہی چنانچہ پچھلے 25 برسوں میں پہلی بار تھپیوں نے ہر قسم کے خطرے سے آزاد ہو کر سفر کیا یہ منظر دیکھنے کیلئے روزانہ ہزاروں لوگ فری وے پر جمع ہو گئے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے زمین سے پانچ فٹ اوپر رنگوں کا دریا بہتا ہوا دیکھا میں نے یہ منظر تائیوان کے ایک ٹیلی ویژن چینل پر دیکھا ٹیلی ویژن کا مبصر کہہ رہا تھا "یہ تھپیاں بھی اتنی ہی شہری ہیں جتنے تائیوان کے دوسرے لوگ اگر ہمیں اس معاشرے میں پورے حقوق کے ساتھ زندہ رہنے کا حق ہے تو ان تھپیوں کو بھی اتنے ہی حقوق حاصل ہیں" مبصر نے مزید کہا انسان کو دوسری مخلوقات کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق رکھنا چاہیے خواہ یہ مخلوق تھپیاں ہی کیوں نہ ہوں"

میں نے تائیوان کی "ملک وید" تھپیوں کی داستان سنی تو مجھے محسوس ہوا ایک طرف تائیوان کے لوگ ہیں جو تھپیوں کیلئے بھی انسانوں سے بلکہ کرسو پتے ہیں جبکہ دوسری طرف ہم لوگ ہیں جن کے پاس انسانوں کیلئے سو پتے کا وقت نہیں میں نے سوچا چیف جسٹس آف پاکستان افتخار محمد چودھری کا کیا تصور تھا؟ کیا وہ قانون کے دائرے میں رہ کر کام نہیں کر رہے تھے چیف جسٹس کا کام لوگوں کو انصاف دینا ہوتا ہے اور یہ شخص کسی سوسائٹیاکشن اور کسی جمہوریت کے ذریعے لوگوں کو انصاف دے رہا تھا صدر نے اس کے خلاف اپنا آئینی اختیار استعمال کیا تو یہ شخص اپنی صفائی کیلئے سپریم کورٹ جانے لگا کیا اس ملک میں کسی شخص کو اپنی صفائی پیش کرنے کا حق نہیں؟ یہ شخص جب انصاف کیلئے نکلا تو سب سے پہلے دھکا دیا اس کے گرد جمع ہوئے حکومت کو دھکا دیا یہ حرأت پسند نہ آئی سوال یہ ہے کیا وہ کیلوں کو کسی شخص کا ساتھ دینے کا حق حاصل نہیں؟ یہ شخص دوروں پر روانہ ہوا تو لوگ دیوانہ وار سڑکوں پر نکل آئے لوگوں نے اس کے ہاتھ اس کی گاڑی اور اس کے کپڑے چومنا شروع کر دیئے کیا اس ملک کے لوگوں کو کسی شخص کے حق میں نعرے لگانے اس کیلئے سڑکوں پر نکلنے اور کسی شخص کے ہاتھ چومنے کا حق حاصل نہیں اور پھر اس شخص نے 12 مئی 2007ء کو کراچی بار سے خطاب کا اعلان کیا تو کراچی شہر کو ایک دن کیلئے غنڈوں بد معاشوں اور قاتلوں کے حوالے کر دیا گیا یہ لوگ دن بھر رنجرز کی گاڑیوں کے پیچھے پیادے لے کر گولی چلاتے رہے اور اس



فائرنگ کے نتیجے میں 34 معصوم انسان جاں بحق اور ڈیڑھ سو زخمی ہو گئے اس دن صورتحال یہ تھی نفیس سڑکوں پر پڑی تھیں اور انہیں اٹھانے والا کوئی نہیں تھا سوال یہ ہے کراچی کے لوگوں کو کس جرم کی سزا دی گئی؟ کیا اس ملک میں چیف جسٹس کا استقبال کرنا جرم ہے؟ کیا وہ تمام لوگ مجرم ہیں جو چیف جسٹس کو مظلوم اور بے گناہ سمجھتے ہیں اور ان کی بحالی کے خواہاں ہیں؟ لوگوں نے ایم کیو ایم کو اس قتل و غارت گری کا ذمہ دار قرار دیا اخبارات کے فوٹو گرافروں اور ٹیلی ویژن چینلوں کے کمرہ بینوں کے پاس فائرنگ کرنے والوں کی تصاویر موجود تھیں ہزاروں لاکھوں لوگوں نے اپنی نظروں سے ٹیلی ویژن سکرین پر ان لوگوں کو گولی چلاتے ہوئے بھی دیکھا لیکن حکومت نے ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی کی اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی پرچہ درج ہوا سوال یہ ہے اگر کوئی شخص حکومت کی "محبت" میں بے گناہ لوگوں کو قتل کر دے تو کیا یہ جرم جرم نہیں رہتا!! لوگوں نے جب با آواز بلند ایم کیو ایم کے خلاف احتساب کے مطالبے کیے تو صدر صاحب نے ایم کیو ایم ہماری اتحادی اور محبت وطن ہے کا دعویٰ فرما کر یہ مطالبے مسترد کر دیئے سوال یہ ہے کیا اتحادیوں کیلئے اس ملک میں کوئی قانون کوئی ضابطہ اخلاق نہیں اور آخر میں میڈیا کی باری آتی ہے میڈیا نے 12 مئی کو بڑی جرأت اور پروڈیشنل ازم کا مظاہرہ کیا میرے دوست طلعت حسین نے جان پر کھیل کر ساری صورتحال عوام کے سامنے رکھ دی ان پر گولیاں برتی رہیں لیکن وہ کبھی بیٹھ کر اور کبھی لیٹ کر کوریج کرتے رہے لیکن حکومت نے اس پروڈیشنل ازم کو تخریب کاری قرار دیا صدر صاحب نے فرمایا "اگر میڈیا نے اپنی منفی سرگرمیاں بند نہ کیں تو میں سختی کروں گا" سوال پیدا ہوتا ہے کیا اصلی خبر لوگوں تک پہنچانا منفی سرگرمی ہے اور کیا اس ملک میں پروڈیشنل ازم جرم ہے؟ ہم مانیں یا نہ مانیں لیکن یہ حقیقت ہے 12 مئی اس ملک کے ہاشور لوگوں کیلئے بے شمار سوال چھوڑ گیا ہے اور ان تمام سوالوں کا صرف ایک ہی جواب ہے "طاقت" اس ملک میں قانون ضابطہ اور اخلاقیات صرف محروم اور کمزور لوگوں کیلئے ہے جبکہ اس ملک کا ہر طاقتور شخص اور اس طاقتور شخص کے دوست 'خوادی اور اتحادی ہر قسم کے قانون اور ضابطے سے مبرا ہیں ان لوگوں کا اس ملک میں کوئی خدا نہیں۔

میں نے تائیوان کی تیلیوں کا قحطی پاکستان کے لوگوں سے کیا تو میرے دل سے آہ نکلی اور میں نے سوچا کاش ہم سولہ کروڑ لوگ تائیوان کی تیلیاں ہوتے کاش ہم لوگ حشرات الارض ہوتے اور کسی غیر اسلامی ملک کی زمین پر ریگ رہے ہوتے تو آج دنیا میں ہمارے حقوق بھی ہوتے ہمیں بھی زندہ رہنے سانس لینے اور نعرہ لگانے کی آزادی ہوتی آج ہم لوگ یوں حکومت کے اتحادیوں کے ہاتھوں سڑکوں پر نہ مارے جاتے۔





## صرف حاضری لگوانے کے لیے

”مرزا صاحب ادھر کھڑے ہیں، میں حاضری لگوا کر آتا ہوں“ میرا دوست مرزا صاحب کی طرف چل پڑا اور میں گروڈیش کا جائزہ لینے لگا، قبرستان میں ڈیڑھ دو ہزار لوگ تھے، میت قبر کے سر ہانے پڑی تھی، مولوی صاحب تہ فین کیلئے ہدایات دے رہے تھے اور لوگ مختلف ٹولیوں میں کھڑے ہو کر سگریٹ پی رہے تھے، جمائیاں لے رہے تھے یا پھر مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے مرزا صاحب کے گرد سب سے زیادہ رش تھا، لوگ ان کے پاس جاتے تھے، ان سے ہاتھ ملا تھے، ”بہت افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ آپ کو مہر دے“ جیسا روایتی فقرہ بولتے تھے اور آگے نکل جاتے تھے، میں تمام ٹولیوں کا جائزہ لینے لگا، زیادہ تر لوگ غیر فعال چیف جسٹس، پانوں کی قیمتوں اور بینظیر بھٹو کی ذیل پر گفتگو کر رہے تھے، ایک دو حضرات مرزا صاحب کی غیبت میں بھی مصروف تھے جبکہ چند لوگ پاکستانی قبرستانوں کا پور پی قبرستانوں سے تعلق کر رہے تھے، وہ پور پی قبرستانوں کی صفائی، خوبصورتی اور ترتیب کی تعریف کرتے تھے اور حسرت سے کہتے تھے کاش مرحوم کا نام بہری یا قلب ہوتا اور اس کا انتقال یورپ میں ہوتا تو وہ آج آسودہ حال مردہ ہوتا، کچھ لوگ آگے پیچھے دیکھ کر تہقیر لگا رہے تھے، چند زندہ دل ایک دوسرے کو تازہ ترین لپٹے سنا رہے تھے جبکہ نوے فیصد لوگوں کے موبائل بج رہے تھے۔ مرزا صاحب سو گواروں کے اس جھوم میں گھرے تھے اور وقتے وقتے سے اپنے مرحوم بھائی کی خوبیاں گنوا رہے تھے۔ لوگ ان کی ہر بات پر ہاں میں گردن ہلا دیتے تھے، جھوم کے درمیان چار فوٹو گرافر بھی گھوم رہے تھے، یہ فوٹو گرافر وہاں موجود ہر نامور، مشہور اور اہم شخصیت کی تصویر کھینچ رہے تھے، بعض لوگ فوٹو گرافروں سے اہم لوگوں کے ساتھ تصویر کھینچانے کی فرمائش کرتے تھے، وہ اپنی ڈائری میں اس کا ایڈریس اور ٹیلی فون لکھتے تھے اور اسے اہم شخصیت کے ساتھ کھڑا کر کے تصویر کھینچ دیتے تھے۔ قبرستان سے ذرا فاصلے پر شامیانے لگے تھے، باوردی ویٹر شامیانے میں کھانا لگا رہے تھے۔ کھانے کا انتظام شہر کی مشہور کینرنگ کھینی نے کیا تھا جبکہ دوسرے شامیانے میں دو مدرسوں کے چار سو بچے قرآن خوانی میں مصروف تھے، قبرستان میں دعا کیلئے ساؤنڈ سسٹم لگ رہا تھا، کبھی کے باوردی ورکر قبرستان کے چار کونوں میں سپیکر لگا رہے تھے جبکہ مرزا صاحب کے ملازمین نے قبرستان کے درمیان میں لکڑی کا ایک تخت بچھا دیا تھا، مولوی صاحب نے اس تخت پر کھڑے ہو کر دعا کرائی تھی، میں اس سارے انتظام کا جائزہ لے رہا تھا۔

میرا دوست واپس آگیا، وہ بہت خوش تھا، مرزا صاحب کے سامنے اس کی حاضری لگ گئی تھی، مرزا صاحب اس کے والد کے جنازے میں شریک ہوئے تھے لہذا اس نے ان کے بھائی کی تدفین میں شریک ہو کر بدلا اتار دیا تھا، وہ بار بار ہاتھ ملتا تھا اور مسکرا کر کہتا تھا ”مرزا صاحب ایک عظیم انسان ہیں، بھائی کے انتقال کے باوجود انہیں میرا کام یاد تھا انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا آپ نگر نہ کریں قل کے بعد آپ کا کام ہو جائے گا“ میرا دوست خوشی سے بار بار ہاتھ رگڑتا تھا، قبرستان کا چکر لگاتا تھا اور واپس آ کر مرزا صاحب کی یادداشت اور وسعت قلبی کی تعریف کرتا تھا، وہ خوشی میں اوپر تلے تین چار سگریٹ بھی پھونک گیا، اس نے قبرستان کا چوتھا چکر لگایا اور واپس آ کر خبر دی ”تدفین میں مزید آدھ گھنٹہ لگ جائے گا، مولوی صاحب کو قبر کے رخ پر اعتراض ہے وہ اب قبر کی چھائی کر رہے ہیں لہذا ہمیں کھسک جانا چاہیے“ میں نے آہستہ آواز میں کہا ”لوگوں کے درمیان سے ٹکنا اچھا نہیں لگتا“ اس نے آگے پیچھے دیکھا اور دہلی آواز میں بولا ”مرزا صاحب کے سامنے حاضری لگ چکی ہے اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں، ہم قبرستان کی دیوار کے ساتھ ساتھ جوتے ہوئے نکل جاتے ہیں، کسی کو پتہ نہیں چلے گا، لوگ کلب میں میرا انتظار کر رہے ہیں“ میں اس دوست کے اصرار پر وہاں آیا تھا اور میں نے اس کی گاڑی میں واپس جانا تھا چنانچہ میرے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی، ہم دونوں قبرستان کی دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے، وہاں ہمارے جیسے میں پچیس مزید بچھدار لوگ بھی موجود تھے وہ بھی ”حاضری“ لگوا چکے تھے اور انہیں بھی سردے میں اب کوئی دلچسپی نہیں تھی، ہم بھی ان کے ساتھ شامل ہو کر قبرستان سے باہر نکل گئے، ہماری گاڑی ذرا فاصلے پر کھڑی تھی، ہم نوئے ٹیوں سے ہوتے ہوئے گاڑی کی طرف چل پڑے ”میرا دوست اس دوران دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ کرنے لگا“ اس کا کہنا تھا ”ہمارے دلوں سے خوف خدا ختم ہو چکا ہے، ہم لوگ موت پر بھی ویسے جتنا کھانا پکاتے ہیں، تم مرزا صاحب کو دیکھو انہوں نے قبرستان میں کیڑے کا بندوبست کر دکھا تھا“ میرے دوست کو قبرستان میں موجود فوفو گر افروں پر بھی اعتراض تھا، اس کا کہنا تھا چند برس پہلے تک صرف شادی بیاہ کی تصویریں شائع ہوتی تھیں لیکن اب اخبارات میں جنازے، قل اور چالیسیویں کی تصویریں بھی چھپتی ہیں، کل تک صرف شادی بیاہ کے چیف گیسٹ ہوتے تھے لیکن اب جنازوں کیلئے بھی چیف گیسٹ کا بندوبست کیا جاتا ہے اس کا کہنا تھا ہمارے ملک میں اب کسی شخص کے والد بھائی یا بھتیجے کے جنازے میں جتنے وزیر، مشیر، سفیر اور کاروباری لوگ شریک ہوتے ہیں وہ شخص اتنا ہی معتبر اور با اثر سمجھا جاتا ہے، میرے دوست کا کہنا تھا لوگ کل تک اپنے بچوں اور بہن بھائیوں کی شادیوں پر نوگوں کو مدعو کیا کرتے تھے لیکن اب لوگوں نے سوگواروں اور جنازے پڑھنے والوں کی فہرٹیں بھی بنا رکھی ہیں جن میں ان کا کوئی عزیز فوت ہوتا ہے ان کا سیکرٹری یا پی ای اے لوگوں کو ٹیلی فون کرنا شروع کر دیتا ہے، سیکرٹری صاحب یا پی ای اے جنازے سے ایک آدھ گھنٹے پہلے شرکا کو ”ری کنفرم“ بھی کرتے ہیں جبکہ اس جنازے میں اگر کسی وی وی آئی پی نے شرکت کرنی ہو تو جنازے کا وقت اس شخصیت کی مصروفیات کے مطابق ”ایڈجسٹ“ کر لیا جاتا ہے، میرے دوست نے پنجاب کے ایک سیاسی خاندان کی مثال دی، ان لوگوں کا والد فوت ہو گیا تھا، اس وقت چیف منسٹر غیر ملکی دورے پر تھے چنانچہ انہوں نے والد کا جنازہ چیف منسٹر کی واپسی



تک سو خر کر دیا، وزیر اعلیٰ واپس آئے تو چیف منسٹر ہاؤس سے باقاعدہ وقت لیا گیا، جنازہ گاہ کے ساتھ ٹیلی پز بنایا گیا، چیف منسٹر صاحب جنازے سے لیٹ ہو گئے تو ان لوگوں نے شرکاکو جنازہ گاہ میں روکھنے انتظار کرایا، چیف منسٹر آئے، جنازہ پڑھایا گیا اور اس کے بعد ان لوگوں نے میت اپنے ملازموں کے حوالے کی اور خود چیف منسٹر کے ساتھ جیلے میں چلے گئے۔

میرے دوست نے ایک اور سیاسی شخصیت کی مثال بھی دی، یہ صاحب جب کسی جنازے میں شریک ہوتے ہیں تو فوٹو گرافر اور کیمرہ مین ساتھ لے کر جاتے ہیں، یہ صاحب تعزیت اور مردے کیلئے دعا کرتے ہوئے ہمیشہ اپنی تصویر بھی اترواتے ہیں اور فلم بھی بنواتے ہیں اور بعد ازاں یہ فلم ٹیلی ویژن پر چلائی جاتی ہے اور تصویریں اخبارات میں شائع ہوتی ہیں، میرے دوست کا کہنا تھا دعا کے لئے اب صدر وزیراعظم، وزیراعلیٰ اور وزراء کو بلوانا فیشن ہو چکا ہے، لوگ اب کسی کی سماجی حیثیت اور شیئس کا اندازہ اس کے گھر دعا کیلئے آنے والی شخصیات سے کرتے ہیں، اگر ان کے گھر صدر یا وزیراعظم آجائے اور ان کی آمد کی تصویر اخبارات اور ٹیلی ویژن میں چھپو پر آجائے تو لوگوں پر اس کے تعلقات کی دھاک بندھ جاتی ہے اور لوگ بڑی مدت تک تذکرہ کرتے رہتے ہیں، فلاں کے والد کے انتقال پر صدر صاحب آئے تھے اور فلاں کے گھر وزیراعظم آیا تھا، میرے دوست کا کہنا تھا لوگ اب یہ بھی مانیٹر کرتے ہیں کہ شخص کے گھر کون سی شخصیت کتنی دیر میں آئی تھی، اگر صدر یا وزیراعظم انتقال کے فوراً بعد اس شخص کے گھر پہنچ جائیں تو وہ انتہائی اہم شخص سمجھا جاتا ہے، اگر یہ حضرات دوسرے دن جائیں تو یہ لوگ کم اہم سمجھے جاتے ہیں اور اگر ایک آدھ ماہ گزرے جائے تو وہ اہم شخصیات کی فہرست میں تیسرے درجے کا اہم شخص ہوتا ہے، میرے دوست کا کہنا تھا لوگ اب صدر اور وزیراعظم کو دعا کیلئے گھر بلانے کے لئے باقاعدہ ”لائنک“ کرتے ہیں، وہ مقتدر شخصیات پر دباؤ ڈالنے کے لئے گرو پنک تک کرتے ہیں، وہ صدر صاحب کو بتاتے ہیں آپ نے فلاں شخص کی تعزیت کر کے ہماری ناک کاٹ دی تھی اور اگر آپ ہمارے گھر نہ آئے تو ہمارے لئے ووٹ لینا مشکل ہو جائے گا، یہ لوگ صدر وزیراعظم اور وزیراعلیٰ سے پیشگی وعدہ بھی لے لیتے ہیں چنانچہ یہ لوگ اس وعدے کے بعد بڑی شدت سے اپنے کسی قریبی عزیز کے انتقال کا انتظار کرتے ہیں۔ میرے دوست نے نفرت، افسوس اور بیزارگی سے سر مارا اور آخر میں تاسف سے بولا ”پتہ نہیں زمانے کو کیا ہو گیا ہے لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف ہی نہیں رہا۔“

میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا، وہ اچانک میری طرف مڑا اور اس نے مجھ سے پوچھا ”لوگ اس طرح کیوں کرتے ہیں؟“ لوگوں کو قبرستانوں، مردوں اور جنازوں میں کھڑے ہو کر بھی اللہ کا خوف کیوں نہیں آتا؟“ میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے جواب دیا ”لوگ آج کل قبرستانوں میں مردوں کیلئے نہیں جاتے، یہ جنازہ پڑھنے اور دعا کیلئے بھی نہیں جاتے، یہ فقط حاضری لگوانے اور تصویر کھینچوانے کیلئے آتے ہیں، یہ دوسروں کے دلوں میں اپنے تعلقات کی دھاک بٹھانے کیلئے آتے ہیں“ میں رکا اور دوبارہ عرض کیا ”آج کل لوگ مردوں کیلئے نہیں بلکہ زندوں کیلئے قبرستان جاتے ہیں لہذا ان کے دل خدا کے خوف سے خالی ہیں“





## ہمارے پاس بنیاد ہی نہیں

خاتون نے عجیب سوال پوچھا، اس نے پوچھا، "پاکستان کے سینئر صحافی اور کالم نگار حکومت کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے رہتے ہیں، اخبارات میں حکومت کی کرپشن، بے حسی، اختیارات سے تجاوز اور اقرباء پروری کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رہتی، حکومت ان کالموں اور ان خبروں کی تردید تک گوارا نہیں کرتی، کیوں؟" میں نے تھوڑی دیر سوچا اور اس کے بعد ان سے عرض کیا، "حکومت کے تمام اہم مسئولوں نے آنے والی زندگی میں ووٹ مانگتے ہیں اور نہ ہی الیکشن لڑنے ہیں چنانچہ لوگ حکومت کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، وہ حکمرانوں کو کس نظر، کس زاویے سے دیکھتے ہیں حکومت کو اس سے کوئی غرض نہیں" میں نے عرض کیا، "حکمرانوں اور عوام کے درمیان سب سے بڑا رشتہ ووٹ اور الیکشن ہوتے ہیں جو سیاستدان پلیٹ باکس سے ہو کر حکومت تک پہنچتے ہیں وہ اپنے امیج، وہ اپنے تاثر کے بارے میں بہت محتاط ہوتے ہیں انہیں معلوم ہوتا ہے وہ عوام کے کندھے پر بیٹھ کر ایوان تک پہنچتے ہیں اور جب تک انہیں عوامی مقبولیت حاصل رہے گی ان کے اقتدار کا سورج چمکا رہے گا چنانچہ یہ لوگ نہ صرف خبروں اور کالموں کے معاملے میں سنجیدہ ہوتے ہیں بلکہ ان کے کانوں پر جوں بھی رہتی ہے لیکن جو لوگ بھلی گلی سے ہو کر اقتدار تک پہنچتے ہیں اور جنہوں نے سامنے والے دروازے سے نکل کر امریکہ واپس لوٹ جانا ہوتا ہے انہیں عوام، اخبارات اور عوامی رائے کی کوئی پروا نہیں ہوتی، وہ عوام کے غم، غصے اور نفرت کو جوڑنے کی ٹوک پر دیکھتے ہیں اور ہماری حکومت بد قسمتی سے دوسرے گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔"

میں نے خاتون سے عرض کیا، "آپ کی بات سو فیصد درست نہیں، اس حکومت میں بھی بے شمار ایسے لوگ ہیں جو اپنے امیج کے بارے میں فکر مند ہیں، جو تردید بھی کرتے ہیں، کالم نگاروں کو حقائق بھی بتاتے ہیں اور اپنی غلطیوں کی معافی بھی مانگتے ہیں" خاتون نے حیران ہو کر پوچھا، "یہ کون لوگ ہیں؟" میں نے عرض کیا، "یہ وہ لوگ ہیں جو 2002ء کے الیکشنوں میں باقاعدہ جیت کر اسمبلی تک پہنچے تھے اور جنہوں نے 2007ء کے الیکشنوں میں ایک بار پھر عوام کے پاس جانا ہے" خاتون نے فرمایا، "آپ اپنے چھیس کی وضاحت کریں" میں نے عرض کیا، "آپ حکمران جماعت کے ایم این ایز اور سینئروں کے رویے کا تجزیہ کر لیجئے، مسلم لیگ ق کے ایم این ایز ہر عوام

دشمنِ مل پر ہنس وچیش سے کام لیتے رہے ہیں جبکہ سینئرزوں کو کسی قسم کی پروا نہیں، آپ تحفظ حقوق نسواں مل کو لے لیجئے، مسلم لیگ (ق) کے ایم این ایز کے دل میں اس مل کے بارے میں تحفظات پائے جاتے تھے یہ لوگ اس مل کی پیدائش سے لے کر منظوری تک اپنی گردن بچانے کی کوشش کرتے رہے یہ لوگ ”ایک ڈور ڈپلومیسی“ کے ذریعے مسلم لیگ (ن) اور ایم ایم اے کو اس مل کی مخالفت پر اکساتے رہے تھے، انہوں نے اس مل کے خلاف اخبارات کو بھی استعمال کیا لیکن جب حکومت نے ان ایم این ایز کو ڈنڈا دکھانا شروع کر دیا تو یہ لوگ اس ڈنڈے کے خوف سے مل منظور کرنے پر مجبور ہو گئے، چودھری شجاعت حسین، عمران جماعت کے صدور ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس مل کے معاملے میں اپنے انجی کے بارے میں متشکر ہیں، وہ مل منظور ہونے کے بعد بھی نہ صرف علماء کرام سے رائے لے رہے ہیں بلکہ وہ اپنے ملاقاتیوں سے بھی بہانے بہانے سے اپنے اور اپنی پارٹی کے انجی کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس آپ مسلم لیگ (ق) کے سینئرز کو لے لیجئے، یہ لوگ شروع دن سے اس مل کی حمایت کر رہے تھے، ان لوگوں نے آگے بڑھ بڑھ کر اس کی حمایت میں تقریریں بھی کیں اور بیانات بھی جاری کئے، اس مل کی منظوری کے بعد وزیراعظم شوکت عزیز اور ہمارے وزیر اطلاعات و نشریات جناب محمد علی درانی مل کے سب سے بڑے وکیل ہیں، آپ ان دونوں کا پس منظر بھی ملاحظہ کیجئے، یہ دونوں ایک سیاسی شارٹ کٹ کے ذریعے اقتدار تک پہنچے ہیں لہذا انہیں بھی اپنے عوامی انجی کی کوئی پروا نہیں۔“

میں نے عرض کیا ”ایک ڈیموکریٹک اور ایک ڈیکٹیٹر حکومت میں یہی فرق ہوتا ہے، ڈیموکریٹک حکومت اپنے انجی کے بارے میں بہت حساس ہوتی ہے جبکہ غیر جمہوری اور کسی جمہوری حکومتوں کو انجی کی کوئی پروا نہیں ہوتی، آپ نیوز کانفرنس کی مثال لیجئے، اس وقت ریگا میں نیوز کانفرنس ہو رہی ہے، اس کانفرنس کا پس منظر بہت دلچسپ ہے، کینیڈا کے اذھائی ہزار فوجی نیٹو کے پلیٹ فارم پر جنوبی افغانستان میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں، پچھلے دنوں طالبان کے ساتھ لڑائی میں کینیڈا کے 44 فوجی ہلاک ہو گئے، ان فوجیوں کے تابوت جب کینیڈا پہنچے تو عوام احتجاج کرنے لگے، اس احتجاج کے رد عمل میں کینیڈا کی حکومت اپنے فوجی واپس بلانے پر غور کرنے لگی لیکن امریکہ اور برطانیہ نے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا جس سے متاثر ہو کر کینیڈا افغانستان میں اپنے فوجیوں کے قیام میں 2009 تک توسیع پر مجبور ہو گیا، اس توسیع پر کینیڈا میں شدید احتجاج شروع ہو گیا، صدر بش اور ٹونی بلیر نے کینیڈا کی حکومت کو دباؤ سے نکالنے کے لئے نیٹو کے رکن ممالک سے جنوبی افغانستان میں فوجی بھجوانے کی درخواست کر دی لیکن جرمنی، فرانس، اٹلی اور سپین کی جمہوری حکومتوں نے صاف انکار کر دیا چنانچہ صدر بش نیٹو کانفرنس بلانے پر مجبور ہو گئے، اب اگر آپ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر پاکستان کو دیکھتے تو آپ کو ایک جمہوری اور ایک غیر جمہوری حکومت کا فرق معلوم ہو جائے گا، ہم نے 2001ء میں افغانستان پر یوٹرن لیا تھا، ہم نے اس یوٹرن کے نتیجے میں کیا کیا نقصان اٹھایا، ذرا سوچئے، پاکستان میں کتنے بم دھماکے ہوئے؟ پاکستان میں کتنے خودکش حملے ہوئے؟ ہم نے لب تک نعشوں کے کتنے تابوت وصول کئے اور ہمارے باجوڑ اور درگی میں کتنے لوگ شہید

ہوئے؟ ہمارے شمالی اور جنوبی وزیرستان کے حالات کہاں جا پہنچے؟ بلوچستان کس حد تک آتش فشاں کی شکل اختیار کر گیا اور ہمارا چورا ملک کس قدر خوف اور دہشت گردی کا شکار ہوا؟ آپ 2001ء سے پہلے اور 2001ء کے بعد کے پاکستان کا جائزہ لیجئے۔ آج حالت یہ ہے ہمارا کوئی وزیر تک سیکورٹی گود کے بغیر اپنے دفتر سے باہر نہیں نکل سکتا، ہماری مسجدیں تک غیر محفوظ ہیں اور ہر نماز کے وقت مسجدوں کے سامنے پولیس کھڑی ہوتی ہے ہمارے عوام حکومت کی روشن خیالی اور مجاہد دشمن پالیسیوں کے دل سے خلاف ہیں اور ہر صاحب دل اور صاحب ایمان شخص حکومت کو برا بھلا کہہ رہا ہے ملک میں مہنگائی ہے اور لوگ پیٹ پر روٹی باندھ کر ٹرین کے سامنے لیٹ رہے ہیں لیکن ہماری حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رہے کیوں؟ کیونکہ حکومت عوامی ایجنڈے سے بالاتر ہے اس کی بلا سے اس ملک کے سارے لوگ بھوکے مر جائیں اسے کوئی فرق نہیں پڑتا لہذا میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ نینڈا نے پچھلے چھ برس میں جتنے تابوت وصول کئے تھے اگر اتنے تابوت روزانہ اسلام آباد کراچی اور لاہور میں آنا شروع ہو جائیں تو بھی ہماری حکومت کے پر تیلے نہیں ہوں گے ہماری حکومت پریشان نہیں ہوگی کیوں؟ کیونکہ اس حکومت نے بیلٹ ہاکس سے جرم نہیں لیا یہ عوامی رائے کی کوکھ سے پیدا نہیں ہوئی لہذا یہ عوام کے ایجنڈے اور رائے سے متاثر نہیں ہوتی۔ میں نے خاتون سے عرض کیا ”جمہوریت، ووٹ اور بیلٹ ہاکس وہ بنیادی ”کیوں“ ہوتے ہیں جن سے قوموں کا مستقبل طے ہوتا ہے لیکن بد قسمتی سے ہمارے ملک کے پاس یہ بنیاد ہی نہیں“





## دس لوگ

میں نے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور گاڑی سے فوراً ہاجر آ گیا۔ عابد ڈرائیور کے پاس رک گیا، وہ پہلے گاڑی میں ڈرائیور کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا اور اس کے بعد دونوں باہر آ کر کھڑے ہو گئے۔ یہ میرے لئے انتہائی مشکل وقت تھا۔ فلائیٹ چھوٹنے میں تھوڑی سی دیر باقی تھی لیکن عابد ڈرائیور کے ساتھ مذاکرات میں مصروف ہو چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا یہ مذاکرات شام تک جاری رہیں گے۔ عابد انسانوں کے اس گروپ سے تعلق رکھتا ہے جو بولنے پر آتے ہیں تو اس وقت تک گفتگو جاری رکھتے ہیں جب تک دوسرا ان سے اتفاق نہیں کر لیتا یا پھر انہیں سلام کر کے دائیں بائیں نہیں ہو جاتا۔ میں عابد جیسے لوگوں کو "سکڑ مین" کہتا ہوں۔ آپ ان لوگوں کو میمنس کے سامنے کھڑا کر دیں تو یہ اسے رنگ گورا کرنے کی کریم بیچنا شروع کر دیں گے لیکن ہمارا ایک تیسرا دوست اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کا خیال ہے یہ لوگ پیدائشی خوشامدی ہوتے ہیں۔ یہ بلا مقصد بلا فائدہ دوسروں کی خوشامدی کرتے رہتے ہیں۔ ان کے سامنے اگر شیطان بھی آ بیٹھے تو یہ اس کے حسن، اس کی ذہانت اور اس کے اخلاق کی تعریف شروع کر دیں گے۔ مجھے نہیں معلوم میری رائے درست ہے یا ہمارے اس تیسرے دوست کی لیکن یہ حقیقت ہے عابد موقع اور وقت دیکھے بغیر غیر متعلقہ لوگوں کے ساتھ گفتگو میں الجھ پڑتا ہے۔ وہ اس وقت بھی اپنی عادت بھرا رہا تھا۔ میں کراچی انٹر پورٹ کے برآمدے میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا اور وہ ہنس ہنس کر ڈرائیور سے گپ شپ کر رہا تھا۔ میں نے انگلی سے اومام گھڑی بنائی اور اسے جلدی آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے انگشت شہادت سے ایک منٹ مانگا۔ ڈرائیور کے ساتھ دو باتیں کیں۔ ڈرائیور نے قہقہہ لگایا۔ اس کے ساتھ بغل گیر ہوا۔ آٹھ گھنٹیں پوچھیں۔ دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھ کر سلام کیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ عابد بھاگتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ ہم ڈیپارچر لاؤنج کی طرف دوڑ پڑے۔

میں غصے سے اٹل رہا تھا۔ میں بورڈنگ پاس لینے تک خاموش رہا۔ ہم لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے تو وہ مسکرایا اور مجھے خوشامدی نظروں سے دیکھنے لگا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی تعریف کرنے سے پہلے ایسا کرتا تھا۔ وہ نرم اور ہنسی آواز میں بولا۔ "ڈرائیور شدید ٹینشن میں تھا۔ گاڑی کے مالک نے اسے گالیاں دی تھیں اور وہ ٹینشن کے عالم میں گاڑی لے کر باہر آ گیا تھا شاید اسی وجہ سے وہ غیر محتاط ڈرائیور بن گیا۔ میں نے گرم لہجہ میں

جواب دیا "تم نے دیکھا نہیں اس نے راستے میں کتنے مشکل توڑے" اس نے ٹرار کے ساتھ ریس لگائی اس نے راستے میں کتنے لوگوں سے بدتمیزی کی اور وہ ہمارے ساتھ کس لہجے میں بات کر رہا تھا لیکن تم نے اس کے ساتھ رشتے داری نکال لی تم بنیادی طور پر ایک گھنیا قسم کے خوشامدی ہو تم خوشامد میں معیار تک کا خیال نہیں رکھتے" اس نے قہقہہ لگایا اور مجھے تو مسلمی نظروں سے دیکھ کر بولا "میں نے ڈرائیور کی فینشن بھانپ لی تھی لہذا میں نے اس کی فینشن کو دو منٹ دینے کا فیصلہ کیا" تم گاڑی سے اترے تو میں نے اس کی ڈرائیونگ کی تعریف کی "میں نے اس سے کہا" میں نے پوری زندگی تم جیسا کوئی دوسرا ڈرائیور نہیں دیکھا" تم نے انتہائی حیرت ریزی کے باوجود گاڑی کا توازن برقرار رکھا اور تم کراچی کے تمام "شارٹ کس" سے واقف ہو چکے ہو راستے میں جہاں بھی ٹریفک جام ملی تم فوراً کسی گلی میں ٹھس گئے اور چند منٹ میں کسی اچھی سڑک پر نکل آئے" میرے غصے میں اضافہ ہو گیا "میں نے نفرت اور بے بسی کے طے جلتے احساس کے ساتھ اس کی طرف دیکھا "تم اس واہیات انسان کی ڈرائیونگ کو بہترین قرار دے رہے تھے" اس نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا "میں اسے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اچھا ڈرائیور سمجھتا ہوں، اس نے غیر محتاط ڈرائیونگ کے باوجود گاڑی کو کسی سے ٹکرانے نہیں دیا، اس نے سارے مشکل توڑے لیکن کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ تم یقین کرو اس کی بے احتیاطی میں بھی ایک احتیاط تھی" میں نے غصے میں پہلو بدل لیا لیکن وہ بولتا چلا گیا "میری ہمدردی نے ڈرائیور کی فینشن کو آئسوؤں کی شکل دے دی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ یہاں تک کہ اس کا سارا غصہ اس کی ساری نفرت نشوونما میں منتقل ہو گئی۔ وہ ہلکا ہلکا ہو گیا، میں نیچے اترا اسے بھی باہر نکالا، اس نے تازہ ہوا کے چند لمبے سانس لیے۔ میرے ساتھ لمبی مذاق کی باتیں کیں اور چلا گیا۔" وہ چپ ہو گیا۔

میں نے گرم لہجے میں پوچھا "لیکن تمہیں مدد دینا ہی کر کیا فائدہ ہوا؟" اس نے قہقہہ لگایا اور انکار میں سر ہلا کر بولا "میں نے کراچی جیسے اچھے، پچھلے شہر کو اس اور سکون کا متحدہ دے دیا" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرایا "نفرت اور محبت کے جذبے متعدي امراض کی طرح ہوتے ہیں، یہ ہمیشہ ایک سے دوسرے اور دوسرے سے آئینوں دسویں شخص کو متاثر کرتے ہیں، غصے اور فینشن کا شکار شخص دو گھنٹوں میں پانچ سو لوگوں کا سوڈا خراب کر دیتا ہے اور یہ پانچ سو لوگ شام تک پورے شہر کو بیمار کر دیتے ہیں۔ ہماری نفرت کی ایک نفر، ہماری ایک گالی اور ہمارا پانچ سیکنڈ کا غصہ "ملٹی پلانی" ہوتا ہے اور یہ شام تک پورے شہر کو شدت اور غصے میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح ایک تھینک ہو، ایک شکر یہ، مہربانی کا ایک لفظ، ایک تھینک، واو واہ کا ایک سیکنڈ، شفقت کا ایک ہاتھ، ایک مسکراہٹ اور محبت کی ایک نظر بھی "ملٹی پلانی" ہوتی ہے اور شام تک پورے شہر کو خوبصورت بنا دیتی ہے" میں دلچسپی سے اس کی بات سننے لگا، وہ بولا "انسان جذبات کا انگریز اسٹ فٹن ہوتا ہے، ہم اپنے جذبات اپنی ذات تک محدود نہیں رکھ سکتے، ہم ہمیشہ دوسروں کو اپنی نفرت اور اپنی محبت میں شریک کرتے ہیں، برے لوگ ہمیشہ دوسروں کو برا بناتے ہیں اور اچھے اور نیک لوگ ہمیشہ دوسروں کو اچھائی کی تبلیغ کرتے ہیں، ہم اگر فینشن لے کر گھر سے نکلیں تو ہم یہ فینشن راستے میں ملنے والے لوگوں میں تقسیم کرتے جاتے ہیں، ہم اپنی فینشن رسکے والے، ٹھیکسی والے، پٹرول

پپ کے چھوٹے، دفتر کے چیرا سی، ماپنے پی اے اور اپنے فکر کے حوالے کرتے جاتے ہیں اور یہ لوگ اس ٹینشن کو آگے منتقل کرتے رہتے ہیں۔ یوں ٹینشن اور نفرت کا یہ سلسلہ پورے شہر میں پھیل جاتا ہے، اسی طرح جب کوئی شخص اپنے گھر سے خوش ہے تو وہ اپنی یہ خوشی بھی راستے میں بانٹتا جاتا ہے۔ ”وہ رکا اور دوبارہ بولا“ میں نے محسوس کیا یہ ڈرامہ ٹینشن کا شکار ہے لہذا وہ کراچی کی سڑکوں پر ٹینشن کا چھڑکاؤ کر رہا ہے چنانچہ میں نے اس کا تہہ بانی آپریشن کیا اور اس کا غصہ نکال کر ڈس جین میں پھیٹک دیا جس کے بعد وہ پرسکون ہو گیا ”تم ذرا تصور کرو اب وہ جس راستے سے گزر رہا ہوگا، وہ جس جس شخص سے مل رہا ہوگا وہ اسے سکون، اطمینان، ہمدردی اور محبت کا تھنڈے رہا ہوگا۔ وہ لوگوں میں امن اور محبت تقسیم کر رہا ہوگا“ عابد خاموش ہو گیا، میرے پاس اس کی بات جھٹلانے کیلئے کوئی دلیل، کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ بولا ”میرا دعویٰ ہے اگر صرف دس لوگ یہ نیت لے کر گھر سے نکلیں کہ ہم نے لوگوں کی ٹینشن اور نفرت کو ہمدردی اور محبت میں تبدیل کرنا ہے اگر یہ لوگ شام تک گلیوں، بازاروں، بسوں، دیکھوں اور دیکھوں میں لوگوں کے غصے کی آگ بجھاتے رہیں تو پاکستان کے تمام شہروں کے مزاج بدل جائیں۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ لڑنا، بھڑانا بند کریں اور لوگوں میں فساد کی خور اور اختلاف کی عادت ختم ہو جائے“ وہ رکا، اس نے ایک لمحہ غور کیا اور مسکرا کر بولا ”ہمارے ہر شہر کو ایسے دس رضا کاروں کی ضرورت ہے جو محبت کے ڈسٹری بیوٹر بن جائیں، جو ٹشو پیپر بن کر سارے شہر کی تنگی چوس لیں اور جو شہروں میں مسکراہٹوں کی دکانیں کھول لیں، تم یقین کرو، یہ ملک بدل جائے گا“





## جہاں زیادہ محنت وہاں زیادہ ٹیلنٹ

لو جو ان نے پانی کا گلاس چڑھایا ایک لمبی آہ بھری اور کرسی سے ایک لگا دی "سر میں ناکامیوں کا مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکتا لہذا میں مرجانا چاہتا ہوں" سر میں خود کٹھی کر لوں گا "میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پیار سے پوچھا "تم ضرور خود کٹھی کر لیتا" یہ آپشن دنیا کے تمام جانداروں کیلئے ہر وقت کھلا رہتا ہے "اس نے آنکھیں پونچھیں اور مضطرب لہجے میں بولا "سر میں ایک ناکام طالب علم ہوں میں نے تین بار بی اے کے پرچے دیے مگر میں ٹل ہو گیا" میں نے چار سال نوکری حلاش کی کچھ نہیں ملی میں نے پچھلے تین برسوں میں آنکھ قسم کے کاروبار کئے وہ سارے کاروبار ناکام ہوئے اور میرے گھر کے برتن تک بک گئے لہذا میرے لئے اب زندگی میں کوئی دلچسپی کوئی خوبصورتی نہیں" میں مرجانا چاہتا ہوں "میں نے تھوڑا لگا دیا وہ مجھے نفرت سے دیکھنے لگا "میں نے کہا "تو تم جدوجہد کو شش اور محنت سے گھبرائے ہوئے ہو" اس نے پہلو بدل کر کہا "نہیں سر میں ناکامیوں سے گھبرایا ہوا ہوں" میں نے اس سے پوچھا "تم زندگی میں کتنی بار ناکام ہوئے ہو" اس نے تھوڑی دیر گنا اور پھر بے یقینی کے عالم میں بولا "بارہ تیرہ مرتبہ" میں نے اوپر بلب کی طرف اشارہ کیا "تم جانتے ہو یہ بلب کس نے ایجاد کیا تھا؟" "لو جو ان نے فوراً جواب دیا "ایڈیسن نے" میں نے کہا "ایڈیسن نے یہ بلب بنانے کیلئے 2 ہزار کوششیں کی تھیں اور اس کی ہر کوشش ناکام رہی تھی وہ دو ہزار کوششوں کے بعد کامیاب ہوا تو کسی نے اس سے پوچھا "تھیں 2 ہزار مرتبہ ناکام ہونا کیسا لگا" اس نے مسکرا کر جواب دیا "میں اپنی ناکامیوں کو ناکامیاں نہیں سمجھتا میں اپنی کامیابی کی سڑھیاں سمجھتا ہوں اور سر ملے سمجھتا ہوں" میں سمجھتا ہوں" میں نے بلب کی منزل تک پہنچنے کیلئے دو ہزار مرحلے طے کئے تھے"

میں نے انگلی نیچے کی اور اس کی طرف دیکھ کر کہا "تم بتاؤ تیرہ ناکامیاں زیادہ ہیں یا دو ہزار ناکامیاں" وہ خاموش رہا میں نے کہا "بیٹا تم نے کبھی تھلی کی پیدائش کا عمل دیکھا ہے؟" اس نے انکار میں سر جھکا دیا میں نے کہا "قدرت تھلی کو ایک "کوکون" میں پیدا کرتی ہے جب اس کا جسم مکمل ہو جاتا ہے تو قدرت اس "کوکون" میں ایک باریک سا سوراخ کھداتی ہے اور تھلی کو اپنے پورے جسم کا زور لگا کر اس سوراخ سے باہر آنا پڑتا ہے سوراخ چھوٹا اور تھلی کا جسم بڑا ہوتا ہے لہذا وہ کوکون سے باہر آنے میں کئی کئی دن لگا دیتی ہے یہ کوشش یہ محنت اور یہ چھوٹا سا سوراخ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت ہے بات دراصل یہ ہے جب تھلی کے جسم میں جان ڈالی جاتی ہے تو اس کے پر بے جان ہوتے ہیں جب وہ سوراخ سے باہر نکلنے کیلئے زور لگاتی ہے تو اس کے جسم سے ایک مواد نکل کر پروں کی رگوں میں پہنچتا ہے یہ مواد پروں کو زندگی دیتا ہے تھلی "کوکون" میں جتنا زور لگاتی ہے اتنا ہی مواد اس کے پروں

میں پہنچتا ہے اور اس کے پرانے ہی خوبصورت اور اتنے ہی طاقتور ہو جاتے ہیں اگر یہ سوراخ تنگ نہ ہو اور اگر تنگی اس سوراخ سے باہر آنے کیلئے زور نہ لگائے تو وہ کبھی اڑنے کے قابل نہ ہو اور اس میں اور عام کیڑے مکوڑوں میں کوئی فرق نہ رہے یہ قدرت کا انتہائی دلچسپ نظام ہے تم اس نظام کو سامنے رکھ کر دیکھو تو تمہیں محسوس ہوگا قدرت جس شخص کو زیادہ ٹیلنٹ دیتی ہے اس شخص کو زندگی میں دوسروں کی نسبت زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے وہ عام لوگوں کی نسبت زیادہ ناکام ہوتا ہے "نوجوان نے حیرت سے میری طرف دیکھا میں نے مسکرا کر کہا "دیکھو تم انسانی تاریخ اٹھا کر دیکھو نوےس قہمیں قریب ترین تاریخ کی مثالیں دیتا ہوں مینٹھون مغربی موسیقی کا سب سے بڑا نام ہے اس کی سمٹیوں نے پوری دنیا میں آگ لگا دی تھی اس کا شمار تاریخ کے چار لچڑ موسیقاروں میں ہوتا ہے لیکن یہ شخص اپنی موسیقی خود نہیں سن سکتا تھا یہ بہرہ تھا لہذا یہ سازوں کی حرکت اور سننے والوں کی کیفیت سے اپنے فن کا اندازہ لگاتا تھا" جارج واشنگٹن امریکہ کا کامیاب ترین صدر تھا امریکہ کا دارالحکومت واشنگٹن اس کے نام سے منسوب ہوا وہ شخص جہن میں فورگ کی وادی میں پھنس گیا تھا یہ وادی برف سے اٹی ہوئی تھی اور وہاں سے اس کے بچنے کے امکانات صفر تھے یہ اس کی زندگی کا ناقابل فراموش اور ناقابل یقین لمحہ تھا ابراہم لنکن کی زندگی انتہائی عسرت اور غربت میں گزری وہ جنگل سے ٹکڑیاں کاٹ کر لاتا تھا البرٹ آئن سٹائن کو دنیا کا سب سے بڑا دماغ کہا جاتا ہے لیکن وہ جہن میں ایک ناکام اور تالاق طالب علم تھا اس کے استادوں کا کہنا تھا آئن سٹائن کبھی کالج کے درجے تک نہیں پہنچ سکے گا کہ سنوکر کلبس نے امریکہ کی تلاش میں جتنی مشکلات برداشت کیں اس نے جتنے دیکھے کھائے تم اس کا تصور نہیں کر سکتے جیمز اول جوز دنیا کا مشہور ترین اداکار ہے وہ طالب علمی کے زمانے میں بول نہیں سکتا تھا وہ طویل عرصے تک اپنے اساتذہ اور ہم جماعتوں سے لکھ کر بات کرتا تھا دنیا میں آنرک پرل مین سے اچھا دانشور آج تک کسی شخص نے نہیں بجایا یہ شخص نازی کیمپ میں پیدا ہوا اور چار سال کی عمر میں اس کا بچلا دھڑ مفلوج ہو گیا اس نے پوری زندگی دلی چیز پر بیٹھ کر واکمن بجایا اور جیمز کارل سن نے 40ء کی دہائی میں ایک سسٹم "ELECTROSTATIC PAPER-COPYING PROCESS" بنایا وہ سات برس تک یہ سسٹم اٹھا کر پھرتا رہا لیکن اسے ہر روز اڑے سے دھکا دیا گیا یہاں تک کہ نیو یارک کی ایک چھوٹی سی کمپنی ہالائیڈ (HALOID) نے یہ سسٹم خرید لیا اور اس کے بعد اس سسٹم کی بنا پر یہ کمپنی زیروکس کے نام سے ملٹی نیشنل بن گئی ایسی بے شمار کہانیاں ہیں روز ویلٹ امریکہ کا چار بار صدر منتخب ہوا اسے 39 سال کی عمر میں پالے ہوا اور اس نے باقی زندگی تکلیف اور پریشانی میں گزاری وہ اسی عالم میں صدر بنّا فارغ جاپان جنرل میک آرٹھر "دوست پواعت" کے داخلہ ٹیسٹ میں دوبارہ نفل ہوا تھا مشہور ایکٹر لوسل بال کو ڈرامہ سکول کے ہیڈ ماسٹر نے پیشہ بدلنے کا مشورہ دیا تھا اور اکیڈمی ایوارڈ یافتہ رائٹر پروڈیوسر اور ڈائریکٹر روڈی ایلن موشن پکچر پروڈکشن میں مل گیا تھا لہذا میرے بچے یہ سمجھیں یہ کیا کامیاں اور یہ کوششیں تو آپ کو طاقت دیتی ہیں یہ تو آپ کو آگے بڑھنے ترقی کرنے کا حوصلہ دیتی ہیں اور یہ قدرت کی طرف سے اعلان ہوتی ہیں اللہ نے آپ کو تنگی کی طرح زیادہ رنگوں سے نواز رکھا ہے لہذا آپ کو یہ رنگ دکھانے کیلئے زیادہ زور لگانا پڑے گا اور آپ کو اپنے پر پھیلانے کیلئے زندگی کے چھوٹے سوراخ سے گزرنا ہوگا"

میں خاموش ہو گیا "نوجوان کا چہرہ جذبات سے دمک رہا تھا وہ اٹھا اس نے مجھے سلام کیا اور تے جذبے کے ساتھ زندگی کے دھارے میں شامل ہو گیا۔





## ایک زبان دوکان

مل میگزین امریکہ کے ایک نامور بزنس مین ہیں یہ ہوٹل کی دنیا کی سب سے بڑی "چین" میگزین کے چیئرمین اور چیف ایگزیکٹو افسر ہیں دنیا کے 151 ممالک میں اس چین کے ہوٹل ہیں اس چین کی کامیابی کے پیچھے مل میگزین کی ان تھک محنت اور حیران کن ذہنی استطاعت ہے پچھلے سال کسی صحافی نے مل میگزین سے ان کی اس کامیابی کی وجہ دریافت کی "مل میگزین نے بڑا لوکا جواب دیا اس کا کہنا تھا "میں لوگوں کی بات بڑے غور سے سنتا ہوں" پوچھنے والے نے حیرت کا اظہار کیا تو مل میگزین نے وضاحت کی "میں جب جوان تھا تو میرے والد نے مجھے ٹریڈنگ کیلئے نیوی میں بھرتی کر دیا ان دنوں آئرن اور امریکہ کے صدر تھے صدر میرے والد کے بہت اچھے دوست تھے ایک کمرس پر صدر ہمارے گھر تشریف لائے اس دن شدید سردی تھی اور باہر برف باری ہو رہی تھی میرے والد اور صدر دونوں برف میں نشانہ بازی کرنا چاہتے تھے صدر اندر بیٹھ گئے تو میرے والد نے مجھے حکم دیا "مل تم جاؤ اور صدر سے کہو اس موسم میں نشانہ بازی واقعی ایک دلچسپ اور حریفار کام ہوگا" آپ پہلے آتش دان کے پاس بیٹھیں گے یا پھر فوراً نشانہ بازی پسند کریں گے میں نے والد کی بات سنی لیکن کبھی نہیں میں فوراً صدر کے پاس گیا اور ان سے عرض کیا "سر باہر بہت سردی ہے اس سردی میں نشانہ بازی اچھی نہیں رہے گی آپ کیلئے بہتر ہے آپ آتش دان کے پاس بیٹھ جائیں" صدر نے تھینک یو کہا اور آتش دان کے قریب بیٹھ گئے جب صدر چلے گئے تو میرے والد نے مجھے بلایا اور بنجیدگی سے بولے مل ایک بات کان کھول کر سن لو جب بھی کوئی شخص بات کرے وہ بات غور سے سنو اور سننے کے ساتھ ساتھ اسے سمجھو اور جب تک تم سے تمہاری رائے نہ پوچھی جائے تم اپنی رائے نہ دو تم زندگی میں کبھی ناکام نہیں ہو گے میں نے اپنے والد کی بات پلے باندھ لی لہذا اس کے بعد میں نے ہاری زندگی فیصلے کرنے سے پہلے دوسرے لوگوں کی بات غور سے سنی اسے سمجھا اور پھر آرڈر جاری کیا یہ میری زندگی کی کامیابی کی واحد وجہ ہے۔"

مل میگزین کا یہ نظریہ بہت دلچسپ ہے لیکن یہ نیا نہیں امریکہ میں ایک ادارہ ہے "انٹرنیشنل سٹیک ایسوسی ایشن" یہ ادارہ لوگوں کو سننے کا فن سکھاتا ہے اس ادارے کا دعویٰ ہے ہم لوگ روزانہ 45 فیصد وقت سننے میں



گزارتے ہیں لیکن ہم لوگ اپنی سنی ہوئی پچاس فیصد باتیں بھول جاتے ہیں ان کا کہنا ہے انسان زندگی میں جو کچھ سیکھتا ہے اس کے 75 فیصد حصے کی بنیاد سننے کی حس ہوتی ہے اگر انسان کی یہ حس چھن جائے یا معطل ہو جائے تو اس کی صلاحیتیں 75 فیصد کم ہو جاتی ہیں اور وہ 75 فیصد چیزیں سیکھنے کا اہل نہیں رہتا ان کا کہنا ہے ہم لوگ جو کچھ سننے میں وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ اس میں سے صرف 20 فیصد باتیں ہمارے ذہن میں رو جاتی ہیں باقی 80 فیصد اطلاعات علم اور باتیں ہمارے ذہن سے محو ہو جاتی ہیں لیکن کامیاب لوگ اس استطاعت کو بڑھا لیتے ہیں وہ میں فیصد سے زیادہ باتیں یاد رکھتے ہیں ان کے کان ان کے دماغ کے ان حصوں سے جڑے رہتے ہیں جو تمام سنی ہوئی باتیں ریکارڈ کر لیتے ہیں اس ادارے کا دعویٰ ہے انسان ایک منٹ میں 125 سے لے کر 250 لفظ تک سنتا ہے مگر یہ الفاظ دماغ میں پہنچ کر ذہن کو ایک ہزار سے 3 ہزار الفاظ سوچنے کی تحریک دیتے ہیں یہ تحریک بنیادی طور پر اس شخص کو عمل پر ابھارتی ہے اور جو شخص اس تحریک پر عمل کر لیتا ہے وہ زندگی میں کامیاب ہو جاتا ہے اس ادارے نے آج تک 35 ہزار سے زائد کرائے یہ سروے دنیا کی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو ڈائریکٹر، صدر اور انٹرپرائز جرنلز کے گرد گھومتے ہیں ان سروے کے دوران معلوم ہوا دنیا میں ترقی کرنے والے تمام لوگ سننے کے فن سے واقف ہیں وہ اپنے وقت کا زیادہ تر حصہ لوگوں کی باتیں سننے میں صرف کرتے ہیں وہ اپنے دونوں کان کھول کر بیٹھتے ہیں اور وہ کہنے والوں کو پوری توجہ پوری یکسوئی دیتے ہیں سروے میں پتہ چلا جس کمپنی میں سننے والے لوگ زیادہ ہیں اس کمپنی نے دوسری کمپنیوں کی نسبت زیادہ تیزی سے ترقی کی۔ وہ کمپنی بہت جلد بڑی کمپنی بن گئی اس ادارے نے ناکام بزنس مینوں اور دیوالیہ کمپنیوں کے سروے بھی کئے اس سروے میں معلوم ہوا دیوالیہ ہونے والی کمپنیاں ایسے لوگ چلا رہے تھے جو سننے کی بجائے بولنے پر یقین رکھتے تھے جو یکسوئی سے دوسرے شخص کی بات نہیں سن سکتے تھے یہ ادارہ امریکہ کی اعلیٰ کاروباری شخصیات، نوجوان بزنس مینوں اور پبلک ڈیلیٹ کا کام کرنے والے لوگوں کو سننے کی ٹریننگ بھی دیتا ہے یہ انہیں بتاتا ہے اگر وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ مخاطب کی بات سننے میں صرف کریں گے اگر ان باتوں کو ذہن نشین کریں گے اگر ان کا تجزیہ کریں گے اور اس تجزیہ کی بنیاد پر اپنی ذمہ داریاں نبھائیں گے تو ان کی کامیابی کا گراف بہت جلد اوپر چلا جائے گا۔

میں نے جب اس ادارے کی تحقیق کے بارے میں پڑھا تو مجھے اپنے ایک دوست یاد آ گئے ان کا تعلق چینیٹی فیلٹی سے تھا اور کراچی میں ان کا بہت بڑا کاروبار تھا ان کے ایک ملازم کا نام "نورا" تھا یہ نورا چالیس برس تک ان کے ساتھ رہا شیخ صاحب دنیا کے جس کونے میں جاتے تھے نورا ان کے ساتھ رہتا تھا وہ کار میں بیٹھیں جہاز میں ہوں ملک کے اندر ہوں باہر ہوں فیکٹری جا رہے ہوں یا بیڈروم میں نورا سائے کی طرح ان کے ساتھ رہتا تھا شیخ صاحب کے بیڈروم کے ساتھ نورا کے ایک چھوٹا سا بیڈروم تھا میں نے ایسی انوکھی دنیا بھی دیکھی کسی جگہ نہیں دیکھی تھی لہذا میں نے ایک بار شیخ صاحب سے اس "نورے بیڈروم" کے بارے میں پوچھ لیا شیخ صاحب نے اس کی ایک حیران کن وجہ بتائی انہوں نے بتایا نورا میرے ہونٹوں کی حرکت سے اندازہ لگا لیتا ہے میں کیا کہہ رہا ہوں

اور میں کیا چاہتا ہوں میں اسے آج کہوں تم نے ٹھیک دس سال بعد مجھے یہ بات یاد کرائی ہے تو یہ ٹھیک دس برس بعد میرے کان پر جھکے گا اور آہستہ آواز میں کہے گا "بھابی آپ نے فلاں وقت یہ کہا تھا" مجھے اس کی اس عادت اس صلاحیت سے پیار ہے میں اگر بات بھول جاؤں تو میں فوراً نورے سے پوچھتا ہوں "نورے تم بتاؤ میں نے فلاں جگہ یہ بات کہی تھی" نوراً فوراً لفظ بہ لفظ وہ بات دہرا دیتا ہے میں شیخ صاحب کا جواب سن کر حیران رہ گیا مجھے اس کردار سے معلوم ہوا سنتا اور سننے ہوئے کو یاد رکھنا کتنا بڑا فن ہے۔

میں واپس ملی سیریت کی طرف آتا ہوں اس نے کہا تھا "اگر لوگ اپنی زبان کی بجائے کانوں پر انحصار کریں تو دس ہزار گنا زیادہ کامیابی حاصل کریں میرے والد نے کہا تھا اللہ نے انسان کو زبان ایک جبکہ کان دو دیئے ہیں۔ لہذا انسان کو چاہئے وہ جتنا کام زبان سے لیتا ہے اس سے دو گنا کام کانوں سے لے"



Kashif Azad @ OneUrdu.com

## سیلف ریٹائرمنٹ

ہم بارگاہی کی پہاڑی کے دامن میں پہنچے تو شیخ صاحب ٹھک کر رک گئے۔ یہ ایک خوبصورت دل تھا، اسلام آباد شہری دھوپ میں نہایا ہوا تھا، ہم دونوں واک کیلئے پہاڑ پر گئے تھے، شیخ صاحب ایک بیچ پر بیٹھ کر ہاتھ لگے، میں نے ان سے اوپر جانے کیلئے کہا، تو وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر بولے "میں ایک بوڑھا شخص ہوں، تم چلے جاؤ" میں یہاں رک کر تمہارا انتظار کرتا ہوں" میں نے اصرار کرنے کا سوچا لیکن پھر ان کی حالت دیکھ کر چپ ہو گیا، ان کے ہاتھ پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے اور سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی، میں انہیں وہیں چھوڑ کر ٹریک کی طرف چل پڑا۔

شیخ صاحب میرے بزرگ دوست ہیں، ان کی عمر بمشکل ساٹھ برس ہے لیکن اگر ان کا حلیہ ان کی سوچ اور سستی دیکھی جائے تو وہ اپنی عمر سے کہیں بوڑھے نظر آتے ہیں۔ وہ بات بے بات بڑھا پے کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس بڑھا پے کا پورا پورا کریٹ حاصل کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مثلاً وہ بس میں چڑھیں گے تو ساتھ ہی کسی نوجوان سے کہیں گے "چل کا کاٹھ بوڑھے کو جگہ دو" اور نوجوان کو اٹھا کر اس کی جگہ پر قابض ہو جائیں گے۔ بل جمع کرانے جائیں گے تو انتظار میں سب سے آگے موجود شخص کے ساتھ کھڑے ہو جائیں گے اور اس سے کہیں گے "چل، جی، باؤ بوڑھے کو بھی بل جمع کرانے دو" اور جہاں بھی اسی سختی، دُراسی مشقت کا سر ملے گا تو وہ اپنے بڑھا پے کا اعلان کر کے ایک سائینڈ پر کھڑے ہو جائیں گے، میں ان کے اس رویے کا ہمیشہ شاک رہا ہوں، میں ان سے اکثر کہتا ہوں "شیخ صاحب آپ کہاں سے بوڑھے ہیں آپ کی عمر میں تو یورپ میں لوگ اخلاقی جرائم میں پکڑے جاتے ہیں" لیکن وہ اپنی گردن کی لٹکی ہوئی جلد اور پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ بھیر کر ہانپنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں ان سے اکثر لڑنے کا پروگرام بناتا ہوں لیکن پھر یہ سوچ کر رو جاتا ہوں کہ شیخ صاحب پاکستان میں اکیلے نہیں ہیں یہ ایک سوچ ہے جو پاکستان کی ایک سرحد سے دوسری سرحد تک پھیلی ہوئی ہے۔ پاکستان کا ہر وہ شخص جس کی عمر چالیس سال کی ٹیکر کو چھو جاتی ہے وہ بڑھا پے کا اعلان کرتا ہے اور زندگی کے دائرے سے نکل کر ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے اور وہ ان تمام چیزوں کو اپنے اوپر حرام قرار دے دیتا ہے جسے مذہب، معاشرہ



اور اخلاقیات موت تک حلال کہتی ہیں۔ آپ پاکستان کے کسی شہر قصبے یا گاؤں کی کسی گلی بازار یا محلے میں کھڑے ہو جائیں آپ کو وہاں ایسے ہزاروں لاکھوں بزرگ ملیں گے جو سارا سارا دن کھیاں مارتے ہیں اور جن کی زندگی کا صرف ایک مشغلہ ہوتا ہے الف سے لے کر ی تک اخبار پڑھنا اپنے سنہری دلوں کو یاد کرنا موجودہ زمانے کو گالیاں دینا پورے محلے کی غیبت کرنا اور اپنے بچوں اور بہوؤں کو برا بھلا کہنا اس وقت پاکستان میں ایسے لوگوں کی تعداد کروڑ سے کم نہیں ہوگی یہ لوگ مکمل طور پر بے کار ہیں اور یہ ایک "سیلف ریٹائرمنٹ" کے شکار ہیں جبکہ ہم جب یورپ اور امریکہ کا دورہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے وہاں لوگوں کی اصل زندگی شروع ہی ہاتھ برس سے ہوتی ہے۔

امریکہ میں پچھلے دنوں انکشاف ہوا بوزھے لوگ جوانوں سے بہتر پرفارمنس دیتے ہیں یہ انکشاف برگرنے والی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی مائیکروسلٹ نے کیا تھا۔ جم کاٹالوچو اس کمپنی کا چیف ایگزیکٹو تھا اس کی عمر 60 برس تھی پچھلے برس اپریل 2004ء میں اسے ہارٹ ایکٹ ہوا اور وہ فوت ہو گیا اس کے انتقال کے بعد کمپنی نے سوچا ہمیں کسی جوان اور صحت مند شخص کو چیف ایگزیکٹو بنانا چاہئے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے بے شمار لوگوں کے انٹرویوز کئے ان میں سے چارلس تیل کو منتخب کر لیا گیا چارلس تیل 44 برس کا ایک صحت مند اور چست شخص تھا اس نے کمپنی جو اس کی لیگن اسے ابھی دفتر میں بیٹھے ایک ہی ماہ گزارا تھا کہ اسے کینسر ہو گیا اور وہ 2004ء کے آخر میں انتقال کر گیا۔ کمپنی کیلئے چارلس تیل کی موت ایک پریشان کن صورت حال تھی انہوں نے ماہرین سے رابطہ کیا ماہرین نے امریکی میڈیا کو لکھا جس کے بعد امریکہ میں یہ دلچسپ بحث چھڑ گئی کہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا چیف ایگزیکٹو کس عمر کا شخص ہونا چاہئے اعداد و شمار جمع کئے گئے معلوم ہوا امریکہ کی ایک ہزار بڑی کمپنیوں میں سے 627 کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹو 70 برس اور 70 برس سے زیادہ عمر کے لوگ ہیں۔ ان اعداد و شمار کے تجزیے کے بعد معلوم ہوا بزرگ چیف ایگزیکٹو کی مالک کمپنیاں جوان تنظیمیں والی کمپنیوں کے مقابلے میں زیادہ برنس کر رہی ہیں۔ اس نئی مفذی کے بعد اس کمپنی نے 60 سال کے ایک بزرگ جیمز سکٹر کو چیف ایگزیکٹو بنا دیا تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق یہ مائیکروسلٹ اب چارلس تیل کے دور سے کہیں بہتر برنس کر رہی ہے۔

یہ تو تھی برنس کی صورت حال اب آتے ہیں کھیلوں کی طرف ہاروے سکے (HARVEY MACKAY) امریکہ کے ایک معروف کالم نگار ہیں۔ ان کا کالم یک وقت 52 امریکی اخبارات میں شائع ہوتا ہے وہ "سکے انوالوپ کارپوریشن" کے چیف ایگزیکٹو بھی ہیں وہ کھیلوں کے شائق ہیں وہ اب تک پانچ اولمپکس دیکھ چکے ہیں پچھلے سال جب یونان میں اولمپکس ہوئیں تو وہ اتھنز گئے وہاں انہوں نے ایک عجیب بات نوٹ کی انہوں نے محسوس کیا 2004ء کی اولمپکس میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والے کھلاڑی 2000ء میں ملٹائی تھے جیسے والے کھلاڑیوں سے "بوزھے" تھے انہوں نے اسی وقت انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی سے رابطہ کیا اور ان سے 2000ء اور 2004ء کے اولمپکس کے پروٹائل حاصل کرنے پر وٹائل کے مطالعے سے معلوم ہوا 2004ء میں میں بال کے مقابلوں میں کامیاب ہونے والے کھلاڑی 2000ء میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والوں سے

ڈیڑھ سے دو سال بڑے تھے، کشتی رانی اور فٹ بال کے کھلاڑی پچھلے کھلاڑیوں کی نسبت عمر میں 3 سال بڑے تھے اور کمزور سواروں کے کھلاڑیوں کی عمروں میں 9 سال کا فرق تھا، ان اعداد و شمار نے کھیل کے دس ہزار سالہ تصورات تبدیل کر دیے۔ آج تک دنیا یہ سمجھتی آئی تھی جوں جوں انسان کی عمر بڑھتی ہے اس کے کھیلنے اور کودنے کی صلاحیتیں کم ہو جاتی ہیں لیکن کئے کی سٹڈی نے دنیا کو حیران کر دیا، اس نے ثابت کر دیا کھیل اور کامیابی کا عمر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ایک بوڑھا شخص چاہے تو وہ کھیل بھی سکتا ہے اور ایوارڈ بھی حاصل کر سکتا ہے۔ کئے کے اس انکشاف کے بعد سپورٹس کی درجنوں امریکی تنظیموں نے سٹڈی کی اور انہوں نے تسلیم کیا جو کھلاڑی مسلسل پریکٹس کرتے رہتے ہیں اور جو اپنے آپ کو توانا اور جہان سمجھتے ہیں، وہ 60 برس تک نئے اور جوان کھلاڑیوں سے اچھی پرفارمنس دیتے ہیں اور وہ زیادہ اچھے اور شاندار کھلاڑی ثابت ہوتے ہیں چنانچہ میکڈونلڈ اور ہاروے کئے کے ہمیشہ ملاقات نے بڑھاپے کے سارے تصورات تبدیل کر دیے، نئی تصویروں کی ثابت کرتی ہے، عمر آپ کو کمزور بنا چار اور کامل نہیں بناتی بلکہ وہ آپ کی صلاحیتوں، سلیمنے اور تجربے میں اضافہ کرتی ہے اور یہ ہم لوگ ہیں جو اپنے آپ کو کامل بنا چار کمزور اور بوڑھا بنانے کا تمام تر کارنامہ سرانجام دیتے ہیں، ہم خود ہی اپنے آپ کو زندگی کے دائرے سے باہر نکال لیتے ہیں، ہاروے کئے کی سٹڈی سے معلوم ہوا قدرت ہمیں رہنا نہیں کرتی، یہ ہم لوگ ہیں جو قدرت کی منشا اور رضا مندی کے خلاف خود ہی ریٹائرمنٹ لے لیتے ہیں، ہم قدرت سے "گولڈن فیک ونڈ" کر لیتے ہیں اور ہم اللہ تعالیٰ کے بخشے باقی نہیں ہیں، برس خود تری اور خود جی میں گزار دیتے ہیں اور ہم گلیوں میں کھڑے ہو کر موت کا انتظار کرتے ہیں، ہم ملک الموت کو بلا تے رہتے ہیں، ہم بہت ناشکرے اور تھوڑے دے ہیں۔

ہم نے اور ہمارے بزرگوں نے کبھی اس موضوع پر سوچا۔



## استقامت کے دس دن

میرے ایک دوست سرکاری ملازم ہیں وہ اسلام آباد کے ایک درمیانے درجے کے سیکٹر میں رہتے ہیں ان کی گلی خراب تھی وہ ایک دن میرے پاس تشریف لائے اور فرمانے لگے "اگر تم ہماری گلی پر کام لکھ دو تو یہ ٹھیک ہو سکتی ہے" میں نے ان سے پوچھا "کالم سے گلی کیسے ٹھیک ہو سکتی ہے؟" انہوں نے فرمایا "تم کالم لکھو گے" یہ کالم کسی صاحب اقتدار کی نظر سے گزرے گا وہ چیئر مین سی ڈی اے کو حکم دے گا اور ایک سی ڈی میں ہماری گلی مرمت ہو جائے گی" میں نے قہقہہ لگایا اور ان سے پوچھا "اگر یہ کالم کسی صاحب اقتدار کی نظر سے نہ گزرا تو؟" انہوں نے غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھا اور سنجیدگی سے بولے "یہ کیسے ممکن ہے" تم لوگوں کے کالم نیچے سے لے کر اوپر تک پڑھے جاتے ہیں اور حکمران ان پر عملدرآمد بھی کرتے ہیں" میں نے مسکرا کر جواب دیا "سرور صاحب جو لوگ قرآن مجید پر عمل نہیں کرتے وہ کالم پر کیا خاک توجہ دیں گے" وہ خاموش رہے میں نے عرض کیا "میں آپ کو گلی ٹھیک کرانے کا ایک حیرت انگیز نسخہ بتاؤں" اس نسخے کے ذریعے دنیا کا بوسے بڑا مسئلہ حل ہو سکتا ہے" وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگے میں نے عرض کیا "آپ دفتر کیلئے گھر سے کب نکلتے ہیں" وہ بولے "سازمے آٹھ بجے" میں نے عرض کیا "آپ کل آٹھ بجے نکلیں راستے میں سی ڈی اے کے دفتر رکھیں متعلقہ ڈپٹی ڈائریکٹر اور ڈائریکٹر کو تلاش کریں ان کے دفتر میں جائیں اور نہایت شائستگی سے ان سے عرض کریں جناب میں فلاں سیکٹر کا رہنے والا ہوں ہماری گلی اتنے عرصے سے خراب ہے آپ مہربانی فرما کر گلی ٹھیک کرا دیں" ان سے اتنا عرض کریں اور آٹھ کرا جائیں" وہ میری طرف حیرت سے دیکھ کر بولے "کیا وہ لوگ گلی ٹھیک کرا دیں گے" میں نے فوراً نفی میں سر ہلایا "وہ نہیں کرائیں گے" آپ دوسرے دن دوبارہ ان کے دفتر جائیں ان سے ملیں اور اسی شائستگی کے ساتھ اپنی عرض دہرا دیں اور اپنے دفتر چلیں جائیں" تیسرے دن ایک بار پھر جائیں عرض کریں اور دفتر چلے جائیں اور اس کے بعد اسے اپنا معمول بنالیں روز دس منٹ کیلئے سی ڈی اے کے دفتر رکھیں ان لوگوں سے عرض کریں سلام کریں اور واپس آ جائیں مجھے یقین ہے دس پندرہ دن بعد وہ لوگ آپ کی بات پر سنجیدہ ہو جائیں گے اور آپ کی گلی پر کام شروع ہو جائے گا" وہ مسکرائے اور شرارتی لہجے میں بولے "اگر اس کے باوجود کام نہ ہوا تو؟" میں نے قہقہہ لگایا "پھر آپ اپنے ساتھ دو مصالحوں کو شامل کر لیجئے گا" آپ آٹھ بجے سی ڈی اے جائیں آپ کے بعد



دوسرا ہمسایہ چلا جائے وہ مسکرا کر سلام کرے اور آپ بھی شائستگی کے ساتھ مطالبہ دوہرا دے اور رخصت ہو تو تیسرا ہمسایہ ڈائریکٹر کے دفتر میں داخل ہو جائے اور نہایت عاجزی کے ساتھ اپنی گلی کا مسئلہ بیان کر دے میں دعوے سے کہتا ہوں یہ نسخہ ضرور کامیاب ہوگا۔ میرے دوست نے قہقہہ لگایا اور رخصت ہو گیا۔

میرے وہ دوست دس دن بعد تشریف لائے تو ان کا چہرہ خوشی سے تھما رہا تھا، وہ میرے گلے لگے اور فحش کر بولے ”آج ہماری گلی کی تعمیر شروع ہو گئی ہے“ میں نے قہقہہ لگایا اور ان سے عرض کیا ”یہ انسانی نفسیات ہے دنیا کا کوئی شخص کسی کی بیس دن سے زیادہ درخواست رد نہیں کر سکتا لیکن اس کے لئے ضروری ہے درخواست کرتے ہوئے آپ کا لہجہ نہایت شائستہ اور عاجز ہو اس عمل کے دوران صاحب اختیار شخص تیسرے یا چوتھے دن چڑ جاتا ہے وہ آپ کو لعن طعن کرتا ہے وہ آپ کو جھڑ پلاتا ہے اور وہ بعض اوقات آپ کو گالی بھی دے دیتا ہے لیکن آپ نے اس کے رد عمل میں چڑنا نہیں، آپ نے گالی کا جواب گالی اور نفرت کا جواب نفرت سے نہیں دیا“ آپ نے اپنے مطالبے کو اپنا حق ثابت کرنے کی کوشش بھی نہیں کرنی، آپ نے اس کی جھڑ کے جواب میں بس اتنا عرض کرنا ”جنا ب آپ کی بہت مہربانی ہوگی آپ بس ایک بار جا کر ہماری گلی دیکھ لیں ہم آٹھ دس ہزار لوگ آپ کے کمون ہوں گے اور دوسرے دن دوبارہ اسی شائستگی اور محبت کے ساتھ اس کے دفتر پہنچے جائیں“ میرا دعویٰ ہے پھر سے پھر اور جاہل سے جاہل ترین شخص بھی دس سے پندرہ دن میں مکمل جائے گا اور آپ کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے گا اگر اس سارے عمل کے دوران کسی دن آپ پھر اسٹاپ لوڈ کر گئے آپ نے اس افسر پر چڑھائی کر دی، آپ نے اسے ڈانٹ پلا دی یا آپ نے گلی کو اپنا قانونی اور شہری حق ثابت کرنے کی کوشش کی تو آپ یہ جنگ ہار جائیں گے، وہ افسر آپ کو بدتمیز، بے وقوف اور مغرور کہے گا اور سبز ٹھونک کر آپ کے سامنے کھڑا ہو جائے گا یوں یہ ایک جائز مسئلہ دو اشخاص کی ان کی جنگ بن جائے گا۔“

میرے دوست نے قہقہہ لگایا اور فحش کر بولا ”تم نے یہ فارمولا کہاں سے سیکھا“ میں نے بھی قہقہہ لگایا ”میں نے یہ فارمولا انشورنس ایجنٹوں اور تبلیغی جماعت سے سیکھا، یہ دونوں ”شیعے“ اس فارمولے پر عمل کرتے ہیں، انشورنس ایجنٹ ایک بار آپ کے پاس آتا ہے، آپ معذرت کر لیتے ہیں لیکن وہ اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجا کر دوسرے دن پھر حاضر ہو جاتا ہے، آپ انکار کرتے ہیں لیکن وہ اپنا بدتمیز مز پر رکھ جاتا ہے، تیسرے اور چوتھے دن اس کا ٹیلی فون آ جاتا ہے اور اس کے بعد اس وقت تک اس کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا ہے جب تک آپ اس کے سامنے ”سریعہ زخم“ نہیں کرتے۔ تبلیغی جماعت کے لوگ بھی اسی سپرٹ سے کام کرتے ہیں، یہ اسلام علیکم کہتے ہیں اور آپ کو نماز کی دعوت دیتے ہیں، آپ نفرت سے دروازہ بند کر دیتے ہیں لیکن یہ اگلے روز آپ کو دوبارہ ”گھیر“ لیتے ہیں، آپ ان سے بھاگتے ہیں لیکن یہ لوگ کبھی آپ کی دکان پر پہنچ جاتے ہیں اور کبھی آپ کے گھر اور آپ کے کھیل کے میدان میں، آپ ان سے معذرت کرتے ہیں، آپ ان کے ساتھ بدتمیزی کرتے ہیں، انہیں جھڑ پلاتے ہیں اور بعض اوقات ان کے ساتھ دست و گریبان تک ہو جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کے ماتھے پر شکن نہیں آتی، یہ اسی شائستگی اور محبت سے آپ کے ساتھ مخاطب ہوتے ہیں آپ کو دعوت دیتے رہتے ہیں یہاں تک

کہ ایک دن آپ بھی اپنا بستر باندھتے ہیں، اپنا لوٹا اٹھاتے ہیں اور ان کے ساتھ تبلیغ کیلئے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس صرف چار تھپڑا ہوتے ہیں، نیک مقصد، مقصد کے ساتھ اخلاص، شائستگی اور تسلسل لہذا میں نے یہ فارمولہ ان لوگوں سے سیکھا اگر آپ ان کے فارمولے کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں شامل کر لیں تو آپ اپنی جگہ سے لے کر عدالت تک اپنے سارے مسئلے حل کر سکتے ہیں، آپ اپنے سارے نظام ٹھیک کر سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کے قہانے کا ایس ایچ اور رشوت لیتا ہے تو آپ دفتر جانے سے پہلے روز اس کے دفتر وکس اور نہایت شائستگی سے عرض کریں ”سر لوگ آپ کے بارے میں بڑے پریشان ہیں، مہربانی فرما کر اپنے چیک ایچ پر توجہ دیں“ اور وہاں سے آجائیں، دوسرے دن، تیسرے دن، چھ یقین ہے وہ جب چوتھے دن رشوت لینے لگے گا تو اس کا ہاتھ کاٹنے کا وہ گھبرا کر دائیں بائیں ضرور دیکھے گا، اسی طرح اگر آپ کسی جج سے مطمئن نہیں ہیں تو آپ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے دفتر جائیں، چیف جسٹس سے ملاقات کی درخواست کریں۔ شروع شروع میں پی اے انکار کرے گا، آپ اصرار کیے بغیر واپس آجائیں، دوسرے دن دوبارہ چلے جائیں، اس کے بعد تیسرے دن چوتھے دن اور پانچویں دن بالآخر کسی دن آپ کی ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ آپ ان سے اپنا مسئلہ بیان کر دیں وہ ہمدردانہ غور کا وعدہ کریں گے، آپ شکریہ ادا کر کے واپس آجائیں۔ اس کے بعد آپ اگلے دن دوبارہ جائیں اور پی اے سے درخواست کریں وہ چیف صاحب کو آپ کا کام یاد کر اوسے، آپ اتنا کہہ کر واپس آجائیں، اگلے دن، اس سے اگلے دن اور اس سے اگلے دن آپ پی اے کے پاس جاتے رہیں اور انہیں یاد کراتے رہیں، اس دوران اگر آپ چند مزید لوگوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیں تو پی اے اور چیف جسٹس کیلئے یہ نفسیاتی دباؤ برداشت کرنا ممکن نہیں رہے گا یوں آپ کا کام ہو جائے گا۔ میرے دوست نے مسکرا کر کہا ”لیکن یہ کھیل خطرناک بھی ہو سکتا ہے“ میں نے تہقیر لگایا ”نیکی کا ہر کھیل خطرناک ہوتا ہے، اگر تبدیلی آسان ہوتی تو دنیا کا کوئی نئی ہجرت کرنا اور نہ ہی عسرت کی زندگی گزارنا، دنیا میں نیکی اور تبدیلی تسلسل بھی مانگتی ہے اور شائستگی بھی، یہ نبیوں کا کام ہے لہذا اس کے لیے نبیوں جیسی استقامت، اولیاء کرام جیسی نیک نیتی اور قلموں جیسی شائستگی اور کار ہوتی ہے اور یقین کیجئے اگر آپ ایک بار اس راستے پر چل پڑے تو کامیابی ضرور آپ کا مقدر بنتی ہے۔ یہ اللہ کا انسان سے وعدہ ہے اگر وہ نیک نیتی سے کسی بھلائی کے کام میں شامل ہو اور اس میں استقامت کا مظاہرہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے لہذا جس طرح آپ نے دس دن میں اپنی جگہ خالی بالکل اسی طرح آپ جیسے چند سو لوگ دس دس پندرہ پندرہ دن میں اس ملک کے سارے مسائل حل کر سکتے ہیں، بس اس کے لئے استقامت کے دس دن چاہئیں۔“





## قربانی فنڈ

یہ سہرا ہاسٹل اور چوتھی بیٹی تھی، میں حاجی صاحب کے ساتھ چل چل کر تھک گیا لیکن حاجی صاحب کام پھولا تھا اور نہ ہی ان کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے وہ مسلسل چل رہے تھے ہم ہاسٹل میں داخل ہو گئے صید کی چھٹیوں کے بعد ہاسٹل آہستہ آہستہ باد ہو رہا تھا بچیاں بکسوں، لٹینی کیسوں اور بیگوں کے ساتھ جیکبوں سے اتر رہی تھیں ہاسٹل کے دینٹک روم میں مختلف بچیوں کے والدین بیٹھے تھے ہم دونوں بھی ایک کونے میں سکر کر بیٹھ گئے حاجی صاحب نے ہاسٹل کی مائی کو چٹ پر بچی کا نام لکھ کر دیا اور ہم انتظار کرنے لگے تھوڑی دیر بعد ایک دھان پان سی بچی آئی اس نے ہمیں سلام کیا حاجی صاحب نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا 'ناگل سے' 'دو چ' نکالا بچی کو پکڑ لیا سلام کیا اور ہم باہر آ گئے ہم اب ہولی فمیلی ہسپتال کی طرف چل پڑے حاجی صاحب راستے میں ایک میڈیکل سنٹر پر رے سنٹر کا مالک حاجی صاحب کو دیکھ کر کاؤنٹر سے باہر آیا اور عقیدت سے ان کے ہاتھ چومنے لگا حاجی صاحب اسے کونے میں لے گئے وہ دونوں چند لمحوں تک سرگوشتیاں کرتے رہے اس کے بعد حاجی صاحب نے جیب سے نوٹوں کا بٹنل نکالا اور سنٹر کے مالک کے حوالے کر دیا مالک نے ایک بار پھر حاجی صاحب کے ہاتھ پر بوسا دیا اور ہم باہر آ گئے۔

میں بری طرح تھک چکا تھا مجھے اب "بریک" چاہیے تھی میں نے حاجی صاحب سے چائے کی فرمائش کر دی حاجی صاحب مجھے ہسپتال کی کینٹین پر لے گئے ہم دونوں دھوپ میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے میں نے حاجی صاحب سے اس سارے کو دکھ دھندے کے بارے میں پوچھا شروع کر دیا حاجی صاحب مسکرائے اور شرمیلے شرمیلے لہجے میں بولے "میں قربانی فنڈ تقسیم کر رہا ہوں" میں نے حیرت سے پوچھا "یہ قربانی فنڈ کس بلا کا نام ہے" حاجی صاحب مسکرائے "میں نے تین سال پہلے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر سوچا تھا ہم لوگ ہر سال عید الاضحیٰ پر پانچ جانوروں کی قربانی دیتے ہیں ہم بکرے، بیل اور اونٹ ذبح کرتے ہیں ان کا گوشت کھاتے ہیں اور لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں ہماری اس قربانی سے معاشرے کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟ پتہ چلا یہ قربانیاں خالصتاً ہماری ذات تک محدود ہیں ہم میں سے بے شمار لوگ قربانی کو عبادت کی بجائے اپنی امارت کا اظہار سمجھتے ہیں ہم بڑے فخر سے لوگوں کو بتاتے ہیں ہم نے قربانی کے لئے اسنے لاکھ لاکھ اونٹ خریدے ہم پانچ پانچ لاکھ روپے کا بیل خریدا ہے



ہیں اور اخبارات میں اس کی تصویریں چھپواتے ہیں اور ہم منڈی کا سب سے مہنگا اور اچھا بکر خرید کر گلی میں باندھ دیتے ہیں، ہمیں اس غور و خوض کے دوران محسوس ہوا ہمارے معاشرے میں قربانی قربانی نہیں رہی وہ نمائش بن گئی ہے اور یہ اسلام کی روح کے منافی ہے، ہم نے یہ بھی محسوس کیا ہمارا معاشرہ غربت، بے بسی اور بیماری کی اس سلسلے تک پہنچ چکا ہے جہاں پانچ پانچ جانوروں کی قربانی عبادت کی بجائے ظلم اور زیادتی محسوس ہوتی ہیں، تم خود سوچو ہمارے مسائے میں مریض دوا کی ایک گولی کو ترس رہا ہے، ایم اے کے طالب علم کے پاس فیس کے لئے پیسے نہیں ہیں، لوگوں کے گھروں میں چار چار بچیاں ہاتھ پیلے ہونے کا انتظار کر رہی ہیں، لوگوں کے دلوں کو روگ لگے ہوئے ہیں، لوگوں کے گردے نفل ہو رہے ہیں اور ہزاروں لاکھوں بچے خون کی ناقابل علاج بیماریوں کا شکار ہیں اور ہم پانچ پانچ لاکھ روپے کا تیل خرید رہے ہیں اور عید کے دن اس کی قربانی کا جشن منا رہے ہیں، کیا یہ بات اسلامی اور اخلاقی نقطہ نظر سے درست ہوگی؟ وہ خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگے، میں نے نرم آواز میں جواب دیا، ”قربانی مسلمان پر واجب ہے“ حاجی صاحب نے قہقہہ لگایا اور فیس کر بولے، ”میں دھبیٹ سے انکار نہیں کر رہا لیکن اسلام نے قربانی دینے کا حکم دیا ہے، اس نے پانچ لاکھ کا تیل زنج کرنے یا جانور کی نمائش کا حکم نہیں دیا، تم دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دو جن معاشروں میں مائیں اپنی بیٹیوں کو غربت کے ہاتھوں بچ دیں اور لوگ دل کے علاج کے لئے گروہ فروخت کر دیں کیا ان معاشروں میں قربانی کو نمائش کی شکل دے دینا زیادتی نہیں؟ وہ ایک لمحے کے لئے رکے اور ذرا سا ٹھہر کر بولے، ”تم بتاؤ اگر تمہارے سامنے کوئی شخص جل کر مر رہا ہو اور تم نماز کی نیت کر کے کھڑے ہو جاؤ تو اسلام میں تمہاری اس نماز کی کیا حیثیت ہوگی؟“ میں خاموش رہا، ”حاجی صاحب جوش میں بولے، ”دین کے ہر فرض کی قضاء موجود ہے لیکن دنیا کے کسی فرض اور کسی ذمہ داری کی کوئی قضا ہے اور نہ ہی معافی، اگر ہماری ذرا سی غفلت، ذرا سی کوتاہی اور ذرا سی بے حسی سے فرات کے کنارے کوئی کتا بھوکا مر جائے تو حضرت عمر فاروقؓ جیسے جلیل القدر خلیفہ تک خود کو اس کا ذمہ دار سمجھتے ہیں، وہ تک اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جوابدہ ہوں گے“

حاجی صاحب ٹریک سے ہٹنے لگے لہذا میں انہیں فوراً واپس قربانی فٹڈ کی طرف لے آیا، وہ چمکے اور دوبارہ بولے، ”ہم دوستوں نے سوچا، ہماری قربانی قربانی کم اور نمائش زیادہ ہے لہذا ہم نے فیصلہ کیا ہم لوگ آئندہ صرف ایک ایک جانور کی قربانی دیں گے اور یہ جانور بھی تین ہزار سے مہنگا نہیں ہوگا اور ہم لوگ قربانی کے پیسے جمع کریں گے اور یہ رقم ضرورت مند طالب علموں اور مریضوں میں تقسیم کر دیں گے۔ اس سال ہمارے پاس دو لاکھ روپے جمع ہوئے تھے، ہم نے چار طالب علم بچیاں تلاش کیں، ان بچیوں کے والدین انتہائی غریب ہیں لیکن اس کے باوجود یہ بچیاں ایم اے اور ایم ایس ہی کر رہی ہیں، میں نے ان بچیوں کی فیس کے دو چلے، بچیوں میں ان کی فیس جمع کرانی اور آج میں انہیں رسیدیں دینے نکلا ہوں، اسی طرح ہم نے اس میڈیکل سٹور کے مالک کے ساتھ ایک ”ارٹھسٹ“ کر رکھا ہے، اس کے دو کرز ہسپتال میں پھرتے رہتے ہیں، انہیں جوں ہی کوئی ضرورت مند مریض ملتا ہے، یہ ہمارے کھاتے سے اس مریض کو مفت ادویات دے دیتا ہے“ حاجی صاحب خاموش ہو

مگے۔ میں نے ان سے پوچھا ”کیا آپ نے اس معاملے میں کسی عالم دین سے فتویٰ لیا تھا“ حاجی صاحب مسکرائے ”عبادت اللہ اور بندے کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے، ہم نے سوچا ہمیں اس ذاتی معاملے میں کسی تیسرے کو شریک نہیں کرنا چاہیے لہذا ہم لوگ چپ چاپ یہ کام کر رہے ہیں اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے درخواست کر رہے ہیں یا باری تعالیٰ اگر یہ غلط ہے تو ہمیں معاف فرما دے اور اگر ہم صحیح کر رہے ہیں تو ہماری اس چھوٹی سی قربانی کو قبول فرمائے“ حاجی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، انہوں نے رومال سے آنکھیں پونچھیں اور نرم آواز میں بولے ”ہم اپنے عمل کی مذہبی اور اسلامی پوزیشن سے ناواقف ہیں لیکن ہم اتنا جانتے ہیں تازہ ترین عید الاضحیٰ پر پاکستان کے شہریوں نے 70 لاکھ جانوروں کی قربانی دی، لاہور شہر میں 70 ہزار جبکہ راولپنڈی اور فیصل آباد میں پچیس پچیس ہزار بڑے جانور ذبح کیے گئے اور اس سال پاکستان میں ایک لاکھ اونٹ ذبح ہوئے۔ اگر ہم ان جانوروں کی مالیت نکالیں تو یہ 90 ارب روپے بنتے ہیں۔ تم اس رقم کو طبی، تعلیمی اور فلاحی شعبے میں بھینا کر دیکھو اور فیصلہ کرو، اس رقم سے کتنے لوگوں کی زندگیاں بدل سکتی تھیں۔ کتنے مریضوں کے دکھ درد اور تکلیفیں ختم ہو سکتی تھیں اور کتنے طالب علم اپنی تعلیم مکمل کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں پانچ لاکھ روپے میں ایک ڈاکٹر بنتا ہے اور یہ ڈاکٹر زندگی میں اوسطاً ایک لاکھ لوگوں کا علاج کرتا ہے، فرض کرو اگر ہم یہ رقم ایف ایس سی کے طالب علموں کو دے دیجے تو ملک کو لاکھوں نئے ڈاکٹر مل جاتے اور یہ ڈاکٹر ہر سال کروڑوں مریضوں کو فیض پہنچاتے اس وقت شوکت خانم، ایچی فاؤنڈیشن اور سہارا جیسے سنگتوں اور ادارے قربانی کی کھالوں پر چل رہے ہیں۔ تم ذرا تصور کرو اگر ان اداروں کو کھالوں کی جگہ جانوروں کی قیمت مل جائے، لوگ انہیں بکروں، گائیوں، بیلوں اور اونٹوں کی قیمت دے دیں تو کتنے مریضوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اسی طرح اگر ہم پاکستان کے سات بڑے شہروں میں انتہائی جدید یونیورسٹیاں بنائیں اور ان شہروں کے لوگ ہر سال ان یونیورسٹیوں میں قربانی کے پیسے جمع کرا دیں تو تم سوچو ملک میں کتنا بڑا انقلاب آ جائے گا، ہم اگر پاکستان کے تمام بڑے چھوٹے شہروں، قصبوں اور دیہات میں ہسپتال اور یہ ڈسپنسریاں بنائیں اور ڈسپنسریاں اور ہسپتال قربانی کے پیسوں سے چلیں تو تم خود سوچو کیا پاکستان میں صحت کا مسئلہ رہے گا؟“ دور کے اور دوبارہ بولے ”اگر ہم نے قربانی پر اجتہاد نہ کیا، اگر ہم نے شہر شہر میں قربانی فنڈ قائم نہ کئے تو یقیناً کروڑوں اس معاشرے کو قربان کھاٹے تک لے جائے گی اور ہم سب کی گردن پر چھری پھر جائے گی“ وہ اٹھے انہوں نے آنکھوں پر رومال رکھا اور آہستہ آہستہ لہجے میں بولے ”میں سمجھتا ہوں پاکستان میں تین ہزار روپے سے بہتے اور دوسرے جانور کی قربانی پر پابندی ہونی چاہیے“





## اللہ کے نام پر

ان کی بات حیران کن تھی۔ میں نے انہیں ہمیشہ خیر کے کاموں سے دور دیکھا تھا، ان میں وہ تمام عیب موجود تھے جنہیں شریعت عیب سمجھتی ہے، ان کے محلے کے کسی شخص نے انہیں کبھی نماز پڑھنے نہیں دیکھا تھا، وہ سال میں پانچ بار تھائی لینڈ جاتے تھے، کرکٹ کے سیزن میں جوا کھیلتے اور کھلاتے تھے اور شراب ان کیلئے پانی کی حیثیت رکھتی تھی، ان کے تمام احباب انہیں ”پریکٹیکل“ کہتے تھے، وہ زندگی کے تمام معاملات میں عملیت پسند انسان تھے وہ افسروں، سیاستدانوں اور مانتوں کے ساتھ براہ راست سودے بازی کرتے تھے اور ان کا کہنا تھا ”جب تک کوئی افسر رشوت نہ لے اس وقت تک آپ اس کے وعدے پر یقین نہ کریں“ وہ ہمیشہ حکومتی پارٹی میں شامل رہے ہیں، بے نظیر بنو کے دور میں وہ میٹروپولیٹن میں تھے، نواز شریف کے دور میں وہ بچے مسلم لیگ تھے، 12 اکتوبر کے بعد وہ فوج کے ڈپٹی اور محبت الوطنی کے گن گاتے تھے 2002ء کے بعد وہ ق لیگ کے سرگرم رکن بن گئے اور آج کل وہ ایک بار پھر پیپلز پارٹی کی تعریف کر رہے ہیں، ہم سب دوست انہیں ”وقت کی آواز“ کہتے ہیں لیکن کل انہوں نے ایک ایسی بات کہی جس نے میرے جسم کی آخری رگیں تک ہلا دیں، وہ گزشتہ روز میرے پاس تشریف لائے اور انہوں نے سرگوشی میں کہا ”میرے پاس ایک لاکھ روپے ہیں، اگر تمہاری نظر میں کوئی مستحق فیملی ہو تو میں یہ رقم اسے دینا چاہتا ہوں“ میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا، وہ مسکرائے اور سر جھکا کر بولے ”میں نے جوانی میں محنت کر کے ایک دکان خریدی تھی، یہ دکان میری حق حلال کی کمائی تھی، میں نے یہ دکان کرائے پر چڑھا رکھی ہے، میں اس کا کرایہ جمع کرتا رہتا ہوں اور رمضان میں یہ رقم ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتا ہوں“ میری حیرت میں اضافہ ہو گیا، وہ مزید بولے ”میری باقی دولت منگھوک ہے، میں دل سے اسے پاک رزق نہیں سمجھتا لہذا میں اسے نیکی کے کاموں میں خرچ کرتے ہوئے ڈرتا ہوں لیکن میری یہ جائیداد وسیع حلال اور پاک ہے چنانچہ میں نے اسے اللہ کے بندوں کیلئے وقف کر رکھا ہے، تم مہربانی فرما کر مجھے چند ضرورت مند تلاش کرو۔“

وہ چلے گئے لیکن اپنے پیچھے سوچ کی ایک لمبی لکیر چھوڑ گئے، میں نے سوچا ہمارے ملک کے لوگوں میں خدا ترسی، انسانیت اور اللہ تعالیٰ کا خوف موجود ہے ہم میں سے ہر شخص اپنی بہت کے مطابق اللہ کی راہ میں خرچ



کرتا رہتا ہے یہ اس معاشرے کا ایک دوسرا پہلو ہے، بچپنوں میں مری ملاقات ڈاکٹر امجد ثاقب سے ہوئی، ڈاکٹر امجد ثاقب آب زم زم کی طرح اُچلے اور آئینے کی طرح شفاف انسان ہیں، وہ سول سروس میں تھے، ڈی ایم جی گروپ میں تھے، جب شہباز شریف پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے تو وہ ان کے سیکرٹری تھے، سول سروس سے وہ پنجاب رورل سپورٹ پروگرام میں گئے اور وہاں انہوں نے ”اخوت“ کے نام سے ایک معجزاتی تنظیم کی بنیاد رکھ دی۔ اس تنظیم کا آغاز ایک دلچسپ واقعہ تھا، ڈاکٹر صاحب کے ایک دوست سلیم رانجھا نے انہیں دس ہزار روپے دیئے، ڈاکٹر صاحب نے یہ دس ہزار روپے لاہور کی ایک خاتون کو بطور قرض دے دیئے، اس قرض سے پاکستان کی پہلی مائیکرو فنانس تحریک کا آغاز ہوا، ڈاکٹر صاحب کی تنظیم لاہور اور راولپنڈی میں انتہائی ضرورت مند لوگوں کو بلا سود قرضے دیتی ہے، قرضہ لینے والی خواتین اور حضرات اس رقم سے کاروبار کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی قسطوں میں یہ قرضہ واپس کرتے ہیں، اس تنظیم نے لاہور اور راولپنڈی میں کمال کر دیا، اس وقت 12 ہزار سے زائد لوگ اس تنظیم سے مستفید ہو چکے ہیں جبکہ اخوت لوگوں کو 14 کروڑ روپے سے زائد رقم بطور قرض دے چکی ہے، یہ 14 کروڑ روپے اہل ثروت نے اخوت کو دیئے تھے ڈاکٹر صاحب پاکستان میں ڈاکٹر یونس بن کر ابھر رہے ہیں جبکہ اخوت ”گرامین بینک“ کی طرح معاشرے کی جڑوں تک پہنچ رہی ہے، میں وہاں ڈاکٹر امجد ثاقب کی طرف آتا ہوں۔ میری ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے عجیب بات بتائی، انہوں نے بتایا پاکستان کا شمار خیرات کرنے والے پانچ بڑے ممالک میں ہوتا ہے اس وقت دنیا کے 140 ممالک میں خیرات کا سسٹم موجود ہے جن میں پاکستانی فی کس آمدنی کے لحاظ سے دنیا میں خیرات کرنے والے لوگوں میں پانچویں نمبر پر آتے ہیں، پاکستان میں 1998ء میں 70 ارب روپے خیرات کئے جاتے تھے جبکہ آج 2006ء میں یہ رقم 150 ارب روپے تک پہنچ چکی ہے، ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا لوگوں کا یہ جذبہ حیران کن بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ میں ان کی بات پر بھی حیران ہو گیا۔

ڈاکٹر امجد ثاقب نے مجھے پاکستانی معاشرے کا ایک نیا پہلو دکھایا، ہم روڈ انڈیا اس معاشرے کا سیپا کرتے رہتے ہیں، ہمیں اس ملک اس معاشرے میں ہزار ہزار کینز نظر آتے ہیں لیکن ہم نے کبھی اس معاشرے کے ان چھتروں کے پیچھے جھانک کر نہیں دیکھا، ہم نے کبھی اس معاشرہ کا صاف، شفاف اور معطر جسم نہیں دیکھا، یہ ملک تضادات کا عجیب مجموعہ ہے۔ اس ملک میں جہاں کرپشن، لاقانونیت، ہیرا پھیری اور زبردستی ہے، اس ملک میں جہاں فوج پریم پاور ہے اس میں جہاں ق لیگ جیسی سیاسی سوچ کی بہتات ہے اس میں جہاں ”یونین“ بسب سے بڑی سفارتکاری ہے اور اس میں جہاں رچرڈ آرمیج جیسے لوگ حکومت کر رہے ہیں وہاں اس ملک میں خدا ترسی، رحم، خدمت اور محبت کا ایک نہ نظر آنے والا نظام بھی موجود ہے، اس ملک میں اس وقت 8100 چھوٹے بڑے دربار ہیں اور ان درباروں پر چوبیس کھینے لنگر چلتا ہے اور ہزاروں لاکھوں لوگ ان لنگروں سے مفت کھانا کھاتے ہیں، یہ لنگر کیسے چل رہے ہیں، ان کیلئے آٹا، دالیں، چاول، گھی، چینی اور گوشت کہاں سے آتا ہے، آج تک کسی

یہ سمجھ نہیں آ سکا، ہمارے ملک میں دنیا کی سب سے بڑی ”پاورٹی لائن“ ہے، پاکستان میں اس وقت سات کروڑ لوگ خطا فرست سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں، یہ لوگ کیسے زندہ ہیں؟ دنیا کے بڑے بڑے ماہرین آج تک اس کا انداز نہیں لگا سکے، یہ سات کروڑ لوگ اعلیٰ خیر اور اعلیٰ ثروت کی خدا ترسی سے زندہ ہیں، اس ملک میں ایسے لاکھوں ہاتھ ہیں جو رات کے اندھیرے میں آگے بڑھتے ہیں اور لاکھوں ضرورت مندوں کی مدد کر کے واپس چلے جاتے ہیں اور دوسرے ہاتھ تک کو اس کی خبر نہیں ہوتی، اس ملک میں ایسے سینکڑوں ہزاروں ہسپتال، سکول، مدرسے، مساجد اور یتیم خانے ہیں جو صاحبانِ ثروت کی امداد سے چل رہے ہیں اور اس ملک میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو بھوکا سوتا ہو اور شاید ہی کوئی ایسا مریض ہو جسے دوا نہ ملتی ہو اور اس ملک میں شاید ہی کوئی ایسا ضرورت مند ہو جس تک اللہ تعالیٰ کا فیسی ہاتھ نہ پہنچتا ہو۔

اس ملک میں کوئی ایسا خفیہ نظام موجود ہے جو لوگوں کی امید کا دھاگہ نہیں ٹوٹنے دیتا، جوان کی زندگی کو گھوکوز دیتا رہتا ہے، ہم لوگ کہتے بد قسمت ہیں ہمیں اس ملک کو توڑنے، لوٹنے اور خراب کرنے والے تو نظر آتے ہیں لیکن اس ملک اور اس ملک کے لوگوں کو سہارا دینے اور خدمت کرنے والے دکھائی نہیں دیتے، ہم جیتھڑوں میں لپٹے ہوئے لعل نہیں دیکھ سکتے۔ میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں ”جب تک ہمارے ملک میں رانا صاحب اور حضرت بری امام کے سنگرمٹل رہے ہیں جب تک ہم لوگ اللہ کے نام پر اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈالتے رہیں گے اس وقت تک یہ یہ ملک قائم رہے گا“



## عصر کی قسم

میں نے عرض کیا "خوبصاحب سائنس نے کمال کر دیا ہے، قدرتی آفتیں اور بیماریاں انسان کے دو بڑے مسئلے ہیں، سائنس ان دونوں کے حل کے قریب پہنچ چکی ہے، اب وہ وقت دور نہیں جب انسان آفتوں اور عذابوں کے ہاتھ سے نکل آئے گا" وہ مسکرا کر میری طرف دیکھتے رہے وہ غم آواز میں بولے "مثلاً سائنس نے کیا کر دیا ہے؟" میں نے عرض کیا "سرزلزے، آتش فشاں، آندھیاں، طوفان اور سیلاب پانچ بڑی آفتیں ہیں، سائنس نے ان آفتوں کی پیش گوئی کا سسٹم بنالیا ہے، سائنس دانوں نے ایک ایسا کیمرہ بنایا ہے جو آتش فشاں کے پیندے میں چلا جاتا ہے اور وہاں آنے والی تبدیلیاں نوٹ کر لیتا ہے، ماہرین یہ تبدیلیاں دیکھ کر پیش گوئی کر سکیں گے، فلاحی آتش فشاں فلاحی دن اور فلاحی وقت اٹل پڑے گا، اس سسٹم کے بعد آتش فشاں کے قریب آباد لوگ وہاں سے بروقت نقل مکانی کر سکیں، یوں بے شمار لوگوں کی جانیں اور املاک بچ جائیں گی" خوبصاحب سکون سے سنتے رہے، میں نے عرض کیا "زلزلے کے ماہرین نے ایک ایسی سلاخ بنائی ہے جو زمین کی تہ میں پچاس ساڑھ کلومیٹر نیچے چلی جائے گی، یہ زمین کے اندر موجود پلٹنوں کی حرکت نوٹ کرے گی، اب جو نیکی پلیٹ میں کسی قسم کی حرکت ہوگی، ماہرین زلزلے سے کہیں پہلے زلزلے کی شدت، اس کے مرکز اور اس سے متاثر ہونے والے علاقے کا تخمینہ لگا لیں گے، جس کے بعد ماہرین اس علاقے کے لوگوں کو بروقت مطلع کر دیں گے، لہذا وہ لوگ زلزلے سے پہلے گھروں اور دفاتروں سے باہر آ جائیں گے، یوں ہزاروں لاکھوں زندگیاں بچ جائیں گی، ماہرین نے مارتوں کے ایسے ڈھانچے بھی بنائے ہیں جو ساڑھے نو درجے کی شدت سے آنے والے زلزلے میں بھی عمارت کو نقصان نہیں پہنچتے دیں گے، چنانچہ وہ وقت دور نہیں جب زلزلے آئیں گے لیکن لوگ، طہیمانان سے اپنے معمول کے کام کرتے رہیں گے" خوبصاحب بڑی توجہ سے میری بات سنتے رہے، میں نے عرض کیا "بیماریاں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہیں، سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے ہمارے جسم میں ساڑھے چار ہزار بیماریاں ہوتی ہیں اور ہر بیماری کا ایک الگ جین ہوتا ہے، سائنس دانوں نے اڑھائی ہزار مہلک بیماریوں کے جینز تلاش کر لئے ہیں، لہذا اب وہ وقت دور نہیں جب سائنس دانان تکلیف شروع ہونے سے پہلے کسی شخص کا سائیکس کریں گے، اس میں پروان چڑھنے والے جینز



کھسکے۔ ان چیز کو صحت مند چیز کے ساتھ بدل دیں گے اور مریض مرض کے حملے سے پہلے ہی صحت مند ہو جائے گا۔ انسانی کلوننگ کا عمل بھی شروع ہونے والا ہے۔ اگلے دس بیس برس میں انسان مرنے سے پہلے دوبارہ جنم لینا شروع کر دے گا۔" خوبصورت صاحب نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلادیا۔ میں نے عرض کیا "اس طرح سائنس دانوں نے آنندھیوں، طوفانوں اور سیلابوں کی پیدائش کے مراکز بھی تلاش کر لئے ہیں، ماہرین کا کہنا ہے اگر ان آفتوں کے مراکز تباہ کر دیئے جائیں تو یہ آفتیں پیدا نہیں ہوں گی۔" سائنس دان ایسے آلے بنا رہے ہیں جو ان ہوائوں، ان پانیوں اور ان موجوں کو اکٹھا نہیں ہونے دیں گے جو اکٹھی ہو کر آندھی، سیلاب اور طوفان بنتی ہیں چنانچہ اگلے بارہ برسوں میں انسان ان تینوں آفتوں پر بھی قابو پالے گا لہذا خوبصورت صاحب نے آندھی، طوفان اور وقت انسان کے لئے بڑا آئیڈیل ہو گا۔ دنیا میں انسان کے لئے کوئی چیز نہیں ہو گا۔ لوگ مطمئن آرام دہ اور سکھی زندگی گزاریں گے۔"

خوبصورت صاحب نے قہقہہ لگایا اور مجھے ٹیٹھی ٹیٹھی نظروں سے دیکھ کر بولے "تم بڑے بے وقوف ہو، یہ قدرتی آفتیں اتنی بڑی دشمن نہیں ہیں جتنا بڑا انسان، انسان کا دشمن ہے۔ آج تک انسان نے انسان کو جتنا نقصان پہنچایا ہے اتنا نقصان پچھلے دس ہزار سال میں قدرتی آفتیں مل کر نہیں پہنچا سکیں، تم یہ دیکھ لو 18 اکتوبر کے زلزلے میں جتنے لوگ مارے گئے تھے اس سے پانچ گنا زیادہ لوگ ہماری سڑکوں پر پچھلے ساٹھ برسوں میں حادثوں میں مارے گئے ہیں، ہر سال ہسایوں کے ہاتھوں جتنے ہسائے قتل ہوتے ہیں، جتنے بیٹے اپنے باپ قتل کرتے ہیں، آتشاؤں کے ہاتھوں جتنے خاندان مارے جاتے ہیں، جتنے خاندان اپنی بیویوں کو قتل کرتے ہیں، ڈاکوؤں کے ہاتھوں جتنے راگمیر مارے جاتے ہیں اور جتنے دوست ہر سال دوستوں کو قتل کرتے ہیں، یہ ساری ہلاکتیں قدرتی آفتوں سے مرنے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہیں، بیش جیسے لوگ اپنی انا کی تسکین کے لئے جتنے لوگ مار رہے ہیں، دہشت گردوں کے ہاتھوں جتنے لوگ مارے جاتے ہیں، کشمیر، فلسطین، افغانستان، سری لنکا، عراق اور چین میں انسانوں کے ہاتھوں جتنے انسان مارے جاتے ہیں، گورے کے ہاتھوں جتنے کالے مارے جاتے ہیں اور سرخ رو انسان جتنے پیلے انسانوں کو قتل کرتے ہیں یہ تعداد قدرتی آفتوں کا لقمہ بننے والے انسانوں سے کہیں زیادہ ہے ناگاساکی پر بم کس نے پھینکا تھا، ایک انسان نے اس کا نشانہ کون بنے دوسرے انسان، دوسری اور پہلی جنگ عظیم کس نے شروع کی تھی، ایک انسان نے اس جنگ کا لقمہ کون بنے دوسرے انسان کو یا کی جنگ کس نے چھیڑی تھی، دینام پر حملہ کس نے کیا تھا، روس، افغانستان جنگ کس نے شروع کی تھی، افغانستان اور عراق پر حملہ کس نے کیا تھا؟ انسان نے؟ اور ان جنگوں سے کس کو نقصان پہنچا؟ انسان کو؟ بارہ اکتوبر کا واقعہ کس کا کمال تھا؟ انسان کا اور اس کا نقصان کس کو پہنچا؟ انسان کو؟ اس دنیا میں بھائی کے ہاتھوں بھائی اور دوست کے ہاتھوں دوست مارا جاتا ہے لہذا انسان کا سیلابوں، طوفانوں اور بیماریوں سے مقابلہ نہیں، انسان کا انسان سے مقابلہ ہے اور جب تک انسان کی شرست میں تبدیلی نہیں آتی، یہ دنیا وارمن نہیں بن سکتی اس زمین پر تخریب کا عمل جاری رہے گا۔"

میں خوبصورت صاحب کی بات غور سے سنتا رہا، انہوں نے فرمایا "انسان انسان سے خائف ہے، وہ جب بھی

ذرا سا خوشحال ہوتا ہے، اسے جب بھی ذرا سا اقتدار یا اختیار ملتا ہے، وہ جب بھی ذرا سی کامیابی پاتا ہے تو وہ دوسرے انسان کو تکلیف دینا شروع کر دیتا ہے، وہ آم کھا کر گھٹلیاں بمسائے کے گھر پھینک دے گا، وہ دولا کھ کا کتا خریدے گا اور یہ کتا دوسرے کے دروازے پر باندھ دے گا، وہ انیم جم بنا کر چاہے گا ساری دنیا اس کے قدموں میں جھک جائے، وہ بادشاہ کا مصاحب بن کر چاہے گا سب لوگ اسے سلام کریں، سب لوگ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کریں، اب دوسری طرف بھی انسان ہوتا ہے، اس کے اندر بھی وہی خون، وہی انا اور وہی ہٹ دھرمی ہوتی ہے، لہذا انسان انسان کے ساتھ ٹکرا جاتا ہے اور آخر میں دونوں فنا ہو جاتے ہیں، انسان کی انسان کے ساتھ جگ میں پورس بھی مارا جاتا ہے اور سکندر بھی، دونوں خسارے میں رہتے ہیں، یہ اس زمین کا قانون ہے، لہذا انسان جب تک مقدونیہ، سرقد اور واشنگٹن کے اقتدار تک محدود نہیں رہتا، وہ جب تک دوسرے انسان پر بھگوانی کی خواہش ختم نہیں کرتا اور وہ جب تک دوسرے لوگوں سے بھیڑ چھاڑ بند نہیں کرتا اس وقت تک انسان کے ہاتھوں انسان مارا جاتا رہے گا، اس وقت تک اس زمین پر اس نہیں ہوگا، میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا، انہوں نے فرمایا ”مسائنس دانوں کو قدرتی آفتوں کی بجائے انسانی شرست کا کوئی علاج دریافت کرنا چاہئے، انہیں کوئی ایسی دوا ایجاد کرنی چاہئے جسے کھانے کے بعد صدر بٹش اور صدام حسین کی انا پر سکون ہو جائے اور دونوں ایک دوسرے سے ٹکراتا بند کر دیں، جسے کھانے سے صدر پرویز مشرف اور لواڈ شریف کے اختلافات ختم ہو جائیں اور دونوں خود کو کمزور اور چند سانسوں کے مہمان انسان سمجھ لیں، جسے کھانے سے طالبان اور امریکہ ایک دوسرے کو تسلیم کر لیں، جسے کھانے سے ایران اور امریکہ ایک دوسرے کی آزادی اور زندہ رہنے کا حق مان لیں، جسے کھانے سے انسان انسان کو معاف کر دے اور جسے کھانے سے انسان انسان سے ٹکراتا بند کر دے“

میں خاموشی سے ان کی بات سنتا رہا، انہوں نے فرمایا ”یقین کرو ایک جنگل میں دو شیر سکون اور آرام سے رو سکتے ہیں لیکن ایک جھٹ کے نیچے دو انسان لڑے، ٹکرائے اور مرے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے، شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا عصر کی قسم انسان خسارے میں ہے“



## گھائے کے سوداگر

ہنری کا تعلق امریکہ کے شہر سیائل سے تھا، وہ ہائیکرو سافٹ میں ایکریکٹو مینجر تھا، اس نے 1980ء میں جارج واشنگٹن یونیورسٹی سے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر کیا اور اس کے بعد مختلف کمپنیوں سے ہوتا ہوا ہائیکرو سافٹ پہنچ گیا، ہائیکرو سافٹ اس کے کیریئر میں ”پہلی پڑ“ ثابت ہوئی اور وہ دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا گیا، وہ 1995ء میں کمپنی میں بیماری معاوضہ لینے والے لوگوں میں شمار ہوتا تھا اور اس کے بارے میں کہا جاتا تھا جب تک ہنری کسی سافٹ ویئر کو مسکرا کر نہ دیکھ لے ہائیکرو سافٹ اس وقت تک اسے مارکیٹ نہیں کرتی، ہنری نے کمپنی میں یہ پوزیشن بڑی محنت اور جدوجہد سے حاصل کی تھی، وہ دفتر میں روزانہ 16 گھنٹے کام کرتا تھا، وہ صبح 8 بجے دفتر آتا تھا اور رات بارہ بجے گھر جاتا تھا، ہنری کا ایک ہی بیٹا تھا، ہنری دفتری مصروفیات کے باعث اپنے بیٹے کو زیادہ وقت نہیں دے پاتا تھا، وہ جب صبح اٹھتا تھا تو اس کا بیٹا سکول جا چکا ہوتا تھا اور وہ جب دفتر سے لوٹتا تھا تو بیٹا سو رہا ہوتا تھا، چھٹی کے دن اس کا بیٹا کھیلنے کے لئے نکل جاتا تھا جبکہ ہنری سارا دن سوتا رہتا تھا۔ 1998ء میں سیائل کے ایک ٹیلی ویژن چینل نے ہنری کا انٹرویو نشر کیا، اس انٹرویو میں ٹیلی ویژن کے میزبان نے اعلان کیا، ”آج ہمارے ساتھ سیائل میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی شخصیت بیٹھی ہے“، کیمرا میزبان سے ہنری پر گیا اور ہنری نے فخر سے مسکرا کر دیکھا، اس کے بعد انٹرویو شروع ہو گیا، اس انٹرویو میں ہنری نے انکشاف کیا وہ ہائیکرو سافٹ سے 500 ڈالرنی محنت لیتا ہے۔

یہ انٹرویو ہنری کا بیٹا اور بیوی بھی دیکھ رہی تھی، انٹرویو ختم ہوا تو ہنری کا بیٹا اٹھا، اس نے اپنا ”مٹی باکس“ کھولا، اس میں سے تمام نوٹ اور سکے نکالے اور گنتا شروع کر دیئے، یہ ساڑھے چار سو ڈالر تھے، ہنری کے بیٹے نے یہ رقم جیب میں ڈال لی، اس رات جب ہنری گھر واپس آیا تو اس کا بیٹا جاگ رہا تھا، بیٹے نے آگے بڑھ کر باپ کا ہیک اٹھایا، ہنری نے جھک کر بیٹے کو چہرہ کیا، بیٹے نے باپ کو صوفے پر بٹھایا اور بڑی عاجزی کے ساتھ عرض کیا ”ڈیڈی کیا آپ مجھے پچاس ڈالر ادا کر دے سکتے ہیں“ باپ مسکرایا اور جیب سے پچاس ڈالر نکال کر بولا ”کیوں نہیں میں اپنے بیٹے کو اپنی ساری دولت دے سکتا ہوں“ بیٹے نے پچاس ڈالر کا نوٹ کچلا، جیب سے ریڑ گاری اور



نوٹ نکالے، پچاس کانوٹ ان کے اوپر رکھا اور یہ ساری رقم باپ کے ہاتھ پر رکھ دی، ہنری حیرت سے بیٹے کو دیکھنے لگا، بیٹے نے باپ کی آنکھ میں آنکھ ڈالی اور مسکرا کر بولا "یہ پانچ سو ڈالر ہیں، میں ان پانچ سو ڈالروں سے سیٹل کے سب سے امیر ورکر سے ایک گھنٹہ خریدنا چاہتا ہوں،" ہنری خاموشی سے بیٹے کی طرف دیکھتا رہا، بیٹا بولا "میں اپنے باپ سے صرف ایک گھنٹہ چاہتا ہوں، میں اسے جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں، میں اسے چھونا چاہتا ہوں، میں اسے پیار کرنا چاہتا ہوں، میں اس کی آواز سننا چاہتا ہوں، میں اس کے ساتھ ہنسنا، کھیلنا اور بولنا چاہتا ہوں، ڈیڈی کیا آپ مجھے ایک گھنٹہ دے دیں گے، میں آپ کو اس کا پورا معاوضہ دے رہا ہوں،" ہنری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے بیٹے کو گلے سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ ہنری نے 1999ء میں "فیل لائف" کے نام سے ایک آرٹیکل لکھا تھا، مجھے یہ مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا، اس مضمون میں اس نے انکشاف کیا دنیا میں سب سے قیمتی چیز خاندان ہوتا ہے، دنیا میں سب سے بڑی خوشی اور سب سے بڑا اطمینان ہماری بیوی اور بچے ہوتے ہیں لیکن بد قسمتی سے ہم لوگ انہیں سب سے کم وقت دیتے ہیں، ہنری کا کہنا تھا دنیا میں سب سے بڑی بے وقاف چیز ہماری نوکری، ہمارا پیشہ اور ہمارا کاروبار ہوتا ہے، ہم آج بیمار ہو جائیں یا آج ہمارا ایکسیڈنٹ ہو جائے تو ہمارا ادارہ شام سے پہلے ہماری کرسی کسی دوسرے شخص کے حوالے کر دے گا، ہم آج اپنی دکان بند کر دیں تو کل ہمارے گاہک کسی دوسرے مشورے خریداری کر لیں گے اور آج ہمارا انتقال ہو جائے تو کل ہمارا شعبہ ہمارا پیشہ ہمیں فراموش کر دے گا لیکن بد قسمتی سے ہم لوگ دنیا کی سب سے بڑی بے وقاف چیز کو زندگی کا سب سے قیمتی وقت دے دیتے ہیں، ہم اپنی بہترین توانائیاں اس بے وقاف دنیا میں صرف کر دیتے ہیں جبکہ وہ لوگ جو ہمارے دکھ درد کے ساتھی ہیں جن سے ہماری خوشیاں اور ہماری سرگمیاں وابستہ ہیں اور جو ہمارے ساتھ انتہائی وفادار ہوتے ہیں ہم انہیں فراموش کر دیتے ہیں، ہم انہیں اپنی زندگی کا انتہائی کم وقت دیتے ہیں۔"

ہنری کی کہانی نے مجھے زندگی کا ایک دوسرا پہلو دکھایا، مجھے عیسویں ہوا ہماری زندگی میں دوسرے قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ لوگ جن کے لئے ہمارا وجود معمول کی چیز ہوتا ہے، یہ لوگ ہمیں مشین کی طرح سمجھتے ہیں، ان کی نظر میں ہم محض ایک کارکن ہیں اور یہ لوگ ہمیں میز، کرسی، ٹیبل، لیپ، گاڑی، قلم، کاغذ، نشوونما، کھڑکی اور دروازے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور یہ ہمارے بارے میں کہتے ہیں "استعمال کرو، پھینکو اور بھول جاؤ،" جبکہ دوسری قسم کے لوگ ہمیں اپنے وجود، اپنی دھڑکنوں اور اپنی سانسوں کا حصہ سمجھتے ہیں، یہ ہمارے لئے تکلیف برداشت کرتے ہیں، یہ ہمارے لئے غم سہتے ہیں، یہ راتوں کو جاگ کر ہمارا انتظار کرتے ہیں، یہ ہمارے دھروں کو آسانی تحریر سمجھتے ہیں، اور ان کی نظر میں ہمارا ایک ایک لفظ مقدس اور پاک ہوتا ہے اور یہ ہمارے اصل ساتھی ہوتے ہیں، میں نے سوچا بد قسمتی سے ہم لوگ پہلی قسم کے لوگوں کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی حصہ دیتے ہیں جبکہ ہم لوگ زندگی بھر دوسری قسم کے لوگوں کو فراموش کر کے پہلی قسم کے لوگوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں، ہم بے وقاف لوگوں سے وفاداری سمجھاتے رہتے ہیں اور وفاداروں سے بے وفائی کرتے ہیں، میں نے کسی جگہ امریکہ کے ایک رچائز

سرکاری افسر کے بارے میں ایک واقعہ پڑھا تھا اس افسر کو وائٹ ہاؤس سے فون آیا کہ فلاں دن صدر آپ سے ملنا چاہتے ہیں اس افسر نے فوراً معذرت کر لی فون کرنے والے نے وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا "میں اس دن اپنی پوتی کے ساتھ چڑیا گھر جا رہا ہوں" یہ جواب سن کر فون کرنے والے نے ترش لہجے میں کہا "آپ چڑیا گھر کو صدر پر فوقیت دے رہے ہیں" ریٹائر افسر نے نرمی سے جواب دیا "میں اس اپنی پوتی کی خوشی کو صدر پر فوقیت دے رہا ہوں" فون کرنے والے نے وضاحت چاہی تو ریٹائر افسر نے کہا "مجھے یقین ہے میں جوں ہی وائٹ ہاؤس سے باہر نکلوں گا تو صدر میرا نام اور میری شکل تک بھول جائیں گے جبکہ میری پوتی اس سیر کو پوری زندگی یاد رکھے گی لہذا میں گھانے کا سودا کیوں کروں؟ میں یہ وقت اس پوتی کو کیوں نہ دوں جو اس دن اس وقت میری شکل اور میرے نام کو پوری زندگی یاد رکھے گی جو مجھ سے محبت کرتی ہے اور جو اس دن کیلئے گھڑیاں گن رہی ہے" میں نے جب یہ واقعہ پڑھا تو میں نے کرسی کے ساتھ ٹیک لگا لی اور آنکھیں بند کر کے دیر تک سوچتا رہا ہم میں سے 99 فیصد لوگ زندگی بھر گھانے کا سودا کرتے ہیں ہم لوگ ہمیشہ ان لوگوں کو اپنی زندگی کے قیمتی ترین لمحات دے دیتے ہیں جن کی نظر میں ہماری کوئی اوقات ہماری کوئی اہمیت نہیں ہوتی جن کیلئے ہم ہوں یا نہ ہوں کوئی فرق نہیں پڑتا اور جو ہماری غیر موجودگی میں ہمارے جیسے کسی دوسرے شخص سے کام چلا لیتے ہیں میں نے سوچا ہم اپنے سنگدل پاس کو ہمیشہ اپنی اس بیوی پر فوقیت دیتے ہیں اور جو ہمارے لئے دروازہ کھولنے ہمیں گرم کھانا کھلانے کے لئے دوڑا دو بجے تک جاگتی رہتی ہے ہم اپنے بے وفا بیٹے کو اپنے ان بچوں پر فوقیت دیتے ہیں جو ہمیں ہمیشہ ہمارے پس ہماری شفقت اور ہماری آواز کو ترستے رہے ہیں جو ہمیں صرف الہموں اور تصویروں میں دیکھتے ہیں جو ہمیں یاد کرتے کرتے بڑے ہو جاتے ہیں اور جو ہمارا انتظار کرتے کرتے جوان ہو جاتے ہیں لیکن انہیں ہمارا قرب نصیب نہیں ہوتا ہم زندگی بھر انہیں ان کا جائز وقت نہیں دے پاتے میں نے سوچا ہم سب گھانے کے سوداگر ہیں۔



## Do Not Wish For Less Problems

خوبصاحب نے فرمایا ”یہ دعائیں کلی لحاظ سے غلط ہے لہذا میں اس معاملے میں آپ لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتا“ سب لوگوں کے چہرے دھواں ہو گئے کمرے میں بڑی دیر تک خاموشی رہی میں ان تمام لوگوں میں نسبتاً منہ پھٹ تھا لہذا میں نے عرض کیا ”حضور دعا تو دعا ہوتی ہے اس میں تکنیک کہاں سے آگئی“ خوبصاحب مسکرائے ”ہاں تمہاری بات درست ہے لیکن اگر تم کسی شخص کو ایک ہزار سال تک زندہ رہنے کی دعا دو اگر تم یہ دعا کرو اللہ تعالیٰ تمہارے کسی دوست کو پر لگا دے اور وہ اڑ کر لندن پہنچ جائے یا تم یہ دعا کرو تمہارے دادا دوبارہ زندہ ہو جائیں اور وہ تمہارے ساتھ بیٹھ کر چائے پیئے لگیں تو ان دعاؤں کا کیا نتیجہ نکلے گا یہ دعائیں فیکٹیکلی غلط ہیں مگر اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے وہ اگر چاہے تو پوری دنیا کے لوگوں کی عمریں ہزار سال ہو جائیں تمام انسانوں کے جسم پر سنگز نکل آئیں اور پوری دنیا کے مرحوم ”دادے“ دوبارہ زندہ ہو جائیں لیکن اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کرتا یہ ساری باتیں اس کی ترجیحات میں شامل نہیں ہیں اس نے ایک سسٹم بنا دیا ہے اور وہ عموماً اس سسٹم میں کوئی تبدیلی نہیں لاتا“ وہ خاموش ہو گئے ہمارے ایک ساتھی نے پوچھا ”لیکن اگر کوئی بندہ اللہ سے یہ درخواست کرے یا باری تعالیٰ میرے مسائل اور مصائب میں کمی کر دے تو اس دعا میں کیا خرابی ہے یہ دعائیں کلی لحاظ سے کیسے غلط ہو گئی“ خوبصاحب مسکرائے ”آپ کے دوست نے فرمایا تھا آپ میرے مسائل اور مصائب کے خاتمے کیلئے دعا کریں جبکہ میں نے عرض کیا یہ خرابی فیکٹیکلی غلط ہے میں نے یہ دعائی نئی رسالت کی حیات طیبہ کی بنیاد پر ہی کیا تھا حضور کا فرمان ہے دنیا مصائب کا گھر ہے اب تم خود بتاؤ اگر یہ دنیا مصائب کا گھر ہے تو کیا اس دنیا میں وہ مصائب سے چھٹکارہ ممکن ہے؟ نہیں ممکن لہذا ہم اگر مسائل اور مصائب سے چھٹکارے کی دعا کریں گے تو وہ سیدھی سادی موت کی دعا ہوگی“ وہ خاموش ہو گئے ہم سب پریشان ہو گئے۔

یہ ایک نیاز اور یہ نظر اور زندگی کا ایک نیا پہلو تھا ہم نے خوبصاحب سے پوچھا ”اصل دعا کیا ہے“ انہوں نے منطقی منطقی نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور بولے ”میرے بھگوان اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ دعا کرتی چاہیے وہ ہمیں زندگی کے مسائل اور مصائب سے بچنے کی ہمت دے وہ ہمیں پریشانیوں کا سامنا کرنے میں مشکلات کا مقابلہ کرنے اور ان پریشانیوں میں مصائب اور ان مشکلات کو شکست دینے کی استطاعت دے اور وہ ہمارے اندر



جرات ہمت اور طاقت پیدا کر دے" خواجہ صاحب رکے ذرا سا توقف کیا اور پھر اسی شیریں لہجے میں بولے "دنیا کے تمام کامیاب لوگوں کے پاس یہی طاقت ہمت اور جرات ہوتی ہے ان کے پاس یہی استطاعت ہوتی ہے جس کے باعث یہ لوگ کامیابی پر کامیابی حاصل کرتے جاتے ہیں تم بھی اہم کی حیات پر حوصلہ اہم کرام کی زندگیوں کا احوال دیکھو تم دنیا کے تمام بڑے فلسفیوں سائنس دانوں لیڈروں اور رہنماؤں کی بانیو گرافیاں پڑھو جنہیں ان سب کی زندگیوں میں ان گنت مسائل اور مصائب ملیں گے لیکن ان میں سے کسی شخص نے کبھی ان مصائب اور مسائل کے خاتمے کی دعا نہیں کی انہوں نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ان مشکلوں سے بچنے کی ہمت مانگی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی انہیں استطاعت اور طاقت عطا کی اور یوں یہ لوگ کامیاب ہو گئے حضرت آدم سے لے کر نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ تک تم سب بھی اہم کے احوال دیکھو تم سقراط سے لے کر مل گئیں تک دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی زندگی کا تجزیہ کرو تمہیں ان سب میں دو چیزیں مشترک نظر آئیں گی مسائل اور ہمت یہ لوگ مسائل کے سامنے ڈٹے رہے انہیں ان کے گھر والوں نے فراموش کر دیا انہیں ان کے قبیلے نے وھکے دیئے انہیں ان کی قوم نے نکال دیا یہ بھی کہ کے ریکڑاڑوں میں مارے مارے پھرتے رہے اور کبھی شعب ابی طالب میں خشک چڑا اہال کرکھاتے رہے ان میں سے بے شمار لوگوں کو زمین کی گولائی مارنے کے جرم میں سزا دی گئی لوگوں نے کے مارکر ان کے کان پھاڑ دیئے ان سے ان کے بچے چھین لئے گئے یہ لوگ کوڑھی بن کر خلافت میں پڑے رہے یہ لوگ چالیس چالیس برس تک جھلی کے پیٹ میں رہے انہیں مصر سے نقل مکانی کرنی پڑی یہ لوگ ہزاروں میں موت کی آئی کے عوض بکے انہیں جج بولنے کے جرم میں قید خانوں میں ڈالا گیا انہیں زہر کے پیالے پینے پر مجبور کیا گیا انہیں دھوپ میں کھڑا کر کے کوڑے مارے گئے اور ان کی کھالیں کھینچی گئیں لیکن ان لوگوں نے پسائی اختیار نہ کی یہ لوگ مسائل مشکلات اور مصائب سے نہ گھبرائے یہ لوگ ڈٹے رہے لہذا آخری فتح ان ہی کے حصے آئی یہی وہ لوگ تھے جو کامیاب ٹھہرے" وہ خاموش ہو گئے۔

ہم سب حیرت اور سرشاری کے عالم میں ان کا چہرہ دیکھتے رہے انہوں نے آنکھیں بند کیں ذرا دیر کے اور پھر دوبارہ بولے "مجھے یہ نقطہ ایک امریکی دانشور جم روڈن نے سمجھا تھا" جم روڈن امریکہ میں کامیابی پر لکھتے رہے وہ لوگوں کو بتاتا ہے آپ لوگ کامیاب کیسے ہو سکتے ہیں آپ لوگ خوشی تک کیسے پہنچ سکتے ہیں اور آپ لوگ ایک پرست اور مطمئن زندگی کیسے گزار سکتے ہیں مجھے جم روڈن کی ایک سی ڈی سننے کا اتفاق ہوا تھا یہ کامیابی پر اس کا ایک لکچر تھا اس لکچر کے دوران اس بد بخت نے ایک ایسا فقرہ کہہ دیا جس نے میری زندگی کا نظریہ ہی تبدیل کر دیا جس نے مجھے دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی کامیابی کا اصل گر سمجھا دیا میں چاہتا ہوں آپ سب لوگ یہ فقرہ لکھ کر اپنی میز پر لگا لو اس نے کہا تھا

"Do Not Wish For Less Problems, Always Wish For More Skills"

وہ رکے اور مسکرا کر بولے "اگر تم لوگ کامیاب ہونا چاہتے ہو تو اس فقرے کو اپنا پیر مان لو اسے اپنا رہنما بنا لو تم زندگی میں کبھی ناکام نہیں ہو گے"



## وائے می

”سر میرا کیا قصور ہے“ وائے می سر“ اس نے منہ پر ہاتھ رکھا اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا“ کمرے کی فضا سوگوار ہو گئی“ میں خاموش ہو گیا“ اس کی کہانی میں دکھ اور ملال تھا“ وہ مظفر آباد شہر کا رہنے والا تھا“ وہ لوگ کچلی تین لسلوں سے رکھیں تھے والد کپڑے کا کاروبار کرتے تھے وہ تین بہنیں اور چار بھائی تھے“ 18 اکتوبر کو زلزلہ آیا اور اس کا سارا خاندان اس زلزلے کی نذر ہو گیا“ والدین“ بہن بھائی“ سبھیے اور بھانجیاں سب فوت ہو گئے“ وہ انیس اور گھر لیے کا ڈھیر بن گئے“ صرف وہ زندہ بچا۔ وہ بچھلے دو ماہ سے ایک امدادی کیمپ میں پڑا تھا“ اس نے اپنی کہانی سنائی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا“ اس کا کہنا تھا“ ”سر میرا کیا قصور ہے“ وائے می“

میں نے اس سے کہا“ بخت زمان اتم نے آخر آتش کا نامنا ہے“ اس نے آنکھیں پونچھیں اور انکار میں سر ہلادیا“ ”آخر آتش ایک وقت میں دنیا کا سب سے بڑا ٹینس پلیئر تھا“ وہ درجنیہا کے مشہور قصبہ رحمت میں پیدا ہوا“ وہ افریقی امریکن تھا“ اس کی ماں اس کا باپ دونوں کالے تھے“ اس نے بچپن میں اٹھلیٹ بننے کی کوشش کی لیکن جسمانی کمزوری کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا“ چھ سال کی عمر میں اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا“ وہ اکیلا رہ گیا“ جب تہائی ستانے لگی تو اس نے فیصلہ کیا وہ دنیا میں کوئی ایسا کام کرے گا جو اس سے پہلے کسی کالے نے نہ کیا ہو“ اس نے ٹینس کھیلنا شروع کر دی“ وہ کورٹ میں داخل ہوا تو اس نے کمال کر دیا“ وہ 1963ء میں امریکہ کا سب سے بڑا ٹینس پلیئر تھا“ حکومت نے اسے ڈیوس کپ کی ٹیم میں شامل کر لیا“ وہ امریکہ کی قومی ٹیم کا پہلا کالہ کھلاڑی تھا“ وہ ڈیوس کپ جیت گیا“ یہ ایک حیران کن کامیابی تھی۔ 60ء کی دہائی میں امریکہ کے اخبارات ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینلوں نے اسے اتنی کوریج دی کہ وہ 1969ء میں امریکہ کا سب سے زیادہ مشہور شخص تھا“ میں چند لمحوں کے لئے رک گیا۔ اس نے نشو سے منہ صاف کیا اور بڑے جوش سے بولا“ ”ویل ڈن سر یہ تو بڑی دلچسپ کہانی ہے“ میں مسکرایا“ ”میں اصل کہانی آگے آئے گی“ اس نے سر ہلادیا“ میں نے گھٹکوں کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا“ 1969ء میں جنوبی افریقہ میں ٹینس کا بیچ تھا“ آتش نے ساؤتھ افریقہ کے دیزے کے لئے درخواست دی“ اس کی درخواست مسترد کر دی گئی“ اس وقت جنوبی افریقہ میں گوروں کی حکومت تھی اور وہ کسی کالے کو ویزہ جاری نہیں کرتے تھے“ آخر آتش کے لئے یہ زندگی کا دوسرا بڑا چیلنج تھا“ اس نے ٹینس چھوڑ دی اور امریکہ میں کالوں کے حقوق کی جنگ شروع کر دی“



۱

۱۔ مشہور آدمی تھا میڈیا اور عوام اس کے ساتھ تھے اس نے اپنے چاہنے والوں کو اپنی فوج بنالیا یہاں تک کہ امریکہ اور اس کی حلیف طاقتیں کالوں کے حقوق تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئیں ساؤتھ افریقہ کے سفارتخانے نے اسے ویزہ جاری کر دیا یہ اس کی بہت بڑی کامیابی تھی "میں سانس لینے کے لئے رکا" نوجوان ہلکا سا مسکرایا اور پرجوش آواز میں بولا "سرکمال ہے یہ تو بہت بڑا شخص تھا" میں نے ہنس کر کہا "نہیں اصل کہانی ابھی آگے آئے گی" وہ ہسٹن کوش ہو گیا "میں نے کہا" جب وہ ساؤتھ افریقہ کا ویزہ لے کر نکلا تو کسی نے کہا آتش نے ویزہ تو حاصل کر لیا لیکن وہ اب ٹینس نہیں کھیل سکے گا اس شخص کا خیال تھا جو شخص اتنے سال فینس کوٹ سے باہر رہا وہ اس کیلئے دوبارہ پینٹل چیمپین بننا آسان نہیں ہوگا اس شخص کی بات ٹھیک تھی لیکن آتش ایک بار پھر کورٹ میں داخل ہوا اس نے کھیلنا شروع کیا اور 1975ء میں اس نے ٹینس کی دنیا کا سب سے بڑا اعزاز ویمبلڈن کپ جیت لیا وہ یہ کپ لے کر باہر نکلا تو دو ورلڈ شار تھا "میں رکا" میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا اس نے کسمسا کر پہلو بدلا اور پھر ہمارا آواز میں بولا "ویل ڈن سر وہ تو کمال شخص تھا" میں مسکرایا "نہیں اصل کہانی ابھی آگے آئے گی" وہ پوری طرح متوجہ ہو گیا "1980ء میں اسے دل کا دورہ پڑا اسے ہارٹ سرجری کے لئے ہسپتال لے جایا گیا وہاں اسے خون دیا گیا اس خون میں ایچ آئی وی تھا آخر آتش ہسپتال سے نکلا تو وہ ایلیڈ کا مریض بن چکا تھا ہیرڈیز ہو گیا "وہ 1993ء تک پورے 13 سال اس مرض سے لڑتا رہا دنیا کے 34 کاروباری اداروں 55 بڑے ہسپتالوں اور دنیا کے 4 ہزار ڈاکٹروں نے اس کی جان بچانے کی کوشش کی لیکن دنیا کا سپر سٹار 6 فروری 1993ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا "میں خاموش ہو گیا" نوجوان ایک بار پھر اس ہو گیا اور اس نے دہکی لہجے میں کہا "موسین" سر یہ بڑی دہکی کہانی ہے "میں نے فوراً عرض کیا "نہیں اصل کہانی آگے آئے گی" وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے عرض کیا "تم نے سوچا یہ کہانی یہاں ختم ہوگئی لیکن اصل کہانی ابھی باقی ہے جب آخر آتش ہسپتال میں آخری سانس لے رہا تھا تو اس کے ایک فہن نے اسے ایک خط لکھا تھا اس خط میں اس نے آتش سے ایک عجیب سوال کیا اس نے پوچھا اس وقت دنیا میں 5 ارب لوگ ہیں قدرت نے ان 5 ارب لوگوں میں سے صرف تمہیں اس موذی مرض کیلئے کیوں منتخب کیا؟ وائے یو! آخر آتش نے اس وائے یو کا کمال جواب دیا یہ جواب ایک پورا فلسفہ ہے۔ میں زندگی میں جب بھی مایوس ہوتا ہوں میں جب بھی خود کو بد نصیب محسوس کرتا ہوں تو میں آتش کی وہ چند لائنیں نکال کر پڑھ لیتا ہوں یقین کرؤ میں ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں میں خود کو دنیا کا خوش نصیب ترین شخص سمجھنے لگتا ہوں آخر آتش نے اسے جواب دیا تھا دنیا میں ہر سال 50 کروڑ بچے ٹینس کھیلنا شروع کرتے ہیں ان میں سے صرف 5 کروڑ بچے یہ کھیل سیکھ پاتے ہیں ان 5 کروڑ بچوں میں سے صرف 5 لاکھ نوجوان پروفیشنل ٹینس پلیئر بنتے ہیں ان پانچ لاکھ نوجوانوں میں سے صرف 50 ہزار کھیل کے سرکٹ میں داخل ہوتے ہیں ان 50 ہزار میں سے صرف پانچ ہزار گرینڈ سلام تک پہنچتے ہیں ان پانچ ہزار کھلاڑیوں میں سے صرف 50 ویمبلڈن کھیلنے آتے ہیں ان پچاس میں سے صرف 4 سکی فائنل تک پہنچتے ہیں ان چار میں سے صرف



دو فائل کھینچتے ہیں اور ان دو میں سے صرف ایک شخص کو وہ ملہذاں کپ ملتا ہے اور میں دنیا کے ان 5 ارب لوگوں میں سے ایک ہوں جسے وہ ملہذاں کپ ملتا تھا میں دنیا کے ان 50 کروڑ کھلاڑیوں میں سے واحد شخص ہوں جس نے ٹینس کھیلنا شروع کیا اور وہ وہ ملہذاں تک پہنچ گیا میں نے زندگی میں ٹینس کے 800 بڑے اعزاز حاصل کئے یہ ریکارڈ تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے میں جب بھی ٹرافی کپ یا ایوارڈ لینے جاتا تھا تو میں خود کو اس اعزاز کا حق دار سمجھتا تھا میں نے کبھی اپنے اللہ سے یہ نہیں پوچھا تھا اے اللہ تعالیٰ تم نے پوری دنیا میں صرف مجھے ہی اس اعزاز کے لئے کیوں منتخب کیا وائے آج میں تکلیف میں ہوں مجھے جب درد ہوتا ہے اور میں اللہ سے یہ پوچھنے لگتا ہوں وائے می تو مجھے اپنے وہ تمام اعزاز یاد آ جاتے ہیں اور میں سوچتا ہوں جب میں نے اپنی کامیابیوں پر اللہ تعالیٰ سے یہ نہیں پوچھا تھا "کاڈ وائے می" تو آج مجھے اپنی تکلیف میں بھی اس سے یہ سوال پوچھنے کا کوئی حق حاصل نہیں جب میں مصلحتی کامیابیوں پر بھی اس کا شکرا ادا نہیں کیا تو آج مجھے اپنی ناکامی پر اس سے کوئی شکوہ نہیں کرنا چاہیے میں خاموش ہو گیا تو جوان کی آنکھوں میں روشنی اتر آئی وہ بولا "مروافقی یہ زندگی کا ایک نیا زاویہ ہے میں نے کبھی زندگی کو اس پہلو سے نہیں دیکھا تھا" میں نے قہقہہ لگایا "نہیں ابھی اصل کہانی آگے ہے آخر آتش نے مرنے سے چند لمحوں پہلے کہا تھا "اے دنیا کے لوگو! اللہ کو کبھی یہ نہ بتاؤ تمہاری مصیبت کتنی بڑی ہے تم مجھ اپنی مصیبت کو یہ بتاؤ تمہارا اللہ کتنا بڑا ہے تم دکھ اور تکلیف سے رہائی پا جاؤ گے" میں رکاوٹ دوبارہ بولا "آخر آتش نے کہا تھا جس شخص نے کامیابیوں پر شکرا ادا نہیں کیا اسے ناکامیوں پر شکوہ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور جو شخص اپنی مصیبت کو اپنے رب سے بڑا سمجھتا ہے اسے اللہ کا بندہ نہیں کہلاتا چاہیے"

